تحریکِ آزادیٔ ہند

اور

مُسلمان

حصّہ دوم

"جو مُسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم اور اضافوں پر مشتمل ہے"

سیّد ابُوالاعلیٰ مودُودیؒ

اِسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

۱۳۔ای، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور (پاکستان)

طابع : ـــــــــــ رانا اللہ داد خاں، مینجنگ ڈائرکٹر

ناشر : ـــــــــــ اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

۱۳۔ ای شاہ عالم مارکیٹ لاہور

مطبع : ـــــــــــ زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور

اشاعت :

۲ تا ۹	مئی ۱۹۷۳ء تا اکتوبر ۱۹۸۹ء	۹۵۰۰
۱۰	جنوری ۱۹۹۶ء	۵۰۰

(قیمت ۹۰/۰۰ روپے)

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

میری اس کتاب کا حصہ اوّل اس سے پہلے شائع ہو چکا ہے جو دراصل تین اجزاء پر مشتمل تھا۔

۱۔ میرے وہ مضامین جو ۱۹۳۷ء میں "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ اول" کے نام سے ابتداءً شائع ہوئے تھے اور پھر ایک مدت تک اِسی نام سے کتابی صورت میں شائع ہوتے رہے۔

۲۔ وہ مضامین جو میں نے ۱۹۳۸ء میں "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ دوم" کے نام سے شائع کیے تھے اور وہ بھی ایک مدت تک اِسی نام سے شائع ہوتے رہے۔

۳۔ میری کتاب "مسئلہ قومیت" کے بعض حصے جو ۱۹۳۹ء میں لکھے گئے تھے۔ ان سب کا موضوع ہندوستان کے مسلمانوں کو اُن خطرات سے آگاہ کرنا تھا جو ملک کے تمام باشندوں کو ایک قوم فرض کر کے ایک لادینی جمہوری قومی ریاست میں ضم کر دینے سے ان کے دین، ان کی تہذیب اور ان کی انفرادیت کو لاحق ہو سکتے تھے۔ اگرچہ اب وہ زمانہ گزر چکا ہے اور حالات بدل گئے ہیں، لیکن بہرحال ان مضامین کی ایک تاریخی اہمیت تھی، اس لیے ان کو "تحریک آزادی ہند اور مسلمان" حصہ اول کے نام سے از سرِ نو شائع کیا گیا۔

اب اسی کتاب کا یہ دوسرا حصہ شائع کیا جا رہا ہے جو دو اجزاء پر مشتمل ہے:

۱۔ میرے وہ مضامین جو مئی ۳۹ء سے اپریل ۴۱ء تک لکھے گئے تھے اور "مسلمان اور موجودہ

سیاسی کشمکش حصہ سوم کے نام سے اُسی زمانے میں شائع ہو چکے تھے۔ ان میں سے ہر مضمون کی تاریخ اشاعت درج کر دی گئی ہے جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ کیا بات کن حالات میں کہی گئی تھی۔

۲۔ وہ مضامین جو سیاسی کشمکش حصہ سوم کی اشاعت کے بعد اسی موضوع سے تعلق رکھنے والے مسائل پر ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۸ء تک لکھے گئے۔ یہ سب مضامین اگرچہ رسالہ ترجمان القرآن میں اپنے اپنے وقت پر شائع ہوتے رہے تھے لیکن ان کو کہیں یکجا مرتب نہیں کیا گیا تھا۔ اب پہلی مرتبہ ان کو مرتب کر کے اس کتاب میں اُن کا اضافہ کر دیا گیا ہے، اور ان میں سے بھی ہر مضمون کی تاریخ اشاعت درج کر دی گئی ہے تاکہ ہر بات کو اس کے تاریخی پس منظر میں دیکھا اور سمجھا جا سکے۔

چونکہ یہ مضامین ——— خصوصاً اس کتاب کے جزو اول کے مضامین ——— برسوں سے میرے خلاف معاندانہ پروپیگنڈے کے لیے خوب خوب استعمال ہوتے ہیں اور ان کی عبارتوں کو سیاق و سباق سے الگ کر کے عجیب عجیب معنی پہناتے جاتے رہے ہیں، اس لیے میں نے ترتیب و نظر ثانی کے وقت ان کی عبارات میں کوئی تغیر نہیں کیا ہے۔ اگر کسی چیز کی تشریح کرنے یا کسی چیز کا اضافہ کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے تو اسے حاشیہ کی صورت میں درج کیا ہے، اور قدیم و جدید حواشی کے درمیان فرق کرنے کے لیے قوسین میں قدیم، یا جدید کے الفاظ لکھ دیئے ہیں، تاکہ کوئی غلط فہمی بھی پیدا نہ ہو، اور کوئی یہ بھی نہ کہہ سکے کہ معترضین کے اعتراضات سے بچنے کے لیے عبارتوں میں ردوبدل کر دیا گیا ہے۔

یہ بھی ایک تاریخی دستاویز ہے جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ میں ۱۹۲۹ء سے تقسیم ہند کے وقت تک ہندوستان کے مسلمانوں سے کیا کہتا رہا ہوں، اور تقسیم کے بعد پاکستان کے مسلمانوں کو میں نے اسلام کے اصل نصب العین کی طرف توجہ دلانے کے لیے ۱۹۴۸ء میں کس طرح اپنی کوششوں کا آغاز کیا۔ تقسیم کے بعد گزشتہ ۲۵ سال کے دوران میں پیش آنے والے حالات کو نگاہ میں رکھ کر ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ جو کچھ میں نے اُس

وقت لکھا تھا وہ حق تھا یا نہیں۔ معترضین کے پیش کردہ اقتباسات، جو زیادہ تر سیاق و سباق سے الگ نکال کر اور تاریخی سیاق کو بھی نظر انداز کر کے پیش کیے گئے ہیں، کسی شخص کو صحیح اور منصفانہ رائے قائم کرنے میں مدد نہیں دے سکتے۔ میری اصل عبارتیں پوری تاریخی ترتیب کے ساتھ بے کم و کاست اس کتاب میں ناظرین کے سامنے موجود ہیں۔ انہیں پڑھیں اور جو رائے قائم کرنا چاہیں کریں۔

لاہور

یکم نومبر ۱۹۷۲ء

ابوالاعلیٰ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مقدمہ طبعِ اوّل

"مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے عنوان سے میرے مضامین کے دو مجموعے اِس سے پہلے شائع ہو چکے ہیں[1]۔ اب اُسی سلسلہ کا یہ تیسرا مجموعہ شائع کیا جا رہا ہے۔ بظاہر پہلے دونوں مجموعوں سے اِس تیسرے مجموعہ کا فاصلہ اتنا زیادہ ہے کہ ایک شخص بادی النظر میں یوں محسوس کرے گا کہ مَیں نے حصّہ دوم کے بعد سے یکایک اپنی پوزیشن بدل دی ہے اور خود اپنی بہت سی کہی ہوئی باتوں کی تردید کرنے لگا ہوں۔ لیکن درا صل اِن تینوں مجموعوں میں ایک نصب العین کی طرف تدریجی ارتقاء ہے جس کی توضیح یہاں کر دینا چاہتا ہوں تاکہ ناظرین کو کسی قسم کا خلجان پیش نہ آئے۔

یہ بات تھوڑے غور و تامل سے ہر شخص کی سمجھ میں آسکتی ہے کہ ایک پُرانی تحریک کو زوال و انحطاط کے بعد دوبارہ زندہ کرنے کا کام کسی نئی تحریک کی ابتداء کرنے کی بہ نسبت زیادہ دشوار اور پیچیدہ ہوتا ہے۔ نئی تحریک پیش کرنے والے کا راستہ تو بالکل صاف ہوتا ہے۔ اُسے صرف اُن لوگوں سے سابقہ پیش آتا ہے جو

---

[1] اب یہ دونوں مجموعے "تحریکِ آزادئ ہند اور مسلمان" حصہ اوّل کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ "مسئلہ قومیت" مستقل کتاب کی صورت میں بھی مل سکتی ہے (جدید)

اُس تحریک سے بیگانہ ہوتے ہیں۔ اُس کو محض اپنے اصول و مقاصد کی تبلیغ کرنی ہوتی ہے۔ پھر یا تو لوگ اُس کی دعوت کو رد کر دیتے ہیں یا قبول کر لیتے ہیں۔ لیکن جو کسی پرانی تحریک کو زوال و انحطاط کے بعد دوبارہ زندہ کرنا چاہے اُس کے لیے صرف یہی ایک کام نہیں ہوتا کہ بیگانوں کے سامنے اپنی دعوت پیش کرے، بلکہ اسے یگانوں پر بھی نظر رکھنی پڑتی ہے۔ وہ اُن لوگوں کو کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتا جو پہلے سے اُس تحریک کے ساتھ وابستہ ہیں اور بہرحال بیگانوں کی بہ نسبت اس سے قریب تر ہیں۔ اُس کو سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ انحطاط کا عمل اُن کے اندر کہاں تک ہو چکا ہے اور اصل تحریک کا اثر کس حد تک اُن میں باقی ہے۔ پھر اُسے یہ فکر کرنی پڑتی ہے کہ جس حد تک بھی وہ دُور نکل گئے ہیں اس سے آگے نہ جانے پائیں، اور جو کچھ اثر اُن کے اندر باقی ہے وہ محفوظ رہے۔ اُن کی حیثیت اُس تحریک کے حق میں بالکل اُس سرمایہ کی سی ہوتی ہے جو کسی شخص کے پاس بچا کھچا باقی رہ گیا ہو، اور ظاہر ہے کہ ایک عقلمند آدمی کسی طرح یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ جو کچھ اس کا ہے وہ بھی ہاتھ سے جاتا رہے۔ لہٰذا اس کے لیے ناگزیر ہوتا ہے کہ اس تحریک کے ساتھ لوگوں کی وابستگی جیسی کچھ بھی برسرِ دست ہے اُس کو کم از کم اُسی حد پر برقرار رکھنے کی کوشش کرے اور اس کو مزید اضمحلال سے روکے۔ تحفظ کی اس تدبیر میں کسی حد تک کامیاب ہو جانے کے بعد اس کے لیے لازم ہوتا ہے کہ وہ انہیں موجودہ حالت پر نہ ٹھیرنے دے بلکہ اصل تحریک کی طرف ان کو کھینچنے کی کوشش کرے اور کسی دوسری چیز کو ان کا نصب العین اور ان کی کوششوں کا مرکز و محور نہ بننے دے۔ اتنے مرحلوں سے گزر کر پھر کہیں اس کے لیے دعوتِ عام کا موقع آتا ہے اور وہ اس مقام پر پہنچتا ہے جہاں سے ایک نئی تحریک پیش کرنے والے کا کام شروع ہوتا ہے۔

چونکہ میرے پیشِ نظر تحریکِ اسلامی کا احیاء ہے اس لیے مجھے بھی اُسی تدریج کے ساتھ اپنے مقصد کی طرف پیش قدمی کرنی پڑی ہے جس کی طرف اُوپر

اشارہ کیا گیا ہے۔ "ترجمان القرآن" کی زندگی کے ابتدائی چار سال اس کوشش میں صرف ہوئے کہ مسلمانوں کے مختلف طبقوں میں گمراہی کی جو جو شکلیں پیدا ہو گئی ہیں ان پر گرفت کی جائے اور اسلام سے جو روزافزوں بُعد ان میں پیدا ہو رہا ہے اُسے روکا جائے[1]۔ ابھی یہ کوشش جاری تھی کہ ۳۷ء میں یکایک یہ خطرہ سامنے آگیا کہ ہندوستان کے مسلمان کہیں اُس وطنی قومیت کی تحریک کے شکار نہ ہو جائیں جو آندھی اور طوفان کی طرح ملک پر چھائی چلی جا رہی تھی۔ یہ ظاہر بات ہے کہ ہم موجودہ ظالمانہ نظامِ حکومت[2] کے خواہ کتنے ہی مخالف ہوں، اور ہمارے دل میں اس کے پنجے سے نکلنے کی خواہش چاہے کانگریسی حضرات سے بھی بڑھی ہوئی کیوں نہ ہو، مگر ہم کسی طرح بھی یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ جو لوگ اِس وقت تک تھوڑے یا بہت اسلام کے حلقۂ اثر میں ہیں اُن کو ہندوستانی قوم پرستی کی تحریک اپنی رابطۂ عوام (Mass Contact) کی تدبیروں سے، اور اپنی وردھا اسکیم اور ودیا مندر اسکیم کے ذریعہ سے، اور اپنے سیاسی و معاشی تفوق کے زور سے اپنے اندر جذب کر لے، اور ان کے نظریات اور ان کی زندگی کو اتنا متغیر کر دے کہ ایک دو پشتوں کے بعد ہندوستان کی آبادی میں اسلام اتنا ہی اجنبی ہو کر رہ جائے جتنا جاپان یا امریکہ میں ہے[3]۔ اس خطرہ کو جس چیز نے اور زیادہ پریشان کن بنا دیا وہ یہ تھی کہ محض انگریزی اقتدار سے آزاد ہونے کے لالچ میں مسلمانوں کے مذہبی رہنماؤں کا ایک سب سے زیادہ با اثر طبقہ وطنی قوم پرستی کی تحریک کا معاون بن گیا اور اس نے انگریز دشمنی کے اندھے جوش میں اِس چیز کی طرف سے

---

۱ میری کتاب "تنقیحات" اسی کوشش کا آئینہ ہے۔ (قدیم)

۲ مراد ہے انگریزی حکومت جو اس وقت پورے برِصغیر ہند و پاکستان پر مسلط تھی۔ (جدید)

۳ اس کا پس منظر سمجھنے کے لیے میری کتاب "تحریکِ آزادیِ ہند اور مسلمان" حصہ اول ملاحظہ فرمائیں۔ (جدید)

بالکل آنکھیں بند کر لیں کہ اس تحریک کا فروغ ہندوستان میں اسلام کے مستقبل پر کس طرح اثر انداز ہوگا۔[1] لہٰذا اس خطرے کا سدِّباب کرنے کے لیے میں نے "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے عنوان سے مضامین کا ایک سلسلہ ۳۷ء کے آخر میں اور پھر دوسرا سلسلہ ۳۸ء کے آغاز میں شائع کیا۔ اِن مجموعوں میں میرے پیشِ نظر صرف یہ چیز تھی کہ مسلمان کم از کم اپنی مسلمانیت کے موجودہ مرتبے سے نیچے نہ جانے پائیں اور اپنے تشخّص کو گم نہ کر دیں۔ اس لیے میں نے ان کے اندر اسلامی قومیت کا احساس بیدار کرنے کی کوشش کی، ان کو اُس جمہوری لادینی نظامِ حکومت کے نقصانات سے آگاہ کیا جو واحد قومیت کے مفروضہ پر ہندوستان میں قائم کیا جا رہا تھا، اُن آئینی تحفظات اور "بنیادی حقوق" کی حقیقت واضح کی جن پر اعتماد کر کے مسلمان اُس مُہلک جمہوری دستور کے جال میں پھنسنے کے لیے آمادہ ہو رہے تھے، اور ان کے سامنے "شبہِ دارالاسلام"[2] کا نصب العین پیش کیا تاکہ کسی نصب العین کے موجود نہ ہونے سے خیالات اور اعمال کی جو پراگندگی اُن کے اندر پیدا ہو گئی ہے وہ بھی دُور ہو اور اُن کو نظر جانے کے لیے ایک ایسا مطمحِ نظر بھی مل جائے جو نہ تو اصل اسلامی سمت سے ہٹا ہوا ہو اور نہ اتنا زیادہ بلند ہو کہ اُس کی بلندی کو دیکھ کر ان کی ہمتیں پست ہو جائیں۔

اُس وقت چونکہ تحفظ کا کام مقدم تھا اس لیے میں نے آزادی، قومیت، قومی تہذیب، حکومت خود اختیاری، اقلیت و اکثریت وغیرہ کے متعلق رائج الوقت تصوّرات کے خلاف کچھ کہنے سے قصداً احتراز کیا، اور ان الفاظ کے جو مفہومات ذہنوں میں راسخ تھے ان کو جوں کا توں قبول کر کے اُسی زبان میں گفتگو کی جس کو لوگ

---

[1] مراد ہے علماء کا وہ گروہ جو اُس وقت کانگریس کا ساتھ دے رہا تھا۔ (جدید)

[2] یعنی ہندوستان اگر پورا دارالاسلام نہ بن سکے تو دارالاسلام سے مشابہ ایک ایسا ملک بن جائے جس میں ان کا اسلامی تشخّص برقرار رہ سکے۔ (جدید)

سمجھ سکتے تھے۔ اسی طرح میں نے مطلوب اصلی سے بحث کرنے کے بجائے حالتِ واقعی تک اپنی بحث کو محدود رکھنا زیادہ مناسب سمجھا تاکہ دونوں چیزوں کو بیک وقت پیش کرنے سے دماغ پراگندہ نہ ہو جائیں اور ایک ہی چھلانگ میں مقصدِ بعید تک پہنچنے کی کوشش کہیں مقصدِ قریب کے بھی ہاتھ سے جانے کی موجب نہ بن جائے۔

یہ کام جس غرض کے لیے کیا گیا تھا اللہ کے فضل و کرم سے وہ پچھلے دو تین سال میں حاصل ہو چکی ہے اور اب اس امر کا کوئی خطرہ باقی نہیں ہے کہ ہندوستان کے مسلمان کسی وطنی قومیت میں اپنے آپ کو گم کر دیں گے یا اپنے آپ کو کسی ایسے جمہوری نظام میں نتھی کرالیں گے جو واحد قومیت کے مفروضہ پر تعمیر کیا گیا ہو۔ یہ جو کچھ ہوا کسی انسانی کوشش سے نہیں بلکہ محض اللہ کے فضل سے ہوا۔ اُسی کی مہربانی سے متعدد اسباب ایسے پیدا ہوئے جن کی بدولت مسلمان اِس خطرے سے بچنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اِس سلسلہ میں جن جن لوگوں کو اس نے تھوڑی یا بہت خدمت کی توفیق بخشی ان کے لیے فخر کا مقام نہیں بلکہ شکر کا مقام ہے۔

اس مرحلہ کے طے ہو جانے کے بعد اب میرے سامنے دوسرا سوال یہ تھا کہ آیا مسلمانوں کو اُس نتیجہ پر مطمئن ہو نے دیا جائے جو حاصل ہو چکا ہے یا ان میں مزید بے چینی پیدا کر کے انہیں اسلام کے اصلی نصب العین کی طرف دھکیلنے کی کوشش کی جائے؟ آیا مسلمانوں کو سیاست و اجتماع کے اُنہی غلط تصورات میں مبتلا رہنے دیا جائے جو مغربی جاہلیت سے اُنھوں نے سیکھے ہیں یا اُن کے سامنے اسلام کے اجتماعی و سیاسی تصورات کو صرف علمی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ ایک عملی مطمحِ نظر کی حیثیت سے بھی پیش کر دیا جائے؟ آیا مسلمانوں کو محض اپنی انفرادیت کے سنبھالنے ہی میں لگا رہنے دیا جائے یا انہیں یہ بتایا جائے کہ تمہاری انفرادیت مقصود بالذات نہیں بلکہ ایک عظیم تر مقصد کے لیے مطلوب ہے؟ یہ سوال سامنے آتے ہی میرے ضمیر نے قطعی فیصلہ صادر کیا کہ پہلی شق غلط ہے اور صرف دوسری شق ہی صحیح ہے۔

چنانچہ اگر کوئی دوسرا سبب پیش نہ آتا تب بھی مجھے وہ کام کرنا ہی تھا جو میں نے کیا۔ لیکن بدقسمتی سے اس کے ساتھ دو مزید وجوہ ایسے پیدا ہو گئے جنہوں نے مجبور کر دیا کہ پچھلے مجموعہ کی اشاعت کے فوراً بعد ہی اُن مضامین کا سلسلہ شروع کر دوں جن کا مجموعہ اس وقت ہدیۂ ناظرین کیا جا رہا ہے۔

پہلی وجہ یہ تھی کہ اس نئی تحریک کے دَور میں عامۂ مسلمین کی قیادت و رہنمائی ایک ایسے گروہ کے ہاتھ میں چلی گئی جو دین کے علم سے بے بہرہ ہے اور محض قوم پرستانہ جذبہ کے تحت اپنی قوم کے دُنیوی مفاد کے لیے کام کر رہا ہے۔ دین کا علم رکھنے والا عنصر اس گروہ میں اتنا بھی نہیں جتنا آٹے میں نمک ہوتا ہے اور اُس قدرِ قلیل کو بھی کوئی دخل رہنمائی میں نہیں ہے۔ یہ براہِ راست نتیجہ ہے علماءِ کرام کی اُس غلط سیاسی روش کا جس پر وہ ابھی تک اصرار کیے چلے جاتے ہیں۔ اور میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ ہندوستان میں اس سے پہلے کبھی عام مسلمانوں کا اعتماد علمائے دین سے ہٹ کر اس شدت کے ساتھ غیر دیندار اور ناواقفِ دین رہنماؤں پر نہیں جما تھا۔ میرے نزدیک یہ صورتِ حال اسلام کے لیے وطنی قومیت کی تحریک سے کچھ کم خطرناک نہیں ہے۔ اگر ہندوستان کے مسلمانوں نے دین سے بے بہرہ لوگوں کی قیادت میں ایک بے دین قوم کی حیثیت سے اپنا علیحدہ وجود برقرار رکھا بھی (جیسا کہ ٹرکی اور ایران میں برقرار رکھے ہوئے ہیں[1]) تو ان کے اس طرح زندہ رہنے میں اور کسی غیر مسلم قومیت کے اندر فنا ہو جانے میں آخر فرق ہی کیا ہے؟ ہیرے نے اگر اپنی جوہریت ہی کھو دی تو پھر جوہری کو اس سے کیا دلچسپی کہ وہ کم بخت پتھر کی صورت میں باقی رہے یا منتشر ہو کر خاک میں رُل مِل جائے[2]۔

---

[1] یہ اُس وقت کی کیفیت تھی جب یہ مضمون لکھا گیا تھا۔ (جدید)

[2] یہ بات جب لکھی گئی تھی تو لوگوں کو بہت ناگوار ہوتی تھی۔ لیکن اب ۱۹۷۲ء کے پاکستان میں جو حالت ہے اسے سب دیکھ رہے ہیں۔ (جدید)

دوسری وجہ یہ تھی کہ میں نے اس تحریک کے اندر داعیۂ دینی کے بجائے داعیۂ قومی کو بہت زیادہ کارفرما دیکھا۔ اگرچہ ہندوستان کے مسلمانوں میں اسلام اور مسلم قوم پرستی ایک مدت سے خلط ملط ہیں، لیکن قریبی دور میں اس معجون کا اسلامی جُز اتنا کم اور قوم پرستانہ جُز اتنا زیادہ بڑھ گیا ہے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں اس میں نِری قوم پرستی ہی قوم پرستی نہ رہ جائے۔ حد یہ ہے کہ ایک بڑے ممتاز لیڈر کو ایک مرتبہ اس امر کی شکایت کرتے ہوئے سُنا گیا کہ بمبئی اور کلکتہ کے دولتمند مسلمان اینگلو انڈین فاحشات کے ہاں جاتے ہیں حالانکہ مسلمان طوائفیں ان کی سرپرستی کی زیادہ مستحق ہیں! اس حدِ کمال کو پہنچ جانے کے بعد اس مسلم قوم پرستی کے ساتھ مزید رواداری برتنا میرے نزدیک گناہِ عظیم ہے۔ یہ ظاہر بات ہے کہ مستحکم جماعتی زندگی پیدا کرنے کے لیے افراد میں بہر حال کوئی ایک مشترک وفاداری پیدا کرنا کافی ہے، خواہ وہ خدا کی وفاداری ہو یا قوم کی یا وطن کی۔ اس لحاظ سے جن لوگوں کو محض جماعتی استحکام مطلوب ہے اُن کے لیے تو یہ امر کسی تشویش کا باعث نہیں ہو سکتا کہ مسلمانوں میں خدا کے بجائے قوم کی مشترک وفاداری سے یہ مقصد حاصل ہو۔ لیکن ہم خدا پر ایمان رکھنے والوں کو آخر کس زمین میں پناہ اور کس آسمان کے نیچے سر چھپانے کی جگہ ملے گی اگر ہم بھی خدا کے ان بندوں کو خدا کے بجائے کسی اور کی مشترک وفاداری پر مجتمع ہوتے دیکھتے رہیں اور کچھ نہ بولیں۔

یہ ہیں وہ محرکات جن کے تحت اس مجموعہ کے مضامین لکھے گئے ہیں۔ میں نے ان مضامین میں مسلمانوں کی مختلف جماعتوں پر اور کہیں کہیں اُن کے لیڈروں پر بھی صاف صاف تنقید کی ہے، مگر خدا شاہد ہے کہ کسی شخصیت یا کسی پارٹی سے مجھ کو کوئی ذاتی عداوت نہیں ہے۔ میں صرف حق کا دوست اور باطل کا دشمن ہوں۔ جس چیز کو میں نے حق سمجھا ہے اس کے حق ہونے کی دلیل بیان کر دی ہے، اور جسے باطل سمجھا ہے اس کے بُطلان پر بھی دلائل بیان کر دیے ہیں۔ اگر کوئی

شخص مجھ سے اختلاف رکھتا ہو اور وہ دلیل سے میری رائے کی غلطی واضح کر دے تو میں اپنی رائے واپس لے سکتا ہوں۔ رہے وہ حضرات جو صرف یہ دیکھ کر کہ کچھ اُن کی پارٹی یا ان کی محبوب شخصیتوں کے خلاف کہا گیا ہے غضبناک ہو جاتے ہیں اور پھر اس سے بحث نہیں کرتے کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ حق ہے یا باطل، تو ایسے لوگوں کے غیظ و غضب کی مجھے کوئی پروا نہیں۔ میں نہ ان کی گالیوں کا جواب دوں گا اور نہ اپنے طریقہ ہی سے ہٹوں گا۔

لاہور

محرم ۱۳۶۰ھ (فروری ۱۹۴۱ء)

ابوالاعلیٰ

تعارفِ مقصد

قوانینِ فطرت سب کے سب بلا استثناء، دائمی، عالمگیر اور بے لاگ ہیں۔ یہ آج سے لاکھوں برس پہلے جس قانون کی تابع تھی، اُسی کی تابع آج بھی ہے اور اسی کی تابع قیامت تک رہے گی۔ زمانہ کے تغیّرات کا اس پر کوئی اثر نہیں۔ روشنی اور حرارت کے لیے جو قانون دنیا کے ایک حصّہ میں ہے وہی دوسرے حصّہ میں بھی ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا اور نہیں ہو سکتا کہ مشرق میں حرارت کی ماہیت و کیفیت کچھ اور ہو اور مغرب میں کچھ اور، شمال میں روشنی ایک رفتار سے چلے اور جنوب میں دوسری رفتار سے۔ اشیاء کے بننے اور بگڑنے، بڑھنے اور گھٹنے، پیدا ہونے اور فنا ہو جانے کے لیے جو قوانین مقرر ہیں ان کا اطلاق سب پر یکساں ہوتا ہے۔ ان میں کوئی رُو رعایت، کوئی لاگ لپیٹ، کوئی جانب داری نہیں پائی جاتی۔ فطرت کا کسی کے ساتھ کوئی ایسا رشتہ نہیں جو دوسرے کے ساتھ نہ ہو۔ وہ کسی کی دوست اور کسی کی دشمن نہیں۔ کسی پر مہربان اور کسی پر نامہربان نہیں۔ جو آگ میں ہاتھ ڈالے گا، جل جائیگا۔ جو زہر کھائے گا، مر جائے گا۔ جو غذا کھائے گا، قوّت اور نشوونما پائے گا۔ فطرت کے حدودِ فرمانروائی میں یہ ممکن نہیں کہ دیا سلائی کی رگڑ سے ایک کے لیے تو آگ کا شعلہ پیدا ہو اور دوسرے کے لیے پانی کی دھار۔

انسان جس فطرت پر پیدا کیا گیا ہے وہ بھی اُسی فطرت کا ایک رُخ ہے جو ساری کائنات پر حاوی ہے، لہٰذا انسانی فطرت کے قوانین بھی فطرتِ کائنات کی طرح دائمی، عالمگیر اور بے لاگ ہیں۔ زمانہ کے تغیرات سے مظاہر میں خواہ کتنا ہی تغیر ہو جائے، حقائق میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔ علم اور وہم میں جو فرق آج سے دس ہزار برس پہلے تھا وہی آج بھی ہے اور قیامت تک رہے گا۔ ظلم اور عدل کی جو حقیقت دو ہزار برس قبل مسیح تھی وہی دو ہزار برس بعد مسیح بھی ہے۔ جو چیز حق ہے وہ چین میں بھی ویسی ہی حق ہے جیسی امریکہ میں ہے، اور جو چیز باطل ہے وہ کالے کے لیے بھی اُسی طرح باطل ہے جس طرح گورے کے لیے ہے۔ انسان کی سعادت و شقاوت اور فلاح و خُسران کے لیے فطرت کا قانون قطعاً بے لاگ ہے۔ اس میں کسی شخص، کسی قوم، کسی نسل کے ساتھ کوئی ایسا معاملہ نہیں جو دوسرے کے ساتھ نہ ہو۔ اسبابِ سعادت اور اسبابِ شقاوت سب کے لیے یکساں ہیں۔ جو شقاوت کے اسباب فراہم کرے گا وہ محض اس بنا پر سعادت سے ہمکنار نہیں ہو سکتا کہ اس کا تعلق کسی خاص ملک یا نسل یا قوم سے ہے، اور اسی طرح جو سعادت کے اسباب فراہم کرے گا وہ بھی محض اس بنا پر اپنے کسب کے ثمرات سے محروم نہ رکھا جائے گا کہ وہ فلاں نسل سے تعلق رکھتا ہے یا فلاں نام سے موسوم ہے۔

فطرتِ انسانی کے اس دائمی، عالمگیر اور بے لاگ قانون ہی کا دوسرا نام "اسلام" ہے۔ اس کو انسان پر منکشف کرنے والا وہی فاطرِ کائنات ہے جس نے انسان کی اور سارے جہان کی فطرت بنائی ہے۔ یہ کسی قوم پرست کا تخیل نہیں ہے جو ساری دنیا کو اپنی قوم کے مفاد و مصالح کی نظر سے دیکھتا ہو۔ یہ کسی طبقاتی لیڈر کی فکر بھی نہیں ہے جو سارے معاملات پر ایک طبقہ کے نقطۂ نظر سے نگاہ ڈالتا ہو۔ فی الجملہ یہ کسی انسان کے اجتہاد کا نتیجہ نہیں ہے کہ کسی خاص عہد کا، کسی خاص ماحول کا اور کسی خاص شخص یا گروہ کی دلچسپیوں کا مُقیّد ہو۔ یہ تو درحقیقت رب العالمین کی ہدایت سے ماخوذ ہے، اور رب العالمین وہ ہے جس کی نگاہ میں سب انسان

یکساں ہیں۔ وہ انسان کو انسان کی حیثیت سے دیکھتا ہے نہ کہ ہندی اور جرمن اور اٹالین کی حیثیت سے، یا مزدور اور کسان اور سرمایہ دار کی حیثیت سے۔ اس کو اشخاص اور اقوام سے دلچسپی نہیں بلکہ محض انسان سے ہے۔ اس لیے وہ دیانت، اخلاق اور مدنیتِ فاضلہ کے جتنے اصول بتاتا ہے وہ سب کے سب ہر قسم کی حد بندیوں سے پاک ہیں۔ اُن میں بحیثیتِ مجموعی تمام انسانوں کی فلاح و بہبود اور زندگی کے ہر مرحلے میں ان کی کامیابی مدِ نظر رکھی گئی ہے۔ وہ فطرت کے تمام دوسرے قوانین کی طرح عالمگیر ہیں۔ ان کا کسی شخص یا قوم کے ساتھ کوئی مخصوص رشتہ نہیں ہے جو کسی دوسرے شخص یا قوم کے ساتھ نہ ہو سکتا ہو۔ جو کوئی بھی ان اصولوں کو قبول کر کے ان کے مطابق عمل کرے گا، فلاح پائے گا، خواہ رومی ہو یا حبشی، آریہ نسل سے تعلق رکھتا ہو یا سامی نسل سے، امریکہ میں رہتا ہو یا ایشیا میں۔ اور جو ان اصولوں سے انحراف کرے گا، نقصان اُٹھائے گا، خواہ وہ کسی پیغمبر کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

اسلام کے انہی عالمگیر اصولوں پر انسانی حیات کی تعمیرِ نو کرنا ہر اُس شخص کا فرض ہے جو اسلام کی صداقت پر ایمان لاتے۔ اور چونکہ ہم اس پر ایمان لاتے ہیں اس لیے یہی ہماری تمام کوششوں کا مقصدِ اصلی ہے۔

مگر جب ہم کہتے ہیں کہ ہمارا مقصد سب سے پہلے اپنے وطن کو اور بالآخر تمام دنیا کو "دارالاسلام" بنانا ہے تو اس سے ایک ناواقف آدمی اس غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے کہ جس طرح ہر جوشیلا قوم پرست زمین میں اپنی قوم کا غلبہ اور تمکن چاہتا ہے، اسی طرح یہ لوگ بھی اپنی قوم کو غالب اور حکمران دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ مسلمانوں کی "قوم" میں پیدا ہوتے ہیں اس لیے "مسلمانوں کی حکومت" ان کا نصب العین بن گیا ہے۔ یہی ہندوؤں میں پیدا ہوتے ہوتے تو مونجے اور ساورکر بنتے[1]۔ جرمنی میں پیدا ہوتے ہوتے تو ہٹلر اور گورنگ کے رُوپ میں نمودار ہوتے۔ کسی اطالوی کی آغوش

---

[1] یہ دونوں اُس زمانے میں ہندوستان کے نہایت متعصب ہندو لیڈر تھے۔ (جدید)

مجسّم میں جنم لیتے تو مسولینی کی صورت اختیار کرتے۔

یہ غلط فہمی صرف اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ "دارالاسلام" کو "دارالمسلمین" کا ہم معنی سمجھا جانے لگا ہے، حالانکہ دونوں میں حقیقتہً بڑا فرق ہے۔ جو لوگ کلمہ گو ہونے کی وجہ سے "دائرۂ اسلام" میں داخل ہیں اور معاشرت کے اعتبار سے مسلمانوں میں شمار کیے جاتے ہیں، وہ اگر غیر اسلامی طریقوں پر حکومت کریں، تو اُن کی حکومت مسلمانوں کی حکومت تو ضرور کہلائے گی کہ اتفاق سے اس کے حکمران کلمہ گو ہیں، مگر ایسی حکومت اِسلامی حکومت ہرگز نہ ہوگی اور نہ اس پر صحیح معنوں میں "دارالاسلام" کا اطلاق ہو سکے گا۔ حاشا و کلّا، ہمارا نصب العین ایسی "مسلمان حکومت" کا قیام ہرگز نہیں ہے۔ اگر اس حیثیت سے ہم اپنی قوم کی بڑائی چاہیں، اور اگر ہمارا مقصد یہ ہو کہ محض فوجی طاقت سے مسندِ حکومت پر قبضہ کر کے زمین کی دولت اور فرماں روائی کے تکبّر کو اپنی قوم کے لیے مخصوص کرلیں تو خود اسلام ہی سب سے پہلے آگے بڑھ کر ہم کو ظالم اور مفسد ٹھہرائے گا، کیونکہ وہ صاف کہتا ہے کہ:-

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا۔ (القصص-۸۳)

"آخرت میں عزت کا مقام ہم نے صرف اُنہی لوگوں کے لیے رکھا ہے جو زمین میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور نہ فساد کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

دراصل جو چیز ہمارے پیشِ نظر ہے وہ مسلمانوں کی حکومت نہیں بلکہ اسلام کی حکومت ہے۔ اُسی اسلام کی حکومت جو مجموعہ ہے دیانت، اخلاق اور مدنیّتِ فاضلہ کے عالمگیر اصولوں کا۔ یہ اسلام ہماری یا کسی کے باپ دادا کی میراث نہیں ہے۔ اس کا کسی سے کوئی خاص رشتہ نہیں۔ جو ان اصولوں پر ایمان لائے اور ان پر عمل کرے وہی اسلام کا علمبردار ہے۔ وہ اگر نسل کے اعتبار سے چمار یا بھنگی بھی ہو تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسندِ خلافت پر بیٹھ سکتا ہے، وہ اگر نکٹا حبشی غلام بھی ہو تو عرب و عجم کے شرفاء اور سادات کا امام بن سکتا ہے۔ ساڑھے تیرہ سو برس سے جن کے خاندان میں

اسلام چلا آرہا ہے وہ اگر آج ان اصولوں سے منحرف ہو جائیں تو اسلام میں ان کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ اور کل تک جو شخص ہندو یا عیسائی یا پارسی تھا، شرک اور بت پرستی، شراب نوشی اور سود اور قمار بازی میں مبتلا تھا، وہی اگر آج اسلام کی فطری صداقتوں کو مان کر عملاً ان کا پابند ہو جائے تو اس کے لیے اسلام میں عزت اور بزرگی کے اونچے سے اونچے مراتب تک پہنچنے کا راستہ کھلا ہوا ہے۔

اس مختصر توضیح سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ ہمارا مقصد ایک قوم پر دوسری قوم کی برتری نہیں ہے، بلکہ نظام تمدن کو اُن اصولوں پر مرتب کرنا ہے جو ہمارے ضمیر و ایمان کے مطابق صحیح ہیں۔ اِس پر اگر کوئی ناک بھوں چڑھائے تو ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اس کے پاس آخر وجہِ اعتراض کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ جب کوئی شخص یا گروہ کسی مسلک کا تنقیدی یا تحقیقی مطالعہ کر کے اِس امر کا اطمینان حاصل کر لیتا ہے کہ اُس میں انسانیت کی فلاح اور انسانی معاملات و تعلقات کی بہتری کمال درجہ پر موجود ہے تو اس کے اندر فطری طور پر یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ جس اجتماعی زندگی سے خود اس کا تعلق ہے، جس سوسائٹی کے ساتھ اس کی زندگی و موت وابستہ ہے، جس حلقۂ انسانیت کے ساتھ وہ تمدنی، سیاسی اور معاشی تعلقات میں جکڑا ہوا ہے، سب سے پہلے اُسی کے نظامِ حیات کو اس مسلک کے مطابق بنانے کی کوشش کرے۔ اُسے اپنے اِس پسندیدہ مسلک کے صحیح و مفید ہونے کا جتنا زیادہ یقین ہوگا، اور اس کے دل میں حُبِّ انسانیت یا حُبِّ وطن کا جذبہ جتنا زیادہ قوی ہوگا، اتنا ہی زیادہ وہ اپنے ابنائے نوع یا ابنائے وطن کو اُس مسلکِ حق کے فوائد سے بہرہ مند کرنے کے لیے بے چین ہوگا جس میں وہ اُن کی فلاح و بہبود اور کامرانی و خوش حالی مُضمر دیکھتا ہے، اور اتنی ہی زیادہ شدت کے ساتھ وہ اُن مسلکوں کی حکمرانی کا مخالف ہوگا جن کو وہ پورے یقین کے ساتھ غلط اور نقصان دہ سمجھتا ہے۔ یہ عین انسانی فطرت کا مقتضا ہے اور اس میں کوئی بات خلافِ حُبِّ وطن (Unpatriotic) نہیں ہے۔ بلکہ خلافِ حُبِّ وطن تو یہ بات ہے کہ آدمی جس مسلک کو ایمانداری کے ساتھ

موجبِ فلاح سمجھتا ہو اس کو خاموشی کے ساتھ اپنے دل میں یا اپنے گھر میں لیے بیٹھا رہے اور جن طریقوں کو وہ ایمانداری کے ساتھ نقصان رساں سمجھتا ہو انہیں اپنے ابنائے وطن کی زندگی پر مسلّط ہونے دے۔

جن لوگوں نے مغرب کے جمہوری نظام کا مطالعہ کیا اور اسے اپنے نزدیک برحق پایا وہ آج کوشش کر رہے ہیں کہ ہندوستان کے نظامِ تمدن کو مغربی ڈیموکریسی کے نمونہ پر ڈھالیں۔ جن لوگوں نے سوشلزم کا مطالعہ کیا اور اسے برحق پایا وہ آج کوشش کر رہے ہیں کہ ہندوستان کی اجتماعی تعمیرِ نو (Social Reconstruction) مارکسی اشتراکیت کے طریقہ پر ہو۔ یہ آخر کیوں ہے؟ کیا اس کے لیے کوئی حجت اس کے سوا پیش کی جاسکتی ہے کہ اُن کے ایمان و اعتقاد کا مقتضا یہی ہے؟ کیا اُن کے اس اقدام کو کوئی شخص خلافِ حُبِ وطن یا خلافِ حُبِ انسانیت کہہ سکتا ہے؟ کیا اُن کے حق میں یہ راست بازی ہوگی کہ وہ جس مسلک کو اپنے ابنائے جنس کے لیے سعادت و فلاح کا ذریعہ سمجھتے ہیں اُس کو رائج کرنے کی جدوجہد نہ کریں اور کسی ایسے نظامِ زندگی کی حکمرانی کو گوارا کرلیں جو ان کے نزدیک باشندگانِ ملک کو پستی اور بدحالی کی طرف لے جانے والا ہو؟ اگر بالفرض ملک کی آزادی اور اقوامِ عالم کے درمیان اہلِ وطن کی عزت بڑھنے کا امکان کسی شخصی استبدادی حکومت کے قیام یا سرمایہ دارانہ نظام کے بقا میں ہو، تو کیا کسی سچے جمہوریت پسند یا کسی راست باز اشتراکی سے آزادی اور وطن کی عزت کے نام پر یہ اپیل کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے اپنے مسلکوں کو چھوڑ کر اُس طریقہ کو قبول کرلیں؟ اور کیا ان دونوں کو اس قسم کی اپیل سُن کر واقعی ہتھیار ڈال دینا چاہیئے؟

بالکل یہی پوزیشن ہماری بھی ہے۔ ہم کو جو چیز "دارالاسلام" کی صدا بلند کرنے پر مجبور کرتی ہے وہ بعینہٖ وہی ہے جو دوسرے لوگوں کو "جمہوریت" اور "اشتراکیت" کے نعرے بلند کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ ہم نے برسوں اسلام کا تنقیدی اور تحقیقی مطالعہ کیا۔ ہم نے اس کی اعتقادی اساس، اُس کے نظریۂ حیات، اُس کے اصولِ اخلاق، اُس کے نظامِ تمدن، اُس کے قوانینِ معاشرت و معیشت، اُس کے

آئینِ سیاست وطرزِ حکومت، غرض اس کی ایک ایک چیز کو جانچا اور پرکھا۔ ہم نے دنیا کے دوسرے اجتماعی نظریات اور تمدّنی مسلکوں کو کھنگال کر دیکھا اور اسلام سے ان کا تقابل کیا۔ اس تمام مطالعے اور تحقیق وتنقید نے ہمیں اس امر پہ پوری طرح مطمئن کردیا کہ انسان کے لیے حقیقی فلاح وسعادت اگر کسی مسلک میں ہے تو وہ صرف اسلام ہے۔ اس کے مقابلہ میں ہر مسلک ناقص ہے۔ کسی دوسرے مسلک کی اخلاقی بنیاد صالح اور مستحکم نہیں۔ کسی دوسرے مسلک میں انسان کی شخصیت کے ارتقاء (Development of Personality) کا پُورا موقع نہیں۔ کسی دوسرے مسلک میں اجتماعی عدل (Social Justice) اور بین الانسانی تعلقات کا صحیح توازن (Balance) نہیں۔ کسی دوسرے مسلک میں فطرتِ انسانی کے تمام پہلوؤں کی متناسب رعایت نہیں۔ اسلام کے سوا کوئی مسلک دنیا میں ایسا موجود نہیں جو انسان کو حقیقی آزادی سے ہم کنار کرتا ہو، اُسے عزت کے بلند ترین مدارج کی طرف لے جاتا ہو، اور ایک ایسا اجتماعی ماحول پیدا کرتا ہو جس میں ہر شخص اپنی قوت و استعداد (Capacity) کے مطابق اخلاقی، رُوحانی اور مادّی ترقی کے انتہائی مدارج تک پہنچ سکے اور ساتھ ہی اپنے دوسرے ابنائے جنس کے لیے بھی ایسی ہی ترقی میں مددگار ہو۔

یہ اطمینان اور یقین حاصل ہو جانے کے بعد ہمارے لیے راست بازی کا تقاضا کیا ہے؟ کیا بالکل وہی نہیں جو ہمارے جمہوریت پسند یا اشتراکیت پسند ابنائے جنس کے لیے ہے؟ جس مسلکِ اجتماعی کو ہم پوری دیانت کے ساتھ انسانیت کے لیے رحمت سمجھتے ہیں، کیا ہم پر یہ فرض عائد نہیں ہو جاتا کہ اپنے ملک اور اپنے ابنائے نوع کی اجتماعی زندگی کو اُسی مسلک کے مطابق منظم کرنے کی جدّوجہد کریں؟ جو چیز جمہوریت پسندوں اور اشتراکیت پسندوں کے لیے حق ہے وہ ہمارے لیے کیوں غیر حق ہے؟

— اسلام کے متعلق ہماری یہ رائے کچھ اس وجہ سے نہیں ہے کہ ہم مسلمان گھر میں پیدا ہوتے ہیں، اور اسلام کے حق میں ایک طرح کا پیدائشی میلان رکھتے ہیں۔ اپنے

دوسرے رفقاء کے متعلق تو میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کا کیا حال ہے، مگر اپنی ذات کی حد تک میں کہہ سکتا ہوں کہ اسلام کو جس صورت میں مَیں نے اپنے گرد و پیش کی مسلم سوسائٹی میں پایا، میرے لیے اس میں کوئی کشش نہ تھی۔ تنقید و تحقیق کی صلاحیت پیدا ہونے کے بعد پہلا کام جو میں نے کیا وہ یہی تھا کہ اُس بے روح مذہبیت کا قلادہ اپنی گردن سے اُتار پھینکا جو مجھے میراث میں ملی تھی۔ اگر اسلام صرف اُسی مذہب کا نام ہوتا جو اِس وقت مسلمانوں میں پایا جاتا ہے تو شاید میں بھی آج ملحدوں اور لامذہبوں میں جا ملا ہوتا، کیونکہ میرے اندر نازی فلسفہ کی طرف کوئی میلان نہیں ہے کہ محض حیاتِ قومی کی خاطر اجداد پرستی کے چکر میں پڑا رہوں۔ لیکن جس چیز نے مجھے الحاد کی راہ پر جانے یا کسی دوسرے اجتماعی مسلک کو قبول کرنے سے روکا اور از سرِ نو مسلمان بنایا وہ قرآن اور سیرتِ محمدیؐ کا مطالعہ تھا۔ اُس نے مجھے انسانیت کی اصل قدر و قیمت سے آگاہ کیا۔ اس نے آزادی کے اُس تصور سے مجھے رُوشناس کیا جس کی بلندی تک دنیا کے کسی بڑے سے بڑے لبرل اور انقلابی کا تصور بھی نہیں پہنچ سکتا۔ اس نے انفرادی حسنِ سیرت اور اجتماعی عدل کا ایک ایسا نقشہ میرے سامنے پیش کیا جس سے بہتر کوئی نقشہ میں نے نہیں دیکھا۔ اس کے تجویز کردہ لائحۂ زندگی (Scheme of Life) میں مجھے ویسا ہی کمال درجہ کا توازن (Balance) نظر آیا جیسا کہ ایک سالمہ (Atom) کی بندش سے لے کر اجرامِ فلکی کے قانونِ جذب و کشش تک ساری کائنات کے نظم میں پایا جاتا ہے۔ اور اسی چیز نے مجھے قائل کر دیا کہ یہ نظامِ اسلامی بھی اُسی حکیم کا بنایا ہوا ہے جس نے اس جہانِ ارض و سما کو عدل اور حق کے ساتھ بنایا ہے۔

پس درحقیقت میں ایک نو مسلم ہوں۔ خوب جانچ کر اور پرکھ کر اُس مسلک پر ایمان لایا ہوں جس کے متعلق میرے دل و دماغ نے گواہی دی ہے کہ انسان کے لیے فلاح و صلاح کا کوئی راستہ اس کے سوا نہیں ہے۔ مَیں صرف غیر مسلموں ہی کو نہیں بلکہ خود مسلمانوں کو بھی اسلام کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اس دعوت سے میرا مقصد اُس نام نہاد

مسلم سوسائٹی کو باقی رکھنا اور بڑھانا نہیں ہے جو خود ہی اسلام کی راہ سے بہت دور ہٹ گئی ہے، بلکہ یہ دعوت اِس بات کی طرف ہے کہ آؤ اُس ظلم و طغیان کو ختم کر دیں جو دنیا میں پھیلا ہوا ہے، انسان پر سے انسان کی خدائی کو مٹا دیں اور قرآن کے نقشہ پر ایک نئی دنیا بنائیں جس میں انسان کے لیے بحیثیت انسان کے شرف و عزت ہو، حریت اور مساوات ہو، عدل اور احسان ہو۔

بدقسمتی سے اس وقت ہندوستان میں حالات نے کچھ ایسی صورت اختیار کر لی ہے جس کی وجہ سے اسلام کی تبلیغ کا نام سنتے ہی ایک شخص کا ذہن فوراً ووٹ بڑھانے کی کوشش اور سیاسی غلبہ (Domination) کی خواہش اور اسی قبیل کی بہت سی دوسری چیزوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ ایک طرف جمہوری طرزِ حکومت کے قیام نے سیاسی طاقت اور اس کے تمام ضمنی فوائد کو ووٹوں کی کثرت پر منحصر کر دیا ہے۔ دوسری طرف مسلمانوں کی پوزیشن یہاں کچھ ایسی ہے کہ ان کی جانب سے اپنے مسلک کو پھیلانے کی کوئی کوشش اس شبہ سے بچ نہیں سکتی کہ یہ حوصلہ مند (Ambitious) قوم اس راستے سے سیاسی اقتدار حاصل کرنا چاہتی ہے۔ ان شبہات کو قوت پہنچانے میں خود مسلمانوں کا اپنا بھی کافی حصہ ہے۔ ان کے بہت سے غلط نمائندوں نے تبلیغ تبلیغ کا شور کچھ اس طرح بلند کیا کہ گویا یہ محض ایک سیاسی حربہ ہے جسے اس جمہوری دَور میں صرف اس غرض کے لیے استعمال کرنا چاہیے کہ اپنی قلتِ تعداد کے پیچیدہ مسئلے کو حل کیا جائے۔ اس چیز نے اسلام کے راستے میں ایک شدید قسم کا سیاسی تعصب حائل کر دیا ہے۔ سوشلزم، کمیونزم، فاشزم یا اور کسی ازم کی تبلیغ کی جائے تو لوگ اس کو محض اس کے ذاتی اوصاف (Merits) کے لحاظ سے دیکھتے ہیں اور اگر ان کے دماغ کو وہ اپیل کرتا ہے تو اسے قبول کر لیتے ہیں۔ مگر "اسلام ازم" کا نام آتے ہی لوگوں کا ذہن اس طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ یہ ہمارے ملک کی ایک ایسی قوم کا مسلک ہے جو پہلے یہاں حکومت کر چکی ہے اور اس جمہوری دَور میں قلیل التعداد ہونے کی وجہ سے اپنے ووٹ بڑھانا چاہتی ہے

تاکہ نمائندہ مجالس کی نشستوں اور دفتری ملازمت کی کرسیوں پر قبضہ کرے۔ یہ خیال آتے ہی دل و دماغ پر قومی تعصب کے قفل چڑھ جاتے ہیں اور ذاتی اوصاف کے لحاظ سے جانچنے پرکھنے کا سوال ہی خارج از بحث ہو جاتا ہے۔

ہمیں اِن حالات کا بڑے صبر کے ساتھ مقابلہ کرنا پڑے گا۔ نیکی اور صداقت کی راہ میں ہمیشہ مشکلات حائل ہوتی رہی ہیں۔ شیطانی راہیں آسان ہوتی ہیں اور حق کی راہ بہر حال موانع سے لبریز رہتی ہے۔ محض صبر، لگاتار سعی اور خالصتہً لوجہ اللہ کام کرنے سے ہم مسلمانوں کے دل بھی بدل سکتے ہیں اور غیر مسلموں کے دل بھی۔ جب ہماری سعی و جہد میں خدا کی خوشنودی اور بنی نوعِ انسان کی خیر خواہی کے سوا کسی دنیوی غرض کا شائبہ تک نہ ہوگا تو لوگوں کے دل خود بخود اِس حقیقت کا ادراک کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے کہ اِسلام کسی نسل اور قوم کی میراث نہیں ہے بلکہ ایک انسانی مسلک ہے جس کا تعلق تمام انسانوں سے ویسا ہی عام ہے جیسا ہوا اور پانی کا تعلق سب سے ہے۔ اس میں ہر انسان دوسرے انسان کے ساتھ برابر کا شریک ہو سکتا ہے۔ یہ جس طرح مسلمانوں کی چیز ہے اسی طرح تمہاری بھی ہو سکتی ہے۔ بلکہ اگر نیکی اور تقویٰ اور قانونِ الٰہی کی اطاعت میں تم نسلی مسلمانوں سے بڑھ جاؤ تو امامت تم کو ملے گی، تقدم اور شرف تم کو حاصل ہوگا، خلافت کے امین تم ہو گے اور نسلی مسلمان پیچھے رہ جائیں گے۔ یہاں برہمنیت اور نسل پرستی نہیں ہے کہ عزت و شرف اور قوت و اقتدار پر کسی خاص گروہ کا دائمی اجارہ ہو۔ یہاں ایک قوم پر دوسری قوم کے غلبہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تبلیغِ اسلام کی نوعیت اچھوت اُدھار[1] کی سی نہیں ہے کہ ایک قوم محض دوسری قوم کے ووٹ بڑھانے کے لیے اُس کی جُزو بنائی جاتے مگر زندگی کی متاع میں اسے برابر کا حصّہ نہ دیا جائے[2]۔ اسلام میں تو برابر ہی نہیں بلکہ

---

[1] اچھوت قوموں کو پستی سے اُٹھانے کی کوشش۔ (جدید)

[2] اُس زمانے میں ہندو لیڈروں نے یہ تحریک صرف اس لیے اٹھائی تھی کہ (باقی صفحہ ۲۷ پر)

اوصافِ ذاتی کے لحاظ سے ایک شخص زیادہ کا حصہ دار بھی ہو سکتا ہے۔ یہاں پیدائش کی وجہ سے آدمی اور آدمی میں کوئی امتیاز نہیں۔ کسی شخص کی راہ میں اس کے پیشے یا اس کی قومیت کی وجہ سے کوئی رکاوٹ حائل نہیں۔ تم اپنے کیرکٹر اور اپنے کردار کے زور سے جہاں تک اُڑنے کی طاقت رکھتے ہو اُڑ سکتے ہو۔ فرش سے عرش تک تمہاری ترقی کی راہ میں کوئی روک نہیں۔

بعض لوگوں کے ذہن میں یہ خیال بھی کھٹکتا ہے کہ اسلام تیرہ چودہ صدی پہلے کا ایک مذہب ہے، اس کو آج ایک فکری و اخلاقی اور تمدنی و سیاسی تحریک کی حیثیت سے زندہ کرنے کا کون سا موقع ہے؟

جو لوگ دُور سے کسی چیز کو محض سرسری نظر ہی سے دیکھ کر رائے قائم کر لیتے ہیں ان کی رائے عموماً غلط ہوا کرتی ہے۔ ایسی ہی غلطی یہ لوگ بھی کر رہے ہیں۔ انہوں نے قرآن کا غائر نظر سے مطالعہ نہیں کیا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر تحقیقی نظر نہیں ڈالی۔ اس لیے محض قیاسی مفروضات کی بنا پر یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ اسلام اب سے تیرہ سو برس پہلے کی ایک مذہبی تحریک تھی جو اُس زمانہ کے مخصوص تمدنی حالات میں تو بلاشبہ مفید ثابت ہوئی مگر اب حالات بہت بدل چکے ہیں اور اس زمانہ کے حالات میں وہ پرانا مسلک کچھ فائدہ مند ثابت نہ ہوگا ـــــ اس غلط فہمی کے پیدا ہونے اور جڑ پکڑنے میں خود مسلمانوں کے اپنے طرزِ عمل کا بھی بہت کچھ دخل ہے، انہوں نے خود بھی اسلام کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور اسے ایک تحریک (Movement) کے بجائے محض زمانہ سلف کی ایک مقدس میراث بنا کر رکھ دیا ـــــ حالانکہ ایک سلیم الفطرت آدمی اگر اپنے ذہن سے تاریخی اور سیاسی تعصبات اور پیشگی مفروضات کو نکال کر اسلام کا سائنٹفک مطالعہ کرے تو اس پر یہ حقیقت بآسانی منکشف ہو سکتی ہے کہ اسلام کسی خاص زمانہ کی مذہبی تحریک نہیں ہے جس کی بنیاد

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶ سے) ہندوستان کے کروڑوں اچھوت کہیں ہندو قوم سے الگ نہ ہو جائیں۔ لیکن عملاً ان مظلوم لوگوں کی جو حیثیت ہندو معاشرے میں تھی وہ جُوں کی تُوں رہی۔ (جدید)

وقتی اور مکانی حالات پر ہو، بلکہ یہ ایسے اصولوں کا مجموعہ ہے جو انسانی فطرت کے حقائق پر مبنی ہیں اور عام قوانینِ فطری کے ساتھ کامل موافقت (Harmony) رکھتے ہیں۔ انسان کے حالات اور خیالات خواہ کتنے ہی بدل جائیں، مگر اس کی فطرت ہر حال میں جوں کی توں رہتی ہے۔ زمانہ خواہ کتنے ہی پلٹے کھائے، بہرحال کائناتِ فطرت کے حقائق اور قوانین میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔ لہٰذا جو فطری اصول طوفانِ نوحؑ کے وقت انسانی زندگی کے لیے مفید تھے وہی اس بیسویں صدی عیسوی میں بھی مفید ہیں، اور وہی ۵۰۰۰ عیسوی میں بھی منزلِ سعادت کی طرف انسان کی رہنمائی کے لیے کافی ہوں گے۔ تغیر جو کچھ بھی ہوگا ان فطری اصولوں میں نہیں بلکہ بدلنے والے حالات پر اُن کے انطباق (Application) میں ہوگا۔ اسلام کی اصطلاح میں اس کا نام اجتہاد ہے، یعنی اصول کو ٹھیک سمجھ کر قانون کی اسپرٹ کے مطابق نئے حالات پر منطبق کرنا۔ اور یہ اجتہاد ہی وہ چیز ہے جو نظامِ اسلامی کو ایک محرک و متحرک (Dynamic) نظام بناتا ہے اور اس کے قوانین کو حالات و ضروریات کے مطابق مرتب (Adjust) کرتا رہتا ہے۔

(ترجمان القرآن۔ جولائی ۱۹۳۹ء)

تحریکِ اسلامی کا تنزُّل

دنیا میں جب کوئی تحریک کسی اخلاقی یا اجتماعی یا سیاسی مقصد کو لے کر اُٹھتی ہے تو اُس کی طرف وہی لوگ رجوع کرتے ہیں جن کے ذہن کو اُس تحریک کے مقاصد اور اس کے اصول اپیل کرتے ہیں، جن کی طبیعتیں اس کے مزاج سے مناسبت رکھتی ہیں، جن کے دل گواہی دیتے ہیں کہ یہی تحریک صحیح اور معقول ہے، اور جو اپنے نفس کی پوری آمادگی کے ساتھ اس کو چلانے اور دُنیا میں قائم کرنے کے لیے آگے بڑھتے ہیں۔ اُن کے سوا باقی تمام لوگ جن کی طبیعت کی اُفتاد اُس تحریک کے مقاصد اور اصولوں سے مختلف ہوتی ہے، پہلے ہی اُسے قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اُس کے دائرے میں آنے والے لائے نہیں جاتے بلکہ خود آتے ہیں۔ انہیں کوئی چیز مجبور کر کے خواہ مخواہ اس میں داخل نہیں کر دیتی، نہ کوئی طاقت اُنہیں لا کر اس میں چھوڑ جاتی ہے، جیسے کوئی کسی اندھے کو جنگل میں لے جا کر چھوڑ دے اور اسے کچھ پتہ نہ ہو کہ میں کہاں ہوں اور کس لیے لایا گیا ہوں۔ بلکہ وہ اسے جانچ کر، پرکھ کر، سمجھ کر، پورے شعور اور کامل قصد کے ساتھ آتے ہیں، اور جب آجاتے ہیں تو اس کے مقصد کو اپنا مقصد بنا کر کام کرتے ہیں کیونکہ وہی مقصد ان کے دل و دماغ کو اپیل کرتا ہے۔ اس کے اصولوں کو وہ اپنے اصول بنا کر چلتے ہیں کیونکہ ان اصولوں کو صحیح و برحق سمجھ کر ہی وہ اس تحریک میں شامل ہوتے ہیں۔ ان

کے لیے اس تحریک کو چلانا زندگی کا مشن بن جاتا ہے کیونکہ جو چیز اُن سے اُن کا پچھلا مسلک و مشرب چھڑاتی ہے اور ان کو اِس نئے مسلک کی طرف کھینچ کر لاتی ہے وہ در اصل اُن کے قلب و رُوح کا یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ یہی مسلک حق اور راست ہے۔ در اصل اُس تحریک میں اُن پر حق منکشف ہوتا ہے۔ اُس کا انکشاف ہی اُن کو اس تحریک کی طرف کھینچتا ہے۔ اور انکشافِ حق کی خاصیت یہ ہے کہ وہ آدمی کو کبھی اُس مقام پر نہیں ٹھیرنے دیتا جہاں وہ انکشاف سے پہلے تھا، بلکہ وہ اسے کشاں کشاں اُس مقام کی طرف کھینچ لے جاتا ہے جدھر حق کی روشنی اُسے نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ کسی تحریک کی صداقت کے معترف ہو کر اُسے قبول کرتے ہیں ان کی زندگیوں کا رنگ بدل جاتا ہے۔ وہ پہلے سے بالکل مختلف ہو جاتے ہیں۔ ان سے ایسی باتوں کا ظہور ہوتا ہے جن کی توقع عام حالات میں انسان سے نہیں کی جاتی۔ وہ اپنے اصول کی خاطر دوستیوں اور خونی و قلبی رشتوں تک کو قربان کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے کاروبار، اپنی پوزیشن اپنے منافع اور اپنی ہر چیز کا نقصان گوارا کرتے ہیں حتیٰ کہ قید و بند کی تکالیف اور موت کے خطرات تک سہنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ یہ انقلاب ایسا ہمہ گیر ہوتا ہے کہ ان کی عادات بدل جاتی ہیں، ان کے خصائل میں تغیّر آجاتا ہے، یہاں تک کہ ان کی شکل، صورت، لباس، خوراک اور عام طرزِ زندگی پر بھی اس کے اثرات ایسے نمایاں ہوتے ہیں کہ گرد و پیش کے لوگوں میں وہ اپنی ہر ادا سے الگ پہچان لیے جاتے ہیں۔ ہر شخص ان کو دیکھ کر کہہ دیتا ہے کہ وہ جا رہے ہیں فلاں تحریک کے حامی۔

ہر تحریک کی ابتدا یوں ہی ہوتی ہے۔ ایسے ہی لوگوں سے وہ جماعت بنتی ہے جو اسے چلانے کے لیے اُٹھتی ہے۔ اس کے مقاصد اور اس کے اصول خود ہی آدمیوں کی اس بھیڑ میں سے، جو دنیا میں چاروں طرف پھیلی ہوتی ہے، اپنے مطلب کے آدمی چھانٹتے ہیں اور صرف انہی لوگوں کو اس تحریک کے دائرے میں لاتے ہیں جنہیں اس سے مناسبت ہوتی ہے۔

اس کے بعد ایک دوسرا دور آتا ہے۔ جو لوگ اس تحریک میں شامل ہوتے ہیں

اُن کی یہ فطری خواہش ہوتی ہے کہ ان کی اولاد بھی اُسی مسلک پر اُٹھے جس کو خود انہوں نے حق پاکر قبول کیا ہے۔ اس غرض کے لیے وہ اپنی نئی نسلوں پر تعلیم، تربیت، گھر کی زندگی اور باہر کے ماحول سے اِس قسم کے اثرات ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کے خیالات، اخلاق، عادات اور خصائل سب کے سب اُس مسلک کی رُوح اور اس کے اصولوں کے مطابق ڈھل جائیں۔ اس میں انہیں ایک حد تک کامیابی ہوتی ہے، مگر بس ایک حد تک ہی ہوتی ہے۔ پوری کامیابی ہونا ممکن نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تعلیم و تربیت اور سوسائٹی کے ماحول اور خاندانی روایات کو طبائع کے ڈھالنے میں بہت کچھ دخل حاصل ہے، مگر فطرت، دماغ کی ساخت، مزاج کی پیدائشی اُفتاد بھی ایک اہم چیز ہے، اور حقیقت میں دیکھا جائے تو بنیادی چیز یہی ہے۔ فطری طور پر دنیا میں ہر قسم کے آدمی، ہر مزاج، ہر رُجحان، ہر ساخت کے آدمی ہمیشہ سے پیدا ہوتے رہے ہیں۔ جس طرح اُس تحریک کے ظہور کے وقت ہر طرح کے آدمی دنیا میں موجود تھے، اور اُن سب نے اُس کو قبول نہیں کر لیا تھا بلکہ صرف وہی اس کی طرف کھنچے تھے جو اس سے ذہنی مناسبت رکھتے تھے، اُسی طرح بعد میں بھی یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ سب لوگ جو اس تحریک کے حامیوں کی نسل سے پیدا ہوں گے انہیں لامحالہ اس تحریک سے مناسبت ہی ہوگی۔ ان میں ابوجہل اور ابولہب بھی ہوں گے۔ عمرؓ اور خالدؓ بھی ہوں گے۔ اور ابوبکرؓ بھی ہوں گے۔ جس طرح آذر کے گھر میں ابراہیمؑ حنیف پیدا ہو سکتا ہے، اسی طرح نوحؑ کے گھر میں "عملِ غیر صالح"[1] بھی پیدا ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔ قانونِ فطرت کے مطابق یہ امر لازمی ہے کہ اُس سوسائٹی سے باہر بہت سے آدمی ایسے پیدا ہوں جو اپنے مزاج کی اُفتاد اور اپنی طبیعت کے رُجحان کے لحاظ سے اُس کے ساتھ مناسبت رکھتے ہوں، اور خود اُس کے اندر بہت سے آدمی ایسے پیدا ہوں جو اس کے ساتھ کوئی مناسبت نہ رکھتے ہوں۔ پس یہ ضروری نہیں کہ تعلیم و تربیت

---

[1] قرآن مجید میں حضرت نوحؑ کے کافر بیٹے کو "عملِ غیر صالح" قرار دیا گیا ہے۔
(ہود۔ آیت ۴۶)

کا وہ نظام جو تحریک کے ابتدائی حامی آئندہ نسلوں کے لیے قائم کرتے ہیں وہ ان کی پوری نئی پود کو ان کے مسلک کا حقیقی متبع بنا دے۔

اس خطرے کے سدِّ باب اور تحریک کو اس کے بنیادی اصولوں پر برقرار رکھنے کے لیے دو صورتیں اختیار کی جاتی ہیں:۔

ایک یہ کہ جو لوگ تعلیم و تربیت اور اجتماعی ماحول کی تاثیرات کے باوجود ناکارہ نکلیں، تکفیر[1] کے ذریعہ سے ان کو جماعت سے خارج کر دیا جائے، اور اس طرح جماعت کو غیر مناسب عناصر سے پاک کیا جاتا رہے۔

دوسرے یہ کہ تبلیغ کے ذریعہ سے جماعت میں اُن نئے لوگوں کی بھرتی کا سلسلہ جاری رہے جو رُجحان و ذہنیت کے اعتبار سے اس تحریک کے ساتھ مناسبت رکھتے ہوں، اور جن کو اس کے اصول و مقاصد اُسی طرح اپیل کریں جس طرح ابتدائی پیرودں کو انہوں نے اپیل کیا تھا۔

بس اور صرف یہی دو صورتیں ایسی ہیں جو کسی تحریک کو زوال سے اور کسی جماعت یا پارٹی کو انحطاط سے بچا سکتی ہیں۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ رفتہ رفتہ لوگ اِن دونوں تدبیروں کی اہمیت سے غافل ہوتے جاتے ہیں۔ جماعت کے باہر سے نئے لوگوں کو اندر لانے کی کوشش کم ہونے لگتی ہے۔ جماعت کی افزائش کے لیے تمام تر نسلی افزائش ہی پر اعتماد کر لیا جاتا ہے۔ اور جو لوگ اِس طرح جماعت کے اندر پیدا ہوتے ہیں اُن میں سے ناکارہ لوگوں کو خارج کرنے میں بھی خونی رشتوں اور معاشرتی تعلقات اور دنیوی مصلحتوں کی خاطر تساہل برتا جاتا ہے۔ طرح طرح کے بہانوں سے جماعتی مسلک میں ایسی گنجائشیں نکالی جاتی ہیں کہ ہر قسم کے رطب و یابس اُس میں سما سکیں۔ اور اس مسلک کو اتنا وسیع کر دیا جاتا ہے کہ سرے سے اس کے

---

[1] موجودہ زمانہ کی تحریکوں میں اسی چیز کو (Purge) سے تعبیر کیا جاتا ہے اور تمام جماعتیں نامناسب آدمیوں کو اپنے دائرے سے خارج کرتی رہتی ہیں۔ بلکہ جماعت کے اصولوں سے علانیہ منحرف ہو جانے والوں کو قتل تک کر دیا جاتا ہے۔ (قدیم)

سرحدی نشانات اور امتیازی حدود باقی ہی نہیں رہتے۔ یہاں تک کہ بھانت بھانت کے آدمی جماعت کے دائرے میں جمع ہو جاتے ہیں جن کو کسی قسم کی مناسبت اس کے مسلک سے اس کے اصولوں سے اور اس کے مقاصد سے نہیں ہوتی۔

پھر جب جماعت میں اس کے اصولوں سے حقیقی مناسبت رکھنے والے کم اور مناسبت نہ رکھنے والے زیادہ ہو جاتے ہیں تو اجتماعی ماحول اور تعلیم و تربیت کا نظام بھی بگڑنے لگتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر نئی نسل پہلے کی نسل سے بدتر اٹھتی ہے۔ جماعت کا قدم روز بروز تنزل و انحطاط کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اس مسلک کا اور ان اصول و مقاصد کا تصور بالکل ہی ناپید ہو جاتا ہے جن پر ابتدا میں وہ جماعت بنی تھی۔ اس مقام پر پہنچ کر حقیقت میں جماعت ختم ہو جاتی ہے اور محض ایک نسلی اور معاشرتی قومیت اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ وہ نام جو ابتدا میں ایک تحریک کے علمبرداروں کے لیے بولا جاتا تھا، اس کو وہ لوگ استعمال کرنے لگتے ہیں جو اس تحریک کو مٹانے والے اور اس کے جھنڈے کو سرنگوں کرنے والے ہوتے ہیں۔ وہ نام جو ایک مقصد اور ایک اصول کے ساتھ وابستہ تھا، وہ باپ سے بیٹے کو ورثہ میں ملنے لگتا ہے بلا لحاظ اس کے کہ صاحبزادے کی زندگی کے اصول اور مقاصد اس نام سے کوئی مناسبت بھی رکھتے ہیں یا نہیں۔ درحقیقت ان لوگوں کے ہاتھ میں پہنچ کر وہ نام اپنی معنویت (Significance) کھو دیتا ہے۔ وہ خود بھول جاتے ہیں اور دنیا بھی بھول جاتی ہے کہ یہ نام کسی مقصد، کسی مسلک، کسی اصول کے ساتھ وابستہ ہے، بے معنی و مفہوم نہیں ہے۔

اسلام اس وقت اسی آخری مرحلے پر پہنچ چکا ہے۔ مسلمان کے نام سے جو قوم اس وقت موجود ہے وہ خود بھی اس حقیقت کو بھول گئی ہے، اور اس کے طرزِ عمل نے دنیا کو بھی یہ بات بھلا دی ہے کہ اسلام اصل میں ایک تحریک کا نام ہے جو دنیا میں ایک مقصد اور کچھ اصول لے کر اٹھی تھی، اور مسلمان کا لفظ اس جماعت کے لیے وضع کیا گیا تھا جو اس تحریک کی پیروی اور اس کی علمبرداری کے لیے بنائی گئی تھی۔ تحریک گم ہو گئی۔ اس کا مقصد فراموش کر دیا گیا۔ اس کے اصولوں کو ایک ایک کر کے توڑ دیا گیا۔ اور اس کا نام اپنی تمام معنویت

کر دینے کے بعد اب محض ایک نسلی و معاشرتی ذمیت کے نام کی حیثیت سے استعمال کیا جا رہا ہے۔ حد یہ ہے کہ اسے ان مواقع پر بھی بے تکلف استعمال کیا جاتا ہے جہاں اسلام کا مقصد پامال ہوتا ہے، جہاں اس کے اصول توڑے جاتے ہیں، جہاں اسلام کے بجائے غیر اسلام ہوتا ہے۔

بازاروں میں جائیے "مسلمان رنڈیاں" آپ کو کوٹھوں پر بیٹھی نظر آئیں گی اور "مسلمان زانی" گشت لگاتے ملیں گے۔ جیل خانوں کا معائنہ کیجیے، "مسلمان چوروں"، "مسلمان ڈاکوؤں" اور "مسلمان بدمعاشوں" سے آپ کا تعارف ہوگا۔ دفتروں اور عدالتوں کے چکر لگائیے۔ رشوت خوری، جھوٹی شہادت، جعل، فریب، ظلم اور ہر قسم کے اخلاقی جرائم کے ساتھ آپ لفظ "مسلمان" کا جوڑ لگا ہوا پائیں گے۔ سوسائٹی میں پھریئے۔ کہیں آپ کی ملاقات "مسلمان شرابیوں" سے ہوگی۔ کہیں آپ کو "مسلمان قمار باز" ملیں گے کہیں "مسلمان سازندوں" اور "مسلمان گویّوں" اور "مسلمان بھانڈوں" سے آپ دوچار ہوں گے۔ بھلا غور تو کیجیے، یہ لفظ "مسلمان" کتنا ذلیل کر دیا گیا ہے اور کن کن صفات کے ساتھ جمع ہو رہا ہے۔ مسلمان اور زانی! مسلمان اور شرابی! مسلمان اور قمار باز! مسلمان اور رشوت خور! اگر سب کچھ جو ایک کافر کر سکتا ہے وہی ایک مسلمان بھی کرنے لگے تو پھر مسلمان کے وجود کی دنیا میں حاجت ہی کیا ہے؟ اسلام تو نام ہی اُس تحریک کا تھا جو دنیا سے ساری بداخلاقیوں کو مٹانے کے لیے اُٹھی تھی۔ اس نے تو مسلمان کے نام سے اُن چیدہ آدمیوں کی جماعت بنائی تھی جو خود بلند ترین اخلاق کے حامل ہوں اور اصلاحِ اخلاق کے علمبردار بنیں۔ اس نے اپنی جماعت میں چوری کا ہاتھ کاٹنے کی، پتھر مار مار کر ہلاک کر دینے کی، کوڑے برسا برسا کر کھال اُڑا دینے کی، حتیٰ کہ سولی پر چڑھا دینے کی ہولناک سزائیں اسی لیے تو مقرر کی تھیں کہ جو جماعت دنیا سے زنا کو مٹانے اُٹھی ہے خود اس میں کوئی زانی نہ پایا جائے جس کا کام شراب کا استیصال ہے وہ خود شراب خوروں کے وجود سے خالی ہو، جسے چوری اور ڈاکہ کا خاتمہ کرنا ہے خود اس میں کوئی چور اور ڈاکو نہ ہو۔ اس کا تو مقصد ہی یہ تھا کہ جنہیں وہ دنیا کی اصلاح کرنی ہے وہ دنیا بھر سے زیادہ نیک سیرت، عالی مرتبہ اور باوقار

لگ ہوں۔ اسی لیے قمار بازی، جعل سازی، اور رشوت خوری تو درکنار، اُس نے تو اتنا بھی گوارا نہ کیا کہ کوئی مسلمان سازندہ اور گویا ہو، کیونکہ مصلحینِ اخلاق کے مرتبہ سے یہ بھی گری ہوئی چیز ہے۔ جس اسلام نے ایسی سخت قیود اور اتنے شدید ڈسپلن کے ساتھ اپنی تحریک اُٹھائی تھی، اور جس نے اپنی جماعت میں چھانٹ چھانٹ کر بلند ترین کیرکٹر کے آدمیوں کو بھرتی کیا تھا، اس کی رسوائی اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ رنڈی اور بھڑوے اور چور اور زانی تک کے ساتھ لفظِ "مسلمان" کا جوڑ لگ جاتے۔ کیا اس قدر ذلیل اور رُسوا ہو جانے کے بعد بھی "اسلام" اور "مسلمان" کی یہ وقعت باقی رہ سکتی ہے کہ سر اُس کے آگے عقیدت سے جُھک جائیں اور آنکھیں اُس کے لیے فرشِ راہ بنیں؟ جو شخص بازار بازار اور گلی گلی خوار ہو رہا ہو کیا کبھی اس کے لیے بھی آپ نے کسی کو ادب سے کھڑے ہوتے دیکھا ہے؟

یہ تو بہت ذلیل طبقہ کی مثال تھی۔ اس سے اُونچے تعلیم یافتہ طبقہ کی حالت اور بھی زیادہ افسوس ناک ہے۔ یہاں یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسلام ایک نسلی قومیت کا نام ہے اور جو شخص مسلمان ماں باپ کے ہاں پیدا ہوا ہے وہ ہر حال مسلمان ہے خواہ عقیدہ و مسلک اور طرزِ زندگی کے اعتبار سے وہ اسلام کے ساتھ کوئی دُور کی مناسبت بھی نہ رکھتا ہو۔ سوسائٹی میں آپ چلیں پھریں تو آپ کو ہر جگہ عجیب و غریب قسم کے "مسلمانوں" سے سابقہ پیش آئے گا۔ کہیں کوئی صاحب علانیہ خدا اور رسولؐ کا مذاق اُڑا رہے ہیں اور اسلام پر پھبتیاں کس رہے ہیں، مگر ہیں پھر بھی "مسلمان" ہی۔ ایک دوسرے صاحب خدا اور رسالت اور آخرت کے قطعی منکر ہیں اور کسی مادہ پرستانہ مسلک پر پورا ایمان رکھتے ہیں، مگر ان کے "مسلمان" ہونے میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ایک تیسرے صاحب سُود کھاتے ہیں اور زکوٰۃ کا نام تک نہیں لیتے، مگر ہیں یہ بھی "مسلمان"۔ ایک اور بزرگ بیوی اور بیٹی کو میم صاحبہ بنا رہی ہیں یا شریمتی جی بنائے ہوئے سینما لیے جا رہے ہیں، یا کسی رقص و سرود کی محفل میں صاحب زادی سے وائلین بجوا رہے ہیں، مگر آپ کے ساتھ بھی لفظ "مسلمان" بدستور چپکا ہوا ہے۔ ایک دوسرے ذاتِ شریف نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، تمام فرائض سے مستثنیٰ ہیں، شراب

زنا، رشوت، جُوا اور ایسی سب چیزیں ان کے لیے جائز ہو چکی ہیں، حلال اور حرام کی تمیز سے نہ صرف خالی الذہن ہیں بلکہ اپنی زندگی کے کسی معاملہ میں بھی اُن کو یہ معلوم کرنے کی پروا نہیں ہوتی کہ خدا کا قانون اس بارے میں کیا کہتا ہے۔ خیالات، اقوال اور اعمال میں ان کے اور ایک کافر و مشرک کے درمیان کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ مگر ان کا شمار بھی "مسلمانوں" ہی میں ہوتا ہے۔ غرض اس نام نہاد مسلم سوسائٹی کا جائزہ لیں گے تو اس میں آپ کو بھانت بھانت کا "مسلمان" نظر آئے گا۔ مسلمان کی اتنی قسمیں ملیں گی کہ آپ شمار نہ کر سکیں گے۔ یہ ایک چڑیا گھر ہے جس میں چیل، کوّے، گدھ، بٹیر، تیتر اور ہزاروں قسم کے جانور جمع ہیں اور ان میں سے ہر ایک "چڑیا" ہے کیونکہ چڑیا گھر میں ہے۔

پھر لطف یہ ہے کہ یہ لوگ اسلام سے انحراف کرنے ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ان کا نظریہ اب یہ ہو گیا ہے کہ "مسلمان" جو کچھ بھی کرے وہ "اسلامی" ہے، حتیٰ کہ اگر وہ اسلام سے بغاوت بھی کرے تو وہ اسلامی بغاوت ہے۔ یہ بینک کھولیں تو اس کا نام "اسلامی بینک" ہوگا۔ یہ انشورنس کمپنی قائم کریں تو وہ "اسلامی انشورنس کمپنی" ہوگی۔ یہ جاہلیت کی تعلیم کا ادارہ کھولیں تو وہ "مسلم یونیورسٹی"، "اسلامیہ کالج" یا "اسلامیہ اسکول" ہوگا۔ ان کی کافرانہ ریاست کو "اسلامی ریاست" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ان کے فرعون اور نمرود "اسلامی بادشاہ" کے نام سے یاد کیے جاتیں گے۔ ان کی جاہلانہ زندگی "اسلامی تہذیب و تمدّن" قرار دی جائے گی۔ ان کی موسیقی، مصوّری اور بُت تراشی کو "اسلامی آرٹ" کے معزز لقب سے ملقّب کیا جاتا ہے۔ ان کے زندقے اور اوہام لاطائل کو "اسلامی فلسفہ" کہا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ یہ سوشلسٹ بھی ہو جائیں گے تو "مسلم سوشلسٹ" کے نام سے پکارے جائیں گے۔ ان سارے ناموں سے آپ آشنا ہو چکے ہیں۔ اب صرف اتنی کسر باقی ہے کہ "اسلامی شراب خانے"، "اسلامی قحبہ خانے" اور "اسلامی قمار خانے" جیسی اصطلاحوں سے بھی آپ کا تعارف شروع ہو جائے۔ مسلمانوں کے اس طرزِ عمل نے اسلام کے لفظ کو اتنا بے معنی کر دیا ہے کہ ایک کافرانہ چیز کو "اسلامی کفر" یا "اسلامی معصیت" کے نام سے موسوم کرنے میں اب کسی کو تناقض فی الاصطلاح (Contradiction in Terms)

کا شبہ تک نہیں ہوتا۔ حالانکہ اگر کسی دُکان پر آپ "سبزی خوروں کی دُکانِ گوشت"، یا "ولایتی سودیشی بھنڈار" کا بورڈ لگا دیکھیں یا کسی عمارت کا نام "موحّدین کا بُت خانہ" سُنیں تو شاید آپ سے ہنسی ضبط نہ ہو سکے گی۔

جب افراد کی ذہنیتوں کا یہ حال ہے تو قومی مقاصد اور قومی پالیسی کا اِس تناقض سے متاثر نہ ہونا امرِ محال ہے۔ آج مسلمانوں کے اخباروں اور رسالوں میں، مسلمانوں کے جلسوں اور انجمنوں میں، مسلمان پڑھے لکھے طبقہ میں آپ ہر طرف کس چیز کی پکار سُنتے ہیں؟ بس یہی نا کہ سرکاری ملازمتوں میں ہمیں جگہیں ملیں۔ غیر الٰہی نظامِ حکومت کو چلانے کے لیے جس قدر پُرزے درکار ہیں اُن میں سے کم از کم اِتنے پُرزے ہم پر مشتمل ہوں۔ شریعت ساز مجلسوں (Legislatures) کی نشستوں میں کم از کم اتنا تناسب ہمارا ہو۔ مَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ[1] میں کم سے کم اتنے فی صدی ہم بھی ہوں۔ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ[2] میں غالب حصّہ ہمارا ہی رہے۔ اِسی کی ساری چیخ پُکار ہے۔ اِسی کا نام اِسلامی مفاد ہے۔ اِسی محور پر مسلمانوں کی قومی سیاست گھوم رہی ہے۔ یہی گروہ عملاً اِس وقت مُسلم قوم کی پالیسی کو کنٹرول کر رہا ہے۔ حالانکہ ان چیزوں کو نہ صرف یہ کہ اِسلام سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ اُس کی عین ضد ہیں۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ اگر اسلام ایک تحریک کی حیثیت سے زندہ ہوتا تو کیا اس کا نقطۂ نظر یہی ہوتا؟ کیا کوئی اجتماعی اصلاح کی تحریک اور کوئی ایسی جماعت جو خود اپنے اصول پر دنیا میں حکومت قائم کرنے کا داعیہ رکھتی ہو کسی دوسرے اصول کی حکومت میں اپنے پیرووں کو کل پُرزے بننے کی اجازت دیتی ہے؟ کیا کبھی آپ نے سُنا ہے کہ اشتراکیوں نے بینک آف انگلینڈ کے نظام میں اشتراکی مفاد کا سوال اُٹھایا ہو؟ یا فاشسٹ گرانڈ کونسل میں اپنی نمائندگی کے مسئلہ پر اشتراکیت کی بقاء و فنا کا انحصار رکھا ہو؟ اگر آج روسی کمیونسٹ

---

[1] جو اللہ کے نازل کردہ (قانون) کے مطابق فیصلہ نہ کریں (المائدہ، آیت ۴۴)

[2] جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں (النساء۔ آیت ۷۶)

پارٹی کا کوئی ممبر نازی حکومت کا وفادار خادم بن جائے تو کیا آپ توقع کرتے ہیں کہ ایک لمحہ کے لیے بھی اسے پارٹی میں رہنے دیا جائے گا؟ اور اگر کہیں وہ نازی آدمی ہی داخل ہو کر نازیت کو سربلند کرنے کی کوشش کرے تو کیا آپ اس کی جان کی سلامتی کی بھی امید کر سکتے ہیں؟ مگر یہاں آپ کیا دیکھ رہے ہیں؟ اسلام جس روٹی کو زبان پر رکھنے کی اجازت بھی شاید انتہائی اضطرار کی حالت میں دیتا، اور جس کو حلق سے اتارنے کے لیے غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ[1] کی شرط لگاتا، اور پھر تاکید کرتا کہ جس طرح سخت بھوک کی حالت میں جان بچانے کے لیے سور کھایا جا سکتا ہے اسی طرح بس یہ روٹی بھی بقدرِ سدِّ رمق کھا لو، یہاں اس روٹی کو نہ صرف یہ کہ هَنِيئًا مَّرِيئًا[2] کر کے پورے انبساط کے ساتھ کھایا جاتا ہے، بلکہ اسی پر کفر اور اسلام کے معرکے سر ہوتے ہیں، اور اسی کو اسلامی مفاد کا مرکزی نقطہ قرار دیا جاتا ہے! اس کے بعد تعجب ہی کیجیے اگر ایک اخلاقی و اجتماعی مسلک کی حیثیت سے اسلام کے ہواخواہ حکمرانی کوششیں کر دنیا مذاق اڑانے لگے، کیونکہ اسلام کی نمائندگی کرنے والوں نے خود اس کے وقار کو اور اس کے دعوے کو اپنے معدۂ شکم کے جہنم میں بھینٹ چڑھا دیا ہے۔

اور دیکھیے۔ آپ کے ہاں ایک صاحب بڑے طنطنہ کے ساتھ ایک قومی تحریک لے کر اٹھتے ہیں اور دعوے کرتے ہیں کہ تمہاری شوکتِ رفتہ کو پھر تازہ کر دوں گا اور تمہیں زمین میں غلبہ دلوا کر چھوڑوں گا۔ آپ کے ہزاروں نہیں، لاکھوں آدمی ان کی طرف دوڑتے ہیں۔ لاکھوں ان سے فلاح و کامرانی کی آس لگاتے ہیں۔ آپ کا پریس ادھر سے ادھر تک ان کی حمایت کرتا ہے اور دیکھتے دیکھتے یہ صاحب اسلام کے سپہ سالار اور ملت کے امیرِ مطاع بن جاتے ہیں۔ مگر آپ میں سے بہت کم لوگوں کو یہ خیال آتا ہے کہ ان کے عقائد، ان کے فہمِ قرآن، ان کے اخلاق، ان کی گفتار، ان کے اعمال، اور ان کے

---

[1] نہ قانون شکنی کا خواہشمند ہو اور نہ حدِّ ضرورت سے تجاوز کرے۔ (البقرہ۔ آیت ۱۷۳)

[2] یعنی خوشگوار اور پُر لطف۔

طریقِ کار کا بھی جائزہ لے کر دیکھیں۔ ایک شخص اسلامی اصطلاحات کے پردے میں میکیاویلی، ڈارون، ارنسٹ ہیکل اور کارل پیرسن جیسے لوگوں کے نظریات پیش کرتا ہے، قانونِ طبعی اور قانونِ شرعی کو خلط ملط کر کے اسلام کی جڑ بنیاد تک اکھاڑ پھینکتا ہے، ایمان، اسلام، تقویٰ، عبادت، توحید، رسالت، جہاد، ہجرت، اطاعتِ امر، جماعت، سب کے مفہوم بدل کر رکھ دیتا ہے، اور تم زہر کے یہ سارے گھونٹ محض اس طمع میں حلق سے نیچے اتار جاتے ہو کہ "یہ مسلم قوم" کی عسکری تنظیم تو کر ہی دے گا۔ ایک شخص علانیہ جھوٹ بولتا ہے، جھوٹ پر اپنی تحریک کی پوری عمارت کھڑی کرتا ہے، غیر مسلموں تک کے سامنے اپنے کذب و دروغ سے اسلام اور مسلمانوں کو رسوا کرتا ہے، [illegible] بدزبانی اور لاف زنی سے مسلمانوں کے قومی اخلاق کی خوب تذلیل و تضحیک کراتا ہے، [illegible] کے مقابلہ پر آ کر پہلی ضرب کھاتے ہی معافی مانگتا ہے، پھر اپنے رفقا کو بہکانے کے لیے علی الاعلان جھوٹ بولتا ہے کہ میں نے معافی نہیں مانگی، اور پھر لاف زنی کرتا ہے اور ادھر میں لڑنے پہنچ جاتا ہے جہاں اس کے واپس نہ جانے کا امکان ہی نہ تھا، [illegible] دیکھتے ہو اور اس کے باوجود اس کے پیچھے لگے رہتے ہو [illegible] امید [illegible] زمین [illegible] کر دے گا۔ ایک شخص کی تحریر و تقریر اور [illegible] سے دنائت و سفلہ پن بازاریت ٹپکی پڑتی ہے، تقویٰ بعد النفس [illegible] تم اس کی امارت تسلیم کرنے میں ذرا تامل نہیں کرتے [illegible] کی جانیں غیر الٰہی حکومت کے لیے بار بار پیش کرتا ہے اور اس خدمت گزاری کا فائدہ تمہیں یہ بتاتا ہے کہ اس بہانے تم کو عسکری ٹریننگ مل جائے گی، [illegible] ہاتھ پاؤں مضبوط ہو جائیں گے، تم اس ذلیل تدبیر کی خوراک بھی حلق سے اتار لیتے ہو اور خوش ہوتے ہو کہ ہمیں ایک [illegible] تسلیم کرنے والا امیر تو مل گیا[1]۔ یہ سب باتیں بتا رہی ہیں کہ تمہارا معیارِ اخلاق [illegible]

---

[1] یہ سب [illegible] کے نہ جاننے کی باتیں ہیں جو اب ۱۹۶۰ء میں زیرِ بحث نہیں ہیں، مگر ہم نے ان کو اس لیے ساقط نہیں کیا کہ اُس وقت کی شائع شدہ کتاب کو ہم ان باتوں کی ترمیم و تنسیخ کے بغیر پیش کرنا چاہتے ہیں۔ (جدید)

انسانیت کس قدر گر گیا ہے۔ تم جس اسلام کی نمائندگی کا دعویٰ کرتے ہو وہ دنیا میں یہ اصول قائم کرنے آیا تھا کہ انسان کا مقصد ہی صرف پاک نہ ہونا چاہیے بلکہ اس کو حاصل کرنے کے ذرائع بھی پاک ہونے چاہئیں۔ مگر تمہارا حال یہ ہے کہ جس ذریعہ سے بھی تم کو کامیابی کے حصول کی اُمید نظر آتی ہے، خواہ وہ کتنا ہی ناپاک اور ذلیل ذریعہ کیوں نہ ہو، تم دوڑ کر اسے دانتوں سے پکڑ لیتے ہو اور جو تمہیں اس سے روکنا چاہے اُلٹا اُسی کو پھاڑ کھانے پر آمادہ ہو جاتے ہو۔ ذرائع کی پاکی و ناپاکی سے قطع نظر کر کے محض کامیابی کو مقصود بالذات بنانا تو دہریوں اور کافروں کا شیوہ ہے۔ اگر مسلمان نے بھی یہی کام کیا تو اُس کی خصوصیت کیا باقی رہی؟ بلکہ یہ طریقہ اختیار کرنے کے بعد دوسری جاہل قوموں سے الگ "مسلمان" کے جُداگانہ وجود کے لیے کون سی وجہ جواز رہ جاتی ہے؟

اور اوپر چلیے، آپ کی سب سے بڑی قومی مجلس مسلم لیگ، جس کو نو کروڑ مسلمانوں کی نمائندگی کا دعویٰ ہے، ذرا اس کو دیکھیے کہ اس وقت وہ کس روش پر چل رہی ہے۔ موجودہ[1] جنگ کے آغاز میں اس نے اپنی جس پالیسی کا اعلان کیا اور پھر وائسرائے کے اعلان پر جس رائے کا اظہار کیا، اس کو پڑھیے اور بار بار پڑھیے[2]۔ اگر آپ ایک اصول پرست جماعت کے طرزِ عمل اور ایک ایسی جماعت کے طرزِ عمل میں جو محض اپنی قوم کی سیاسی اغراض کی خدمت کے لیے بنی ہو، فرق و امتیاز کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، تو اوّل نظر میں آپ کو محسوس ہو جائے گا کہ جنگ کے بارے میں جو پالیسی لیگ نے اختیار کی ہے وہ اصول پرستی

---

[1] مراد ہے جنگِ عظیم دوم جو یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو شروع ہوئی تھی۔ اور ۳ ستمبر کو برطانوی حکومت بھی اس میں شامل ہو گئی تھی۔ (جدید)

[2] سلسلۂ بیان ہی سے واضح ہے کہ یہاں زیرِ بحث مسلم لیگ کی وہ پالیسی ہے جو اس نے جنگِ عظیم کے موقع پر اختیار کی تھی۔ اس مضمون کے آخر میں ہم آل انڈیا مسلم لیگ کے ریزولیوشن مورخہ ۱۸ ستمبر ۱۹۳۹ء کو بطور ضمیمہ درج کر رہے ہیں۔ اسے پڑھ کر ہر شخص خود دیکھ لے کہ کیا یہ کسی ایسی جماعت کا ریزولیوشن ہے جو جنگ کے متعلق خود اپنا کوئی اخلاقی نظریہ رکھتی ہو؟ (جدید)

کے ہر نشان سے خالی ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ درحقیقت یہی پالیسی مسلمانوں کے ذہن کی ترجمانی کرتی ہے تو اس کے آئینے میں ہر صاحبِ نظر آدمی دیکھ سکتا ہے کہ ان نام کے مسلمانوں پر پوری اخلاقی موت وارد ہو چکی ہے۔ مقامی طور پر ہندوستان میں مسلمانوں کی جو سیاسی پوزیشن اس وقت ہے اِس پوزیشن میں اگر دنیا کی کوئی اور قوم ہوتی تو اس کی لیگ بھی ایسی ہی پالیسی اختیار کرتی، اور قریب قریب اِنہی الفاظ میں اپنا ریزولیوشن مرتب کرتی۔ آپ مسلم کے بجائے سکھ، پارسی، جرمن، اٹالین، جو نام چاہیں رکھ سکتے ہیں۔ یہی سیاسی موقف اور یہی مقامی حالات اس کے ساتھ وابستہ کر دیجیے، اور پھر بڑی آسانی کے ساتھ آپ اس ریزولیوشن کو ان میں سے ہر قوم کی طرف منسوب کر سکتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوتے کہ مسلمان اب اسی سطح تک گر گیا ہے جس سطح پر دنیا کی تمام قومیں ہیں۔ ایک موقع تو محل پر دنیا کی کوئی کافر و مشرک قوم جو طرزِ عمل اختیار کر سکتی ہے وہی مسلمان بھی اختیار کر رہا ہے۔ وہ بھول گیا ہے کہ میں اوّلاً اور بالذات ایک اخلاقی اصول کا نمائندہ اور وکیل ہوں، اسی حیثیت سے میرا نام مسلمان ہے، میرا کام سب سے پہلے ایک معاملہ کے اخلاقی پہلو کو دیکھنا ہے، اور میری مسلمان ہونے کی حیثیت کا تقاضا یہ ہے کہ اسی پہلو پر اپنے فیصلہ کا مدار رکھوں۔ اگر میں نے بھی صرف یہی دیکھا کہ پیش آمدہ معاملہ خود مجھ پر اور میری قوم پر کیا اثر ڈالتا ہے، اور یہ کہ میں اس صورتِ حال میں اپنے لیے کس طرح فائدہ حاصل کر سکتا ہوں، تو پھر "مسلمان" کے نام سے میرے الگ وجود کی کوئی وجہ باقی ہی نہیں رہتی۔ ایسا طریقِ عمل تو اگر میں نامسلمان ہوتا اور کسی آسمانی کتاب کی ہوا بھی مجھے نہ لگی ہوتی تب بھی میں اختیار کر سکتا تھا۔

میں اس معاملہ کو ہندوستانی وطن پرست کے نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتا۔ مجھے اس سے بھی کوئی بحث نہیں کہ سیاسی حیثیت سے مسلم لیگ کی یہ پالیسی مسلمان نام کی اس قوم کے لیے، جو ہندوستان میں بستی ہے، مفید ہوگی یا مضر۔ میرے لیے جو سوال اہمیت رکھتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ جو قوم اس وقت مسلمان کے نام سے پکارے جانے کے باعث دنیا میں اسلام کی نمائندہ سمجھی جاتی ہے، اس کی سب سے بڑی مجلس نے دنیا کے سامنے اسلام کو کس رنگ میں پیش کیا ہے؟ اس نقطۂ نظر سے جب میں مسلم لیگ کے

ریزولیوشن کو دیکھتا ہوں تو میری روح بے اختیار ماتم کرنے لگتی ہے[1]۔ ان لوگوں کو ایک موقع اور نادر موقع ملا تھا کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے دنیا کی ساری قوموں پر اپنے اخلاقی مرتبہ کی برتری کا سکہ جما دیتے۔ ان کو ایک بیش قیمت موقع ملا تھا اس حقیقت کے اظہار کا کہ ہم ایک اخلاقی اصول کے پیرو کار ہیں، اور وہ اخلاقی اصول حق اور عدل کی پاک ترین مرضی کا حامل ہے، اور دنیا میں صرف ہماری جماعت ہی وہ ایک جماعت ہے جو شخصی یا قومی نفع و نقصان کے تصورات سے بالاتر ہو کر مجرد اخلاق کی بنیاد پر کام کرتی ہے۔ اگر لیگ کے رہنماؤں میں اسلامی حس کا شائبہ بھی موجود ہوتا تو وہ اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیتے، اور اس کا جو گہرا اخلاقی اثر مترتب ہوتا، اس کی قدر و قیمت کے مقابلہ میں کوئی نقصان جو ایسا طرز عمل اختیار کرنے کی وجہ سے حاصل ہونے کی توقع ہے قطعاً کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ مگر افسوس کہ لیگ کے قائد اعظم سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرز فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہو۔ یہ لوگ مسلمان کے معنی و مفہوم اور اس کی مخصوص حیثیت کو بالکل نہیں جانتے۔ ان کی نگاہ میں مسلمان بھی ویسی ہی ایک قوم ہے جیسی دنیا میں دوسری اور قومیں ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہر ممکن سیاسی چال اور ہر مفید مطلب سیاسی تدبیر سے اس قوم کے مفاد کی حفاظت کر [illegible] ہی "اسلامی سیاست" ہے ——— حالانکہ ایسی ادنیٰ درجہ کی سیاست کو اسلامی سیاست کہنا اسلام کے لیے ازالۂ حیثیت عرفی سے کم نہیں!

"مسلمانوں" کی زندگی کے مختلف شعبوں اور مختلف پہلوؤں سے یہ چند مثالیں جو میں

---

[1] بعض لوگوں نے کمال بددیانتی کے ساتھ اس فقرے کو سیاق و سباق سے الگ نکال کر مجھ پر یہ الزام لگایا ہے کہ میں نے یہ بات مسلم لیگ کے مارچ ۱۹۴۰ء والے ریزولیوشن کے بارے میں لکھی تھی۔ حالانکہ یہ مضمون نومبر ۱۹۳۹ء کے ترجمان القرآن میں شائع ہوا تھا۔ اس میں مارچ ۴۰ء کے ریزولیوشن پر اظہار خیال کسی الہامی طاقت ہی سے کیا جا سکتا تھا!

(جدید)

نے پیش کی ہیں، یہ سب ایک ہی نتیجہ کی طرف رہنمائی کر رہی ہیں، اور وہ یہ ہے کہ اسلامی
تحریک اس وقت تنزل و انحطاط کے اس آخری مرحلے پر پہنچ گئی ہے جہاں ایک تحریک
کی روح ناپید ہو جاتی ہے، صرف اس کا نام باقی رہ جاتا ہے، اور اس نام کا اطلاق برعکس
نہند نام زنگی کافور کے بمصداق، اُن چیزوں پر ہونے لگتا ہے جو اس کے اصلی معنی کی ضد
ہوتی ہیں۔ نظریات غیر اسلامی اور نام اُن کا مسلمان۔ مقاصد غیر اسلامی اور ان کا نام بھی
مسلمان۔ سیرت غیر اسلامی اور اس پر بھی لفظ مسلمان چسپاں۔ زندگی غیر اسلامی اور اس پر
بھی لفظ مسلمان کا بے تکلف اطلاق۔ افراد سے لے کر جماعتوں تک، سوسائٹی کے
ادنیٰ ترین طبقوں سے لے کر بلند ترین طبقوں تک، چھوٹی انجمنوں سے لے کر بڑی سے
بڑی مجلسوں تک، ہر طرف اسی ایک وبائے عام کے اثرات پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔
میرے دل نے بارہا یہ سوال کیا ہے کہ اسلام جو کبھی آندھی اور طوفان کی طرح اٹھا تھا جس
کے سامنے دنیا کی کوئی طاقت نہ ٹھیر سکتی تھی آج اس کی کشور کشائی اور عالمگیری آخر کس چیز
نے چھین لی؟ اس کا جواب ہر بار مجھے یہی ملا کہ اسلامی تحریک پر تنزل و انحطاط کے اسی
قانون کا عمل جاری ہو گیا ہے جسے میں ابتدا میں بیان کر آیا ہوں۔ اب اصلاح کی صورت
اس کے سوا کچھ نہیں کہ اسلام کو از سر نو ایک تحریک کی حیثیت سے اٹھایا جائے اور مسلم
کے معنی کو پھر سے تازہ کیا جائے۔ گردوں کی اس پستی میں جو تھوڑے سے بہت مسلمان دل ابھی
حرکت کر رہے ہیں، اور جن کی گہرائیوں سے ابھی تک یہ شہادت بلند ہو رہی ہے کہ
اسلام ہی حق اور صدق ہے اور انسانیت کی فلاح صرف طریق اسلامی ہی میں ہے، اُن کو جان
لینا چاہیے کہ اب کرنے کا کام یہی ہے ۔۔۔۔ مگر اس کام کو کرنا کھیل نہیں ہے۔ یہ وہ کوہ کنی
ہے جس کے تصور ہی سے فرہاد کا زہرہ آب ہو جاتا ہے۔

(ترجمان القرآن۔ نومبر ۱۹۳۹ء)

ضمیمہ

ذیل میں آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا وہ ریزولیوشن درج کیا جا رہا ہے جو اس

نے ۱۰ر ستمبر ۱۹۳۹ء کو پاس کیا تھا۔

"ورکنگ کمیٹی کی یہ رائے ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے ۲۷ر اگست ۱۹۳۹ء کو جو قرارداد نمبر ۸ منظور کی تھی وہ مسلمانانِ ہند کے صحیح جذبات اور آراء کی عکاسی کرتی ہے۔ اس قرارداد کے الفاظ یہ ہیں کہ: "برطانوی حکومت کی اس پالیسی پر اظہارِ افسوس کیا جائے کہ اس نے مسلمانانِ ہند کی مرضی کے خلاف ان پر ایک کانسٹی ٹیوشن مسلط کرنے کی کوشش کی ہے۔ بالخصوص وہ فیڈریشن جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی رُو سے تجویز کیا گیا ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہندوستان پر ایک ایسی مستقل اور معاندانہ فرقہ وارانہ اکثریت کی حکومت قائم ہو جائے گی جو مسلمانوں کے مذہبی، معاشرتی اور اقتصادی حقوق کو پامال کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھے گی۔ نیز وائسرائے اور کانگرسی صوبوں کے گورنروں کا فرض تھا کہ اپنے اختیارات خاص استعمال کر کے اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کرتے اور ان سے انصاف کرتے۔ لیکن انہوں نے اس ضمن میں بدرجہ غفلت، بے اعتنائی اور بے تدبیری کا ثبوت دے کر کچھ بھی نہیں کیا۔ اس کے علاوہ فلسطین کے عربوں کے مطالبات تسلیم کرنے سے انکار کیا گیا ہے۔ اندریں حالات اگر برطانوی حکومت آئندہ خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلمانانِ عالم اور بالخصوص مسلمانانِ ہند کی ہمدردی کے حصول کی خواہاں ہے تو اس کا فرض ہے کہ بلا تامل ہندوستان کے مسلمانوں کے مطالبات کو تسلیم کرے۔"

ورکنگ کمیٹی وائسرائے کے اس اعلان کو بہ نظر تحسین دیکھتی ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ فیڈریشن کی وہ سکیم جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں درج ہے معطل کر دی گئی ہے۔ وائسرائے کا یہ اعلان ہندوستان اور بالخصوص مسلمانوں کے مفاد کے مطابق ہے۔ ورکنگ کمیٹی چاہتی ہے کہ معطل کرنے کے بجائے اس سکیم کو قطعی ترک کر دیا جائے اور ملک معظم کی حکومت تک اپنی آواز پہنچاتی ہے کہ بلا توقف اس مطالبے پر عمل کیا جائے۔ کمیٹی یہ امر بھی واضح کرنا چاہتی ہے کہ وائسرائے نے مرکزی مجلسِ قانون ساز کے ممبروں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے "فیڈریشن مقصود" ہے کی جو ترکیب استعمال کی ہے اور کہا ہے کہ ملک معظم کی حکومت کے پیشِ نظر یہ "فیڈریشن مقصود" ہے، کمیٹی ہرگز اس کی تائید نہیں کرتی اور برطانوی حکومت

سے پُرزور درخواست کرتی ہے کہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے صوبائی حصّے پر عمل در آمد کرنے کے بعد جو نتائج سامنے آئے ہیں اور جو حالات بدلے ہیں ان کی روشنی میں ہندوستان کے مستقبل کے آئین کے مسئلے پر از سرِ نو غور کیا جائے۔

"اس ضمن میں کمیٹی یہ واضح کرنا چاہتی ہے کہ ہندوستان کی سیاست میں مسلمانوں کو ایک خاص اور نمایاں مقام حاصل ہے۔ اور عرصۂ دراز سے مسلمان متوقع رہے ہیں کہ وہ ہندوستان کی قومی زندگی، یہاں کی حکومت اور ملک کے نظم و نسق میں باعزت مقام حاصل کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں حصّہ لیا تاکہ آزاد ہندوستان میں آزاد اسلام رونما ہو اور وہ اپنے مذہبی، سیاسی، معاشرتی، اقتصادی اور ثقافتی حقوق کی طرف سے مطمئن ہو کر اکثریت رکھنے والی قوم کے ساتھ اشتراک کر سکیں۔ لیکن حالات میں جو تغیّر پیدا ہوا ہے، بالخصوص اس صوبائی آئین کے نفاذ کے بعد جو ایک نام نہاد پارلیمنٹری جمہوریت کے طرزِ حکومت پر وضع کیا گیا ہے، حالات نے جس قسم کا پلٹا کھایا ہے اس کا گذشتہ دو سال سے کچھ اوپر مدت میں یہ تلخ تجربہ ہوا ہے کہ اس صوبائی آئین نے بلاشک و شبہ ہندوستان کے مسلمانوں پر ہندو اکثریت کی ایک دائمی اور مستقل حکومت قائم کر دی ہے۔ اور مختلف کانگرسی صوبوں کی حکومتوں کے تحت مسلمانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو خطرے میں پڑ گئی ہے۔ یہاں تک کہ ہر روز یہ کانگرسی حکومتیں مسلمانوں کے مذہبی حقوق اور کلچر کو مٹانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ مسلمان اس بات کے خلاف ہیں کہ ہندوستان کے باشندوں کو لوٹ کھسوٹ کا نشانہ بنایا جائے۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ مسلمانوں نے بار بار ہندوستان کی آزادی کا مطالبہ کیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی مسلمان یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ ہرگز مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں پر ہندو اکثریت کی حکومت قائم نہیں ہونے دیں گے۔ اور نہ مسلمانوں کو ہندوؤں کا غلام بننے دیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایسے "فیڈریشن مقصود" کے قطعی خلاف ہیں جس سے جمہوریت اور پارلیمنٹری نظامِ حکومت کی آڑ میں ہندوستان پر اکثریت کی حکومت قائم ہو۔ اس ملک کے لیے جس میں مختلف قومیں آباد ہوں اور جو ایک قومی مملکت نہیں بن سکتا اس قسم کا پارلیمنٹری نظامِ حکومت ہرگز موزوں نہیں۔

مسلم لیگ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کے نظریئے کی مخالف ہے۔ وہ ایسے حملے کی مذمت کرتی ہے جو بغیر کسی وجہ کے دوسرے پر کیا جاتے۔ وہ انسانیت کی آزادی کی علمبردار ہے اور طاقتور کو محض طاقت کے بل پر دوسروں کے حقوق غصب کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتی۔ ورکنگ کمیٹی کو پولینڈ، انگلستان اور فرانس سے گہری ہمدردی ہے۔ بایں ہمہ وہ محسوس کرتی ہے کہ اس آزمائش کی گھڑی میں برطانیہ کو اس وقت تک مسلمانوں کی مدد اور تعاون بخوبی حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ ملک معظم کی حکومت اور وائسرائے کانگرسی صوبوں میں جہاں آج مسلمانوں کا مال محفوظ ہے نہ جان، عزت محفوظ ہے نہ آبرو، اور جہاں ان کے ابتدائی حقوق کو نہایت بے رحمی سے کچلا جا رہا ہے، ان کے ساتھ حق و انصاف کا سلوک نہیں کرتی۔ ورکنگ کمیٹی نہایت پُرزور الفاظ میں ملک معظم کی حکومت اور وائسرائے سے درخواست کرتی ہے کہ وہ گورنروں کو ہدایت کریں کہ جہاں جہاں صوبائی وزارتیں مسلمانوں کے حقوق کو تلف کر رہی ہیں، انہیں مظالم کا نشانہ بنا رہی ہیں، اور ان کے مذہبی، سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی حقوق پر ڈاکہ ڈال رہی ہیں، وہاں یہ گورنر اپنے اختیاراتِ خاص کو جو از روئے آئین انہیں حاصل ہیں استعمال کریں۔ ورکنگ کمیٹی نہایت افسوس سے یہ کہتی ہے کہ گورنروں نے اب تک مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کرنے سے کوتاہی برتی ہے اور اپنے ان اختیاراتِ خاص کو محض اس خوف سے استعمال نہیں کیا کہ کانگرس کا ہائی کمان مسلسل یہ دھمکیاں دے رہا ہے کہ اگر گورنروں نے یہ اختیاراتِ خاص استعمال کیے تو وہ ان صوبوں میں جہاں کانگرس کی اکثریت ہے "ڈیڈلاک" پیدا کر دے گا۔

مسلم لیگ اگرچہ ہندوستان کی آزادی کی علمبردار ہے لیکن ورکنگ کمیٹی ملک معظم کی حکومت سے کہتی ہے کہ مسلم لیگ کی منظوری اور رضامندی کے بغیر اس قسم کا کوئی اعلان نہ کیا جائے جس کا مقصد ہندوستان میں آئینی اور دستوری ترقی کے مدارج معین کرنا ہو۔ نیز ملک معظم کی حکومت اور برطانوی پارلیمنٹ کسی قسم کا دستور وضع نہیں کر سکتی اور نہ منظور کر سکتی ہے جب تک اس بارے میں مسلم لیگ کی منظوری اور رضامندی حاصل نہ کر لی جائے۔

فلسطین کے عربوں کے بارے میں برطانوی حکومت نے جو پالیسی اختیار کی ہے اس نے

مسلمانوں کے احساسات و جذبات کو سخت مجروح کیا ہے اور اس ضمن میں جس قدر احتجاج کیا گیا ہے اس کا کوئی معقول نتیجہ اب تک نہیں نکلا۔ ورکنگ کمیٹی پھر ایک بار ملک معظم کی حکومت پر زور ڈال کر کہتی ہے کہ عربوں کے قومی مطالبات جلد تسلیم کیے جائیں۔

آج دنیا کو جو خطرناک بحران درپیش ہے اگر اس سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کے لیے حکومت برطانیہ کو مسلمانوں کا حقیقی اور آبرومندانہ تعاون درکار ہے تو اس کا فرض ہے کہ مسلمانوں میں یہ احساس پیدا کرے کہ ان کے حقوق محفوظ ہیں۔ نیز اس کا یہ بھی فرض ہے کہ اس سلسلہ میں مسلم لیگ کا جو مسلمانانِ ہند کی واحد نمائندہ جماعت ہے، اعتماد حاصل کرے۔

موجودہ نازک گھڑی میں ورکنگ کمیٹی ہر مسلمان سے یہ درخواست کرتی ہے کہ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے پرچم کے نیچے اس عزم صمیم کے ساتھ کھڑا ہو جائے کہ وہ بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔ کیونکہ اسی پر ہندوستان کے نو کروڑ مسلمانوں کی آئندہ تقدیر اور عزت و آبرو کا انحصار ہے[1]۔"

(ماخوذ از "ہماری قومی جدوجہد جنوری ۱۹۳۹ء سے دسمبر ۱۹۳۹ء تک" تالیف ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی۔ مطبوعہ پاکستان ٹائمز پریس، لاہور)

---

[1] جن عبارتوں پر ہم نے خط کھینچ دیا ہے ان پر غور کر لیا جائے۔ ان میں حکومت برطانیہ کو اس شرط پر جنگ عظیم دوم میں تعاون کا یقین دلایا گیا ہے کہ وہ ہندوستان میں مسلمان قوم کے حقوق کا تحفظ کرے۔ دوسرے الفاظ میں اس کے معنی یہ تھے کہ ہمیں اس سے بحث نہیں تھی کہ برطانیہ اور اس کے حریفوں کی باہمی جنگ قتال فی سبیل اللہ ہے یا قتال فی سبیل الطاغوت۔ ہمیں صرف اس سے بحث تھی کہ ہمارے قومی حقوق کا تحفظ ہو اور اس تحفظ کی یقین دہانی حاصل کرنے کے بعد ہم اس قتال میں تعاون کے لیے تیار تھے جو بہر حال قتال فی سبیل اللہ نہیں بلکہ فی سبیل الطاغوت ہی تھا۔ (جدید)

نسلی مسلمانوں کے لیے دو راہیں

عمل، خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی، بہر حال اس کی صحت کے لیے دو چیزیں شرط لازم ہیں:

پہلی شرط خود شناسی ہے۔ آپ کو سب سے پہلے یہ جاننا چاہیئے کہ آپ کیا ہیں، اور جو کچھ آپ ہیں اِس ہونے کے مقتضیات کیا ہیں۔ پھر اگر اس تحقیق سے آپ پر کوئی ایسی حقیقت منکشف ہو جس سے آپ راضی نہ ہوں، یعنی آپ کی یہ خواہش ہو کہ جو کچھ آپ ہیں وہ نہ رہیں بلکہ کچھ اور ہو جائیں، تب بھی آپ کے لیے لازم ہے کہ اُس "کچھ اور" کا تعین کریں اور جو کچھ بھی آپ ہونا چاہتے ہیں اس کے مقتضیات کو اچھی طرح سمجھ لیں۔

دوسری شرط قوّتِ فیصلہ اور قوّتِ ارادی ہے۔ آپ کو بہر حال یہ فیصلہ کرنا چاہیئے کہ جو کچھ آپ ہیں وہی رہنا چاہتے ہیں، یا کچھ اور بننے کے خواہش مند ہیں پھر اس فیصلہ کی رُو سے جو کچھ بھی آپ ہونا چاہیں، اُس ہونے کے مقتضیات کا بار اُٹھانے کے لیے آپ کو تیار رہنا چاہیئے۔ اِس سے بڑھ کر خطرناک بات کسی شخص یا گروہ کے لیے اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ ایک حیثیت سے محبت اور دوسری حیثیت کا لالچ رکھتا ہو، کبھی اِس حیثیت سے چمٹ جائے اور کبھی اُس حیثیت کی طرف لپکے۔ مگر دونوں میں سے کسی ایک کے مقتضیات بھی پورے کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔ اس تلوّن اور تردّد

کا لازمی نتیجہ خام کاری ہے۔ جو شخص یا گروہ اس حالت میں مبتلا ہو وہ بے وزن ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کے لیے کوئی ثبات اور قرار نہیں ہوتا۔ اس کی حالت ایسی ہو جاتی ہے جیسے ایک پتہ جو زمین پر پڑا ہو اور ہواؤں کے جھونکے اُسے اُڑائے اُڑائے لیے پھریں۔

مسلمانوں کے افراد اور اُن کی جماعتوں کے اعمال میں تلوّن اور خام کاری کی جو کیفیات ایک مدت سے نمایاں ہیں اور اب نمایاں تر ہو گئی ہیں اُن کے اسباب پر میں نے جتنا زیادہ غور کیا اتنا ہی زیادہ مجھے یقین ہوتا چلا گیا کہ تمام خرابیوں کی جڑ انہی دو چیزوں کا فقدان ہے۔ کہیں خود شناسی مفقود ہے اور کہیں قوّتِ فیصلہ و قوّتِ ارادی۔

ایک معتد بہ جماعت ہم میں ایسی ہے جو سرے سے اپنی خودی کا احساس ہی نہیں رکھتی۔ اُسے یہ معلوم ہی نہیں کہ مسلمان ہونے کے معنی کیا ہیں اور اس کے مقتضیات کیا ہیں۔ پھر بھلا اس سے یہ اُمید کیسے کی جا سکتی ہے کہ اپنے انفرادی یا اجتماعی عمل کے لیے وہ کوئی ایسا راستہ منتخب کرے گی جو مسلمان کو کرنا چاہیے؟

ایک دوسری جماعت، اور وہ بھی معتد بہ، ایسی ہے جو شعورِ ذات تو رکھتی ہے مگر قوّتِ فیصلہ اور قوّتِ ارادی نہیں رکھتی۔ یہ لوگ جانتے ہیں کہ ہم کیا ہیں اور انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ جو کچھ ہم ہیں اس کے ہونے کے مقتضیات کیا ہیں۔ لیکن اس علم نے اُن میں محبّت اور خوف کے دو گونہ جذبات پیدا کر دیے ہیں۔ جو کچھ یہ ہیں وہی رہنا چاہتے ہیں، کیونکہ اُنہیں اپنی حیثیت سے محبّت ہے۔ لیکن جو کچھ یہ ہیں اُس ہونے کے مقتضیات کی دہشت اُن پر طاری ہو گئی ہے۔ جانتے ہیں کہ مسلمان ہونا کھیل نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ذمہ داریوں کا ایک بھاری بوجھ آتا ہے۔ اس کے ساتھ پابندیاں ہیں، ایثار اور قربانی ہے، جہاد اور مشقت ہے، ایک ایسا سخت مشن ہے جس میں دنیا بھر سے لڑائی ہے، اور اس لڑائی کے معاوضہ میں خدا کی خوشنودی کے سوا کسی چیز کی طلب بھی جائز نہیں۔ اس ہولناک چیز کا خوف اِن کے دلوں پر ایسا بیٹھا ہوا ہے کہ یہ مسلمان ہونے کے مقتضیات سے کترا کر بھاگتے ہیں اور کوئی ایسی حیثیت اختیار کرنا چاہتے ہیں جس میں آسانی ہو۔ مگر انہیں خود بھی معلوم ہے

کہ مسلمان ہونے کی حیثیت باقی رکھ کر یہ کوئی دوسری حیثیت اختیار نہیں کر سکتے۔ اس لیے ان کی قوتِ فیصلہ جواب دے گئی ہے۔ یہ اسلام اور کفر کے درمیان مُتردّد ہو کر رہ گئے ہیں۔ اسلام سے چمٹنا چاہتے ہیں مگر اس کے مقتضیات کا خوفناک چہرہ دیکھ کر دُور بھاگتے ہیں۔ کفر کی آسائشوں اور لذّتوں اور فائدوں کو دیکھ کر اس کی طرف لپکتے ہیں، مگر وہ کہتا ہے کہ میری طرف آتے ہو تو پُورے کافر بن کر آؤ اور میرے مقتضیات پورے کرو۔ یہ اس کے لیے بھی تیار نہیں۔ لہٰذا اس سے بھی دُور بھاگتے ہیں۔ اب ان کی حالت ایک ایسے شخص کی سی ہو کر رہ گئی ہے جو ہر طرف آسائشیں اور فائدے ڈھونڈتا ہو مگر کسی طرف کی بھی ذمّہ داریاں قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔

مسلمانوں کی جماعت زیادہ تر انہی دو گروہوں پر مشتمل ہے، اس لیے عمُوماً جو اجتماعی تحریکیں مسلمانوں میں پھیل رہی ہیں وہ اسلامی نقطۂ نظر سے غلط ہیں۔ ان کے مقاصد میں غلطی ہے، ان کے طریقِ کار میں غلطی ہے، اُن کی قیادت میں غلطی ہے اور اُن کی رُوحی کیفیت میں غلطی ہے۔ بہت سے لوگوں کو بے شعوری کی وجہ سے اِس غلطی کا احساس ہی نہیں ہوتا اس لیے وہ جوش وخروش کے ساتھ اِن تحریکوں کو چلاتے ہیں۔ ان کے نزدیک کسی تحریک کے درست ہونے کے لیے بس یہی بات کافی ہے کہ اس میں "مسلمانوں کا فائدہ" ہے۔ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا[1]۔ اور بہت سے لوگ جن کو غلطی کا احساس ہے وہ اپنے نفس کی چھپی ہوئی کمزوری کے باعث اِن تحریکوں کا ساتھ دیتے ہیں۔ کیونکہ ان کے نفس نے انہیں یہ دھوکا دے رکھا ہے کہ اسلام اور جاہلیت کے درمیان ایک بین بین راہ چلنے ہی میں سلامتی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اسلام اور جاہلیت کے درمیان کوئی بیچ کی راہ نہیں ہے اور ایسی کسی راہ پر چل کر مسلمان کہیں کے بھی نہیں رہتے۔ لہٰذا مسلمانوں کی حقیقی خیر خواہی کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے سامنے واضح طور پر اسلام اور جاہلیت کی راہوں کو اُن کے مقتضیات اور اُن کے نتائج کے ساتھ کھول کر

---

[1] "وہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں خوب کر رہے ہیں۔" (الکہف۔ آیت ۱۰۴)

پیش کر دیا جائے، اور انہیں مشورہ دیا جائے کہ ان میں سے کسی ایک کو اختیار کر لیں۔

مَیں نے ترجمان القرآن میں "قوم" اور "جماعت" کے اصولی فرق کی بحث اِسی توضیح کے لیے چھیڑی تھی[1]۔ اس بحث میں مَیں نے قرآن اور حدیث کی شہادت سے یہ ثابت کیا تھا کہ "مسلمان" کی اصطلاح جس گروہ کے لیے وضع کی گئی ہے، وہ دراصل ایک "قوم" نہیں ہے بلکہ ایک "جماعت" ہے۔ اب میں ذرا تفصیل کے ساتھ یہ بتانا چاہتا ہوں کہ "قوم" ہونے اور "جماعت" ہونے کے مقتضیات و نتائج میں کیا فرق ہے۔ مجھے اور کسی شخص کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ آپ کو قوم کے بجائے جماعت بننے پر مجبور کرے۔ آپ کو پُورا اختیار ہے کہ جو چاہیں بنیں۔ البتہ جو خدمت ہم انجام دے سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ آپ کے ذہن کی اُلجھن اور نظر کے دُھندلکو دُور کر دیں، تاکہ آپ دونوں حیثیتوں کا صحیح موازنہ کر لیں، اور آپ پر یہ واضح ہو جائے کہ ان حیثیتوں کے جمع کرنے کی جو صورتیں آپ نکال رہے ہیں یہ اصولاً غلط اور نتائج کے اعتبار سے مہلک ہیں۔

ایک گروہ میں قومیت کا احساس دراصل تاریخی اثرات اور تہذیبی وراثت کے تسلسل سے پیدا ہوتا ہے۔ یعنی جب کچھ لوگ ایک طویل مدّت تک ایک قسم کے اخلاقی تصورات اور ایک قسم کے معاشرتی طور طریقوں کے ساتھ باہم متفق اور دوسرے گروہوں سے ممتاز ہو کر زندگی بسر کرتے ہیں، اور ایک نسل کے بعد دوسری نسل اس ورثہ کو لے کر اپنے اندر مستحکم کرتی چلی جاتی ہے، تو ان میں اپنے مستقل اجتماعی وجود کا وہ احساس پیدا ہوتا جاتا ہے جسے "قومیت" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چند عادتیں اور رسمیں ہوتی ہیں جن سے وہ مانوس ہوتے ہیں۔ چند تخیلات ہوتے ہیں جن سے انہیں محبت ہوتی ہے اور جن کی ترجمانی اُن کا لٹریچر کیا کرتا ہے۔ انہی چیزوں کے مجموعہ کو ان کی قومی تہذیب کہا جاتا ہے۔ ان میں طبعاً یہ

---

[1] ملاحظہ ہو "تفہیمات" جلد اول، مضمون "اسلامی قومیت کا حقیقی مفہوم"۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "مسئلہ قومیت"۔ یہ مضامین پہلے رسالہ ترجمان القرآن میں شائع ہوتے تھے اور بعد میں ان کو مذکورہ بالا کتابوں میں شامل کر دیا گیا۔ (جدید)

خواہش ہوتی ہے کہ اس تہذیب یعنی اسلاف کے اِس ورثہ کو باقی رکھیں اور اپنے اخلاف کے لیے اسے چھوڑ جائیں تاکہ ان کی قومی زندگی کا تسلسل قائم رہے۔

اس معنی میں جو گروہ ایک قوم بن گیا ہو اس میں قومیت کا شعور پیدا ہونے کے بعد طبعی طور پر یہ خواہش اُبھرآتی ہے کہ اپنی اجتماعی زندگی کا ضبط اس کے اپنے ہاتھ میں ہو اور کسی دوسرے گروہ کی مرضی اس پر مسلّط نہ ہونے پاتے۔ یہ ایک قوم کا سیاسی مفاد ہے۔

اسی طرح وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ معیشت کے جو وسائل اس کے پاس ہیں ان کی حفاظت کرے، اور جو مزید وسائل حاصل ہو سکتے ہوں انہیں حاصل کرے تاکہ اس کے افراد زیادہ سے زیادہ خوش حال ہوں۔ یہی چیز ہے جس کو قوم کے معاشی مفاد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اِس میں کسی کلام کی گنجائش نہیں کہ قومیت کا یہ مفہوم جو اوپر بیان ہوا ہے، اس کے لحاظ سے مسلمان صدیوں کے توارث کی بدولت ایک قوم بن چکے ہیں، اور اب دوسرے تمام گروہوں سے ممتاز وہ اپنا ایک مستقل اجتماعی وجود رکھتے ہیں۔ اِس میں بھی کسی شبہہ کی گنجائش نہیں کہ دوسرے گروہوں کی ایک کثیر تعداد کے درمیان گھرے ہوئے ہونے کی وجہ سے اُن کے سیاسی اور معاشی مفاد اور اُن کی قومی تہذیب کے تحفّظ کا سوال بھی پیدا ہوتا ہے جس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا مسلمانوں کی اجتماعی حیثیت بس یہی ہے؟ کیا وہ اِس کے سوا کچھ نہیں کہ دنیا کی بہت سی قوموں میں سے ایک قوم ہیں؟ کیا ان کی قومیت کی حقیقت بس اتنی ہی ہے کہ ایک گروہ نے نسلاً بعد نسلٍ ایک طرح کی زندگی بسر کر کے اپنے اندر "قومیت" پیدا کر لی ہے؟ کیا وہ تہذیب جسے یہ اسلامی تہذیب کہتے ہیں محض موروثی عادات و رسوم اور تاریخی تجارب کا مجموعہ[1] ہے؟ کیا ان کے اصل قومی مسائل صرف یہی ہیں کہ جس ورثہ کو انہوں نے باپ دادا سے پایا ہے اس کی حفاظت

---

[1] اسلامی تہذیب دراصل کس چیز کا نام ہے اِس کو مَیں نے اپنی کتاب "اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی" میں بیان کیا ہے۔ (جدید)

کریں، جو وسائلِ معیشت اور جن سیاسی اقتدارات پر وہ ابھی تک قابض ہیں انہیں ہاتھ سے نہ جانے دیں، جن چیزوں کی اُنہیں اپنے گروہ کے افراد کی خوش حالی کے لیے ضرورت ہے اُن کو حاصل کرلیں، اور فی الجملہ اُن کی اجتماعی زندگی کا ضبط اُن کے اپنے ہی ہاتھ میں رہے ؟

اگر یہی مسلمانوں کی قومیت اور یہی ان کی تہذیب ہے۔ اور یہی ان کے قومی مسائل ہیں، تو بلاشبہ وہ سب قومی تحریکات درست ہیں جو اس وقت ان میں چل رہی ہیں۔

اس صورت میں :

اِن کے لیے یہ بالکل کافی ہے کہ ان کی ایک لیگ ہو جس میں وہ سب لوگ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں جو مسلمان کہلاتے ہیں اور مسلمانوں کے نظامِ معاشرت سے وابستہ ہیں۔ اُنہی کے گروہ کے کچھ لوگ اُن کے قائد ہوں جن کے اشاروں پر یہ حرکت کریں۔ اور اُن کی تمام جدوجہد کا مقصود صرف یہ ہو کہ جو کچھ ان کے ہاتھ میں ہے وہ جانے نہ پائے، اور جو کچھ مزید ہاتھ آسکتا ہو وہ آجائے، قطعِ نظر اس سے کہ اسلام جس کے نام پر یہ اپنی قوم کو مسلمان کہتے ہیں، اُس کو جائز سمجھتا ہو یا نہ سمجھتا ہو۔ اُن کے لیے تمام تر اہمیت صرف اسی چیز کی ہونی چاہیئے کہ ملک کا نظم و نسق خواہ کسی نوعیت کا ہو، بہرحال اُس کے ضبط میں خود اُن کے اپنے افراد کو کافی حصّہ ملے تاکہ اپنے آبائی ورثہ (یعنی اپنی قومی تہذیب) کو وہ خود جس صورت میں بھی باقی رکھنا چاہیں، رکھ سکیں اور جس قسم کے بھی فوائد و منافع ملک کی آبادی میں تقسیم ہو رہے ہوں ان میں سے ایک معتدبہ حصّہ اُن کے افراد کو بھی مِل جائے۔

اُن کے لیے یہ بھی درست ہے کہ موقع اور محل کو دیکھ کر یہ ملک کی جس پارٹی[1] کے ساتھ جن شرائط پر چاہیں معاملہ کرلیں، بشرطیکہ اُس معاملہ میں اُن کے اپنے گروہ کا مفاد متصوّر ہو۔ ایسے کسی معاملہ میں قومی غداری کا سوال صرف اُس وقت پیدا ہوگا جب معاملہ جان بوجھ کر نقصان کے ساتھ کیا جائے، یا اس میں اپنی قوم کے سیاسی و معاشی مفاد کو

---

[1] خواہ وہ کانگریس پارٹی ہو یا سوشلسٹ پارٹی یا کوئی اور۔ (قدیم)

نظر انداز کر دیا جائے۔

ان کے لیے یہ بھی جائز ہے کہ جس طرح دوسری قوموں میں قوم پرستی (Nationalism) پیدا ہوئی ہے اُسی طرح اِن میں بھی ہو۔ یہ بھی اٹلی اور جرمنی اور جاپان کی طرح غلبہ اور تمکّن فی الارض کا مطالبہ کریں۔ اِن کی تنظیم بھی فاشستی اصولوں پر کی جائے۔ یہ بھی انتخابِ طبیعی (Natural Selection) اور بقائے اصلح (Survival of the Fittest) کے قانون کے مطابق اپنے آپ کو بھیڑیئے کی طرح "صالح" ثابت کریں اور غیر صالح بکریوں کو ہضم کرنا شروع کر دیں۔ یہ بھی استعماری قوموں کے زمرے میں شامل ہو جائیں، جس طرح ممکن ہو زمین میں غلبہ حاصل کریں، اور اسی دنیا کی زندگی میں اِسی زمین پر اپنے لیے جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ کا لطف پیدا کر لیں۔

قومیت کا یہ نظریہ اختیار کر لینے کے بعد آپ کے لیے یہ سب کچھ درست ہو جاتا ہے۔ مگر خوب جان رکھیے کہ اسلام کو اِس قومیت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اسلام کو نہ تو کسی نسلی گروہ سے دلچسپی ہے، نہ وہ کسی جماعت کی موروثی عادات اور رسوم سے لگاؤ رکھتا ہے، نہ وہ دنیا کے معاملات کو چند اشخاص یا مجموعۂ اشخاص کی منفعت کے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے، نہ وہ اس لیے آیا ہے کہ انسانیت جن گروہوں میں بٹی ہوئی ہے ان کے اندر اپنے نام سے ایک اور گروہ کا اضافہ کر دے، نہ وہ انسانی جماعتوں کو جانور بنانا چاہتا ہے کہ ایک دوسرے کے بالمقابل تنازع للبقاء (Struggle for Existence) کے میدان میں اُتریں اور انتخابِ طبیعی کے امتحان میں شریک ہوں۔ یہ سب کچھ غیر اسلامی ہے۔ لہٰذا اگر یہ آپ کی قومیت اور یہ آپ کی قومی تہذیب ہے، اور یہ آپ کے قومی مقاصد ہیں تو آپ اپنی قوم کا جو نام چاہیں تجویز فرما لیں۔ اسلام کا نام استعمال کرنے کا آپ کو حق نہیں ہے۔ کیونکہ اسلام آپ کی اس قومیت اور قومی تہذیب سے تبرّی کرتا ہے۔ اور میں نہیں سمجھتا اسلام ہی کا نام استعمال کرنے پر آپ کو اصرار کیوں ہو؟ "مسلمان" کے معنی و مفہوم سے تو آپ کو کوئی بحث ہے ہی نہیں۔ آپ کو تو اپنی قومیت کے لیے بس ایک نام چاہیے۔ سو اس غرض کے لیے آپ جو نام بھی وضع کر لیں گے وہ آپ کی مستقل اجتماعی

حیثیت پر اُسی طرح دلالت کرنے لگے گا جس طرح اب لفظِ "مسلمان" کر رہا ہے۔ آخر اِس نوع کی قومیت میں کون سی خصوصیت ہے جس کے لیے لفظِ "مسلمان" ہی استعمال کرنا ضروری ہو؟

اِس نام کو بدل دینے کی ضرورت صرف اِسی لیے نہیں ہے کہ آپ کے یہ نظریات جن پر آپ اپنی قومیت کی بنا رکھ رہے ہیں، اولاً اسلام کے خلاف ہیں، بلکہ اِس کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ اِن نظریات کے ساتھ آپ جو کچھ کریں گے وہ اسلام کے لیے رسوائی و بدنامی کا موجب ہوگا۔ دنیا آپ کی حرکات کو دیکھ کر سمجھے گی کہ اسلام یہی کچھ سکھاتا ہوگا، اور یہ چیز اُس کو اسلام سے اور زیادہ دُور پھینکے گی۔ آپ اپنے "قومی مفاد" کی حفاظت کیلیے غیر اسلامی فوج میں اپنا تناسب قائم رکھنے کی کوشش کریں گے، اور دنیا یہ سمجھے گی کہ شاید یہ اسلام کی تعلیم ہے کہ جو تمہیں پندرہ روپے تنخواہ دے اس کے حکم سے تم ہر ایک کا گلا کاٹنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ آپ اپنے قومی مفاد کی خاطر ہر اُس منفعت کو دانتوں سے پکڑنے کی کوشش کریں گے جو کسی مسلمان یا بہت سے مسلمانوں کو کسی طور سے حاصل ہو یا ہو سکتی ہو، اور دنیا اس دنائت کو اسلام کی طرف منسوب کرے گی۔ آپ انتہائی بے اصولی کے ساتھ کہیں ایک چیز کی حمایت کریں گے اس لیے کہ وہ آپ کے مفاد کے مطابق ہے، اور کہیں اُسی چیز کی مخالفت کریں گے اس لیے کہ وہ آپ کے مفاد کے خلاف ہے، کبھی ایک پارٹی سے ملیں گے اور کبھی اُسی پارٹی سے لڑیں گے، نہ اس لیے کہ آپ کے اور اُس کے درمیان اصولی اتفاق یا اتحاد ہے، بلکہ صرف اس لیے کہ آپ کے پیشِ نظر اصول نہیں "قومی مفاد" ہے۔ یہ ابن الوقتی جو آپ کے کیرکٹر سے ظاہر ہوگی، دنیا سمجھے گی کہ ایسا ہی کیرکٹر اسلام پیدا کرتا ہے۔ آپ قومی مفاد کی تلاش میں ہر طرف لپکیں گے۔ فاشزم کے اصول یا کمیونزم کے نظریات بھی اختیار کریں گے، ظالمانہ سرمایہ داری اور مُستبدانہ شخصی ریاستوں کے دامن میں بھی پناہ لیں گے، انگریز اور ہندو اور ریاستہائے ہند، جس کے آستانہ پر بھی فائدہ کا بُت بیٹھا نظر آئے گا اسی کی طرف سجدہ ریز ہوں گے، اور یہ سارے داغ آپ کے توسط سے اسلام کے دامن پر لگتے چلے جائیں گے۔ اسلام نے صدیوں آپ پر جو

احسانات کیے ہیں اُن کا کم از کم یہ بدلہ تو نہ ہونا چاہیئے کہ آپ اس طرح اس کی رسوائی کا سامان کریں۔

لیکن اگر آپ کو اسلام سے واقعی محبت ہے اور حقیقت میں آپ مسلمان ہی رہنا چاہتے ہیں تو آپ کو یہ جان لینا چاہیئے کہ اسلام یہودیت اور ہندوازم کی طرح ایک نسلی مذہب نہیں ہے جو ایک نسلی قومیت بناتا ہو بلکہ وہ تمام نوعِ انسانی کے لیے ایک اخلاقی و اجتماعی مسلک ہے۔ ایک جہانی نظریہ (World Theory) اور ایک عالمی تصور (Universal Idea) ہے۔ وہ ایک ایسی جماعت پیدا کرنا چاہتا ہے جو اس مسلک، اس نظریہ، اس تصور کو لے کر اٹھے، اور دنیا کے سامنے عملاً اس کا نقشہ پیش کرے، اور جس جس قوم کے جو جو لوگ اس کو قبول کرتے جائیں انہیں اپنی جماعت میں شامل کرتی چلی جائے، یہاں تک کہ قوموں کے درمیان تفریق کی دیواریں مسمار ہو جائیں۔ اُس کے نزدیک "اسلامی" صرف وہ چیز ہے جو اُس کے مسلک اور اس کے نظریہ کے مطابق ہو۔ اور جو چیز اُس کے خلاف ہو اُس کو وہ اپنا لینے سے صاف انکار کرتا ہے خواہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا ذاتی مفاد اس سے وابستہ ہو۔ لہٰذا اگر آپ اسلام کے مسلک کی خاطر جئیں اور اُس کو دنیا میں حکمران بنانے کے لیے جدّوجہد کریں تب تو یقیناً آپ اسلامی جماعت اور مسلمان گروہ ہوں گے، ورنہ اپنے لیے جینے اور اپنے مفاد کے لیے جدّوجہد کرنے کی صورت میں اسلام سے آپ کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔ آپ کو ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ کام اپنے لیے کریں اور نام اسلام کا لیں۔

مسلکِ اسلام کی اس جہانی و عالمی نوعیت کو ذہن نشین کر لینے کے بعد اب یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ ایک عالمگیر مسلک اور جہانی نظریہ کے مقتضیات کیا ہوتے ہیں۔

اوّلاً وہ مختلف پارٹیوں میں سے ایک پارٹی بن کر رہنے پر قانع نہیں ہوتا، بلکہ اُس کی فطرت کا اقتضا یہ ہوتا ہے کہ بس وہی ایک ہو۔ وہ مقابل کی کسی طاقت کو اپنا شریک و سہیم بنانے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ مُدارات اور مصالحت (Compromise) کرنا اس کے لیے ناممکن ہوتا ہے۔ وہ سودا نہیں کرتا، وہ غالب ہونا چاہتا ہے،

لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ[1]

ثانیاً وہ اشخاص یا طبقوں یا قوموں کے نقطۂ نظر سے مسائل کو نہیں دیکھتا بلکہ کُلّی اور جہانی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ اُسے اِس امر سے قطعاً کوئی بحث نہیں ہوتی کہ اِس شخص یا اِس طبقہ یا اِس گروہ کا فائدہ کس چیز میں ہے۔ اُس کو انسان سے بحث ہوتی ہے اور وہ اُن مسائل کو حل کرنا چاہتا ہے جو مجموعی حیثیت سے انسان کے لیے حل طلب ہوں، قطع نظر اس سے کہ کس کو کیا ملتا ہے اور کس سے کیا چھنتا ہے، كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ[2]۔

ثالثاً اس کے پیشِ نظر وقتی یا مقامی مقاصد نہیں ہوتے بلکہ ایک دائمی اور جہانی مقصد ہوتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ دنیا میں زندگی کا جو نظام اُس کے اصول کے خلاف قائم ہے اُس کو توڑ ڈالے اور اپنے اصول کے مطابق مستقل طور پر ایک نظام قائم کرے۔

رابعاً وہ ایسی قومیت کے تنگ دائرے میں بند ہونے کے لیے تیار نہیں ہوتا جو نسلی اور تاریخی روایات پر قائم ہو۔ اُس کی کامیابی کے لیے تو لازمی شرط یہی ہے کہ اپنے عہد کے تمام انسانوں میں سے بہتر اور صالح تر افراد کو نکال کر اپنی تنظیم کی طرف کھینچ لائے اور اُن کی قابلیتوں سے کام لے۔ اگر وہ کسی خاص قوم کی ذاتی اغراض کا حامی بن جائے تو ظاہر ہے کہ دوسری قوموں کے لیے اس کی اپیل قطعاً غیر مؤثر ہو جائے گی۔

خامساً وہ کسی خاص قوم کی موروثی تہذیب اور روایتی رسوم و عادات سے اپنا دامن نہیں باندھتا بلکہ ہر عہد میں تمام عالمِ انسانی نے اپنی علمی تلاش و جستجو سے جو حقائق — نظریات نہیں بلکہ حقائق — دریافت کیے ہوں، یا اپنی سعی و عمل سے جو صالح نتائج پیدا کیے ہوں، اُن سب کو لے کر وہ اپنے تجویز کردہ نظامِ اجتماعی میں اپنے اصول کے مطابق اس طرح جذب کرتا ہے کہ وہ اِس نظام کے فطری اجزاء (نہ کہ درآمد شدہ اشیاء) بن جائیں۔

---

[1] تاکہ وہ اس دینِ حق کو پوری جنسِ دین پر غالب کر دے خواہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔ (التوبہ: ۳۳)

[2] تم وہ بہترین اُمّت ہو جسے لوگوں (کی اصلاح و ہدایت) کے لیے نکالا گیا ہے (آلِ عمران: ۱۱۰)

سادشا اس کی کامیابی کے لیے صرف یہ ثابت کر دینا کافی نہیں ہوتا کہ وہ بجائے خود برحق ہے اور اس میں انسان کے لیے فلاح ہے۔ بلکہ اپنے مقصود کو پہنچنے کے لیے وہ اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ اس کے اصولوں کو ایک انقلابی تحریک کی بنیاد بنا دیا جائے، اُس پر ایمان رکھنے والے اُس تحریک کے زور سے ایک مجاہد جماعت بن کر اُٹھیں، اور بالآخر اُس کے نظریات ایک اسٹیٹ کے لیے بنیادی قانون بن جائیں۔

یہ اسلام کے مقتضیات ہیں اور یہی مسلمان ہونے کے مقتضیات بھی ہیں۔ اب اگر آپ "اسلامی جماعت" بن کر کام کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو اپنی اُس قومی پالیسی پر نظرِ ثانی کرنی ہوگی جس پر آپ اب تک چلتے رہے ہیں، اور اُسے بالکلیہ بدل کر ان مقتضیات کے مطابق ڈھالنا ہوگا۔

آپ کو اپنے دماغ سے قومی مفاد کا تصور نکال دینا پڑے گا اور اس کی جگہ اسلام کے اصول اور اس کے نصب العین کو دینی ہوگی۔ آپ کو وقتی اور مقامی مقاصد سے صرفِ نظر کر لینا ہوگا اور اپنی نظر اس ایک مقصد پر جما دینی ہوگی کہ اسلام کے اصول دنیا میں حکمراں ہوں۔ اس غرض کے لیے آپ کو دنیا بھر سے لڑنے کے لیے تیار ہونا پڑے گا اور کسی ایسی پارٹی سے، جو آپ کے اصول نہ مانتی ہو، آپ کسی شرط پر بھی سودا نہ کر سکیں گے۔ آپ کو سختی کے ساتھ ایک بااصول جماعت بننا پڑے گا، اُن ناکارہ لوگوں کو اپنے سے الگ کرنا ہوگا جو آپ کے اصول کو نہ مانتے ہوں، اور سب قوموں میں سے اُن صالحین کو چُن چُن کر اپنے ساتھ ملانا ہوگا جو ان اصولوں کو ماننے کے لیے تیار ہوں۔ آپ کو ابن الوقتی چھوڑ دینی ہوگی۔ اپنے اصولوں سے ہٹ کر آپ کچھ نہ کر سکیں گے خواہ اُس میں کتنا ہی بڑا شخصی یا قومی فائدہ ہو۔ آپ کو ایک ایسی مجاہد جماعت بننا پڑے گا۔ جو اپنے اصولوں کے لیے لڑنے والی ہو، جس کا مقصد اپنی "قومی حکومت" (National State) قائم کرنا نہ ہو بلکہ اپنے "اصولوں کی حکومت" (Ideological State) قائم کرنا ہو۔

ایسی جماعت جب آپ بنیں گے تو آپ کو اپنی قیادت میں تغیر کرنا ہوگا۔ اُس وقت آپ کے قائد صرف وہ لوگ ہو سکیں گے جو اسلام کے اصول کو ٹھیک ٹھیک جانتے ہوں

اور سب سے زیادہ اُن کا اتباع کرنے والے ہوں۔ ایک قوم کا لیڈر ہر وہ شخص ہو سکتا ہے جو قوم کا فرد ہو۔ مگر ایک جماعت کا لیڈر صرف وہی ہو سکتا ہے جو جماعت کے مسلک کا سب سے بڑا علمبردار ہو۔ مسلمانوں کی قومی تنظیم میں تو اسلام کے مسلک سے ہٹے ہوئے لوگ صفِ اول میں بھی جگہ پا سکتے ہیں، مگر جماعتی تنظیم میں ان کا مقام سب سے پچھلی صفوں میں ہوگا، بلکہ شاید اُن میں سے بہت سوں کو کسی صف میں بھی جگہ نہ ملے گی۔

قَدْ تَبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ[1]۔ آپ پر دونوں راستے واضح ہو چکے ہیں۔ اب ان کے فوائد اور نقصانات کا موازنہ کر کے بھی دیکھ لیجیے تاکہ ان میں سے کسی ایک کو انتخاب کرنے میں آسانی ہو۔

اگر آپ محض ایک ایسی قوم ہوں جو اپنے ذاتی مفاد کے لیے جدوجہد کرتی ہو، تو آپ کی حیثیت ایک جامد چٹان کی سی ہوگی، اور آپ کے مقابلہ میں دوسری بہت سی قومیں ایسی ہی چٹانوں کی صورت میں موجود ہوں گی۔ آپ کا اور اُن کا مقابلہ اُسی طرح ہوگا جس طرح چٹانوں کا ایک دوسرے سے ہوتا ہے۔ ایک چٹان دوسری چٹان میں سے اجزا لے کر اپنا حجم نہیں بڑھا سکتی۔ نہ ایک چٹان کے اندر گھس سکتی ہے۔ ان کے درمیان معاملہ کی بس دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو ہر ایک چٹان اپنی اپنی جگہ رہنے پر قانع ہو۔ یا ایک چٹان دوسری چٹان پر چڑھ جائے اور اس سے ٹکرا کر اسے توڑنے اور پیسنے کی کوشش کرے۔ پہلی صورت میں آپ محدود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اور دوسری صورت میں آپ کے لیے وسعت کا امکان تو ہے، مگر اُسی طرح کی وسعت جیسی فاشسٹ اٹلی اور نازی جرمنی حاصل کر رہا ہے، اور اس سے پہلے امپیریلسٹ برطانیہ حاصل کر چکا ہے۔ اس طرح کی وسعت حاصل کر کے آپ دنیا میں بس ایک مفسد قوم کا اضافہ کر دیں گے جو زمین میں کچھ مدّت تک فساد پھیلائے گی اور بالآخر اپنے کیے کی سزا پائے گی۔

بخلاف اس کے اگر آپ اسلامی مفہوم کے مطابق ایک ایسی اصولی جماعت ہوں جو

---

[1] سیدھا راستہ ٹیڑھے راستے سے الگ نمایاں ہو گیا۔

محض ایک عالمگیر مسلک اور ایک جہانی نظریہ کے لیے جدوجہد کرتی ہو، اور جس میں ہر انسان آپ کے اصول قبول کر کے مساوی حقوق اور مساویانہ حیثیت کے ساتھ شریک ہو سکتا ہو، تو آپ ایک جامد پتھر کی طرح نہ ہوں گے بلکہ ایک نامی جسم (Organic Body) کی طرح ہوں گے۔ آپ کی مثال اس درخت کی سی ہو گی جو ہر طرف اپنے گردوپیش سے اجزاء جذب کرتا ہے اور پھیلتا چلا جاتا ہے۔ اس صورت میں آپ ایک عالمگیر طاقت (World Force) ہوں گے۔ آپ دنیا کو اپنے لیے نہیں بلکہ اصولِ حق کے لیے فتح کرنے کی کوشش کریں گے۔ اور اگر واقعی آپ کے اصول فطرتِ انسانی کو اپیل کرنے والے اور انسانیت کی مشکلات کو حل کرنے والے ہیں ــــــــ جیسے کہ وہ فی الواقع ہیں ــــــــ تو دنیا خود اپنے آپ کو مفتوحیت کے لیے آپ کے سامنے پیش کر دے گی۔ آپ کے شخصی یا قومی مفاد میں تو کوئی عالمگیر کشش نہیں ہے۔ اُس کی طرف آپ دعوت دیں گے تو دنیا اس کی طرف خود کبھی نہ کھنچے گی بلکہ آپ کو زبردستی اسے کھینچنا پڑے گا۔ لیکن اسلام کے اصول میں عالمگیری کی طاقت ہے۔ دنیا اُن کی طرف خود کھنچے گی بشرطیکہ آپ اپنے لیے نہیں بلکہ اپنے اصولوں کے لیے جئیں اور مریں۔ آپ کے سامنے اشتراکیت کی مثال موجود ہے۔ وہ ایک عالمگیر طاقت صرف اس لیے بنتی چلی گئی کہ اشتراکی لوگ اشتراکیوں کے مفاد کے لیے نہیں بلکہ اشتراکیت کے اصول کے لیے جہاد کرتے رہے ہیں۔ آج اگر وہ اشتراکیت کے لیے جہاد کرنا چھوڑ دیں اور ہر قوم کے اشتراکیوں کو صرف اپنے قومی مفاد کی فکر لگ جائے تو آپ دیکھیں گے کہ اشتراکیت کی عالمگیری ختم ہو جائے گی۔

(ترجمان القرآن۔ مئی ۱۹۳۹ء)

اقلیّت واکثریت

مسلمانوں نے چونکہ اپنے دین کو ایک عالمگیر تحریک کے بجائے ایک جامد قومی تہذیب اور خود اپنے آپ کو ایک بین الاقوامی انقلابی جماعت کے بجائے محض ایک قوم بنا کر رکھ دیا ہے لہٰذا اس کا نتیجہ آج ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ مسلمان کے لیے تاریخ میں پہلی مرتبہ اقلیت و اکثریت کا سوال پیدا ہوا ہے، اور اس کے لیے یہ بات سخت پریشانی کی موجب بن گئی ہے کہ مردم شماری کے اعتبار سے جب میں چار کے مقابلہ میں ایک کی نسبت رکھتا ہوں تو اب میں چوگنی تعداد کے غلبہ سے اپنے آپ کو کیسے بچاؤں۔

یہ پریشانی اب رفتہ رفتہ شکست خوردہ ذہنیت میں تبدیل ہو رہی ہے اور کمزور فریق کی طرح اب مسلمان کو بچاؤ کی کوئی تدبیر اس کے سوا نہیں سوجھتی کہ وہ پسپا ہو کر اپنے خول میں سمٹ آئے۔ اس صورتِ حال کی تنہا وجہ یہی ہے کہ اِس اللہ کے بندے کو نہ تو اُس طاقت کا علم ہے جو اس کے دین کی صورت میں اس کے پاس ہے، اور نہ اِسے یہی خبر ہے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے دنیا میں اس کا مقام کیا ہے۔ یہ اپنے دین کو ایک کُند ہتھیار اور اپنے آپ کو ایک "قوم" سمجھ رہا ہے، اسی وجہ سے اِس کو بچاؤ کی پڑ گئی ہے۔ اگر اس کو یاد ہوتا کہ میں ایک جماعت ہوں اور وہ جماعت ہوں جس کا مشن ہی دنیا کو اپنے نظریہ و مسلک اور اپنے فلسفۂ اجتماع (Social Philosophy) کی طاقت سے فتح کرنا ہے تو ہرگز اسے کوئی پریشانی

پیش نہ آتی۔ اس کے لیے اکثریت و اقلیت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ یہ اپنے خول میں سمٹ آنے کی فکر نہ کرتا بلکہ آگے بڑھ کر میدان جیتنے کی تدبیریں سوچتا۔

کثرت و قلت کا سوال صرف قوموں ہی کے لیے پیدا ہوتا ہے۔ "جماعتوں" کے لیے نہیں۔ جو جماعتیں کسی طاقت ور نظریہ اور جاندار اجتماعی فلسفہ کو لے کر اٹھتی ہیں وہ ہمیشہ قلیل التعداد ہی ہوتی ہیں۔ اور قلتِ تعداد کے باوجود بڑی بڑی اکثریتوں پر حکومت کرتی ہیں۔ روسی کمیونسٹ پارٹی کے ارکان کی تعداد اِس وقت[1] صرف ۳۲ لاکھ ہے اور انقلاب کے وقت اس سے بہت کم تھی، مگر اس نے ۱۷ کروڑ انسانوں کو مسخر کر لیا۔ مسولینی کی فاشسٹ پارٹی صرف ۴ لاکھ ارکان پر مشتمل ہے، اور روم پر مارچ کرتے وقت ۳ لاکھ تھی، مگر یہ قلیل تعداد ساڑھے چار کروڑ اطالویوں پر چھا گئی۔ یہی حال جرمنی کی نازی پارٹی کا ہے۔ اگر قدیم زمانہ کی مثالیں خود اسلامی تاریخ سے دی جائیں تو ان کو یہ کہہ کر ٹالا جا سکتا ہے کہ وہ زمانہ گزر گیا اور وہ حالات بدل گئے۔ لیکن یہ تازہ مثالیں آپ کے اِسی زمانہ کی موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ قلت آج بھی حکمران بن سکتی ہے بشرطیکہ وہ اُس طرح مجاہدہ کرے جس طرح ایک اصول اور مسلک رکھنے والی جماعت کیا کرتی ہے، اور محدود اغراض کے لیے لڑنے کے بجائے ایسے اصولوں کے لیے لڑے جو لوگوں کی زندگی کے مسائل کو حل کرنے والے اور انسانی توجہات کو اُس جماعت کی طرف کھینچنے والے ہوں۔

اسلام کے اصول اِس غرض کے لیے بہترین پروگرام دے سکتے ہیں اور اُس پروگرام کو لے کر اگر مسلمان عملی مجاہدے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں تو چند سال میں حالات کا نقشہ بدل سکتا ہے۔ لیکن یہاں مسلمانوں کی قیادت جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے وہ نہ اسلام کو جانتے ہیں، نہ اپنے آپ کو مسلمان کی حیثیت سے پہچانتے ہیں، نہ ان کو اُس منبع کی خبر ہے جہاں اسلام کی قوتِ تسخیر چھپی ہوئی ہے۔ ان کے دماغوں کی پہنچ زیادہ

---

[1] یہ ۱۹۳۹ء تک کے اعداد و شمار ہیں۔ (جدید)

سے زیادہ جہاں تک ہوسکتی ہے وہ یہی ہے کہ یا تو اپنے آپ کو قلیل التعداد دیکھ کر محفوظ قلعوں کی طرف بھاگنے کی فکر کریں، یا اس نتیجہ پر پہنچ جائیں کہ ہمارے لیے دوسروں کے پیچھے چلنے اور اپنے آپ کو غیر مسلموں کی قیادت کے حوالے کر دینے کے سوا کوئی زندگی نہیں ہے۔

دنیا میں اس وقت جتنی جماعتیں برسرِ اقتدار ہیں ان میں کسی جماعت کی تعداد بھی لاکھوں سے متجاوز نہیں ہے۔ غالباً روسی کمیونسٹ پارٹی اس وقت سب سے بڑی جماعت ہے، مگر جیسا کہ ابھی میں نے بیان کیا اس کے ارکان بھی ۲۲ لاکھ سے زیادہ نہیں ہیں۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو کہنا پڑے گا کہ جس نظریہ و مسلک کے حامیوں کی تعداد صرف ایک ملک میں آٹھ کروڑ اور دنیا بھر میں چالیس کروڑ یا اس سے زیادہ ہو اس کو تمام کرۂ زمین پر حکمران ہونا چاہیئے۔ یہ نتیجہ یقیناً رونما ہوتا اگر اِن لوگوں میں جماعتی احساس بیدار ہوتا، اور انہیں اپنی جماعت کے مشن کا شعور نصیب ہوتا، اور یہ اُس مشن کے لیے سعی و جہد پر کمربستہ ہوتے۔ لیکن جس چیز نے اِس عظیم الشان تعداد کو بالکل بے اثر، قطعی ناکارہ بنا دیا ہے وہ اِسی احساس و شعور اور اِسی آمادگیِ عمل کا فقدان ہے۔ مختلف قسم کی شیطانی قوتیں اس جماعت کو چمٹ گئی ہیں اور پیہم اس کوشش میں لگی ہوئی ہیں کہ کسی طرح یہ اپنے آپ سے واقف نہ ہونے پائے، اور اِس کو کبھی اتنا ہوش ہی نہ آنے پائے کہ یہ اپنی زندگی کے مشن کا خیال کر سکے۔ آپ مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک ہندوستان کے مسلمانوں کے حالات کا جائزہ لے لیجیے۔ ہر جگہ آپ کو یہی نظر آئے گا کہ ایک نہ ایک شیطان اِس قوم کی جان کا لاگو بنا ہوا ہے اور پوری مستعدی کے ساتھ اپنے کام میں منہمک ہے۔ جہاں مسلمانوں میں مذہب کے ساتھ ابھی دلچسپی باقی ہے وہاں یہ شیاطین مذہبیت کا جامہ پہن کر آتے ہیں اور دین کے نام سے اُن مسائل پر بحثیں چھیڑتے اور نزاعیں برپا کرتے ہیں، بلکہ بسا اوقات سر پھٹول تک نوبت پہنچا دیتے ہیں جن کی دین میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ اِس طرح مسلمانوں کا سارا مذہبی جوش اُن کی اپنی تخریب میں ضائع ہو جاتا ہے۔ اور جہاں مذہب کی طرف سے کچھ سرد مہری پیدا ہو گئی ہے

وہاں کچھ دوسری قسم کے شیاطین نمودار ہوتے ہیں اور وہ دنیوی ترقی و خوش حالی کا سبز باغ دکھا کر مسلمانوں کو ایسی تحریکوں کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں جو اپنے مقاصد و طریقِ کار کے لحاظ سے قطعاً غیر اسلامی ہیں۔

جن لوگوں کو مسلم عوام کی حالت دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے وہ جانتے ہیں کہ اِس گئی گزری حالت میں بھی اِن لوگوں کے اندر اچھی خاصی اخلاقی طاقت موجود ہے جس سے بہت کچھ کام لیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ بہت سے روگ جو اس قوم کو لگے ہوتے ہیں، انہوں نے آٹھ کروڑ مسلمانوں کی اِس عظیم الشان تعداد کو صفر کے درجے تک نیچے گرا دیا ہے۔ اسلام جس مقصد کے لیے جہاد اور محنت و جاں فشانی چاہتا ہے، یہ اس سے بہت دور ہٹا دیئے گئے ہیں۔ ان کے ذہن سے اسلام کا صحیح تصوّر اور مسلمان کا حقیقی مفہوم نکال دیا گیا ہے۔ یہ درحقیقت خود اپنے آپ سے بے گانہ کر دیئے گئے ہیں۔ یہ اس غلط فہمی میں ڈال دیئے گئے ہیں کہ وہ نظریۂ حیات جو اسلام اِن کو دیتا ہے اُس کے لیے کوئی مستقبل نہیں، کامیابی کا کوئی موقع نہیں۔

ان وجوہ سے وہ عظیم الشان تعداد جو ہم کو مردم شماری کے رجسٹروں میں نظر آتی ہے اسلامی اغراض کے لیے قریب قریب بالکل بے کار ہو چکی ہے۔ اس تعداد کے بھروسہ پر اگر کچھ کیا جائے گا تو سخت مایوسی سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ جو اُمید وابستہ کی جاسکتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ اگر اسلام ازسرِنو ایک زندہ تحریک کی حیثیت سے اُٹھے اور شیطانی قوتوں کے مقابلہ میں اپنے اصول کی حکمرانی و فرمانروائی قائم کرنے کے لیے نبرد آزما ہو، تو شاید غیر مسلموں کی بہ نسبت اِن مسلمانوں میں سے اُس کو کچھ زیادہ والنظر نسبتہً زیادہ آسانی کے ساتھ مل سکیں گے۔

اب جو لوگ حقیقت میں اُس اسلام کو جانتے اور سمجھتے ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا اور جن کا قلب اس امر پر پوری طرح مطمئن ہے کہ انسانیت کی فلاح و سعادت اُسی اسلام کی حکمرانی میں ہے اور صرف اسلام ہی کے اصول پر انسانی تمدن و اجتماع کا ایک معتدل و متوازن نظام تعمیر ہو سکتا ہے، ان کو چند غلط فہمیوں سے اپنے ذہن کو صاف کر

لینا چاہیئے اور چند حقیقتیں اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہئیں۔

اول یہ کہ "مسلمانوں کے مفاد" سے اسلام کا دامن باندھنا غلطی ہے۔ اسلام کی نگاہ میں یہ سوال ہرگز کوئی اہمیت نہیں رکھتا اور نہ اسلام اپنے پیروؤں کے اس "مفاد" کو تسلیم کرتا ہے کہ ایک غیر الٰہی نظامِ حکومت کو چلانے کے لیے کتنے "مسلمانوں" کی خدمات فوج میں اور کتنوں کی پولیس میں اور کتنوں کی دفتروں میں حاصل کی جاتی ہیں، اور کتنی نشستیں ان کو مجالسِ قانون ساز میں ملتی ہیں تاکہ خدا کے ملک میں وہ بھی غیر مسلموں کی طرح شریعت ساز بن کر بیٹھیں، اور کن ریاستوں کی مسندِ حکمرانی مسلمان فرمانرواؤں کے لیے محفوظ رکھی جائے تاکہ وہ غیر مسلم راجاؤں کی طرح ملکِ خدا کے ناجائز مالک بنے بیٹھے رہیں۔ اس قسم کے سوالات کو اسلامی سوالات کہنا اسلام کی توہین ہے۔ ایک اسلامی تحریک کو اس قسم کے تمام سوالات سے قطعاً بے تعلق ہونا چاہیئے۔

دوسرے یہ کہ اسلام کی کامیابی نہ تو اُن مسلمانوں کی تعداد اور طاقت پر منحصر ہے جو اس وقت مردم شماری میں مسلمان کی حیثیت سے لکھے ہوتے ہیں، اور نہ اُس کی کامیابی کی راہ میں ہندوؤں اور دوسرے غیر مسلموں کی کثرتِ تعداد ہی کوئی مضبوط رکاوٹ ہے۔ مردم شماری کے رجسٹروں میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کی آبادی کا تناسب دیکھ کر یہ گمان کرنا کہ اسلام کی طاقت ہندوستان میں صرف اتنی ہی ہے جتنا آبادی میں مسلمانوں کا تناسب ہے، اور یہ سمجھنا کہ آبادی میں غیر مسلموں کا تناسب جتنا زیادہ ہے اتنا ہی اسلام کی کامیابی کا امکان کم ہے، یہ صرف اُن لوگوں کا کام ہے جو اسلام کو محض ایک جامد مذہبی رسم کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ اگر اسلام ایک زندہ عملی تحریک کی حیثیت سے میدان میں آجائے اور اس کے اصولوں کی بنیاد پر ہندوستانی زندگی کے حقیقی مسائل کو حل کرنے کے لیے ایک عملی پروگرام لے کر کوئی منظم جماعت اُٹھ کھڑی ہو تو یقین رکھیے کہ اُس کی اپیل پیدائشی مسلمانوں تک محدود نہ رہے گی بلکہ شاید اُن سے بڑھ کر غیر مسلموں کو اپنی طرف کھینچے گی اور کوئی طاقت اس سیلِ رواں کو نہ روک سکے گی۔ آج جو لوگ اسلام کے تحفظ کی بس یہی ایک صورت دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو ہر طرف سے سمیٹ کر چند گوشہ ہائے عافیت میں پہنچا دیا جائے، افسوس ہے کہ وہ اسلام کے اِن امکانات سے

ناواقف ہیں۔

تیسرے یہ کہ کسی تحریک کی کامیابی کا انحصار اس پر نہیں ہے کہ اس کے حقیقی معتقدوں اور پیرووں کی تعداد ملک میں ۸۰ یا ۷۰ فی صدی ہو جائے۔ تاریخ کے واقعات اور خود موجودہ دنیا کے تجربات ہمیں بتاتے ہیں کہ ایک مضبوط اور منظم پارٹی، جس کے ارکان اپنی تحریک پر پورا ایمان رکھتے ہوں، اور اس کی راہ میں جان و مال قربان کرنے کے لیے تیار ہوں، اور پارٹی ڈسپلن کی کامل اطاعت کرتے ہوں، محض اپنے ایمان اور ڈسپلن کی طاقت سے برسرِ اقتدار آسکتی ہے خواہ اس کے ارکان کی تعداد ملک کی آبادی میں ایک فی ہزار بھی نہ ہو۔ پارٹی کا پروگرام کروڑوں کو اپیل کرتا ہے اور کروڑوں کی ہمدردی حاصل کرتا ہے، مگر خود پارٹی کے اندر صرف وہی لوگ ہوتے ہیں جو ایمان اور اطاعتِ امر کے اوصاف کمال درجے پر رکھتے ہوں۔ پس اسلام کو حکمران بنانے کے لیے حقیقی مسلمانوں کی کسی بڑی تعداد کی ضرورت نہیں۔ تھوڑے ہی کافی ہیں بشرطیکہ علم اور عمل کے اعتبار سے مسلمان ہوں اور خدا کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرنے پر مستعد ہوں۔

(ترجمان القرآن۔ جون ۱۹۳۹ء)

شکایات

ناظرین "ترجمان القرآن" میں سے ایک صاحب لکھتے ہیں :

"آپ کی نظر میں نہ موجودہ لیڈروں میں، نہ عوام میں کوئی اس قابل ہے کہ اپنے آپ کو مسلمان کہنے یا کہلانے کا مستحق ہو، نہ موجودہ دَور کی سیاسی کشمکش میں اِن نام نہاد مسلمانوں کی بہبودی کی جدّو جہد مستحسن ہے۔ پھر برائے خدا یہ بتائیے کہ یہ مسلمان کس نام سے پکارا جائے اور اس پر جو ہر طرف سے حملے ہو رہے ہیں ان سے بچنے کے لیے کسی تدبیر کی ضرورت بھی ہے یا نہیں؟ یہ سچ ہے کہ دَورِ حاضر کے مسلمان بُرے ہیں۔ مذہب کی پابندی نہیں کرتے۔ لیکن آخر کیا انہیں ڈوبتا ہی چھوڑ دیا جائے؟ ...... کیا جس وقت تک سب راہ راست پر نہ آجائیں اس وقت تک نہ اپنے آپ کو کوئی مسلمان کہے نہ ان کی بہتری کے واسطے انہی جیسے مسلمانوں کی طرف سے کوئی جدّو جہد کی جائے؟ ...... ڈوبتے ہوئے سے یہ کہنا کہ تو گہرے پانی میں گیا ہی کیوں تھا اور تو کسی ہمدردی کا مستحق نہیں ہے سراسر خلافِ انسانیت ہے۔ ضرورت تو اس کی ہے کہ اسے نکالنے کی کوشش کی جائے اور ہر ممکن تدبیر اس کی جان بچانے کی عمل میں لائی جائے۔"

ایک دوسرے صاحب فرماتے ہیں:

"آپ کی روش میرے لیے اور مجھ جیسے خیالات رکھنے والے بہت سے دوسرے لوگوں کے لیے سخت وجہ پریشانی بن گئی ہے۔ جب تک آپ نیشنلسٹ مسلمانوں یا کانگریس سے تعاون کرنے والے مسلمانوں کے طرزِ عمل پر تنقید کرتے رہے، ہم نے یہ سمجھا کہ آپ ہندوستان میں مسلمانوں کی انفرادیت برقرار رکھنے کے حامی ہیں اس لیے اُن لوگوں سے اختلاف رکھتے ہیں جن کے رویّہ سے آپ کو خطرہ ہے کہ مسلمانوں کی انفرادی ہستی گم ہو جائے گی۔ مگر اب آپ نے اُن دو تحریکوں اور ان کے لیڈروں پر بھی نکتہ چینی شروع کر دی ہے جو اس انفرادیت کے تحفظ ہی کے لیے کوشاں ہیں، یعنی مسلم لیگ اور خاکسار تحریک۔ اب ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ آخر چاہتے کیا ہیں؟ ہندوستان میں اگر مسلمانوں کو زندہ رہنا ہے تو بہرحال یہ ضروری ہے کہ وہ کسی مرکز پر جمع ہوں، ایک منظم گروہ بنیں، کسی قیادت کے تحت حرکت کریں۔ اس مقصد کے لیے جو کوشش کی جاتی ہے اس سے آپ کا اختلاف کیا معنی رکھتا ہے؟ اگر آپ مذہبیت کا احیاء چاہتے ہیں تو یہ بھی تب ہی ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کا ایک اجتماعی نظام بن جائے۔ فی الحال بُری یا بھلی، جیسی بھی ہے، جماعت تو بن رہی ہے۔ اس کا ساتھ دیجیے۔ پھر مذہبی احیاء کے لیے بھی کوشش کر لیجیے گا۔ لیکن آپ کی روش سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے جو کوششیں کی جا رہی ہیں ان میں سے کسی کا بھی ساتھ آپ دینا نہیں چاہتے۔"

یہ دو خط منجملہ ان بہت سے شکایتی خطوط کے ہیں جو پچھلے دنوں مجھے وصول ہوئے ہیں۔ ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں میں ایک بہت بڑا گروہ اسی طرز پر سوچ رہا ہے اور ان خطوط میں دراصل اسی طرزِ خیال کی نمائندگی کی گئی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے اوپر آپ تنقید کرنا اور اپنی کمزوریوں کا جائزہ لینا کوئی خوش آیند چیز نہیں ہے۔ میں بھی اس کام کو خوش آیند سمجھ کر نہیں کرتا۔ بڑا تلخ گھونٹ، زہر کا گھونٹ ہے جسے حلق سے اُتارتا ہوں، اور اچھی طرح اُس تلخی کو محسوس کرتا ہوں جو میرے دوسرے بھائی اس کے اندر پاتے ہوں گے۔ اس احساس کے باوجود میرا ضمیر تقاضا کرتا ہے کہ اس تلخی سے بچنے کے بجائے اسے گوارا کرنا چاہیئے۔ تلخی تو واقعہ میں موجود ہے۔ تغافل کا فائدہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اپنے احساس کو حقیقی اور واقعی تلخی کے ادراک سے معطّل کر لیا جائے۔ دوسروں کی چیرہ دستیوں اور جارحانہ کارروائیوں پر شکوہ سنج ہونا اور اپنی کمزوریوں اور غلطیوں سے نہ صرف غفلت برتنا بلکہ ان کے لیے جواز و استحسان کے دلائل ڈھونڈنا بہت خوشگوار چیز ہے جس سے دل خوب بہلتا ہے، مگر اس کی حیثیت مارفیا کے انجکشن کی سی ہے۔ یہ ایک پینک ہے جس کے نشہ میں مریض سو جاتا ہے مگر وہ اندرونی خرابیاں دُور نہیں ہوتیں جن کے سبب سے بیرونی آفات کو اس پر تسلّط حاصل ہوتا ہے۔ میرے بھائی چاہتے ہیں کہ میں بھی انہیں اسی پینک کی خوراکیں دیا کروں۔ ان کی خواہش ہے کہ جس خیالی جنّت میں وہ جی رہے ہیں، جن سرابوں سے وہ چشمۂ آبِ حیواں پانے کی امیدیں باندھے بیٹھے ہیں، اور جن غلط فہمیوں کا دل فریب طلسم انہوں نے اپنے گرد بنا رکھا ہے، ان سب چیزوں کو جوں کا توں رہنے دوں۔ بلکہ اگر ہو سکے تو خود بھی ان لوگوں میں شامل ہو جاؤں جن کے لیے ان چیزوں کا سرا ہنا دین اور امت کی سب سے بڑی خدمت بنا ہوا ہے۔ اِس خدمت کے فوائد بھی مجھے معلوم ہیں، مگر میں مجبور ہوں کہ مجھے محبوب دشمن کے بجائے مبغوض دوست بننا زیادہ مرغوب ہے۔

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد

پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

مسلمانوں کا مفاد، مسلمانوں کی فلاح و بہبود، مسلمانوں کی تنظیم، مسلمانوں کی جمعیت و مرکزیت، مسلمانوں کی ترقی و خوشحالی، یہ وہ چیزیں ہیں جن کا ذکر بار بار زبانوں

پرانا ہے۔ میں بھی یہ ذکر کرتا ہوں، زید بھی کرتا ہے، بکر بھی کرتا ہے، اور ہر ایک شخص جو اس گروہ مسلمین میں شامل ہے، انہی الفاظ سے اپنے مدعا کے اظہار میں کام لیتا ہے۔ مگر اس کے باوجود ہمارے عمل کی راہوں میں اختلاف ہے۔ ایک کسی طرف جا رہا ہے، دوسرا کسی اور طرف، تیسرا کسی اور طرف۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ کیا یہ محض اتفاقی امر ہے؟ یا اس کی تہ میں کوئی بنیادی سبب ہے جسے سمجھنے کی کوشش نہیں کی جاتی؟

میرے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے درمیان الفاظ مشترک ہیں مگر معنی و مفہوم میں اختلاف ہے۔ ایک ہی لفظ ہے "مسلمان"، لیکن میں اس سے کچھ اور مراد لیتا ہوں، اور دوسرے اس کا مفہوم کچھ اور سمجھتے ہیں۔ اسی وجہ سے مفاد، فلاح و بہبود، تنظیم، جمعیت و مرکزیت، ترقی و خوشحالی اور ہر ایک چیز جو لفظ "مسلمان" کی نسبت سے بولی جاتی ہے، ہمارے درمیان مختلف المعنی ہو کر رہ گئی ہے۔ اسی الجھن کے سبب سے غلط فہمیاں واقع ہو جاتی ہیں، اور جب لوگ اسے سلجھانے سے عاجز رہ جاتے ہیں تو شکایات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ تم کو مسلمانوں کے مفاد اور فلاح و بہبود اور ترقی و خوش حالی وغیرہ سے ہمدردی نہیں، جمعیت بن رہی ہے، مرکزیت پیدا ہو رہی ہے، مگر تم اس کی مخالفت کرتے ہو، مسلمانوں کی بہتری کے لیے کام ہو رہا ہے اور تم اس میں روڑے اٹکاتے ہو۔ حالانکہ ایک شخص ان الفاظ کا اطلاق جن مخصوص و متعین چیزوں پر کرتا ہے دوسرے کے نزدیک ان پر یہ الفاظ منطبق ہی نہیں ہوتے، ورنہ ظاہر ہے کہ کون کافر ہوگا جس کو فی نفسہ فلاحِ مسلمین وغیرہ سے دشمنی ہو۔

آیئے، ذرا تحقیق کر کے دیکھیں کہ اس الجھن کی نوعیت کیا ہے۔

مُطلق اور مُقیّد کا فرق ایک ایسی واضح چیز ہے جسے ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ جب ہم کوئی ایسا لفظ بولتے ہیں جس میں اِطلاق اور عُموم ہو تو اس کے استعمال میں وسعت ہوتی ہے۔ اور جب اُسے مُقیّد کر دیا جاتا ہے تو اُس قید کا لحاظ کیے بغیر اُس لفظ کا استعمال صحیح نہیں ہوتا۔ مثلاً جب ہم "رنگ" بولتے ہیں تو اس کا استعمال ہر رنگ پر ہوگا۔ کوئی چیز خواہ سیاہی میں ترقی کرے، یا سفیدی میں، یا سُرخی میں، بہر حال ہم کہیں گے

کہ اس کا رنگ گہرا ہو رہا ہے۔ مگر جب رنگ کے ساتھ ہم سفید کی قید لگا دیں تو سیاہ، سُرخ، سبز اور دوسرے رنگ کی چیزوں پر ہم اس لفظ کا اطلاق نہ کر سکیں گے، اور سیاہی یا سرخی میں ترقی کرنے کو سفید رنگ کی ترقی کہنا صحیح نہ ہوگا۔ اسی طرح مثال کے طور پر لفظ "قافلہ" کو لیجیے۔ ہر قافلہ جو کسی طرف جا رہا ہو، اس لفظ سے موسوم ہو سکتا ہے۔ جس طرف بھی وہ بڑھے اس کی پیش قدمی کو قافلہ کی پیش قدمی کہا جا سکتا ہے۔ ہر شخص اُس کا میرِ قافلہ بن سکتا ہے۔ ہر گاڑی پر وہ سفر کر سکتا ہے۔ ہر قسم کا زادِ سفر اس کا زادِ سفر ہو سکتا ہے۔ غرض اصل کے مطلق ہونے کی وجہ سے ہر وہ چیز جو اس سے تعلق رکھتی ہو مطلق ہی ہوگی۔ لیکن جب مثلاً عزمِ پشاور کی قید سے مقید کر کے "قافلۂ پشاور" کہہ دیا جائے تو پھر وہ عموم باقی نہیں رہ سکتا جو محض "قافلہ" ہونے کی صورت میں تھا۔ "قافلۂ پشاور" کا اطلاق صرف اُسی قافلہ پر ہوگا جو عازمِ پشاور ہو۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ جا تو رہا ہو مدراس یا بمبئی کی طرف اور کہلائے قافلۂ پشاور۔ اسی طرح ہر وہ چیز جو اس سے تعلق رکھتی ہو، پشاور کی قید سے مقید ہو جائے گی۔ مثلاً قافلۂ پشاور کی پیش قدمی کا مفہوم یہ ہوگا کہ وہ پشاور کی سڑک پر چل رہا ہے۔ اگر وہ کسی دوسری سڑک پر بڑھ رہا ہو تو اسے قافلۂ پشاور کی پیش قدمی نہیں کہا جا سکتا، بلکہ اسے پیش قدمی کے بجائے رجعت کہا جائے گا۔ کیونکہ دوسرے راستہ پر وہ جتنے قدم بھی چلے گا، پشاور کی نسبت سے دُور ہوتا چلا جائے گا۔ اس کا میرِ قافلہ بھی صرف وہی ہو سکتا ہے جو پشاور کا راستہ جانتا ہو۔ دوسرے راستوں کے علم میں کوئی شخص خواہ کتنا ہی ماہر ہو، اگر وہ پشاور کی راہ سے ناواقف ہے تو بہر حال وہ قافلۂ پشاور کا سردار نہیں بن سکتا۔ اسی پر دوسرے امور کو بھی قیاس کر لیجیے۔

اب دیکھیے کہ الجھن کس طرح پیش آتی ہے۔ قافلہ ہی کی مثال کو لے لیجیے۔ ایک قافلہ کا نام تو ہے "قافلۂ پشاور"۔ مگر آپ یا تو پشاور کی قید کو بھول کر اسے محض قافلہ سمجھ لیتے ہیں۔ یا آپ کو پشاور کا راستہ معلوم نہیں ہے۔ یا آپ کا خیال یہ ہے کہ اس قافلہ کے لوگ جب ایک دفعہ "قافلۂ پشاور" کے نام سے موسوم ہو چکے ہیں تو اب یہ پشاور کے سوا جس رُخ پر جاہیں سفر کریں بہر حال انہیں کہنا چاہیے "قافلۂ پشاور" ہی۔

بخلاف اس کے میں قافلۂ پشاور کو اس کے اصلی معنی میں لیتا ہوں اور پشاور کی قید کو نظرانداز کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قافلے کے بارے میں جتنی گفتگو ہوتی ہے، میرے اور آپ کے درمیان بات بات پر تصادم واقع ہوتا ہے۔ جب تک بات مجمل رہتی ہے ہم متفق رہتے ہیں۔ قافلہ کے منتشر مسافروں کو جمع کیا جائے، انہیں دوسرے قافلوں میں گم نہ ہونے دیا جائے، رہزنوں سے ان کی حفاظت کی جائے، ان کے لیے زادِ راہ درکار ہے، انہیں ایک میرِ قافلہ کی ضرورت ہے، ان کو منظم طور پر تیز رفتاری سے منزل کی طرف پیش قدمی کرنی چاہیے، یہ سب باتیں مبہم اور مجمل الفاظ میں جب تک کہی جاتی ہیں، میں اور آپ دونوں ان سے اتفاق کرتے ہیں۔ مگر جب انہی چیزوں کے تعیّن کا وقت آتا ہے تو آپ کے اور میرے خیالات میں بُعد المشرقین پایا جاتا ہے۔ ایک شخص آتا ہے اور اس قافلہ کے لوگوں کو جمع کرکے بمبئی کی طرف چلانا شروع کردیتا ہے، دوسرا آتا ہے اور کلکتہ کی طرف چل پڑتا ہے، تیسرا آتا ہے اور کسی اور طرف کا رُخ کرتا ہے۔ آپ ہر میرِ قافلہ کے جھنڈے کو دیکھ کر زندہ باد کا نعرہ لگاتے ہیں اور پکارتے ہیں کہ چل پڑا "پشاوری قافلہ"۔ میں اسی پر اعتراض کرتا ہوں کہ یہ جمعیت اور یہ پیش قدمی قافلہ پشاور کی جمعیت اور پیش قدمی تو نہیں ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ منتشر مسافر جمع تو ہو رہے ہیں اور صورتِ قافلیّہ بن تو رہی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ سب کچھ بجا و درست، مگر محض جمع ہونے اور صورتِ قافلیّہ بن جانے کا نام تو قافلۂ پشاور بننا نہیں ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ دیکھو، کتنی اچھی، تیز رفتار، شاندار گاڑی ہے جس پر یہ قافلہ جا رہا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ آپ کی بیان کردہ صفات سے انکار نہیں، مگر یہ گاڑی جا کدھر رہی ہے؟ اگر اس کا رُخ پشاور کی طرف نہیں ہے تو قافلۂ پشاور کے لیے موزوں نہیں۔ اس صورت میں اس کی تیز رفتاری اور زیادہ خطرناک ہے، کیونکہ یہ روز بروز قافلہ کو اس کی منزلِ مقصود سے دُور تر لے جاتی رہے گی۔ آپ کہتے ہیں کہ صاحب، قافلہ بننے اور گاڑی چلنے تو دو، پھر پشاور کی سڑک بھی لے ہی لیں گے۔ میں عرض کرتا ہوں جب تک عزمِ پشاور ملتوی ہے اور دوسرے راستوں پر آپ گامزن ہیں، اس

وقت تک کے لیے نام تبدیل فرما لیجیے۔ مجھے آپ کی گاڑی چلنے پر اعتراض نہیں بلکہ اس پر ہے کہ آپ چلیں تو بمبئی یا مدراس یا کلکتہ کی طرف اور نام آپ کا قافلۂ پشاور ہی رہے۔ آپ کہتے ہیں کہ حضرت پشاور کی سڑک تو بڑی دشوار گزار ہے۔ اس وقت اُدھر جانا تو محال ہے، لہٰذا سردست تو قافلۂ پشاور کو دوسرے آسان راستوں ہی پر چلنے دو۔ میں گذارش کرتا ہوں کہ میں نے آپ کو دشوار گزار راستے کی طرف گھسیٹنے پر اصرار کب کیا تھا؟ میرا مقصد تو صرف یہ ہے کہ قافلۂ پشاور کا پشاور کے سوا دوسری سمت میں چلنا اور پھر قافلۂ پشاور ہی رہنا متناقض بات ہے۔ آپ اس تناقض کو دُور فرما دیں۔

اِس تمام بحث میں بنائے نزاع صرف یہ ہے کہ آپ مُقیّد کو مُطلق بناتے ہیں اور اس کے تمام متعلقات کو قید سے آزاد کیے دیتے ہیں۔ اور میں مُقیّد کو مُقیّد ہی سمجھ کر بات کرتا ہوں۔ اگر آپ اپنے ذہن کو صاف کرلیں اور یہ بات سمجھ لیں کہ مطلق قافلہ، اور قافلۂ پشاور میں کیا فرق ہے تو کوئی اُلجھن پیش نہیں آسکتی۔ لیکن آپ سیدھی سمجھ کی بات اختیار کرنے کے بجائے گفتگو کا رُخ کچھ دوسری ہی باتوں کی طرف پھیر دیتے ہیں۔ کبھی ارشاد ہوتا ہے کہ تم قافلہ کے اجتماع اور اس کی تنظیم اور اس کی پیش قدمی کے مخالف ہو۔ حالانکہ نفسِ اجتماع و تنظیم اور پیش قدمی سے کس کافر نے انکار کیا تھا؟ کبھی آپ سوال کرتے ہیں کہ اگر یہ قافلۂ پشاور نہیں تو اسے اور کس نام سے یاد کیا جاتے؟ حالانکہ اس کا نام تجویز کرنے کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے۔ میری بات تو صاف ہے۔ اگر یہ پشاور کی سڑک پر ہے تو قافلۂ پشاور ہے۔ اور اگر اس پر نہیں ہے تو اپنے لیے جو نام چاہے تجویز کرلے، بہر حال اس پر قافلۂ پشاور کا نام راست نہیں آتا۔ آپ چاہیں تو اس امر پر بحث کرلیجیے کہ جس سڑک پر یہ جارہا ہے، وہ پشاور کی سڑک ہے یا نہیں۔ مگر یہ اصول آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ جو اس سڑک پر نہ ہو وہ قافلۂ پشاور نہیں ہے۔ پھر آپ ہمدردی کا سوال چھیڑ دیتے ہیں۔ حالانکہ ہمدردی اور بے دردی کا یہاں کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تو واقعہ اور حقیقت کا سوال ہے۔ مدراس یا کلکتہ کی طرف جانے والوں کو آخر میں عازمِ پشاور کس طرح کہوں؟ جانتے بوجھتے ایک خلافِ واقعہ

بات باور کرنا آخر ہمدردی کی کون سی قسم ہے؟ میرے نزدیک تو ہمدردی کی صورت یہی ہے کہ صاف صاف لوگوں کو بتا دیا جائے کہ یہ پشاور کی سڑک ہے اور یہ دوسری سڑکیں فلاں فلاں سمت کو جاتی ہیں۔ جو لوگ فی الواقع پشاور جانا چاہتے ہیں مگر راستہ سے ناواقف ہونے کے باعث دوسرے راستوں پر بھٹک رہے ہیں یا بھٹکائے جا رہے ہیں وہ صحیح راستہ معلوم کر لیں گے۔ اور جو حقیقت میں جانا ہی دوسری طرف چاہتے ہیں میں نہ تو ان کا راستہ روکنا چاہتا ہوں، نہ ان سے مجھے کوئی دشمنی ہے کہ انسانیت کے خلاف ان کے ساتھ کوئی بے دردی کر دوں۔ میرا مقصد تو صرف یہ ہے کہ جدھر جانا چاہتے ہیں سمجھ بوجھ کر پورے شعور کے ساتھ جائیں، اور جب جائیں تو غلط نام کے ساتھ سفر نہ کریں۔

مسلمانوں کے معاملہ میں جو اُلجھن پیش آ رہی ہے اس کی نوعیت بعینہٖ وہی ہے جو اُوپر کی مثال میں بیان کی گئی ہے۔ مسلمان کا لفظ اسلام سے ماخوذ ہے اور اِسلام ایک طریقِ فکر، ایک مقصدِ زندگی، ایک سیرت و کردار اور ایک طرزِ عمل کا نام ہے۔ اس لحاظ سے مسلمان کے معنی محض آدمی کے نہیں ہیں بلکہ اُس آدمی کے ہیں جو زندگی کے تمام معاملات میں وہ خاص طریقِ فکر، وہ خاص مقصدِ حیات، وہ خاص اخلاق و اطوار اور وہ خاص طرزِ عمل رکھتا ہو جس کا نام اسلام ہے۔ لفظ "مسلمان" کے اِن تقیدات کو اگر صاف صاف سمجھ لیا جائے تو مسلمانوں کی فلاح و بہبود، اُن کا مفاد، اُن کی تنظیم، اُن کی قیادت و امارت، غرض اُن سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کا مفہوم متعین ہو جائے گا۔ لیکن اگر اِن تقیدات سے قطع نظر کر کے "مسلمان" کے لفظ کو مطلقاً ایک گروہِ اشخاص کے معنی میں لے لیا جائے تو پھر ہر شخص کو آزادی ہو گی کہ جس چیز کو چاہے مسلمانوں کا مفاد کہہ دے، جس چیز کو چاہے اُن کی فلاح و بہبود قرار دے لے، جس نوع کی تنظیم کو چاہے اُن کی تنظیم سمجھ لے، اور جو شخص بھی انسانی گلّے کو ہانکنے کی قابلیت رکھنے والا دکھائی دے اُسے مسلمانوں کا قائدِ ملت اور امیرِ مطاع ماننے پر آمادہ ہو جائے۔

بدقسمتی سے یہاں کچھ ایسی ہی صورتِ حال درپیش ہے۔ "اسلام" کی قید سے قطع نظر کرکے فی الواقع "مسلمانوں" کو محض ایک گروہِ اشخاص سمجھ لیا گیا ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ عجیب عجیب چیزوں پر مسلمانوں کے مفاد، اُن کی فلاح و بہبود، اُن کی تنظیم و جمعیت، اُن کی قیادت و امارت وغیرہ کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ مثلاً کہنے والے کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا مفاد اس میں ہے کہ یہ بینک اور انشورنس اور اسی قبیل کی دوسری چیزوں سے استفادہ کریں۔ حالانکہ مسلمان کا لفظ اگر کوئی معنی رکھتا ہے تو اس کی رُو سے مسلمان مامور ہیں اِس پر کہ اُس پورے نظامِ مالیات کو توڑ ڈالیں جو اِس وقت دنیا میں قائم ہے اور اپنے اصول پر ایک نیا نظام بنائیں۔ پھر یہ اُلجھے ہوئے دماغ کی بات نہیں تو اور کیا ہے کہ مسلمان کی حیثیت سے جس نظام کے ساتھ آپ کی اصولی عداوت ہے اسی میں آپ اپنا مفاد سمجھیں اور پھر اس کا نام "مسلمانوں کا مفاد" رکھیں؟ اسی طرح سرکاری ملازمتوں اور شریعت ساز مجالس کی نشستوں اور ایسی ہی دوسری چیزوں کو "مسلمانوں کے مفاد" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حالانکہ مسلمان کے لفظ کو اگر اسلام کی قید سے مقیّد کرکے لیا جائے تو یہ سب چیزیں مسلمان کے مفاد کی ضد ہیں۔ مسلمان کے مفاد کی حیثیت سے تو آپ کا کام اُس نظامِ حکمرانی کو بدل ڈالنا ہے جسے چلانے کو آپ اپنا مفاد کہہ رہے ہیں۔ اِسی طرح وہ نظامِ تعلیم جو انگریزوں نے یہاں قائم کیا ہے اُس کے تحت اپنی نسلوں کا ذہن تیار کرنا آپ کے نزدیک مسلمان کی فلاح و بہبود اور ترقی کا ذریعہ ہے، اور اُس نظام کے تحت آپ خود اپنے خرچ سے درسگاہیں بنا کر ان کے نام اسلامیہ اسکول اور اسلامیہ کالج اور مسلم یونیورسٹی رکھتے ہیں۔ حالانکہ یہ پورا نظامِ تعلیم انسانیت کی تشکیل ایسے نقشے پر کرتا ہے جو اسلامی نقشے کے عین برعکس ہے۔

ایسا ہی غلط تصوّر آپ کے ذہن میں مسلمانوں کی جمعیت، مسلمانوں کی تنظیم اور مسلمانوں کی قیادت کا بھی ہے۔ اگر آپ کو معلوم ہو کہ اسلام کس تحریک کا نام ہے، اس کا مقصد کیا ہے، اس کے اصول کیا ہیں، اور وہ کیا طرزِ عمل چاہتا ہے، تو آپ

بڑی آسانی کے ساتھ یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اُن سیاسی جمعیتوں اور تنظیموں اور اُن قائدوں اور امیروں کی صحیح حیثیت کیا ہے جو اسلام کے نام سے اِس وقت کام کر رہے ہیں۔ اسلام کی رُو سے مسلمانوں کی جمعیت صرف وہ ہو سکتی ہے جو غیر الٰہی حکومت کو مٹا کر الٰہی حکومت قائم کرنے اور قانونِ خداوندی کو حکمراں کرنے کے لیے جدّوجہد کرتی ہے۔ جو جماعت ایسا نہیں کرتی بلکہ غیر الٰہی نظام کے اندر "مسلمان" نامی ایک قوم کے دُنیوی مفاد کے لیے جدّوجہد کرتی ہے وہ نہ تو اسلامی جماعت ہے، اور نہ اسے مسلمانوں کی جماعت ہی کہنا درست ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کی تنظیم صرف وہی ہو سکتی ہے جو خالص اسلامی اصولِ اجتماع پر قائم ہو اور جس کا مقصد اسلامی ہو۔ ورنہ جو تنظیم فاشستی اصولوں پر کیجائے اور جس کا مقصد محض اپنی قوم کا غلبہ و تسلّط ہو اُسے محض اِس بنا پر مسلمانوں کی تنظیم نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مردم شماری کے مسلمانوں کو منظم کرتی ہے اور ان کے "استخلاف فی الارض" کے لیے کوشاں ہے۔ علیٰ ہذا القیاس مسلمانوں کے رہنما بھی صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو سب سے پہلے اِسلامی تحریک کے مقصد، اصول اور طریقِ کار کو جانتے ہوں اور اہلِ تقویٰ و دیانت ہوں۔ باقی رہے وہ لوگ جو سرے سے اسلام کا علم ہی نہ رکھتے ہوں، یا ناقص علم کی بنا پر اسلام اور جاہلیت کو خلط ملط کرتے ہوں اور پھر تقوےٰ و دیانت کی کم سے کم ضروری شرائط سے بھی عاری ہوں، تو ایسے لوگوں کو محض اس لیے مسلمانوں کی قیادت کا اہل قرار دینا کہ وہ مغربی سیاست کے ماہر یا مغربی طرزِ تنظیم کے استادِ فن ہیں، اور اپنی قوم کے عشق میں ڈوبے ہوتے ہیں، سراسر اسلام سے جہالت اور غیر اسلامی ذہنیت ہے۔

یہ باتیں جب مسلمانوں سے صاف صاف کہی جاتی ہیں تو وہ اس پر چیں بہ جبیں ہوتے ہیں اور شکایات کے طومار باندھ دیتے ہیں۔ مگر فی الحقیقت اس معاملہ میں جذبات کی برانگیختگی کا کوئی موقع نہیں ہے۔ لوگوں کو ٹھنڈے دل سے سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کرنا چاہیئے کہ وہ اسلام

کے لیے اسلام کے اصول پر کام کرنا چاہتے ہیں یا اپنے لیے اپنے اصول پر۔ اگر پہلی بات ہے تو انہیں سیدھی طرح ہر اس چیز کو ترک کرنا چاہیئے جو غیر اسلامی ہے۔ اور اگر دوسری بات ہے تو جو کچھ وہ کرنا چاہتے ہیں شوق سے کریں، ہم اُن کا راستہ روکنے نہیں آتے، ہمارا مطالبہ ان سے صرف یہ ہے کہ وہ اسلام اور مسلمان کے نام کو غلط طریقے پر استعمال کرنا چھوڑ دیں۔

(ترجمان القرآن۔ دسمبر ۱۹۳۹ء)

راہ رَوِ پشت بمنزل

دنیا میں ہمیشہ دو قسم کے آدمی کام کرتے ہیں۔ ایک وہ جو حالات کو، جیسے کہ وہ فی الواقع ہیں، جوں کا توں قبول کر لیتے ہیں، اور اُن کے مطابق کام کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جو حالات کو اِس نظر سے دیکھتے ہیں کہ اُنہیں کیا ہونا چاہیئے، اور اِس نقطۂ نگاہ سے وہ حاضر الوقت نظام پر تنقید کرتے ہیں۔ پہلا گروہ حال کی گاڑی کو چلاتا ہے، اور دُوسرا مستقبل کی اصلاح و ترقی کے لیے راستہ صاف کرتا ہے۔ ان دونوں گروہوں میں تعاون ضروری ہے، مگر ان کے تعاون کی فطری صورت یہی ہے کہ ان میں تصادم ہو۔

"کیا ہے" پر نظر رکھنے والے ہمیشہ حال پر فریفتہ ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے خوب ہو رہا ہے۔ اس میں کسی تنقید کی گنجائش نہیں۔ اور بالفرض اگر ہو بھی تو یہ وقت تنقید کا نہیں ہے، کیونکہ اِس وقت تنقید کی جائے گی تو یہ یہ خرابیاں پیدا ہونگی، اور فلاں فلاں مصلحتوں کو ٹھیس لگے گی۔ یہ سب باتیں وہ اس لیے کرتے ہیں کہ اُن کی نگاہ وقتی مصالح اور فوری فوائد میں اُلجھی رہتی ہے۔ عاجلہ کی محبت انہیں اتنی فرصت ہی نہیں دیتی کہ آجلہ کی فکر کریں۔ اُن کے نقطۂ نظر کو دیکھا جائے تو کوئی وقت بھی تنقید کے لیے موزوں نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جس وقت جو کچھ بھی ہو رہا ہوگا خوب ہی ہو رہا ہوگا، ہر وقت کچھ نہ کچھ وقتی مصلحتیں ٹھیس کھانے کے لیے موجود ہوں گی۔ ہر وقت اُن مصلحتوں کی

نزاکت کو دیکھتے ہوئے وہ یہی کہیں گے کہ ابھی تنقید کا وقت نہیں ہے، اور سچ یہ ہے کہ وہ خود کبھی نہ بتا سکیں گے کہ کون سا وقت تنقید کے لیے موزوں ہے۔

لیکن جن کی نظر "کیا ہونا چاہیئے" پر ہوتی ہے وہ چونکہ حالات کو ایک دوسری نگاہ سے دیکھتے ہیں اس لیے وہ اُسی وقت کو تنقید کے لیے موزوں سمجھتے ہیں جو "اہلِ حال" کے نزدیک سخت غیر موزوں ہوتا ہے۔ اُنہیں اپنا کام پرستارانِ عاجلہ کی چیخوں اور فریادوں، بلکہ گالیوں کے درمیان کرنا پڑتا ہے، کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کریں تو اصلاح و ترقی ناممکن ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ "جو کچھ ہو رہا ہے خوب ہو رہا ہے" کی ذہنیت عام لوگوں پر مستولی ہو جانے کے بعد کسی اصلاح کی ضرورت محسوس نہیں ہو سکتی۔ خامیوں کا احساس یا تو پیدا ہی نہ ہو گا کہ انہیں دُور کرنے کی طرف توجہ ہو، یا اگر تھوڑا سا احساس اُبھرا بھی تو حال کے شیدائی اُسے دبانے کے لیے بیسیوں قسم کی تاویلیں کریں گے، تاکہ اُن خامیوں کو ناگزیر ثابت کریں اور بس چلے تو خوبیوں میں تبدیل کر دکھائیں۔

"کیا ہونا چاہیئے" کے نقطۂ نظر سے جو تنقید کی جاتی ہے اس کا نتیجہ کبھی یہ نہیں ہوتا کہ حال میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ یکلخت بند ہو جائے، اور اُس وقت تک جمود و تعطّل کی حالت طاری رہے جب تک کہ وہ مثالی (Ideal) حالت رونما نہ ہو جائے جسے مقصود قرار دے کر ناقد تنقید کرتا ہے۔ ایسا نہ کبھی ہوتا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ فطری طور پر تنقید کا اثر ہمیشہ بتدریج ہوا کرتا ہے۔ اوّل اوّل تو اُسے سخت تلخی اور ناگواری کے ساتھ دیکھا جاتا ہے، کیونکہ عام طبیعتیں نقد سے مانوس اور نشیہ سے نفور ہوتی ہیں۔ پھر ایک دَورِ شبہات کا گزرتا ہے جس میں صداقت اور نیک نیتی کے سوا ہر ممکن چیز ناقد کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ اس کے بعد اگر فی الواقع تنقید میں کوئی جان ہوتی ہے اور درحقیقت حاضر الوقت نظام میں وہ خامیاں پائی جاتی ہیں جن کی نشان دہی تنقید میں کی گئی ہے، اور سننے والوں کا ضمیر بھی راست بازی کے ساتھ اُسی معیار کو حق تسلیم کرتا ہے جسے مدِ نظر رکھ کر ناقد نے تنقید کی ہے، تب کہیں آہستہ آہستہ لوگ اصلاح کی ضرورت محسوس کرنی شروع کرتے ہیں، اور جوں جوں اصلاح کے حق میں رائے عام

تیار ہوتی جاتی ہے، وقت کی قیادت پر دباؤ بڑھتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ یا تو پچھلے قائدوں کو اپنی پالیسی بدلنی پڑتی ہے، یا پھر تغیر پذیر حالات کے اقتضاء سے ایک نئی قیادت (Leadership) خود بخود نشو و نما پا کر سامنے آجاتی ہے۔ اس عمل کے دوران میں کبھی تاریخ کی رفتار میں خلا یا شگاف پیدا نہیں ہوتا کہ تعطل کی وہ حالت پیش آئے جس کی بھیانک تصویر کھینچ کھینچ کر "اہلِ حال" حضرات اصلاح و ترقی کی ہر کوشش کو سمِ قاتل ثابت کیا کرتے ہیں۔

کسی حالت کو مثال یا آئیڈیل قرار دے کر اس کے لحاظ سے حال پر تنقید کرنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہم موجودہ حالت سے دفعتہً چھلانگ لگا کر اُس مثالی حالت میں پہنچ جانا چاہتے ہیں۔ کوئی صاحب عقل آدمی ظاہر ہے کہ ایسے اچانک تغیر کا تصور بھی نہیں کر سکتا، کیونکہ تغیر بہرحال تدریجاً ہی ہوگا۔ مگر کسی صاحبِ عقل آدمی سے شاید یہ توقع بھی نہیں کی جا سکتی کہ وہ جس حالت کو مثالی حالت قرار دیتا ہو اس کے بالکل برعکس حالت کی طرف جانے پر کسی درجہ میں بھی راضی ہو جائے۔ وہ اگر ذوی العقول میں سے ہے تو اس میں کم از کم اس بات کی طلب بلکہ تڑپ ہونی چاہیے کہ حالات کی رفتار اُسی منزل کی سمت میں ہو جسے وہ مقصود قرار دے رہا ہے، خواہ وہ ابتداءً چند قدم ہی کیوں نہ ہو۔ مثلاً اگر میرا خیال یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے خلافتِ راشدہ کے طرز کی قیادت، سیاست اور زندگی مثال کی حیثیت رکھتی ہے۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب جو مسلمانوں کا لیڈر ہو، وہ فاروقِ اعظمؓ سے کم نہ ہو اور اس کے ساتھی سب کے سب علی مرتضیٰؓ اور ابو عبیدہؓ بن الجراح اور عبدالرحمانؓ ابن عوف کے مثیل ہوں۔ مگر اس کا مطلب یہ بھی نہ ہونا چاہیے کہ میری آخری منزلِ مقصود تو ہو وہ مقام جس پر صحابہؓ کرام تھے اور اس منزل کی طرف جانے کے لیے میرے رہبر و رہنما ہوں وہ لوگ جو نہ اس راہ سے واقف ہیں، نہ اس کی طرف جانے کا ارادہ رکھتے ہیں، بلکہ اس کے عین مخالف سمت میں جا رہے ہیں۔

فرض کیجیے کہ میں سطح زمین سے دس ہزار فیٹ کی بلندی پر جانا چاہتا ہوں تو بہرحال میں وہی ذریعہ تلاش کروں گا جو مجھے اوپر کی طرف لے جا سکتا ہو، خواہ ابتداءً وہ مجھے دس فیٹ سے زیادہ نہ اٹھائے۔ ایسا ذریعہ مجھے نہ ملے گا تو میں سطحِ زمین ہی پر قیام کرنا پسند

کروں گا ——— لیکن اگر آپ دیکھیں کہ میں اوپر جانے کے ارادہ سے ایک برقی جھولے میں بیٹھ کر کسی کوئلے کی کان میں اترنا شروع کر دیتا ہوں اور اِس راستے سے اُس بلندی پر جانا چاہتا ہوں تو کیا آپ کو میرے فاترالعقل ہونے میں ذرا سا شبہ بھی ہوگا؟ بالکل اسی طرح آپ کو میرے فتورِ عقل میں اس وقت بھی شبہ نہ ہونا چاہیئے جب آپ دیکھیں کہ میں اسلامی تہذیب کو زندہ کرنے اور فاروقی حکومت کے نصب العین تک پہنچنے کے لیے اُن لوگوں کے پیچھے چلا جا رہا ہوں جن کی عملی زندگی میں، اور جن کے خیالات، نظریات، طرزِ سیاست اور رنگِ قیادت میں خورد بین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جا سکتی، جن کا حال یہ ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے مسائل سے لے کر بڑے سے بڑے مسائل تک کسی معاملہ میں بھی انہیں قرآن کا نقطۂ نظر نہ تو معلوم ہی ہے نہ وہ اسے تلاش کرنے کی ضرورت ہی محسوس کرتے ہیں[1]، جن کو نورِ ہدایت صرف مغربی قوانین و دساتیر ہی میں ملتا ہے، اسی کی طرف وہ رجوع کرتے ہیں، اور اس کے بعد اگر کوئی چیز اُن کی نگاہ میں قابلِ لحاظ ہوتی ہے تو محض وقتی سیاست کی مصلحتیں جنہیں وہ خالص مادہ پرستانہ نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔

منزلِ مقصود وہ اور راستہ یہ! کون عقل مند یہ مان لے گا کہ اُس چیز کو مقصود قرار دینے والا انسان اِس راستہ پر قدم رکھنے کا خیال بھی کر سکتا ہے؟

پشت بمنزل چلنے والا تو خیر نادان بن کر چھوٹ سکتا ہے، مگر اُس شخص کا معاملہ بڑا ہی عجیب ہے جو اپنے ہی آئیڈیل سے ——— جس کو وہ خود آئیڈیل کہتا

---

[1] اس عجائب کی دنیا میں جو عجیب باتیں سُننے میں آتی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ "ہمارے لیڈر اگرچہ قرآن سے ناواقف ہیں مگر پھر بھی جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہ عین قرآن کے مطابق ہے" دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوت ایک فضول چیز ہے، علمِ قرآن کے بغیر بھی انسان اس صراطِ مستقیم پر چل سکتا ہے جو قرآن میں بتائی گئی ہے۔ حمیتِ جاہلیہ کی اس سے بدتر مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔ (قدیم)

ہو ـــــــ گھبراتے، اُس کا نام سُن کر چیں بر جبیں ہو جاتے، اُس کو پامال ہوتے دیکھ کر آفرین و مرحبا کے نعرے بلند کرے، اس کی حمایت کرنے والے کا منہ نوچنے کے لیے دوڑے اور ساتھ ہی یہ بھی کہتا جائے کہ آئیڈیل تو میرا وہی ہے۔ یہ آئیڈیل کی ایک بالکل ہی نرالی قسم دریافت ہوئی ہے جس سے ہم اب تک آشنا نہ تھے۔ ہمیں تو یہی معلوم تھا کہ آئیڈیل انسان کی محبوب ترین چیز ہوتی ہے۔ اس کا نام سُن کر دلوں میں حرارت پیدا ہونے لگتی ہے۔ اگر آدمی اس تک پہنچنے سے عاجز ہوتا ہے تو رنجیدہ اور غمگین ہوتا ہے۔ اگر کسی مجبوری سے اس کے خلاف چلتا ہے تو شرمندہ ہوتا ہے۔ اور اگر کہیں اس غلط روی پر اسے ٹوک دیا جاتا ہے تو اس کی نگاہ شرم کے مارے اُٹھ نہیں سکتی۔ مگر اب ہمارا تعارف اِس نئی قسم کے آئیڈیل سے ہوا ہے، جو ہے تو آئیڈیل ہی، لیکن اس کا نام لیجیے تو چہرے بگڑنے لگتے ہیں، اس کی طرف چلنے کے لیے کہیے تو شدتِ غضب سے تیوریاں چڑھ جاتی ہیں، اُس کے خلاف چلنے پر ٹوکیے تو شرمندگی کے بجائے کمال دیدہ دلیری و جسارت کے ساتھ تاویلیں کی جاتی ہیں، اس کی حمایت کرنے والے سے بڑھ کر نگاہ میں مبغوض کوئی نہیں ہوتا، اور اسے پامال کرنے والوں سے بڑھ کر محبوب کوئی نہیں ہوتا ـــــــ کیسا عجیب ہے یہ آئیڈیل اور کتنے عجیب ہیں اس کے پرستار!

طرفہ تماشا یہ ہے کہ کانگریس اور اس کے نیشنلزم کی مخالفت میں تو اسلام اور اسلامی تہذیب کا نام لیا جاتا ہے، اور انہی نعروں کو نعرۂ جنگ بنا کر مسلمانوں کو اجتماع کی دعوت دی جاتی ہے۔ مگر جہاں یہ اسلام اور اس کی تہذیب کا تحفظ کرنے والے جمع ہوتے ہیں وہاں اسی اسلام کے قوانین خلافیہ توڑے جاتے ہیں، اُسی تہذیب کو ذبح کیا جاتا ہے، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی ساری جنگ صرف اس لیے ہے کہ دوسروں کے ہاتھوں اِس تہذیب کا جھٹکا نہ ہونے پائے بلکہ یہ خود اپنے ہاتھوں سے اس کو حلال کریں۔

وہاں "مسلمان" عورت اُسی تبرّجِ جاہلیت کے ساتھ شمعِ انجمن بنی نظر آتی ہے

جس طرح کوئی شریمتی جی یا کوئی میم صاحبہ ہو سکتی ہیں۔ وہاں عین نماز کے وقت جلسے ہوتے رہتے ہیں اور اگر بادلِ نخواستہ ملتوی کیے بھی جاتے ہیں تو پیشواؤں سے لے کر پیرووں تک شاذ و نادر ہی کوئی نماز کے لیے اٹھتا ہے۔ وہاں لباسوں میں نشست و برخاست میں، دعوتوں اور پارٹیوں میں اسلامی تہذیب کا کہیں نام و نشان تک نظر نہیں آتا اور ایک معمولی مسلمان ان حامیانِ اسلام اور محافظینِ تہذیبِ اسلامی کی صحبت میں پہنچ کر اپنے آپ کو اتنا ہی اجنبی محسوس کرتا ہے جتنا ہندوؤں اور پارسیوں کی کسی محفل میں کر سکتا ہے۔ وہاں کے مباحث آپ گھنٹوں سنتے رہیں مگر بھولے سے بھی کہیں قرآن و حدیث کا ذکر نہیں آئے گا، کسی مسئلے کا حل دریافت کرنے کے لیے اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع نہ کیا جائے گا، بلکہ قرآن و سنت کا نقطۂ نظر صریح طور پر ان کے سامنے رکھ دیا جائے تب بھی بلاتکلف اس کے خلاف طرزِ عمل اختیار کیا جائے گا۔ ان کی کمیٹیوں اور ان کے جلسوں میں آپ مسلمان کا ذکر کبھی اس حیثیت سے نہ سنیں گے کہ اس کا کوئی جماعتی نصب العین بھی ہے، وہ دنیا میں کوئی اخلاقی منصب بھی رکھتا ہے، اور کوئی الٰہی مشن بھی اس کے سپرد کیا گیا ہے۔ ان باتوں کے بجائے وہاں ساری گفتگو صرف اس حیثیت سے ہوگی کہ مسلمان کے نام سے جو ایک مجموعۂ افراد پایا جاتا ہے اس کو دنیوی نقصانات سے کس طرح بچایا جائے اور دنیوی فوائد سے کس طرح متمتع کیا جائے۔ پھر وہ لوگ جو اس طائفہ کے سرخیل ہیں ان کا حال کیا ہے؟ ان میں سے اکثر کے گھروں میں آپ جائیے تو آپ کو نماز کے وقت کوئی یہ بتانے والا نہ ملے گا کہ سمتِ قبلہ کدھر ہے، اور اسبابِ عیش و عشرت سے بھری ہوئی کوٹھیوں میں سے ایک جانماز بھی فراہم نہ ہو سکے گی۔ سارے لیڈروں کو بٹھا کر اسلام کے بنیادی اور ابتدائی مسائل کے متعلق امتحان لیجیے تو شاید کوئی صاحب دو فیصدی سے زیادہ نمبر نہ لے سکیں گے، اِلّا ماشاء اللہ۔

کیا وہ کلچر جسے کانگریس اور اس کی تحریکِ وطنیت سے بچانے کا دعویٰ کیا جاتا ہے یہی ہے؟ اور یہی اس کے تحفظ اور احیاء کے ڈھنگ ہیں؟ اور انہی طریقوں سے،

ایسے ہی رہنماؤں کی قیادت میں اُس حکومتِ الٰہیہ تک پہنچ جائے گا جسے منتہائے نظر اور نصب العین قرار دیا جاتا ہے؟ ——— یہ سوال اِتنا خطرناک ہے کہ اسے زبان پر لانا اپنی شامت کو خود دعوت دینا ہے۔ آپ کی زبان سے اسلام اور اس کی تہذیب کا ذکر سنتے ہی ہر طرف سے شور برپا ہو گا کہ یہ کیا صدائے بے ہنگام بلند کرنی شروع کر دی؟ آخر اس ذکر کا یہ کون سا موقع تھا؟ دیکھتے نہیں کہ ابھی ہم تہذیب کی حفاظت کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔ بھلا جمع ہونے کے دوران میں بھی کہیں اُس کا تحفظ کیا جاتا ہوگا؟

یہی دورنگی اور گندم نمائی وجَو فروشی ہے جسے دیکھ کر غیروں کو یہ کہنے کا موقع ملتا ہے کہ اصل سوال محض معاشی و سیاسی ہے اور تہذیب و مذہب کو محض عام مسلمانوں کے جذبات برانگیختہ کرنے کے لیے بہانہ بنا لیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اِن حرکات کو دیکھ کر کون سمجھے گا کہ اپنے دین اور کلچر کی حمیت میں واقعی آپ مخلص ہیں؟ زبان سے کہیے کہ دل میں درد ہے، مگر ہاتھ سے بار بار پیٹ ہی کو بھینچے جاتیے تو دیکھنے والا یہی خیال کرے گا کہ درد آپ کے پیٹ میں ہے نہ کہ دل میں۔ ایسی ہی باتوں سے ایک قوم کی ہوا اُکھڑتی ہے اور دوسری قوموں کے دل سے اس کا رُعب اُٹھ جاتا ہے۔

تفرقہ و انتشار اور بے نظمی کے تلخ نتائج دیکھ کر مسلمانوں میں اجتماع و تنظیم اور مرکزیت کی ضرورت کا احساس تو پیدا ہوا، مگر افسوس کہ عقل و خرد کی کمی نے اس مفید احساس کو بھی غلط راستہ پر لگا دیا۔ عام طور پر لوگ اب اِس غلط فہمی میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں کہ اجتماع اور تنظیم اور مرکزیت بجائے خود رحمت ہیں، لہٰذا جو مرکز سامنے آئے اس کے گرد جمع ہو جاؤ اور سب مِل کر چلو، انشاء اللہ کہیں نہ کہیں پہنچ ہی جاؤ گے۔ گویا جس طرح کبھی یہ خبط پیدا ہوا تھا کہ "آرٹ محض آرٹ کی خاطر" اور "ادب محض ادب کے لیے" اُسی طرح اب یہ ایک نیا خبط پیدا ہو رہا ہے کہ "اجتماع بس اجتماع کی خاطر" اور "تنظیم محض بغرضِ تنظیم" اور "مرکزیت صرف مرکزیت کے لیے"۔ حالانکہ ان چیزوں کے مفید ہونے کا تمام تر انحصار اجتماع کی روح اور تنظیم کے اصولوں اور مرکز کی

نوعیت پر ہے۔ کسی غلط مرکز کے گرد بے مقصد جمع ہو جانا، یا غلط مقصد کے لیے جمع ہونا بجائے مفید ہونے کے اُلٹا مضر ہو جاتا ہے۔

مسلمانوں کو خوب اچھی طرح سوچ سمجھ کر سب سے پہلے یہ فیصلہ کرنا چاہیئے کہ آخر ان کا مطمحِ نظر کیا ہے اور وہ کس غرض کے لیے اجتماع اور تنظیم چاہتے ہیں۔

اگر آپ اصلی معنوں میں ایک ایسی مسلم جماعت کی تنظیم چاہتے ہیں جو اسلام اور اس کی تہذیب کا تحفظ کر سکتی ہو اور بالآخر اسلامی حکومت کی منزل تک پہنچ سکتی ہو، تو آپ کو جان لینا چاہیئے کہ جو صورتِ تنظیم اِس وقت بن رہی ہے وہ بالکل غلط ہے۔ اِس تنظیم میں جو لوگ سب سے آگے کی صف میں نظر آتے ہیں اسلامی جماعت میں ان کا صحیح مقام سب سے پیچھے کی صف ہے، بلکہ بعض تو وہاں بھی برعایت ہی جگہ پا سکتے ہیں۔ اِس قسم کے لوگوں کو پیشوا بنانا بالکل ایسا ہی ہے جیسے ریل کے سب سے پچھلے ڈبہ کو انجن کی جگہ لگا دینا۔ جس چڑھائی پر آپ جانا چاہتے ہیں، یہ نام نہاد انجن آپ کی گاڑی کو اس کی طرف ایک انچ بھی لے کر نہیں جا سکتا، البتہ گاڑی اپنے وزن سے آپ نشیب کی طرف لڑھکے گی اور آپ لوگ بڑی مدت تک اس غلط فہمی میں مبتلا رہیں گے کہ ماشاء اللہ ہمارا "انجن" اسے خوب اُڑاتے لیے جا رہا ہے۔ اس حقیقت کو جتنے جلدی سمجھ لیا جائے اتنا ہی بہتر ہے، کیونکہ ہر لمحہ جو گزر رہا ہے وہ آپ کو اوپر کے بجائے نیچے کی طرف لے جا رہا ہے۔ جو لوگ آپ کی تہذیب کو جانتے ہی نہیں وہ اس کا تحفظ کیا کریں گے؟ جو اس سے علانیہ برسرِ بغاوت ہیں کس طرح امید کی جا سکتی ہے کہ ان کے ہاتھوں سے اس کا احیاء اور ارتقاء ہو سکے گا؟ وہ اپنی زبان سے کلچر کلچر ضرور پکارتے ہیں، لیکن اگر حقیقت میں کلچر کا درد ان کے دل میں اُٹھا ہوتا تو یقیناً ان کی زندگیاں بدل گئی ہوتیں، ان کی ذہنیتیں بدل گئی ہوتیں، اور ان کا طرزِ فکر بدل گیا ہوتا۔ یہ علامت اُن کی زندگیوں میں ناپید ہے، اور یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ اس گروہ میں حقیقی اسلامی جذبہ ہرگز مشتعل نہیں ہوا ہے۔

اور اگر اسلامی نصب العین آپ کے سامنے نہیں ہے بلکہ محض سادہ معنی میں ایک

قوم کی حیثیت سے آپ اپنی انفرادیت کا تحفظ چاہتے ہیں، اور اپنے اندر نیشنلزم کی روح پیدا کر کے دوسری قوموں کے ساتھ کامیاب مسابقت کرنا آپ کا آخری مطمحِ نظر ہے تو بلاشبہ آپ کو اپنے پیشواؤں میں اسلام کا رنگ دیکھنے کی ضرورت نہیں اور مجھے آپ سے کسی بحث کی ضرورت بھی نہیں۔ آپ کا راستہ جدا ہے اور میرا راستہ جُدا۔ البتہ وہی بات پھر کہوں گا جو اس سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اپنی اس قوم پرستانہ تحریک کے لیے آپ کو اسلام کا نام استعمال کرنے کا حق نہیں ہے کیونکہ اسلام ہر قسم کی قوم پرستی کا دشمن ہے خواہ وہ ہندوستانی قوم پرستی ہو یا نام نہاد "مسلم قوم پرستی"۔

بعض حضرات اس قسم کے غیر اسلامی اجتماع اور مرکزیت کے حق میں قرآن وحدیث سے اس طرح استدلال کرتے ہیں کہ گویا یہی وہ "جماعت" ہے جس کے التزام کا حکم دیا گیا ہے اور جس سے الگ ہونے یا الگ رہنے پر جہنم کی وعید سنائی گئی ہے۔ لیکن میں حیران ہوں کہ اسے نا واقفیت کا کرشمہ سمجھا جائے یا خدا اور رسول کے مقابلہ میں جسارت۔ قرآن تو اس مسجد تک میں کھڑے ہونے کی اجازت نہیں دیتا جس کی بنیاد تقویٰ پر نہ ہو۔ اور یہاں تقویٰ کا نام لینے والے خبطی سمجھے جاتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ "اللہ کی رسّی" کو مضبوط تھامو۔ اور یہاں کہا جا رہا ہے کہ بس لوگوں کا متفق ہو کر کسی رسّی کو تھام لینا ہی ذریعۂ نجات ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ اللہ کی رسّی ہو یا نہ ہو۔ قرآن صاف کہتا ہے کہ:-

إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ۔

(المائدہ ۸۔ آیت ۵۵)

"مسلمانو، تمہارے حقیقی دوست اور ساتھی صرف اللہ اور رسول اللہ اور وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے ہیں، جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں، اور خدا کے آگے جھکنے والے ہیں"

بلکہ یہاں تک کہتا ہے کہ:-

فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ فَإِخْوَانُكُمْ

فِي الدِّيْنِ ۔ (التوبہ ۔ آیت ۱۱)

"پس اگر وہ توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تب وہ تمہارے دینی بھائی ہیں ۔"

مگر یہاں نماز اور زکوٰۃ کی شرط کو محض بے معنی سمجھا جاتا ہے ۔ برادری اور ولایت تو درکنار، امامت اور سرداری تک کے لیے یہ چیزیں شرط نہیں ہیں ۔ بلکہ خدا کی مقرر کی ہوئی ان شرطوں کا نام لے لیجیے تو تیوریوں میں بل پڑ جاتے ہیں ۔

حقیقت یہ ہے کہ احادیث میں التزام جماعت اور اطاعتِ امام کے متعلق جو احکام ہیں، اور مَنْ شَذَّ شُذَّ فِي النَّارِ[1] اور اسی قسم کی جو وعیدیں جماعت اور امام سے الگ ہونے والوں کو سنائی گئی ہیں، انہیں کوئی واسطہ اُن جماعتوں اور اماموں سے نہیں ہے جو محض قوم پرستی کے اصولوں پر دُنیوی اغراض کے لیے بنی ہوں ۔ وہاں تو التزام جماعت سے مراد دراصل اُس جماعت کا التزام ہے جو دُنیوی اغراض سے پاک ہو کر خالصۃً لوجہ اللّٰہ اسلام کے مشن کی خدمت کے لیے بنی ہو ۔ ایسی جماعت سے الگ ہونے کا نتیجہ یقیناً نارِ جہنم ہے اور ہونا چاہیئے ۔ مگر ان ہدایات کو دُنیوی جتھہ بندی اور سیاسی پارٹیوں کی وفاداری کے لیے دلیل بنانا خدا کے رسول پر بہتان گھڑنا ہے ۔ کسی قوم کو کسی دوسری قوم کے مقابلہ میں اگر معاشی یا سیاسی اغراض کے لیے جدّ و جہد کرنی ہو تو وہ عام قوانینِ طبیعی کے مطابق اپنا جتھہ بنائے اور قوت فراہم کرنے کی کوشش کرے ۔ اسے خدا کو بیچ میں لانے کا کیا حق ہے ؟ دو قوموں کی خالص نفسانی کشمکش میں آخر خدا کو جانبدار بننے کی کیا حاجت پیش آئی ہے کہ ایک کی جتھہ بندی سے الگ ہونے والوں کو تو وہ جہنم کی سزا دے اور دوسری کے جتھے کو تقویت پہنچانے کے لیے وہ ہر اُس شخص کے سامنے جہنم پیش کر دے جو اس سے الگ ہو یا الگ رہے ؟

بعض لوگ اس دھوکے میں مبتلا ہیں کہ مسلمانوں کی اکثریت کا نام "سوادِ اعظم" ہے اور

---

[1] جو جماعت سے الگ ہوا وہ آگ میں گیا ۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی ہے کہ سوادِ اعظم کا ساتھ دو، لہٰذا مسلمانوں کی اکثریت جس سیاسی پارٹی کی حامی اور جس قیادت کی متبع ہے اس کے ساتھ رہنا ضروری ہے لیکن یہ ارشادِ نبوی کی سراسر غلط تعبیر ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس سوادِ اعظم کے ساتھ رہنے کا حکم دیا ہے اس سے مُراد دراصل اُن مسلمانوں کی اکثریت ہے جن کے اندر اسلامی شعور موجود ہو، جو حق اور باطل کی تمیز رکھتے ہوں اور جن کو اسلام کی رُوح اور اس کے بنیادی اصولوں سے کم از کم اتنی واقفیت ضرور ہو کہ اسلام اور غیر اسلام میں فرق کر سکتے ہوں۔ ایسے مسلمانوں کی اکثریت کبھی باطل پر مجتمع نہیں ہو سکتی، اور اگر وہ کبھی کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو بھی جاتے تو اس پر زیادہ دیر تک جمی نہیں رہ سکتی۔ اسی بنا پر حضورؐ نے سوادِ اعظم کا ساتھ دینے کی تاکید فرمائی۔ مگر جو لوگ اِن ضروری صفات سے عاری ہوں اور جن میں کھرے اور کھوٹے کی بالکل ابتدائی پرکھ بھی نہ ہو اُن کے ہُلّڑ کا نام ہرگز "سوادِ اعظم" نہیں ہے، نہ اِن کی جماعت اسلامی مفہوم کے اعتبار سے "جماعت" ہے، نہ اُن کی امارت اسلامی اصطلاح کی رُو سے "امارت" ہے، نہ ان کی اس امارت کو کسی حیثیت سے بھی سمع و طاعت کا حق پہنچتا ہے۔ محض لفظ "مسلمان" سے دھوکا کھا کر جو لوگ جاہلیت کی پیروی کرنے والوں کی تنظیم کو تنظیم سمجھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس نوعیت کی کوئی تنظیم خالص اسلامی نقطۂ نظر سے مفید ثابت ہو گی اُن کی کند ذہنی ماتم کی مستحق ہے۔

(ترجمان القرآن۔ جنوری ۱۹۴۰ء)

اسلام کی دعوت اور مسلمان کا نصب العین

جب کسی شخص پر بار بار تشنّج، ہذیان اور بحران کے دورے پڑتے ہوں اور درمیانی وقفوں میں بھی وہ ہر وقت کسی نہ کسی تکلیف سے بے تاب رہتا ہو تو اس کی حالت کو دیکھ کر عقل مند لوگ کیا نتیجہ اخذ کرتے ہیں؟ وہ اسے محض اُوپری خلل کا اثر قرار دیتے ہیں یا یہ سمجھتے ہیں کہ خود اس کے اپنے نظامِ جسمانی کے اندر کوئی خرابی موجود ہے؟ وہ تشنّج کا علاج ہاتھ پاؤں باندھنے سے، ہذیان کا علاج منہ بند کرنے سے اور بخار کا علاج برف میں دبانے سے کرتے ہیں یا ان کی تمام تر کوشش یہ ہوتی ہے کہ اُس اصلی خرابی کو سمجھیں جو کارگاہِ بدن کی ترکیب میں پیدا ہو گئی ہے، اور ساری تدبیریں اُسی کو دُور کرنے میں صَرف کر دیں؟

جہاں تک انفرادی حالات کا تعلق ہے، ہر صاحبِ عقل ایسے مواقع پر دوسری صورت ہی اختیار کیا کرتا ہے۔ مگر تعجب اور سخت تعجب ہے کہ جو عقل ایک فرد کو اس حالت میں دیکھ کر صحیح نتیجہ اخذ کرتی ہے وہ کہاں ماری جاتی ہے جب پوری انسانیت اُس کے سامنے اِسی حال میں ہو۔ تمام عالمِ انسانی اِس وقت ایک شدید بحران میں مبتلا ہے۔ اُس پر تشنّج کا ایک ایسا زبردست دَورہ پڑا ہے جس سے ساری زمین ہل گئی ہے[1]

[1] واضح رہے کہ اُس وقت جنگِ عظیم دوم پوری شدت کے ساتھ جاری تھی۔ (جدید)

اور یہ کوئی پہلا دورہ نہیں ہے۔ ایک مدت سے پیہم اُس پر ایسے ہی دورے پڑ رہے ہیں، اور دوروں کے درمیان جو وقفہ گزرتا ہے اس میں بھی کبھی وہ چین سے نہیں رہتا۔ ہر وقت کسی نہ کسی درد سے بے چین ہی رہتا ہے۔ مگر باوجودیکہ مدت ہائے دراز سے یہ صورتِ حال ساری دنیا میں مشاہدہ کی جا رہی ہے، کسی کا ذہن اِدھر نہیں جاتا کہ انسانی تمدّن وعمران کی اَساس میں ایک بنیادی خرابی موجود ہے۔ ساری دنیا کے بوجھ بجھکڑ اپنی اپنی نظریں صرف اُن خارجی علامات ہی پر جماتے ہوتے ہیں جو اندرونی خرابی کی وجہ سے سطح پر نمایاں ہوتی ہیں، اور ہر ایک کو سطح پر جو پھوڑا سب سے زیادہ نمایاں نظر آتا ہے اسی پر انگلی رکھ کر کہہ دیتا ہے کہ بس اِس کا آپریشن کر دو پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ کوئی کہتا ہے کہ بس کی گانٹھ ڈکٹیٹرشپ ہے، اِس کو کاٹ دو۔ کوئی کہتا ہے کہ ساری خرابی امپیریلزم کی وجہ سے ہے، اِسے مٹا دو۔ کوئی کہتا ہے کہ سرمایہ داری نے دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے، اِس کا خاتمہ کر دو۔ ان نادانوں کی عقل کہاں گم ہو گئی ہے؟ یہ شاخوں کو جڑ سمجھ رہے ہیں۔ ان کو خبر نہیں کہ جڑ کہیں اور ہے، اور وہ جب تک زمین پکڑے رہے گی، شاخیں برابر نکلتی ہی رہیں گی خواہ قیامت تک اُن کو کاٹنے میں وقت ضائع کیا جاتا رہے۔

دنیا میں جہاں جو خرابی بھی پائی جاتی ہے اُس کی جڑ صرف ایک چیز ہے، اور وہ ہے اللہ کے سوا کسی اور کی حاکمیت تسلیم کرنا۔ یہی اُمّ الخبائث ہے۔ یہی اصل بس کی گانٹھ ہے۔ اِسی سے وہ شجرِ خبیث پیدا ہوتا ہے جس کی شاخیں پھیل پھیل کر انسانوں پر مصیبتوں کے زہریلے پھل ٹپکاتی ہیں۔ یہ جڑ جب تک باقی ہے، آپ شاخوں کی جتنی چاہیں قطع وبرید کر لیں، بجز اس کے کچھ بھی حاصل نہ ہوگا کہ ایک طرف سے مصائب کا نزول بند ہو جائے اور دوسری طرف سے شروع ہو جائے۔

ڈکٹیٹرشپ یا مطلق العنان بادشاہی کو مٹایا جائے گا تو حاصل کیا ہوگا؟ یہی نا کہ ایک انسان یا ایک خاندان خدائی کے مقام سے ہٹ جائے گا اور اس کی جگہ پارلیمنٹ خدا بن جائے گی۔ مگر کیا فی الواقع اس طریقہ سے انسانیت کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے؟ کیا

ظلم اور بغی اور فساد فی الارض سے وہ جگہ خالی ہے جہاں پارلیمنٹ کی خدائی ہے؟

امپیریلزم کا خاتمہ کیا جائے گا تو اس کا حاصل کیا ہو گا؟ بس یہی کہ ایک قوم پر سے دوسری قوم کی خدائی اُتر جائے گی۔ مگر کیا واقعی اس کے بعد زمین پر امن اور خوشحالی کا دور شروع ہو جاتا ہے؟ کیا وہاں انسان کو چین نصیب ہے جہاں قوم آپ اپنی خدا بنی ہوتی ہے؟

سرمایہ داری کا استیصال ہو جائے گا تو اس سے کیا نتیجہ برآمد ہو گا؟ صرف یہ کہ محنت پیشہ عوام مالدار طبقوں کی خدائی سے آزاد ہو کر خود اپنے بنائے ہوئے خداؤں کے بندے بن جائیں گے۔ مگر کیا اس سے حقیقت میں آزادی، عدل، اور امن کی نعمتیں انسان کو حاصل ہو جاتی ہیں؟ کیا انسان کو وہاں یہ نعمتیں حاصل ہیں جہاں مزدوروں کے اپنے بنائے ہوئے خدا حکومت کر رہے ہیں؟

اللہ کی حاکمیت سے منہ موڑنے والے زیادہ سے زیادہ بہتر نصب العین جو پیش کر سکتے ہیں وہ بیش از این نیست کہ دنیا میں مکمل جمہوریت قائم ہو جائے، یعنی لوگ اپنی بھلائی کے لیے آپ اپنے حاکم ہوں۔ لیکن قطع نظر اس سے کہ یہ حالت واقعی دنیا میں رونما ہو بھی سکتی ہے یا نہیں[1]، غور طلب سوال یہ ہے کہ ایسی حالت اگر رونما ہو جائے تو کیا اُس فرضی جنت میں انسان خود اپنے نفس کے شیطان، یعنی اُس جاہل اور نادان "خدا" کی بندگی سے بھی آزاد ہو جائے گا جس کے پاس خدائی کرنے کے لیے علم، حکمت، عدل، راستی کچھ بھی نہیں، صرف خواہشات ہی خواہشات ہیں، اور وہ بھی اندھی جابرانہ خواہشات۔

غرض دنیا کے مختلف گوشوں میں انسانی مصائب اور پریشانیوں کے جتنے حل بھی سوچے جا رہے ہیں ان سب کا خلاصہ بس اتنا ہی ہے کہ خدائی یا حاکمیت بعض انسانوں سے

---

[1] تجربات شاہد ہیں کہ حقیقی جمہوریت آج تک دنیا میں کبھی قائم نہیں ہو سکی اور عقلی دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسا ہونا عملاً محال ہے۔ (قدیم)

سلب ہوکر بعض دوسرے انسانوں کی طرف منتقل ہوجاتے۔ اور یہ مصیبت کا ازالہ نہیں ہے بلکہ صرف اُس کا اِمالہ ہے۔ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ سیلابِ بلا اب تک جس راستہ سے آتا رہا ہے اُدھر سے نہ آتے بلکہ دوسرے راستہ سے آئے۔ اِس کو اگر حل کہا جاسکتا ہے تو یہ ایسا ہی حل ہے جیسے دِق کی بیماری کو سرطان سے تبدیل کر لیا۔ اگر مقصود محض دِق کو دُور کرنا تھا تو بے شک آپ کامیاب ہوتے، لیکن اگر اصل مقصد جان بچانا تھا تو ایک پیامِ اجل کو دوسرے پیکِ اجل سے تبدیل کر کے آپ نے کوئی بھی کامیابی حاصل نہ کی۔

خواہ ایک انسان دوسرے کا خدا بنے، یا دوسرے کی خدائی تسلیم کرے، یا آپ اپنا خدا بن جائے، بہرحال ان تمام صورتوں میں تباہی اور خسران کا اصل سبب جوں کا توں باقی رہتا ہے۔ کیونکہ جو فی الواقع بادشاہ نہیں ہے وہ اگر بادشاہ بن بیٹھے، جو حقیقت میں بندہ اور غلام ہے وہ اگر اپنے آپ کو خواجگی و خداوندی کے مقام پر متمکن سمجھ لے، جو دراصل ذمّہ دار اور مسئول رعیّت ہے وہ اگر غیر ذمّہ دار اور خود مختار حاکم بن کر کام کرنے لگے، تو اس اِدّعا کی اور ایسے اِدّعا کو تسلیم کرنے کی حقیقت ایک غلط فہمی کے سوا کچھ نہ ہوگی۔ اصلیت جو کچھ ہے وہ تو بہرحال وہی کی وہی رہے گی۔ حقیقت میں تو جو خدا ہے وہ خدا ہی رہے گا اور جو بندہ ہے وہ بندہ ہی رہے گا۔ مگر جب بندہ اِس عظیم الشّان بنیادی غلط فہمی پر اپنی زندگی کی ساری عمارت اُٹھائے گا کہ وہ خود حاکمِ اعلیٰ ہے یا کوئی دوسرا بندہ اِس کا حاکمِ اعلیٰ ہے، اور جب وہ یہ سمجھ کر کام کرے گا کہ اس سے بالاتر کوئی حاکم نہیں ہے جس کے سامنے وہ جوابدہ ہو اور اپنے امر و نہی میں جس کی رضا لینے کا محتاج ہو، تو یقیناً اس کی زندگی کی عمارت از سرتا پا غلط ہو کر رہ جائے گی اور اس میں راستی و صحت کو تلاش کرنا حماقت کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

یہ بات آخر کس طرح انسان کی عقل قبول کر لیتی ہے کہ خلق کسی کی ہو اور امر کسی اور کا ہو؟ پیدا کرنے اور پالنے والا کوئی ہو اور حکم کسی اور کا چلے؟ ملک کسی کا ہو اور بادشاہت کسی اور کی ہو؟

جس نے انسان کو بنایا، جس نے انسان کے لیے زمین کی قیام گاہ بنائی، جو اپنی ہوا اپنے پانی، اپنی روشنی اور حرارت، اور اپنے پیدا کیے ہوئے سامانوں سے انسان کی پرورش کر رہا ہے، جس کی قدرت انسان کا اور اُس پوری زمین کا، جس میں انسان رہتا ہے، احاطہ کیے ہوئے ہے، اور جس کے حیطۂ قدرت سے انسان کسی حال میں نکل ہی نہیں سکتا، عقل اور فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ وہی انسان کا اور اِس زمین کا مالک ہو، وہی خدا اور رب ہو اور وہی بادشاہ اور حاکم بھی ہو۔ اُس کی بنائی ہوئی دنیا میں خود اُس کے سوا اور کس کو حکومت و فرمانروائی کا حق پہنچتا ہے؟ کس طرح ایک مملوک یہ کہنے کا حق دار ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے جیسے دوسرے مملوکوں کا مالک ہے؟ صانع اور پروردگار کے سوا اپنی مصنوعات اور اپنے پروردوں کی ملکیت اور کس کے لیے جائز ہو سکتی ہے؟ کون اتنی قدرت رکھتا ہے، کس کے پاس اتنا علم ہے، کس کا یہ ظرف ہے کہ اِس سلطنت میں فرمانروائی کر سکے؟ اگر انسان اِس سلطنت کے اصل سلطان کی حاکمیت کو تسلیم نہیں کرتا اور اُس کے سوا کسی دوسرے کی حاکمیت مانتا ہے، یا خود اپنی حاکمیت کا اِدّعا کرتا ہے تو یہ صریح واقعہ کے خلاف ہے بنیادی طور پر غلط ہے۔ ایک عظیم الشان جھوٹ ہے۔ سب سے زیادہ سفید جھوٹ۔ ایسا جھوٹ جس کی تردید زمین و آسمان کی ہر شے ہر وقت کر رہی ہے۔ ایسے بے بُنیاد دعوے اور ایسی غلط تسلیم و اطاعت سے حقیقتِ نفس الامری میں ذرہ برابر بھی فرق واقع نہیں ہوتا۔ جو مالک ہے وہ مالک ہی رہے گا، جو بادشاہ اور حاکم ہے وہ بادشاہ اور حاکم ہی رہیگا، البتہ خود اُس انسان کی زندگی از سرتاپا غلط ہو کر رہ جائے گی جو واقعہ کے خلاف دوسرے کی حاکمیت تسلیم کرے، یا خود اپنی حاکمیت کا مدعی بن کر کام کرے گا۔ حقیقت اِس کی محتاج نہیں ہے کہ تم اس کا ادراک کرو تب ہی وہ حقیقت ہو۔ نہیں! تم خود اس کے محتاج ہو کہ اُس کی معرفت حاصل کر کے اپنی سعی و عمل کو اس کے مطابق بناؤ۔ اگر تم حقیقت کو محسوس نہیں کرتے اور کسی غلط چیز کو حقیقت سمجھ بیٹھتے ہو تو اس میں نقصان تمہارا اپنا ہے۔ تمہاری غلط فہمی سے حقیقت میں کوئی تغیّر رونما نہیں ہو سکتا۔

ظاہر ہے کہ جس چیز کی بنیاد ہی سرے سے غلط ہو اس کو جزوی ترمیمات اور فروعی

اصلاحات سے کبھی درست نہیں کیا جا سکتا۔ ایک جھوٹ کے ہٹ جانے اور اس کی جگہ دُوسرے جھوٹ کے آجانے سے حقیقت میں کوئی فرق بھی واقع نہیں ہوتا۔ اس قسم کی تبدیلی سے طفل تسلی تو ہو سکتی ہے مگر غیرِ حق پر زندگی کی عمارت قائم کرنے کا جو نقصان ایک صورت میں تھا وہی دوسری صورت میں بھی علیٰ حالہ باقی رہتا ہے۔

اس نقصان کو دُور کرنے اور انسانی زندگی کو حقیقی فلاح و سعادت سے ہمکنار کرنے کی کوئی صورت اِس کے سوا نہیں ہے کہ غیر اللہ کی حاکمیت سے کلیۃً انکار کیا جائے اور اُس کی حاکمیت تسلیم کی جائے جو فی الواقع مالک الملک ہے۔ ہر اُس نظامِ حکومت کو رد کر دیا جائے جو انسانی اقتدارِ اعلیٰ کے باطل نظریہ پر قائم ہو، اور صرف اُس نظامِ حکومت کو قبول کیا جائے جس میں اقتدارِ اعلیٰ اُسی کا ہو جو فی الحقیقت مُقتدرِ اعلیٰ ہے۔ ہر اُس حکومت کے حقِ حکمرانی کو ماننے سے انکار کر دیا جائے جس میں انسان بذاتِ خود حاکم اور صاحبِ امر و نہی ہونے کا مدعی ہو، اور صرف اُس حکومت کو جائز قرار دیا جائے جس میں انسان اصلی اور حقیقی حاکم کے ماتحت خلیفہ ہونے کی حیثیت قبول کرے۔ یہ بنیادی اصلاح جب تک نہ ہو گی، جب تک انسان کی حاکمیت، خواہ وہ کسی شکل اور کسی نوعیت کی ہو، جڑ پیڑ سے اُکھاڑ کر نہ پھینک دی جائے گی، اور جب تک انسانی حاکمیت کے غیر واقعی تصور کی جگہ خلافتِ الٰہی کا واقعی (Realistic) تصور نہ لے لے گا، اُس وقت تک انسانی تمدن کی بگڑی ہوئی کل کبھی درست نہ ہو سکے گی، چاہے سرمایہ داری کی جگہ اشتراکیت قائم ہو جائے، یا ڈکٹیٹر شپ کی جگہ جمہوریت متمکن ہو جائے، یا امپیریلزم کی جگہ قوموں کی حکومت خود اختیاری کا قاعدہ نافذ ہو جائے۔ صرف خلافت ہی کا نظریہ انسان کو امن دے سکتا ہے، اُسی سے ظلم مٹ سکتا ہے اور عدل قائم ہو سکتا ہے، اور اسی کو اختیار کر کے انسان اپنی قوتوں کا صحیح مصرف اور اپنی سعی و جہد کا صحیح رُخ پا سکتا ہے۔ ربّ العالمین اور عالم الغیب والشہادۃ کے سوا اور کوئی انسانی تمدن و عمران کے لیے ایسے اصول اور حدود تجویز کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا جو بے لاگ ہوں، جن میں جانب داری، تعصب اور خود غرضی کا شائبہ تک نہ ہو، جو ٹھیک ٹھیک عدل پر قائم ہوں، جن میں تمام انسانوں کے مفاد اور

حقوق کا یکساں لحاظ کیا گیا ہو، جو گمان وقیاس پر نہیں بلکہ حقائقِ فطرت کے یقینی علم پر مبنی ہوں۔ ایسے ضابطہ کی نعمتوں سے انسان صرف اِسی طرح بہرہ ور ہو سکتا ہے کہ وہ خود صاحبِ امر اور قانون ساز بننے کے زعم سے دست بردار ہو جاتے، خدا پر اور اس کے بھیجے ہوئے قانونِ زندگی پر ایمان لاتے اور آخرت کی جوابدہی کا احساس رکھتے ہوئے اُس ضابطہ کو دنیا میں قائم کرے۔

اِسلام انسانی زندگی میں یہی بنیادی اصلاح کرنے آیا ہے۔ اس کو کسی ایک قوم سے دلچسپی اور کسی دوسری قوم سے عداوت نہیں ہے کہ ایک کو چڑھانا اور دوسری کو گرانا اُس کا مقصود ہو۔ بلکہ اُسے تمام نوعِ انسانی کی فلاح وسعادت مطلوب ہے جس کے لیے وہ ایک عالمگیر کلیہ وضابطہ پیش کرتا ہے۔ وہ ایک تنگ زاویہ سے کسی خاص ملک یا کسی خاص گروہِ انسانی کو نہیں دیکھتا بلکہ وسیع نظر سے تمام روئے زمین کو اُس کے تمام باشندوں سمیت دیکھتا ہے، اور چھوٹے چھوٹے وقتی حوادث ومسائل سے بالاتر ہو کر اُن اصولی وبنیادی مسائل کی طرف توجہ کرتا ہے جن کے حل ہو جانے سے تمام زمانوں اور تمام حالات ومقامات میں سارے فروعی وضمنی مسائل آپ سے آپ حل ہو جاتے ہیں۔ اسے ظلم کی شاخوں اور فساد کی فروعی شکلوں سے بحث نہیں ہے کہ آج ایک جگہ ایک شاخ کو کاٹنے پر زور صرف کرے اور کل دوسری جگہ کسی دوسری شاخ سے طبع آزمائی کرنے لگے، بلکہ وہ ظلم کی جڑ اور فساد کے سرچشمے پر براہِ راست حملہ کرتا ہے تاکہ اِن شاخوں کی پیدائش ہی بند ہو جائے اور جگہ جگہ آئے دن کی کاٹ چھانٹ کا جھگڑا ہی باقی نہ رہے۔

یہ چھوٹے چھوٹے ضمنی مسائل جن میں آج دنیا کی مختلف قومیں اور جماعتیں الجھ رہی ہیں، مثلاً یورپ میں ہٹلر کا طغیانِ نازی، یا حبش میں اٹلی کا فساد، یا چین میں جاپان کا ظلم، یا ایشیا وافریقہ میں برطانیہ وفرانس کی قیصریت، اسلام کی نگاہ میں ان کی اور ایسے تمام مسائل کی کوئی اہمیت نہیں۔ اُس کی نگاہ میں ایک ہی سوال اہمیت رکھتا ہے۔ وہ تمام دنیا سے پوچھتا ہے:

ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ۔

(یوسف - آیت ۳۹)

"متفرق چھوٹے چھوٹے خداؤں کی بندگی اچھی ہے یا اُس ایک اللہ کی جو سب پر غلبہ و تسلط رکھتا ہے؟"

جو لوگ پہلی صورت کے پسند کرنے والے ہیں اسلام اُن سب کو ایک سمجھتا ہے، خواہ وہ آپس میں کتنے ہی مختلف شعبوں میں بٹے ہوئے ہوں۔ اُن کی ایک دوسرے کے خلاف جدوجہد اسلام کی نظر میں ایک فساد کے خلاف دوسرے فساد کی جدوجہد ہے۔ ان میں سے کسی کی دشمنی بھی نفسِ فساد سے نہیں ہے بلکہ فساد کی کسی خاص شاخ سے ہے اور اس لیے ہے کہ جس فساد کا جھنڈا ایک فریق نے بلند کر رکھا ہے وہ سرنگوں ہو اور اُس کی جگہ وہ فساد سربلند ہو جس کا جھنڈا دوسرا فریق اُٹھائے ہوئے ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے فریقین میں سے کسی کے ساتھ بھی اُس کا اشتراکِ عمل نہیں ہو سکتا جو اصل فساد کا دشمن ہو۔ اُس کے لیے تو ایک چھوٹے رب کے پرستاروں اور دوسرے چھوٹے رب کے بندوں میں ترجیح کا سوال ہی نہیں۔ اس کی تو بیک وقت سب سے لڑائی ہے۔ وہ تو اپنا سارا زور صرف ایک ہی مقصد پر صرف کرے گا اور وہ یہ ہے کہ انسان کو متفرق غیر حقیقی ربوں اور الٰہوں کی بندگی سے نکالا جائے اور اُس اللہ واحد قہار کی حاکمیت تسلیم کرائی جائے جو فی الحقیقت رَبُّ النَّاس، مَلِكُ النَّاس اور اِلٰهُ النَّاس ہے۔

لفظ "مسلمان" اگر کوئی بے معنی لفظ ہے اور محض علَم کے طور پر انسانوں کے کسی گروہ کے لیے استعمال ہونے لگا ہے، تب تو مسلمانوں کو پوری آزادی حاصل ہونی چاہیئے کہ اپنی زندگی کے لیے جو مقصد چاہیں قرار دے لیں اور جن طریقوں پر چاہیں کام کریں۔ لیکن اگر یہ لفظ اُن لوگوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جنہوں نے اسلام کو بطورِ مسلک و مشرب قبول کیا ہے تو یقیناً مسلمانوں کے لیے کوئی نظریہ، کوئی مقصد اور کوئی طریقِ کار اسلام کے نظریہ، مقصد اور طریقِ کار کے سوا نہیں ہو سکتا۔ غیر اسلامی نظریہ اور پالیسی اختیار کرنے کے لیے حالاتِ زمانہ اور مقتضیاتِ وقت کا بہانہ کوئی بہانہ نہیں

ہے۔ مسلمان جہاں جس ماحول میں بھی ہوں گے ان کو وقتی حوادث اور مقامی حالات و معاملات سے بہرحال سابقہ پیش ہی آئے گا۔ پھر وہ اسلام آخر کس کام کا اسلام ہے جس کا اتباع صرف مخصوص حالات ہی میں کیا جائے اور جب حالات دگرگوں ہوں تو اسے چھوڑ کر حسبِ سہولت کوئی دوسرا نظریہ اختیار کر لیا جائے؟ دراصل تمام مختلف حالات میں اسلام کے اساسی نظریہ اور بنیادی مقصد کے مطابق طرزِ عمل اختیار کرنا ہی مسلمان ہونا ہے، ورنہ اگر مسلمان ہر حادثہ اور ہر حال کو ایک جداگانہ نقطۂ نظر سے دیکھنے لگیں اور ہمیشہ موقع و محل دیکھ کر ایک نئی پالیسی وضع کر لیا کریں جس کو اسلام کے نظریہ و مقصد سے کوئی لگاؤ نہ ہو، تو ایسے مسلمان ہونے میں اور نا مسلمان ہونے میں قطعاً کوئی فرق نہیں۔ ایک مسلک کی پیروی کے معنی ہی یہ ہیں کہ آپ جس حال میں بھی ہوں آپ کا نقطۂ نظر اور طریقِ کار اُس مسلک کے مطابق ہو جس کے آپ پیرو ہیں۔ ایک مسلمان، سچا مسلمان اُسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ وہ زندگی کے تمام جزئی معاملات اور وقتی حوادث میں اسلامی نقطۂ نظر اور اسلامی طریقہ اختیار کرے۔ جو مسلمان کسی موقع و محل میں اسلامی پہلو چھوڑ کر غیر اسلامی پہلو اختیار کرتا ہے اور یہ عذر پیش کرتا ہے کہ اس موقع اور اس محل میں تو مجھے غیر اسلامی طریقہ ہی پر کام کر لینے دو، بعد میں جب حالات سازگار ہو جائیں گے تو مسلمان بن کر کام کرنے لگوں گا، وہ دراصل یہ ظاہر کرتا ہے کہ یا تو اسلام کو وہ سمجھاتے خود کوئی ایسا ہمہ گیر نظامِ زندگی ہی نہیں سمجھتا جو زندگی کے ہر معاملہ اور زمانہ کی ہر گردش پر یکساں حاوی ہو سکتا ہو، یا پھر اس کا ذہن اسلام کے سانچے میں پوری طرح نہیں ڈھلا ہے جس کی وجہ سے اس میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ اسلام کے کلیات کو جزئی حوادث پر منطبق کر سکے اور یہ سمجھ سکے کہ مختلف احوال میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس کی پالیسی کیا ہونی چاہیئے۔

ایک حقیقی مسلمان ہونے کی حیثیت سے جب میں دنیا پر نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے اس امر پر اظہارِ مسرت کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ٹرکی پر ترک، ایران پر ایرانی اور افغانستان پر افغان حکمران ہیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے میں حکومۃ الناس علی الناس للناس[1]

---

[1] (Government of the People, by the People, for the People)

کے نظریہ کا قائل نہیں ہوں کہ مجھے اس پر مسرت ہو۔ میں اس کے برعکس حکم اللہ علی الناس بالحق[1] کا نظریہ رکھتا ہوں، اور اس اعتبار سے میرے نزدیک انگلستان پر انگریزوں کی حاکمیت اور فرانس پر اہلِ فرانس کی حاکمیت جس قدر غلط ہے، اسی قدر ترکی اور دوسرے ملکوں پر اُن کے اپنے باشندوں کی حاکمیت بھی غلط ہے۔ بلکہ اس سے زیادہ غلط، اس لیے کہ جو قومیں اپنے آپ کو مسلمان کہتی ہیں اُن کا خدا کی حاکمیت کے بجائے انسانوں کی حاکمیت اختیار کرنا اور بھی زیادہ افسوس ناک ہے۔ غیر مسلم اگر ضَالِّیْن کے حکم میں ہیں تو یہ اس طرزِ عمل کی بنا پر مَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ کی تعریف میں آجاتے ہیں۔

مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لیے اس مسئلہ میں بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ ہندوستان میں جہاں مسلم کثیر التعداد ہیں وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے۔ میرے نزدیک جو سوال سب سے اقدم ہے وہ یہ ہے کہ آپ کے اس "پاکستان" میں نظامِ حکومت کی اساس خدا کی حاکمیت پر رکھی جائے گی یا مغربی نظریۂ جمہوریت کے مطابق عوام کی حاکمیت پر؟ اگر پہلی صورت ہے، تو یقیناً یہ "پاکستان" ہو گا ورنہ بصورتِ دیگر یہ ویسا ہی "ناپاکستان" ہو گا جیسا ملک کا وہ حصہ ہو گا جہاں آپ کی اسکیم کے مطابق غیر مسلم حکومت کریں گے۔ بلکہ خدا کی نگاہ میں یہ اس سے زیادہ ناپاک، اس سے زیادہ مبغوض و ملعون ہو گا، کیونکہ یہاں اپنے آپ کو مسلمان کہنے والے وہ کام کریں گے جو غیر مسلم کرتے ہیں۔ اگر میں اس بات پر خوش ہوں کہ یہاں رام داس کے بجائے عبداللہ خدائی کے منصب پر بیٹھے گا تو یہ اسلام نہیں ہے بلکہ نیشنلزم ہے، اور یہ "مسلم نیشنلزم" بھی خدا کی شریعت میں اتنا ہی ملعون ہے جتنا "ہندوستانی نیشنلزم"۔

مسلمان ہونے کی حیثیت سے میری نگاہ میں اس سوال کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ ہندوستان ایک ملک رہے یا دس ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے۔ تمام روئے زمین ایک ملک ہے۔ انسان نے اس کو ہزاروں حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ یہ اب تک کی

---

[1] (Rule of God on Man with Justice)

تقسیم اگر جائز تھی تو آئندہ مزید تقسیم ہو جائے گی تو کیا بگڑ جائے گا؟ یہ کون سا ایسا بڑا مسئلہ ہے جس پر مسلمان ایک لمحہ کے لیے بھی غور و فکر میں اپنا وقت ضائع کرے؟ مسلمان کو تو صرف اس چیز سے بحث ہے کہ یہاں انسان کا سر حکم اللہ کے آگے جھکتا ہے یا حکم الناس کے آگے۔ اگر حکم اللہ کے آگے جھکتا ہے تب تو ہندوستان کو اور زیادہ وسیع کیجیے، ہمالیہ کی دیوار کو بیچ میں سے ہٹا دیجئے اور سمندر کو بھی نظر انداز کر دیجیے تاکہ ایشیا، افریقہ، یورپ، امریکہ سب ہندوستان میں شامل ہو سکیں۔ اور اگر یہ حکم الناس کے آگے جھکتا ہے تو جہنم میں جائے ہندوستان اور اس کی خاک کا پرستار، مجھے اس سے کیا دلچسپی کہ یہ ایک ملک ہے یا دس ہزار ٹکڑوں میں بٹ جائے۔ اس بت کے ٹوٹنے پر تڑپے وہ جو اسے معبود سمجھتا ہو۔ مجھے تو اگر یہاں ایک مربع میل کا رقبہ بھی ایسا مل جائے جس میں انسان پر خدا کے سوا کسی کی حاکمیت نہ ہو تو میں اس کے ایک ذرۂ خاک کو تمام ہندوستان سے زیادہ قیمتی سمجھوں گا۔

مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے نزدیک یہ امر بھی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا کہ ہندوستان کو انگریزی امپیریلزم سے آزاد کرایا جائے۔ انگریز کی حاکمیت سے نکلنا تو صرف لَا اِلٰہ کا ہم معنی ہوگا۔ فیصلہ کا انحصار محض اس نفی پر نہیں ہے بلکہ اس پر ہے کہ اس کے بعد اثبات کس چیز کا ہوگا؟ اگر آزادی کی یہ ساری لڑائی صرف اس لیے ہے ــــــ اور مجاہدین حریت میں سے کون صاحب یہ جھوٹ بولنے کی ہمت رکھتے ہیں کہ اس لیے نہیں ہے ــــــ کہ امپیریلزم کے اِلٰہ کو ہٹا کر ڈیموکریسی کے اِلٰہ کو بت خانۂ حکومت میں جلوہ افروز کیا جائے تو مسلمان کے نزدیک درحقیقت اس سے کوئی فرق بھی واقع نہیں ہوتا۔ لات گیا منات آگیا۔ ایک جھوٹے خدا نے دوسرے جھوٹے خدا کی جگہ لے لی۔ باطل کی بندگی جیسی تھی ویسی ہی رہی۔ کون مسلمان اس کو آزادی کے لفظ سے تعبیر کر سکتا ہے؟ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَمْحُوا السَّیِّئَ بِالسَّیِّئِ وَلٰکِنْ یَمْحُوا السَّیِّئَ بِالْحَسَنِ اِنَّ الْخَبِیْثَ لَا یَمْحُوا الْخَبِیْثَ[1]

---

[1] یہ حدیث نبوی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ بدی بدی سے نہیں بلکہ نیکی سے مٹتی ہے۔ ایک ناپاک کو ہٹا کر دوسرا ناپاک اس کی جگہ لے لے تو ناپاکی مٹی کہاں؟

اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی جو مختلف جماعتیں اسلام کے نام سے کام کر رہی ہیں، اگر فی الواقع اسلام کے معیار پر ان کے نظریات، مقاصد اور کارناموں کو پرکھا جائے تو سب کی سب جنسِ کاسد نکلیں گی۔ خواہ مغربی تعلیم و تربیت پائے ہوئے سیاسی لیڈر ہوں یا قدیم طرز کے مذہبی رہنما، دونوں ہی اپنے نظریہ اور اپنی پالیسی کے لحاظ سے یکساں گم کردہ راہ ہیں۔ دونوں راہِ حق سے ہٹ کر تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں۔ دونوں اپنے اصلی ہدف کو چھوڑ کر ہوا میں چوبائی تیر چلا رہے ہیں۔ ایک گروہ کے دماغ پر ہندو کا ہوّا سوار ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ ہندو امپیریلزم کے چنگل سے بچ جانے کا نام نجات ہے۔ دوسرے گروہ کے سر پر انگریز کا بھوت مسلط ہے اور وہ انگریزی امپیریلزم کے جال سے بچ نکلنے کو نجات سمجھ رہا ہے۔ ان میں سے کسی کی نظر بھی مسلمان کی نظر نہیں، ورنہ یہ دیکھتے کہ اصل شیطان نہ یہ ہے نہ وہ، اصل شیطان غیر اللہ کی حاکمیت ہے۔ اُس سے نجات نہ پائی تو کچھ نہ پایا۔ لڑنا ہے تو اُس کو مٹانے کے لیے لڑو۔ جو تیر چلانا ہے اُس ہدف کی طرف شست باندھ کر چلاؤ۔ جس قدر قوت صرف کرنی ہے اُسے مؤکر نے پر صرف کر دو۔ اس کے سوا جس کام میں بھی تم اپنی مساعی صرف کرو گے وہ اسی طرح پراگندہ اور رائگاں ہو کر رہیں گی جس طرح اُن لوگوں کی مساعی جن کے متعلق قرآن فیصلہ کرتا ہے کہ قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ۝ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا۔ (الکہف۔ آیات ۱۰۳ تا ۱۰۵)

مغربی طرز کے لیڈروں پر تو چنداں حیرت نہیں کہ ان بے چاروں کو قرآن کی ہوا تک نہیں لگی ہے، مگر حیرت اور ہزار حیرت ہے اُن علمائے کرام پر جن کا رات دن کا مشغلہ ہی قال اللہ وقال الرسول ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اِن کو کیا ہو گیا ہے۔ یہ قرآن کو کس نظر سے پڑھتے ہیں کہ ہزار بار پڑھنے کے بعد بھی اُنہیں اُس قطعی اور دائمی پالیسی کی طرف ہدایت نہیں ملتی جو مسلمان کے لیے اصولی طور پر مقرر کر دی گئی ہے۔ جن

مسائل کو انہوں نے اہم اور اقدم قرار دے رکھا ہے، قرآن میں ہم کو ان کی فروعی اور ضمنی اہمیت کا بھی نشان نہیں ملتا۔ جن معاملات پر بے چین ہو کر انہوں نے دہلی میں آزاد مسلم کانفرنس منعقد فرمائی اور تڑپ تڑپ کر تقریریں کیں، اُس نوعیت کے معاملات کہیں اشارۃً بھی قرآن میں زیر بحث نہیں آتے۔ برعکس اس کے قرآن میں ہم دیکھتے ہیں کہ نبی پر نبی آتا ہے اور ایک ہی بات کی طرف اپنی قوم کو دعوت دیتا ہے: یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ[1] خواہ بابل کی سرزمین ہو یا ارضِ سدُوم، یا ملکِ مدین، یا حجر کا علاقہ، یا نیل کی وادی۔ خواہ وہ چالیسویں صدی قبل مسیح ہو، یا بیسویں یا دسویں۔ خواہ وہ غلام قوم ہو یا آزاد، خستہ و درماندہ ہو یا تمدنی و سیاسی حیثیت سے بام عروج پر، ہر جگہ، ہر دور میں، ہر قوم میں اللہ کی طرف سے آنے والے رہنماؤں نے انسان کے سامنے ایک ہی دعوت پیش کی اور وہ یہ تھی کہ "اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے"۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم سے صاف کہہ دیا کہ میرے اور تمہارے درمیان کوئی تعاون، کوئی اشتراکِ عمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ تم اس اصل الاصول کو تسلیم نہیں کرتے۔ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ (الممتحنہ۔ آیت ۴) حضرت موسیٰ نے فرعون کے پاس جا کر اَرْسِلْ مَعِیَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ کا مطالبہ کرنے سے پہلے اِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ (الاعراف۔ ۱۰۴) کا اعلان کیا، اور هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى (النازعات ۱۸-۱۹) کی دعوت دی، اور اسے آگاہ کیا کہ تو رب نہیں ہے بلکہ رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور جینے کا طریقہ بتایا رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى (طٰہٰ ۔ ۵۰)۔ حضرت عیسیٰ نے، جن کی قوم رومیوں کی غلام ہو چکی تھی، بنی اسرائیل اور آس پاس کی قوموں کو رومن امپیریلزم کے خلاف جنگِ آزادی کے جھنڈے

---

[1] اے میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔

کی طرف دعوت نہ دی بلکہ اس چیز کی طرف دعوت دی کہ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ (آل عمران - ۵۱) ظاہر ہے کہ یہ واقعات جو قرآن میں بیان کیے گئے ہیں، کسی اور دنیا کے نہیں، اسی دنیا کے ہیں جس میں ہم بستے ہیں، اور ایسے ہی انسانوں سے تعلق رکھتے ہیں، جیسے ہم انسان ہیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جن ملکوں اور قوموں میں انبیاء علیہم السلام آئے ان میں سرے سے کوئی سیاسی، معاشی، تمدنی مسئلہ حل طلب تھا ہی نہیں جس کی طرف توجہ کی ضرورت ہوتی۔ پس جب یہ واقعہ ہے کہ اسلامی تحریک کے ہر رہنما نے ہر ملک اور ہر زمانے میں تمام وقتی اور مقامی مسائل کو نظر انداز کر کے اسی ایک مسئلہ کو آگے رکھا اور اسی پر اپنا سارا زور صرف کیا تو اس سے صرف یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ مسئلہ اُمّ المسائل تھا اور وہ اسی کے حل پر زندگی کے تمام مسائل کا حل موقوف سمجھتے تھے۔

اب یا تو یہ کہہ دیجیے کہ اسلامی تحریک کے وہ رہنما جو خدا کی طرف سے آئے تھے، سب کے سب عملی سیاسیات سے نابلد تھے، نہ جانتے تھے کہ انسانی زندگی کے معاملات میں کون سی چیز مقدم اور کون سی مؤخر ہونی چاہیے، اور انہیں خبر نہ تھی کہ آزادی کے لیے جدوجہد کس طرح کی جاتی ہے اور ملکی معاملات کو حل کرنے کی کیا تدبیریں ہیں۔ یا پھر یہ تسلیم کیجیے کہ اس دور میں جو حضرات اسلام کے نمائندے اور مسلمانوں کے قائد و رہنما بنے ہوئے ہیں وہ جزئیاتِ شرع پر کتنا ہی عبور رکھتے ہوں، بہرحال اسلامی تحریک کے مزاج کو وہ نہیں سمجھتے اور نہیں جانتے کہ اس تحریک کو چلانے اور آگے بڑھانے کا طریقہ کیا ہے۔

تمام مسلمانوں کو جان لینا چاہیئے کہ بحیثیت ایک مسلم جماعت ہونے کے ہمارا تعلق اُس تحریک سے ہے جس کے رہبر و رہنما انبیاء علیہم السلام تھے۔ ہر تحریک کا ایک خاص نظامِ فکر اور ایک خاص طریقِ کار ہوتا ہے۔ اسلام کا نظامِ فکر اور طریقِ کار وہ ہے جو ہم کو انبیاء علیہم السلام کی سیرتوں میں ملتا ہے۔ ہم خواہ کسی ملک اور کسی زمانہ میں ہوں، اور ہمارے گرد و پیش زندگی کے مسائل و معاملات خواہ کسی نوعیت کے ہوں، ہمارے

لیے مقصد و نصب العین وہی ہے جو انبیاء کا تھا، اور اس منزل تک پہنچنے کا راستہ وہی ہے جس پر انبیاء ہر زمانے میں چلتے رہے۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ[1]۔ (الانعام-۹۰) ہمیں زندگی کے سارے معاملات کو اُسی نظر سے دیکھنا چاہیے جس سے اُنہوں نے دیکھا۔ ہمارا معیارِ قدر وہی ہونا چاہیے جو اُن کا تھا۔ اور ہماری اجتماعی پالیسی اُنہی خطوط پر قائم ہونی چاہیے جن پر انہوں نے قائم کی تھی۔ اس مسلک کو چھوڑ کر اگر ہم کسی دوسرے مسلک کا نظریہ اور طرزِ عمل اختیار کریں گے تو گمراہ ہو جائیں گے۔ یہ بات ہمارے مرتبہ سے فروتر ہے کہ ہم اُس تنگ زاویہ سے معاملات دنیا پر نگاہ ڈالیں جس سے ایک قوم پرست، یا ایک جمہوریت پسند یا ایک اشتراکی ان کو دیکھتا ہے۔ جو چیزیں ان کے لیے بلند ترین منتہائے نظر ہیں وہ ہمارے لیے اتنی پست ہیں کہ ادنیٰ التفات کی بھی مستحق نہیں۔ اگر ہم ان کے سے رنگ ڈھنگ اختیار کریں گے، انہی کی زبان میں باتیں کریں گے، اور اُنہی گھٹیا درجہ کے مقاصد پر زور دیں گے جن پر وہ فریفتہ ہیں، تو اپنی وقعت کو ہم خود ہی خاک میں ملا دیں گے۔ شیر اگر بکری کی سی بولی بولنے لگے اور بُزغالوں کی طرح گھاس پر ٹوٹ پڑے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جنگل کی بادشاہی سے وہ آپ ہی دست بردار ہو گیا۔ اب وہ اس کی توقع کیسے کر سکتا ہے کہ جنگل کے لوگ اس کی وہ حیثیت تسلیم کریں گے جو شیر کی ہونی چاہیے؟ یہ تعداد کی بنا پر قومی حکومت کے مطالبے، یہ اکثریت و اقلیت کے نوحے، یہ تحفظات اور حقوق کی چیخ پکار، یہ انگریزی سلطنت اور والیانِ ریاست کے ظلِّ عاطفت میں قومی مفاد کے تحفظ کی تدبیریں، اور دوسری طرف یہ آزادی وطن کے نعرے اور پنڈت نہرو کے سُروں میں امپیریلزم کی مخالفت، یہ سب ہمارے لیے بکری کی بولیاں ہیں۔ یہ بولیاں بول کر ہم خود ایک غلط حیثیت اختیار کرتے ہیں اور اپنی حیثیت اس قدر غلط طور پر دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ دنیا ہمیں بکری ہی سمجھنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ خدا نے ہمیں اس سے بہت اونچا منصب دیا ہے۔ ہمارا منصب یہ ہے کہ ہم کھڑے

---

[1] وہی لوگ تھے جن کی اللہ نے رہنمائی کی تھی لہٰذا ان کی ہدایت کی پیروی کرو۔

ہو کر تمام دنیا سے غیر اللہ کی حاکمیت مٹا دیں اور خدا کے بندوں پر خدا کے سوا کسی کی حاکمیت باقی نہ رہنے دیں۔ یہ شیر کا منصب ہے اور اس منصب کو ادا کرنے کے لیے کسی قسم کی بھاری شرائط درکار نہیں ہیں، بلکہ صرف شیر کا دل درکار ہے۔ وہ شیر، شیر نہیں ہے جو اگر پنجرے میں بند ہو تو بکری کی طرح منمنانے لگے، اور شیر وہ بھی نہیں جو بکریوں کی کثرت تعداد کو دیکھ کر یا بھیڑیوں کی چیرہ دستی دیکھ کر اپنی شیریت بھول جائے۔

(ترجمان القرآن۔ مئی و جون ۴۰ ۱۹ء)

اصلی مسلمانوں کے لیے ایک ہی راہِ عمل

پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اسلام تمام عالمِ انسانی کے لیے بنیادی اصلاح کا ایک پیغام اور عملی اصلاح کا ایک انقلابی پروگرام لے کر آیا ہے۔ اس کا پیغام یہ ہے کہ تمام انسان اللہ وحدہٗ لاشریک کی حاکمیت تسلیم کریں حتیٰ کہ اس کے حکم کے سوا ہر دوسرا حکم باطل ہو جائے۔ اور اس کا پروگرام یہ ہے کہ انسانوں میں سے جو لوگ اِس دعوت کو قبول کریں وہ ایک جتھا بنا کر اپنا پورا زور اِس بنیادی اصلاح کو عملاً نافذ کرنے میں صرف کر دیں، یہاں تک کہ اشخاص کی، خاندانوں اور طبقوں کی، قوموں اور نسلوں کی فرماں روائی اور جمہور کی حکومت خود اختیاری بالکلیہ مٹ جائے اور خدا کی سلطنت میں اُس کی رعیت پر صرف اُسی کا قانون عملاً جاری ہو۔ یہی پیغام اور یہی پروگرام انبیاء علیہم السلام ابتدا سے لے کر آتے رہے ہیں۔ اسی ایک مقصد پر انہوں نے اپنی تمام سعی و جہد کو مرکوز کیا ہے۔ اور مسلمان، جو انبیاء کے وارث اور ان کے پیرو ہیں، ان کے لیے بھی اِس کے سوا نہ کوئی دوسرا مقصد ہے اور نہ کوئی دوسری راہِ عمل۔ مسلمانوں کی مختلف سیاسی جماعتوں پر مجھے جو کچھ اعتراض ہے وہ یہی ہے کہ اپنے آپ کو مسلم (یعنی متبعینِ انبیاء) کہنے کے باوجود انہوں نے اس نصب العین اور اس راہِ عمل کو چھوڑ کر ایسے مقاصد اور طریقے اختیار کر لیے ہیں جن کو اسلام سے کوئی دُور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔

اُن لوگوں کو چھوڑ کر جو اسلام کے علم سے بالکل ہی بے بہرہ ہیں، آج تک مجھے کوئی مسلمان، خواہ وہ کسی جماعت سے تعلق رکھتا ہو، ایسا نہیں ملا جس نے اِس اعتراض کو سُن کر اصولی حیثیت سے تسلیم نہ کیا ہو۔ سب مانتے ہیں کہ بلاشبہ مسلمان کا اصلی کام یہی ہے اور اسی منزل کی طرف انبیاء علیہم السّلام نے ہماری رہنمائی کی ہے۔ لیکن جواب میں دو مختلف سمتوں سے دو مختلف آوازیں آتی ہیں:۔

"آزادی پسند" علماء اور اُن کے ہم خیال مسلمان اس راستہ پر آنے کی مشکلات یوں بیان فرماتے ہیں کہ ہندوستان میں اگر صرف مسلمان آباد ہوتے، یا مسلمانوں کی بھاری اکثریت ہوتی، جیسی مصر، ایران، عراق وغیرہ ممالک میں ہے، تب تو ہمارے لیے آسان تھا کہ حکومتِ الٰہیہ کے لیے جدوجہد کرتے، اور اس صورت میں اس کے قائم ہونے کا امکان بھی تھا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ یہاں ہم قلیل التعداد ہیں، اکثریت غیر مسلم ہے، حکومتِ الٰہیہ کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتی ہے، اور صرف مشترک وطنی حکومت ہی کے نصب العین تک اس کی نظر جا سکتی ہے۔ اوپر انگریزی حکومت بیٹھی ہے جو ہمیں اور غیر مسلم ہمسایوں کو ایک ساتھ دبائے ہوئے ہے۔ خود مسلمانوں کی آبادی کا کثیر حصہ بھی اخلاقی و اعتقادی حیثیت سے انتہائی تنزل کی حالت میں ہے۔ لہٰذا اس وقت جو کچھ ہو سکتا ہے وہ یہی ہے کہ مشترک حکومت کے نصب العین کو قبول کر کے، غیر مسلموں کے ساتھ مل کر، انگریزی اقتدار سے نجات حاصل کر لی جائے۔ یہ مرحلہ طے ہونے کے بعد آزاد ہندوستان میں ہم اپنی قوتوں کو پھر مجتمع کریں گے اور اپنے نصب العین کے لیے جدوجہد شروع کر دیں گے۔ اِس کے سوا اور کوئی راستہ اِس وقت قابلِ عمل نہیں ہے۔

دوسری طرف مسلم لیگ اور اس کے ہم خیال لوگ اپنی مشکلات کو ایک دوسرے رنگ میں بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم یہاں اوّل تو قلیل التعداد ہیں، پھر تعلیمی اور معاشی حیثیت سے ہماری قوت بہت کم ہے، اور مزید برآں ایک ایسی تنگ نظر اکثریت نے سیاسی اور معاشی قوتوں کے منابع پر تسلط حاصل کر لیا ہے جو عملاً تو ہم کو ایک الگ قوم سمجھ کر تعلیم حاصل کرنے اور پیٹ بھرنے کے ہر دروازے سے دُور ہٹاتی ہے، مگر

سیاسی اغراض کے لیے اصولاً ہمارے مستقل قومی وجود سے انکار کر دیتی ہے اور چاہتی ہے کہ ہم "ہندوستانی قوم" میں شامل ہو کر یہاں ایک ایسی جمہوری حکومت قائم ہو جانے دیں جس میں سیاسی طاقت کے حصول کا ذریعہ محض ووٹوں کی کثرت ہو۔ اِس مقصد میں اُس کے کامیاب ہو جانے کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم اپنی قومی شخصیت ہی کو سرے سے کھو دیں، پھر بھلا حکومتِ الٰہیہ کا خواب کہاں دیکھا جا سکے گا؟ لہٰذا سر دست اِس کے سوا کوئی قابلِ عمل صورت نہیں ہے کہ جس طرح دنیا کی اور سب قومیں اپنی تنظیم کیا کرتی ہیں اسی طرح ہم بھی اپنی تنظیم کریں، اور دنیا میں جس طرح سیاسی لڑائی لڑی جاتی ہے اُسی طرح ہم بھی لڑ کر سب سے پہلے اُن علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، اُسی جمہوری دستور کے مطابق جو انگریزی تصورِ جمہوریت کے تحت بنتا ہے، اپنی حکومت قائم کر لیں۔ بعد میں جب اختیارات ہمارے ہاتھ میں آ جائیں گے تو ہم مسلمانوں کی تعلیم اور ان کی اخلاق و تمدنی حالت کو درست کر کے رفتہ رفتہ حکومتِ جمہوریہ کو حکومتِ الٰہیہ میں تبدیل کر لیں گے، اور اللہ نے چاہا تو پھر باقی ہندوستان کی بازیافت کے لیے بھی جدّوجہد کرتے رہیں گے۔

بظاہر دونوں فریقوں کے خیالات میں بڑا وزن محسوس ہوتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان زیادہ تر انہی دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جن مشکلات کا یہ لوگ ذکر کرتے ہیں ان میں قطعاً کوئی وزن نہیں ہے، بلکہ خود یہی بات کہ حکومتِ الٰہیہ کے راستے میں انہیں اِس نوعیت کی مشکلات نظر آتی ہیں، اس امر کا صریح ثبوت ہے کہ انہوں نے اسلامی تحریک کے مزاج اور اس کے طریقِ کار (Technique) کو سرے سے سمجھا ہی نہیں۔ زیادہ گہرائی میں جانے کی ضرورت نہیں، اگر اس تحریک کی تاریخ ہمارے سامنے ہو تو بادی النظر ہی میں ان عذرات کی غلطی نمایاں ہو جاتی ہے۔

دنیا میں جہاں کہیں بھی کوئی رسول آیا ہے اکیلا ہی آیا ہے۔ اقلیت اور اکثریت کا کیا سوال، وہاں سرے سے کوئی "مسلمان قوم" موجود ہی نہ تھی۔ ایک فی قوم، بلکہ ایک

نی دنیا کی حیرت انگیز اقلیت کے ساتھ رسول یہ دعویٰ لے کر اُٹھتا ہے کہ مَیں زمین پر خدا کی بادشاہت قائم کرنے آیا ہوں۔ چند گنے چُنے آدمی اُس کے ساتھ ہو جاتے ہیں اور یہ آٹے میں نمک سے بھی کم اقلیت، حکومتِ الٰہیہ کے لیے جدوجہد کرتی ہے۔ اکثریت کا سمندر اس کے ساتھ جو کچھ سلوک کرتا ہے، اُس کے مقابلہ میں ہندوستان کی غیر مسلم اکثریت کے اُس قہر و تسلّط کی سرے سے کوئی حیثیت ہی نہیں ہے جس کا نوحہ کرتے کرتے ہمارے "مسلم قوم پرست" بھائیوں کے آنسو خشک ہوتے جا رہے ہیں۔ دفتروں کی ملازمت، منڈیوں کے کاروبار، اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے معاملات کا کیا ذکر، وہاں سانس لینے کا حق بھی اس اقلیت کو نہیں دیا جاتا تھا۔ پھر حکومت، خواہ وہ ملکی ہو یا غیر ملکی، جس پنجۂ ظلم و شکنجۂ قہر میں اُن کو کستی تھی اُس کو کسی معنی میں بھی ہندوستان کے اُن انگریز فرمانرواؤں کے برتاؤ سے تمثیل نہیں دی جا سکتی جن کے ظلم و جور کا رونا ہمارے "آزادی پسند" بھائی رات دن رویا کرتے ہیں۔ پھر یہ بھی کچھ ضروری نہ تھا کہ بہر حال رسول اور اصحابِ رسول حکومتِ الٰہیہ قائم کرنے میں کامیاب ہو ہی گئے ہوں۔ بارہا وہ اِس مقصد میں ناکام ہوتے ہیں۔ اُن کو اور اُن کے ساتھیوں کو قتل کر دیا گیا ہے، اور خدائی کے جھوٹے مدعیوں نے اپنی دانست میں اس تحریک کا قلع قمع کر کے چھوڑا ہے۔ مگر اس کے باوجود جو لوگ اللہ پر ایمان لاتے تھے، اور جن کے نزدیک کرنے کا کام بس یہی تھا، انہوں نے آخری سانس تک اِسی مقصد کے لیے کام کیا، اور کسی ایک نے بھی اکثریت کا یا حکومت کا رنگ دیکھ کر، یا وقتی و مقامی مشکلات کا خیال کر کے دوسرے راستوں کی طرف ادنیٰ التفات تک نہ کیا۔

پس یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ اِس تحریک کو اُٹھانے اور چلانے کے لیے خارج میں کسی سامان اور ماحول میں کسی سازگاری کی ضرورت ہے۔ جس سامان اور جس سازگار ماحول کو یہ لوگ ڈھونڈتے ہیں وہ نہ کبھی فراہم ہوا ہے، نہ فراہم ہوگا۔ دراصل خارج میں نہیں بلکہ مسلمان کے اپنے باطن میں ایمان کی ضرورت ہے۔ اِس قلبی شہادت کی ضرورت ہے کہ یہی مقصد حق ہے، اور اِس عزم کی ضرورت ہے کہ میرا جینا اور مرنا اِسی مقصد کے لیے ہے۔ یہ ایمان، یہ شہادت، یہ عزم موجود ہو تو دنیا بھر میں ایک اکیلا انسان یہ اعلان

کرنے کے لیے کافی ہے کہ میں زمین پر خدا کی بادشاہت قائم کرنا چاہتا ہوں۔ اُس کی پشت پر کسی منظم اقلیت یا کسی حکومتِ خود اختیاری رکھنے والی اکثریت کی قطعًا کوئی حاجت نہیں۔ نہ اس امر ہی کی کوئی حاجت ہے کہ اس کا ملک پہلے بیرونی قوم کے تسلط سے آزاد ہو جائے۔ بیرونی قوم کیا، اور گھر کی قوم کیا، اللہ کے سوا دوسروں کی حاکمیت تسلیم کرنے والے سب انسان اس کے لیے یکساں ہیں۔ سب کی اُس سے اور اس کی سب سے یکساں لڑائی ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام سے رومیوں نے جو کچھ برتاؤ کیا، اُس سے زیادہ ہولناک برتاؤ وہ تھا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ان کی اپنی قوم نے کیا۔

یہ تو وہ بات ہے جو بادی النظر میں ہر وہ شخص محسوس کر سکتا ہے جس نے قرآن کو سمجھ کر پڑھا ہے۔ لیکن ذرا زیادہ گہری نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس نوعیت کی مشکلات کو یہ لوگ اپنی راہ میں حائل پا رہے ہیں وہ دراصل ایک قوم کی مشکلات ہیں نہ کہ ایک تحریک کی۔ جہاں ایک قوم اپنی زندگی اور اپنی قومی اغراض کے لیے جدوجہد کر رہی ہو وہاں تو بلاشبہ اسی قسم کے مسائل درپیش ہوتے ہیں۔ اُس کے لیے اِن سوالات میں بڑی اہمیت ہوتی ہے کہ جس ملک میں وہ آباد ہے وہاں اس کی تعداد کتنی ہے؟ اس میں تنظیم ہے یا نہیں؟ اس کی تعلیمی حالت کیسی ہے؟ اس کی معاشی حالت کیسی ہے؟ اس کے اوپر ایک پتھر کا بوجھ ہے یا دو پتھروں کا؟ انہی سوالات کے جوابات پر اس کا مستقبل منحصر ہوتا ہے، اور انہی سوالات کے لحاظ سے اس کو اپنی پالیسی متعین کرنی پڑتی ہے۔ مگر ایک اصولی تحریک جو کسی خاص قوم کی اغراض سے وابستہ نہ ہو بلکہ انسانی زندگی کی صلاح و فلاح کے لیے وہ ایک دعوت لے کر اُٹھے اس کے سامنے اِن سوالات میں سے کوئی سوال بھی نہیں ہوتا۔ اُس کے مسائل کی نوعیت بالکل دوسری ہوتی ہے۔ اُس کی کامیابی و ناکامی کا انحصار اِس پر ہوتا ہے کہ اس کے اصول بجائے خود معقول ہیں یا نہیں؟ وہ انسانی زندگی کے مسائل کو کہاں تک حل کرتے ہیں؟ وہ بالعموم فطرتِ انسانی کو کس حد تک اپیل کرتے ہیں؟ اور اس کی طرف دعوت دینے والے خود اس کی پیروی میں کتنے مخلص اور کتنے صادق العزم ہیں؟

مسلمانوں کو جو کچھ بھی پریشانی پیش آرہی ہے اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ اُن کے سوچنے والے دماغوں نے اپنی حیثیت کو اِن دو مختلف حیثیتوں کے درمیان خلط ملط کر دیا ہے۔ کبھی تو یہ اُن عزائم اور مقاصد کا اظہار کرتے ہیں جن کا تعلق اسلامی تحریک سے ہے، اور ان کی باتوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ ایک اصولی تحریک کے پیرو اور داعی ہیں۔ اور کبھی یہ محض ایک قوم بن کر رہ جاتے ہیں، اُس طرح سوچنے لگتے ہیں جس طرح قومیں سوچا کرتی ہیں، ایسے مسائل میں اُلجھ جاتے ہیں جو صرف قوموں ہی کو پیش آتے ہیں، اور اپنے اِس طرزِ فکر کی وجہ سے اُن مشکلات کو سدِّ راہ پاتے ہیں جو محض قومی مقاصد ہی کے لیے سدِّ راہ ہوا کرتی ہیں۔ ان لوگوں نے آج تک اِن دونوں حیثیتوں کے فرق کو نہیں سمجھا، نہ واضح طور پر فیصلہ کیا کہ دراصل یہ ہیں کیا۔ اسی لیے یہ کوئی ایسی پالیسی ابھی تک اپنے لیے متعین نہ کر سکے جو تناقض سے خالی اور اُلجھاؤ سے پاک ہو۔

یہ ایک کھُلی ہوئی بات ہے کہ قومیت اور قومی اغراض قابلِ تبلیغ چیزیں نہیں ہیں۔ مثلاً جرمنیت، اطالویت، انگریزیت یا ہندوئیت کے متعلق کوئی شخص بھی یہ تصوّر نہیں کر سکتا کہ ان کی طرف دوسروں کو دعوت دی جا سکتی ہے۔ یہ کوئی اصول نہیں ہیں کہ ہر انسان کے سامنے انہیں پیش کیا جا سکے۔ یہ تو نسل، تاریخ اور تمدّن کے بنے ہوئے بے لچک دائرے ہیں۔ اِن دائروں کے مفاد اور مقاصد سے جو کچھ بھی دلچسپی ہو سکتی ہے اُنہی لوگوں کو ہو سکتی ہے جو اِن دائروں کے اندر پیدا ہوتے ہوں۔ دوسرے دائروں کے لوگوں کو ان سے دلچسپی ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ایک جرمن اپنی جرمنیت کی بنیاد پر کوئی کام کرنا چاہے تو لامحالہ وہ جرمنوں ہی سے ہمدردی و اعانت کی توقع کر سکتا ہے۔ انگریز کو کیا پڑی ہے کہ جرمنیت کی زندگی یا اس کی برتری کے معاملہ میں اس کا ساتھ دے۔ جرمنوں کا بول بالا کرنے کی تڑپ تو صرف جرمنوں ہی میں پیدا ہو سکتی ہے، اور یہ بالکل فطری بات ہے کہ ان کے مقابلہ میں انگریز بھی متحد ہو کر اپنا بول بالا کرنے یا رکھنے کے لیے سینہ سپر ہو جائیں۔ یہ ضرور ممکن ہے کہ دونوں فریق ایک دوسرے کے بعض افراد کو ناجائز ذرائع سے خرید کر اپنا آلۂ کار بنا لیں، مگر یہ ممکن نہیں ہے کہ انگریز جرمنیت پر ایمان لا کر جرمنوں کا ولیِ حمیم بن جائے یا جرمن انگریزیت اختیار

کر کے انگریزوں کا حامی و ناصر بن جائے وہی وجہ ہے کہ جہاں دو قوموں کے درمیان موافقت ہوتی ہے وہاں محض خود غرضی کی موافقت ہوا کرتی ہے اور صرف اُس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک خود غرضی اس کی مقتضی ہو۔ اور جہاں ان کے درمیان کشمکش و مزاحمت ہوتی ہے وہاں دونوں کو صرف اپنی قومی طاقت، اپنی تنظیم، اپنے معاشی وسائل، اپنی تعداد، اور اپنے آلاتِ جنگ ہی پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ اس اعتبار سے جو قوم کمزور ہو وہ پس جاتی ہے اور جو طاقت ور ہو وہ اُسے پیس ڈالتی ہے۔ جرمنی کے مقابلہ میں پولینڈ، ڈنمارک، ناروے، ہالینڈ، بلجیم اور فرانس کیوں مغلوب ہو گئے؟ فن لینڈ اور رومانیا کو روس اور جرمنی سے کیوں دبنا پڑا؟ اسی لیے کہ مقابلہ ایک قوم اور دوسری قوم کا تھا۔ دونوں طرف قومیتیں تھیں۔ لہٰذا جس کی قومیت تعداد اور آلات و وسائل اور تنظیم میں بڑھی ہوئی تھی اس نے کمزور کو دبا لیا۔ کوئی فریق بھی خالص انسانیت کی بنیاد پر ایسے اصول لے کر نہ اُٹھا تھا کہ مخالف فریق کے انسانوں کو اپیل کرتا اور یہ ممکن ہوتا کہ خود دشمنوں میں سے اس کو دوست ملتے چلے جاتے۔

یہ ہوتی ہے ایک قوم کی حیثیت۔ اب غور کیجیے کہ فی الحقیقت کیا مسلمانوں کی حیثیت اُس دنیا میں یا اس ہندوستان میں یہی ہے؟ کیا ہم محض نسل، تاریخ اور موروثی تمدن کا بنایا ہوا ایک ایسا گروہ (Group) ہیں جس کی قومیت دنیا کی تمام قومیتوں کی طرح ناقابلِ تبلیغ ہو؟ کیا ہمارے مقاصد کی نوعیت بھی اُنہی قومی اغراض و مقاصد کی سی ہے جن پر دوسری قوموں کا ایمان لانا فطرتاً غیر ممکن ہوتا ہے؟ کیا ہمارے مقاصد اُسی قسم کے قومی مقاصد ہیں جن کا حصول صرف ایک قوم کی تعداد، تنظیم اور وسائل ہی پر موقوف ہوتا ہے؟ کیا وہ اسلامی حکومت جس کا ہم نام لیا کرتے ہیں محض ایک قومی ریاست (National State) ہے جس کے قیام کی بنیاد ایک قوم کی کثرتِ تعداد ہوا کرتی ہے؟ کیا قلیل التعداد ہونے کی صورت میں ہماری حیثیت واقعی ایک قومی اقلیت (National Minority) کی رہ جاتی ہے جس کے لیے اکثریت کے ساتھ ہم آہنگ ہونے یا پھر اپنی انفرادیت کے تحفظ کی تدبیریں اختیار کرنے کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہیں ہوتا؟ کیا حقیقت میں دنیا کی

دوسری قوموں کی طرح ہمارے لیے بھی آزادی کا یہی مفہوم ہے کہ ہمیں غیر قوم کی حکومت سے نجات حاصل ہو جائے؟ اور کیا اپنی قوم کی حکومت یا اپنے اہلِ وطن کی حکومت قائم ہو جانا ہمارے مقاصد کے لیے بھی ضروری ہے؟

اگر واقعی یہی ہماری حیثیت ہے تو بلاشُبہ وہ سب کچھ صحیح ہے جو مسلمانوں کی مختلف جماعتیں اس وقت کر رہی ہیں۔ غیر مسلم ہمسایوں کے ساتھ مل کر آزادی کی جدوجہد بھی صحیح، برطانوی حکومت اور دیسی ریاستوں کا سہارا لے کر ہندو امپیریلیزم کا مقابلہ بھی صحیح، فوج میں اور سرکاری ملازمتوں میں اور انتخابی مجالس میں اپنی نمائندگی کا جھگڑا بھی صحیح، مسلم ریاستوں کی حمایت بھی صحیح، تقسیمِ ملک کا مطالبہ بھی صحیح، خاکساروں کی فوجی تنظیم بھی صحیح، اور وہ مسلم قوم پرستی بھی صحیح جس کی بنا پر حق اور اصول سے قطع نظر کر کے ہر اُس فائدے کو دانتوں سے پکڑا جاتا ہے جو مسلمان قوم یا مسلمان اشخاص کو حاصل ہوتا ہو۔ غرض یہ سب کچھ صحیح ہے کیونکہ قومیت کا آئین یہی ہے، قومیں یونہی کام کیا کرتی ہیں، اور ایک قوم جو کسی اصول کی علمبردار نہیں بلکہ محض اپنی قومی بہتری کی خواہش مند ہو، اِن تدابیر کے سوا آخر اور کیا تدبیریں اختیار کر سکتی ہے؟ البتہ ان سب چیزوں کے ساتھ اگر کوئی بات غیر صحیح ہے تو وہ ہماری یہ خوش فہمی ہے کہ یہ حیثیت اختیار کرنے کے بعد بھی ہم اس زمین پر حکومتِ الٰہیہ قائم کر سکیں گے، حالانکہ اس حیثیت میں یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر ہو ہی نہیں سکتا۔

دراصل ایک ملک پر نہیں بلکہ ساری دنیا پر چھا جانے کی قوت اگر ہے تو وہ صرف ایک ایسی اصولی تحریک میں ہے جو انسان کو بحیثیتِ انسان خطاب کرتی ہو اور اس کے سامنے خود اس کی اپنی فلاح کے فطری اصول پیش کرتی ہو۔ قومیت کے برعکس ایسی تحریک ایک تبلیغی طاقت ہوتی ہے۔ قومیت کے حصار، نسلوں کے تعصبات، قومی ریاستوں کے مضبوط بند، کوئی چیز بھی اُس کا راستہ نہیں روک سکتی۔ وہ ہر طرف، ہر جگہ نفوذ کرتی چلی جاتی ہے۔ اس کی طاقت کا انحصار اپنے پیروؤں کی تعداد یا ان کے وسائل پر نہیں ہوتا۔ ایک اکیلا آدمی اس کو اُٹھانے کے لیے کافی ہے۔ پھر وہ خود اپنے اصولوں کی طاقت سے آگے بڑھتی ہے۔ وہ اپنے دشمنوں میں سے دوست پیدا کرتی ہے۔ سب قوموں میں سے

آدمی ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے جھنڈے کے نیچے آنے لگتے ہیں اور وسائل اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ جو فوجیں اس سے لڑنے آتی ہیں اُن پر وہ صرف اپنی توپ و تفنگ سے ہی آتشباری نہیں کرتی بلکہ اپنی تعلیم اور اپنے اصولوں کے تیر بھی چلاتی ہے۔ خون کے پیاسے دشمنوں میں سے وہ اپنے سرگرم حامی ڈھونڈ نکالتی ہے۔ سپاہی، جنرل، ماہرینِ فنون، سرمایہ دار، صناع اور کاریگر سب انہی میں سے اس کو مل جاتے ہیں، اور بے سرو سامانی میں سے ہر قسم کا سامان نکلتا چلا آتا ہے۔ قومیتیں اس کے سیلاب کے مقابلہ میں کبھی نہیں ٹھہر سکتیں۔ بڑے بڑے پہاڑ اس کے سامنے آتے ہیں اور نمک کی طرح پگھل پگھل کر اس آبِ رواں میں جذب ہو جاتے ہیں۔ اس کے لیے اقلیت اور اکثریت کے سارے سوالات بے معنی ہیں۔ وہ اس کی ہرگز محتاج نہیں ہوتی کہ کسی منظم اور باوسیلہ قوم کی طاقت اس کی پشت پر ہو۔ وہ تو قومی حکومت قائم کرنے نہیں اُٹھتی کہ قومیں اس کی مزاحمت کر سکیں۔ اُسے تو ایک ایسے اصول کی حکومت قائم کرنی ہوتی ہے جو سب قوموں کے لوگوں کی فطرت کو اپیل کرتا ہے۔ جاہلی تعصبات کچھ دیر تک اس سے لڑتے رہتے ہیں، مگر جب فطرتِ انسانی پر لگا ہوا زنگ چھوٹتا ہے تو وہ کیفیت ہوتی ہے کہ:

همه آهوانِ صحرا سرِ خود نهاده بر کف
بامید آنکه روزے به شکار خواهی آمد

مسلمان قرآن اور سیرتِ رسولؐ کے آئینے میں اپنی صورت دیکھیں۔ جس چیز کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، کہیں وہ اسی نوعیت کی تحریک تو نہیں ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ قوموں کے درمیان رہتے رہتے اور انہی جیسی تعلیم و تربیت پا کر اپنی اصلی حیثیت بھول گئے ہوں اور خواہ مخواہ اپنے آپ کو قوم کہتے کہتے انہوں نے وہ سب محدودیتیں بھی اپنے خیال میں خود اپنے اوپر عائد کر لی ہوں جو ایک قلیل الوسائل قوم کے لیے مخصوص ہوتی ہیں؟

اگر واقعہ یہی ہے اور مسلمانوں کی اصل حیثیت ایک عالمگیر اصولی تحریک کے پیرووں اور داعیوں کی ہے تو وہ سارے مسائل یک قلم اُڑ جاتے ہیں جن پر اب تک مسلمانوں کے سیاسی

مذہبی رہنما وقت ضائع کرتے رہے ہیں۔ پوری صورتِ حال بالکل بدل جاتی ہے۔ مسلم لیگ، احرار، خاکسار، جمعیۃ العلماء اور آزاد کانفرنس، سب کی اِس وقت تک کی تمام کارروائیاں حرفِ باطل کی طرح محو کر دینے کے لائق ٹھیرتی ہیں۔ نہ ہم قومی اقلیت ہیں، نہ آبادی کے فیصدی تناسب پر ہمارے وزن کا انحصار ہے، نہ ہندوؤں سے ہمارا کوئی قومی جھگڑا ہے، نہ انگریزوں سے وطنیت کی بنیاد پر ہماری لڑائی ہے، نہ اُن ریاستوں سے ہمارا کوئی رشتہ ہے جہاں نام نہاد مسلمان فرمانروا بنے بیٹھے ہیں، نہ اقلیت کی حیثیت سے اپنے تحفظ کی ہمیں ضرورت ہے، نہ اکثریت کی بنیاد پر اپنی قومی حکومت ہمیں مطلوب ہے۔ ہمارے سامنے تو صرف ایک مقصد ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ کے بندے اللہ کے سوا کسی کے محکوم نہ ہوں، بندوں کی حاکمیت ختم ہو جائے اور حکومت اس قانونِ عدل کی قائم ہو جو اللہ نے خود بھیجا ہے۔ اس مقصد کو ہم انگریز، والیانِ ریاست، ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی اور مردم شماری کے مسلمان، سب کے سامنے پیش کریں گے۔ جو اسے قبول کرے گا وہ ہمارا رفیق ہے، اور جو اس سے انکار کرے گا اس سے ہماری لڑائی ہے بلا لحاظ اس کے کہ اُس کی طاقت کتنی ہے اور ہماری کتنی۔

یہ حیثیت اختیار کرنے اور اِس تحریک کو لے کر اُٹھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے شخصی اور قومی مفاد و اغراض کو بھول جائیں، تمام تعصبات سے بالاتر ہو جائیں اور چھوٹی چھوٹی چیزوں سے نظر ہٹا لیں جن سے ہمارے حقیر دنیوی فوائد کا تعلق ہے۔ اگر ہم میں ہندستانیت کا تعصب ہو گا تو فطری بات ہے کہ انگریز اور ہر غیر ہندوستانی کے کان ہماری دعوت کے لیے بہرے ہو جائیں گے۔ اگر ہم نام نہاد مسلم قوم کے تعصب میں مبتلا ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہندو یا سکھ یا عیسائی کے دل کا دروازہ ہماری پکار کے لیے کھل جائے۔ اگر ہم حیدرآباد، بھوپال، بہاول پور اور رامپور جیسی ریاستوں کی حمایت محض اس لیے کریں کہ ان کے رئیس مسلمان ہیں اور ان سے مسلمانوں کو کچھ معاشی سہارا مل جاتا ہے، تو کوئی احمق ہی ہو گا جو اس کے بعد بھی یہ باور کر لے گا کہ ہم اسلام کے نظریۂ سیاسی پر ایمان رکھتے ہیں اور واقعی حکومتِ الٰہی قائم کرنا ہمارا نصب العین ہے۔ اگر ہم غیر مسلم حکومت کی ملازمت اور غیر اسلامی جمہوری ادارات میں مسلمانوں کی نمائندگی پر جھگڑا کریں تو ہماری اس آواز میں کوئی وزن باقی نہ رہے گا کہ ہم اصولِ

اسلام کی فرمانروائی قائم کرنے اُٹھے ہیں۔ اگر ہم تناسب آبادی کے لحاظ سے تقسیم ملک کا مطالبہ کریں تو غیر مسلموں کو ہم میں اور خود اپنے آپ میں سرے سے کوئی فرق ہی محسوس نہ ہوگا کہ وہ اپنا مقام چھوڑ کر ہماری دعوت پر لبیک کہنے کی کوئی ضرورت سمجھیں۔ اگر ہم غیر اسلامی اصول پر مشترک وطنی حکومت قائم کرنے میں حصہ لیں تو ہمارے اس فعل میں اور ہماری اس دعوت میں ایسا صریح تناقض ہوگا کہ ہماری صداقت کیا معنی صحتِ عقل تک مشتبہ ہو کر رہ جائے گی۔ اس راستے پر چلنے کے لیے ہمیں یہ سب کچھ چھوڑنا ہوگا۔ بلاشبہ ہمیں اس سے بہت نقصانات پہنچیں گے، مگر ایسے نقصانات اُٹھائے بغیر اسلامی تحریک نہ کبھی چلی ہے نہ چل سکتی ہے۔ جو کچھ جاتا ہے جانے دو۔ سیدنا مسیحؑ کے قول کے مطابق جُبّہ جاتا ہے تو کُرتا بھی چھوڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ تب ہی خدا کی بادشاہت زمین پر قائم ہو سکے گی۔

(ترجمان القرآن۔ جولائی ۱۹۴۰ء)

اسلام کی راہِ راست اور اس سے انحراف کی راہیں

مسلمانوں میں سے جو لوگ پاکستان کے نصب العین پر اپنی نظر جماتے ہوتے ہیں، اور جو انگریزی حکومت سے ہندوستان کی آزادی پر اپنی تمام امیدوں کا انحصار رکھتے ہیں، اور جو ان دونوں کے درمیان مختلف راہیں تلاش کر رہے ہیں، ان سب کے اندر ایک چیز مجھے مشترک نظر آتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ اسلام کے اصل نصب العین کی طرف براہِ راست پیش قدمی کرنے سے یہ سب لوگ جھجکتے ہیں۔ مشکلات کا ایک بہت بڑا پہاڑ ان کو اس راستہ میں حائل نظر آتا ہے اور اس کو دور سے دیکھ کر یہ دائیں یا بائیں جانب مڑ جاتے ہیں تاکہ پھیر کے راستوں سے نکل جائیں۔ حالانکہ میں علیٰ وجہ البصیرت یہ سمجھتا ہوں کہ اسلامی نصب العین تک کسی پھیر کے راستے سے پہنچنا غیر ممکن ہے۔ اس کی طرف اگر پیش قدمی کی جا سکتی ہے تو براہِ راست ہی کی جا سکتی ہے، اور جو مشکلات اس راستہ میں نظر آتی ہیں وہ ناقابلِ عبور نہیں ہیں، بشرطیکہ ان کو صحیح طور سے سمجھنے اور دور کرنے کی کوشش کی جائے۔

اوپر کے فقرے میں جو مجمل دعویٰ میں نے کیا ہے اب میں اس کا تجزیہ کر کے ایک ایک جزء پر الگ الگ بحث کروں گا۔

۱۔ اصل اسلامی نصب العین کیا ہے؟

۲- اس کی طرف پیش قدمی کا سیدھا راستہ کون سا ہے؟
۳- اس راستہ میں جو مشکلات نظر آتی ہیں وہ کیا ہیں؟
۴- ان مشکلات کو دیکھ کر کتنے پھیر کے راستے کون کون سے اختیار کیے جا رہے ہیں؟
۵- ان مختلف راستوں میں غلطی کیا ہے اور یہ اصل مقصود تک کیوں نہیں پہنچا سکتے؟
۶- مشکلات کی حقیقی نوعیت کیا ہے اور وہ کس طرح دور ہو سکتی ہیں؟

یہ سوالات ہیں جن پر مجھے اس مضمون میں مختصراً بحث کرنی ہے۔

۱- اسلامی نصب العین

پہلے سوال کا جواب قرآن مجید میں جو کچھ دیا گیا ہے وہ یہ ہے:-

هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۔

(التوبہ- آیت ۳۳)

"وہی ہے (یعنی اللہ) جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس کو پوری جنسِ دین پر غالب کر دے خواہ یہ کام مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔"

اس آیت میں اَلْھُدٰی (ہدایت) سے مراد دنیا میں زندگی بسر کرنے کا صحیح طریقہ ہے۔ انفرادی برتاؤ، خاندانی نظام، سوسائٹی کی ترکیب، معاشی معاملات، ملکی انتظام، سیاسی حکمتِ عملی، بین الاقوامی تعلقات، غرض زندگی کے تمام پہلوؤں میں انسانی زندگی کے لیے صحیح رویّہ کیا ہونا چاہیے، یہ چیز اللہ نے اپنے رسول کو بتا کر بھیجا ہے۔

دوسری چیز جو اللہ کا رسول لے کر آیا ہے وہ دینِ حق ہے۔ دین کے معنی اطاعت کے ہیں۔ کیش اور مذہب کے لیے جو دین کا لفظ استعمال ہوتا ہے، یہ اس کا اصل مفہوم نہیں ہے بلکہ اس کو دین اس وجہ سے کہتے ہیں کہ اس میں بھی انسان خیال و

عمل کے ایک خاص سسٹم کی اطاعت کرتا ہے۔ دراصل "دین" کا لفظ قریب قریب وہی معنی رکھتا ہے جو زمانۂ حال میں "اسٹیٹ" کے معنی ہیں۔ لوگوں کا کسی بالاتر اقتدار کو تسلیم کرکے اس کی اطاعت کرنا، یہ "اسٹیٹ" ہے۔ یہی "دین" کا مفہوم بھی ہے۔ اور "دین حق" یہ ہے کہ انسان دوسرے انسانوں کی، خود اپنے نفس کی اور تمام مخلوقات کی بندگی و اطاعت چھوڑ کر صرف اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کرے اور اُسی کی بندگی و اطاعت اختیار کرے پس درحقیقت اللہ کا رسول اپنے بھیجنے والے کی طرف سے ایک ایسے "اسٹیٹ" کا نظام لے کر آیا ہے جس میں نہ تو انسان کی خود اختیاری کے لیے کوئی جگہ ہے، نہ انسان پر انسان کی حاکمیت کے لیے کوئی مقام، بلکہ حاکمیت اور اقتدارِ اعلیٰ جو کچھ بھی ہے صرف اللہ کے لیے ہے۔[1]

---

[1] اِس آیت کی تفسیر میں جو کچھ میں نے لکھا ہے اس کے سمجھنے میں بہت سے لوگوں کو غلط فہمی ہوتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک کسی شخص کی نظر جدید نظریہ ریاست (Theory of State) پر نہ ہو اس کے لیے اِس مضمون کا سمجھنا مشکل ہے۔ موجودہ زمانہ میں اسٹیٹ محض اُس انتظامی مشینری کا نام نہیں ہے جو اندرونی نظمِ مملکت کا تحفظ اور بیرونی حملوں کی مدافعت کرتی ہے۔ بلکہ آج کل کا اسٹیٹ درحقیقت پوری انسانی زندگی کا ٹھیک اُسی طرح احاطہ کرتا ہے جس طرح مذہب کرتا ہے۔ اشتراکی اسٹیٹ ہو یا فاشسٹی یا جمہوری، ہر ایک کی بنیاد میں ایک خاص مابعد الطبیعی نظریہ ہے، ایک خاص تصورِ کائنات ہے، ایک خاص تصورِ انسان ہے، ایک خاص فلسفۂ اخلاق اور ایک خاص اجتماعی فلسفہ ہے پھر ان میں سے ہر ایک اپنے مخصوص فلسفہ کے لحاظ سے ایک مقتدرِ اعلیٰ کا تعین کرتا ہے (شاہ، قوم یا باشندگانِ ملک یا کمیونٹی) جس کی نیابت و خلافت کسی ڈکٹیٹر، یا پارلیمنٹ یا پارٹی کے سپرد ہوتی ہے۔ پھر اسٹیٹ کے حدود میں رہنے والے تمام افراد سے اس مقتدرِ اعلیٰ کی حاکمیت تسلیم کرنے اور اس کی غیر محدود اطاعت کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ افراد کی زندگی اور بحیثیت مجموعی سوسائٹی کی زندگی کا کوئی شعبہ اسٹیٹ کی گرفت سے باہر نہیں ہوتا۔ اسٹیٹ ہی اپنے نظریات کے مطابق ان کی تعلیم اور تعمیر سیرت کا ذمہ لیتا ہے، اسٹیٹ ہی اپنے فلسفۂ اخلاق کے مطابق ان کے (باقی صفحہ ۲۲ پر)

پھر رسول کے بھیجنے کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اُس نظامِ اطاعت (دین) اور اُس

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۳ سے) لیے اخلاقی معیار مقرر کرتا ہے۔ اسٹیٹ ہی ان کی زندگی کے لیے قوانین وضع کرتا ہے اور حلال وحرام کے حدود مقرر کرتا ہے۔ اور اسٹیٹ ہی یہ طے کرتا ہے کہ وہ اپنی سعی و جہد کن راہوں میں صرف کریں اور کن میں نہ کریں۔ اگرچہ اسٹیٹ کی یہی حقیقت ہر زمانہ میں تھی اور اسی بنا پر کہا گیا تھا کہ اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِہِمْ، مگر پہلے اِس حقیقت پر پردہ پڑا ہوا تھا اور اب یہ بالکل کھل کر سامنے آگئی ہے اور تمام دنیا میں یہی نظریۂ ریاست مسلّم ہو چکا ہے۔

اب غور کیجیے کہ دین اس کے سوا اور کس چیز کا نام ہے؟ ایک مابعد الطبیعی عقیدہ، ایک مقتدرِ اعلیٰ کا تصور جس سے بالاتر کوئی اقتدار (Authority) نہ ہو، اُس مقتدرِ اعلیٰ کی حاکمیت تسلیم کرنا اور اپنے آپ کو اُس کی اطاعت میں دے دینا، ایک فلسفۂ اخلاق و فلسفۂ اجتماع (Social Philosophy) جس پر زندگی کا پورا انتظام قائم ہو، ایک ہمہ گیر قانون جو تمام معاملاتِ زندگی کا احاطہ کرلے، انہی چیزوں کے مجموعہ کا نام تو دین ہے۔ اسی بنا پر خود آج کل کے مغربی فلاسفہ و مفکرین بھی یہ کہنے لگے ہیں کہ موجودہ دور کے اسٹیٹ نے خدا اور مذہب کی جگہ لے لی ہے۔ فرق اگر کچھ ہے تو صرف اس حیثیت سے ہے کہ جو شخص ان ریاستوں میں سے کسی کی اطاعت کرتا ہے اور اسی کی اطاعت کے برحق ہونے کا اعتقاد بھی رکھتا ہے وہ مومن بغیر اللہ و مسلم لغیر اللہ ہے، اور جو ان کے برحق ہونے کا منکر اور اللہ کا معتقد ہے مگر ان کی اطاعت پر بلبغی ہے وہ مومن باللہ و مسلم لغیر اللہ ہے۔ بخلاف اس کے انبیاء علیہم السلام جو دعوت لے کر آئے تھے وہ یہ تھی کہ لوگ مومن باللہ اور مسلم للہ ہو جائیں، اللہ ہی کو مقتدرِ اعلیٰ تسلیم کریں، اسی کی اطاعت قبول کریں اور ان کی پوری زندگی پر وہی ہمہ گیر ضابطۂ اخلاق و قانون محیط ہو جو اللہ نے مقرر کیا ہے۔

اس چیز کو میں جن الفاظ میں بیان کرتا ہوں، بلاشبہ وہ متقدمین کے ہاں کہیں نہ ملیں گے، کیونکہ اُس وقت یہ الفاظ اِن معانی کے ساتھ مستعمل نہ ہوتے تھے۔ مگر انصاف کیساتھ دیکھیے کہ جس حقیقت کو میں بیان کر رہا ہوں، کیا وہی قرآن میں بیان نہیں ہوتی ہے اور کیا اسی کو تمام ائمہ بیان نہیں کرتے چلے آرہے ہیں؟ افسوس یہ ہے کہ لوگ قرآن پڑھتے ہیں مگر (باقی صفحہ ۱۲۵ پر)

قانونِ حیات (الہُدیٰ) کو پوری جنسِ دین پر غالب کر دے۔ پوری جنسِ دین سے کیا مُراد ہے؟ دنیا میں انسان انفرادی یا اجتماعی طور پر جن جن صورتوں سے کسی کی اطاعت کرتا ہے وہ سب "جنسِ دین" کی مختلف انواع ہیں۔ بیٹے کا والدین کی اطاعت کرنا، بیوی کا شوہر کی اطاعت کرنا، نوکر کا آقا کی اطاعت کرنا، ماتحت کا افسر کی اطاعت کرنا، رعیت کا حکومت کی اطاعت کرنا، پیروؤں کا پیشواؤں اور لیڈروں کی اطاعت کرنا، یہ اور ایسی ہی بے شمار اطاعتیں بحیثیتِ مجموعی ایک نظامِ اطاعت بناتی ہیں اور اللہ کی طرف سے رسول کے آنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ پورا نظامِ اطاعت اپنے تمام اجزا سمیت ایک بڑی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۴ سے) سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ تمام انبیا نے یہی کہا ہے کہ اللہ ہی کو الٰہ اور رب (یعنی ہر حیثیت سے مقتدرِ اعلیٰ) تسلیم کرو، اسی کی بندگی اختیار کرو، اور جو ضابطۂ اخلاق و قانون (نظامِ شریعت) ہم اس کی طرف سے لے کر آتے ہیں اسی کی پیروی کرو۔ اور میں نے اسٹیٹ کی جو تعریف بیان کی ہے اس کو سامنے رکھ کر دیکھیے، انبیاء علیہم السلام نے اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ کا عقیدہ، انسان کی طرف سے اس کی تسلیم و اطاعت، اور انسانی زندگی پر شریعتِ الٰہی کے نفاذ کا مطالبہ جو پیش کیا تھا وہ ایک الٰہی اسٹیٹ یا حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی دعوت کے سوا اور کیا تھا؟ اگر معترضین اس کے قائل نہیں ہیں تو وہ مجھے بتائیں کہ انبیاء آخر یہ شریعتیں لے کر کیوں آتے تھے؟ یہ حرام و حلال کے حدود کس لیے تھے؟ یہ دیوانی و فوجداری کے قوانین کیوں انہوں نے پیش کیے تھے؟ یہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (المائدہ۔ ۴۵) اور فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى (البقرہ۔ ۲۵۶) اور اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ (یوسف۔ ۴۰) کا اعلان کیوں کیا جاتا تھا؟ اور ہر نبی یہ کیوں کہتا تھا کہ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ؟ "اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو"۔ کیا یہ شریعتیں اس حیثیت سے آتی تھیں کہ یہ بھی برحق ہوں اور انسانی ساخت کے قوانین بھی برحق ہوں اور انسان کے لیے یکساں جائز ہو کہ چاہے ان کی پیروی کرے اور چاہے اُن کی؟ (ترجمان القرآن۔ ستمبر، اکتوبر، نومبر ۱۹۴۱ء)

اطاعت اور ایک بڑے قانون کے ماتحت ہو جاتے، تمام اطاعتیں اللہ کی اطاعت کے تابع ہوں، اُن سب کو منضبط (Regulate) کرنے والا ایک اللہ ہی کا قانون ہو، اور اِس بڑی اطاعت اور اس ضابطۂ قانون کی حدود سے باہر کوئی اطاعت باقی نہ رہے۔

یہ رسول کا مشن ہے اور رسول اِس مشن کو پورا کرنے پر مامور ہے، خواہ شرک کرنے والے اس پر کتنی ہی ناک بھوں چڑھائیں۔ شرک کرنے والے کون ہیں؟ وہ سب لوگ جو اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں اللہ کی اطاعت کے ساتھ دوسری مستقل بالذات (یعنی خدا کی اطاعت سے آزاد) اطاعتیں شریک کرتے ہیں۔ جہاں تک اللہ کے قانونِ طبیعی (Law of Nature) کا تعلق ہے، ہر انسان طوعاً و کرہاً اس کی اطاعت کر رہا ہے کیونکہ اس کے بغیر تو اس کے لیے کوئی چارہ ہی نہیں ہے۔ مگر جہاں تک انسان کے دائرۂ اختیار کا تعلق ہے، اِس دائرے میں بعض انسان تو بالکل ہی غیر اللہ کے مطیع بن جاتے ہیں اور بعض انسان اپنی زندگی کو مختلف حصّوں میں تقسیم کر کے کسی حصّہ میں خدا کے بھیجے ہوئے قانونِ اخلاقی (شریعت) کی اطاعت کرتے ہیں اور کسی دوسرے حصّے میں اپنے نفس یا دوسروں کی اطاعت بجالاتے ہیں۔ اسی چیز کا نام اللہ کی اطاعت کے ساتھ دوسری اطاعتوں کو شریک کرنا ہے، اور جو لوگ شرک کی ان مختلف صورتوں میں مبتلا ہیں، ان کو یہ بات ناگوار ہوتی ہے کہ اپنی فطری اطاعت کی طرح اپنی اختیاری اطاعت و بندگی کو بھی بالکلیۃً اللہ کے لیے خالص کر دیں۔ خواہ نادانی کے سبب سے، یا اخلاقی کمزوری کے سبب سے، بہر حال وہ شرک پر اصرار کرتے ہیں۔ لیکن اللہ کے رسول پر یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ ایسے لوگوں کی مزاحمت کے باوجود اپنے مشن کو پورا کرے۔

۲۔ اس نصب العین تک پہنچنے کا سیدھا راستہ

یہ ہے اسلامی نصب العین، اور اس نصب العین کی طرف پیش قدمی کرنے کے لیے راہِ راست وہی ہے جو اللہ کے رسول نے اختیار کی، یعنی یہ کہ لوگوں کو "اُلہدیٰ" اور "دینِ حق" کی طرف دعوت دی جائے۔ پھر جو لوگ اس دعوت کو قبول کر کے اپنی بندگی و

اطاعت کو اللہ کے لیے خالص کر دیں، دوسری اطاعتوں کو اللہ کی اطاعت کے ساتھ شریک کرنا چھوڑ دیں، اور خدا کے قانون کو اپنی زندگی کا قانون بنالیں، ان کا ایک مضبوط جتھا بنایا جائے۔ پھر یہ جتھا تمام اُن اخلاقی، علمی اور مادی ذرائع سے جو اس کے امکان میں ہوں، دینِ حق کو قائم کرنے کے لیے جہادِ کبیر کرے، یہاں تک کہ اللہ کے سوا دوسری اطاعتیں جن جن طاقتوں کے بل پر قائم ہیں اُن سب کا زور ٹوٹ جائے اور پورے نظامِ اطاعت پر وہی "الہدیٰ" اور "دینِ حق" غالب آجائے۔

اس راہِ راست کا ہر جُز قابلِ غور ہے۔

پہلا جُز یہ ہے کہ انسانوں کو بالعموم اللہ کی حاکمیت و اقتدارِ اعلیٰ تسلیم کرنے اور اس کے بھیجے ہوئے قانون کو اپنی زندگی کا قانون بنانے کی دعوت دی جائے۔ یہ دعوت عام ہونی چاہیئے، ہر وقت جاری رہنی چاہیئے، اور اس کے ساتھ دوسری غیر متعلق باتوں کی آمیزش نہ ہونی چاہیئے۔ قوموں اور نسلوں اور ملکوں کے باہمی جھگڑے، خود اپنے سیاسی اور معاشی مفادات کی بحثیں، غیر الٰہی نظامات میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا، یا کسی ایسے نظامِ فاسد کی خود غرضانہ حمایت کرنا، یا کسی نظامِ فاسد میں اپنی جگہ بنانے کی کوشش کرنا، یہ سب چیزیں نہ صرف یہ کہ "الہدیٰ" اور "دینِ حق" کے ساتھ میل نہیں کھاتیں بلکہ صریح طور پر اس کے منافی اور اس کے لیے مضرت رساں ہیں۔ پس جب کسی شخص یا گروہ کو دعوتِ حق کی خدمت انجام دینی ہو تو اسے اِن تمام جھگڑوں اور بحثوں سے الگ ہو جانا چاہیئے اور اپنی دعوت کے ساتھ کسی دوسرے غیر متعلق اور بے جوڑ قضیے کو شامل نہ کرنا چاہیئے۔

دوسرا جُز یہ ہے کہ جتھا صرف اُن لوگوں کا بنایا جائے جو اس دعوت کو جان کر اور سمجھ کر قبول کریں، جو بندگی و اطاعت کو فی الواقع اللہ کے لیے خالص کر دیں، جو دوسری اطاعتوں کو اللہ کی اطاعت کے ساتھ واقعی شریک کرنا چھوڑ دیں اور حقیقت میں اللہ کے قانون کو اپنا قانونِ زندگی بنالیں۔ رہے دوسرے لوگ جو اس طرزِ خیال یا اس طرزِ زندگی کے محض معترف ہوں، یا اس سے ہمدردی رکھتے ہوں، تو وہ مجاہدہ کرنے والے جتھے کے لیڈر کیا معنی،

کارکن بھی نہیں بن سکتے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ جو جس درجہ میں بھی اس کا ہمدرد یا بیرونی معاون بن جائے بسا غنیمت ہے۔ مگر ارکان اور ہمدردوں کے درمیان جو حقیقی فرق و امتیاز ہے اسے کسی حال میں بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔

تیسرا جزو یہ ہے کہ براہِ راست غیر الٰہی نظامِ اطاعت پر حملہ کیا جائے۔ تمام کوششوں کا مقصود صرف اس ایک بات کو بنایا جائے کہ اللہ کی حاکمیت قائم ہو، اور اس کے سوا کسی دوسری چیز کو مقصود بنا کر اس کے پیچھے قوتیں ضائع نہ کی جائیں[1]۔

---

[1] بعض لوگ سرے سے اس بات ہی کا انکار کرتے ہیں کہ اسلامی حکومت قائم کرنا نبی کے مقاصدِ بعثت میں سے ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ یہ عجیب و غریب بات بھی کہتے ہیں کہ "جب نبی کوئی پیغام لے کر آتا ہے اور اس کے مخاطبینِ اوّلین کا کوئی گروہ اس پیغام کو قبول کرتا ہے تو ان کو اپنی حکومت قائم کرنی پڑتی ہے اور وہ اپنی حکومت اسلامی طریقہ پر قائم کرتے ہیں۔ مگر اس حکومت کا قیام ایک ضمنی بات ہے، نبی کی بعثت کا اصل مقصد نہیں ہے"۔ سوال یہ ہے کہ آخر نبی وہ کس قسم کا پیغام لاتا ہے جس کے قبول کرنے والوں کو اپنی حکومت ضرور قائم کرنی پڑتی ہے؟ اگر نبی کا پیغام صرف یہ ہے کہ اللہ کی پوجا کرو تو اس پیغام کے لیے اپنی حکومت قائم کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ پھر اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ وہ "حکومت اسلامی طریقہ پر قائم کرتے ہیں"۔ اگر نبی کوئی نظامِ حکومت قائم کرنے نہ آیا تھا، نہ اس نے کوئی نظام پیش کیا، نہ وہ نظامِ حکومت اُس کے پیغام کا کوئی جزء تھا تو یہ "اسلامی طریقہ کی حکومت" کہاں سے آگئی؟ اور اگر ایک نظامِ حکومت بھی اُس نے پیش کیا تھا اور وہ اس کے پیغام کا ایک جزء تھا تو اس کا قیام مقصدِ بعثت سے خارج اور ایک ضمنی چیز کیسے ہو گیا؟ کیا اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کو جو پیغام دیتا ہے اس کا کوئی حصہ اختیاری (Optional) بھی ہوتا ہے؟ یا اُسے محض ضمیمہ کے طور پر ساتھ لگا دیا جاتا ہے کہ جی چاہے تو اس کے لیے کوشش کرے اور نہ چاہے تو نہ کرے؟ پھر اگر نبی کوئی نظامِ حکومت پیش کرتا ہے تو آیا اُس کی حیثیت یہ ہوتی ہے کہ یہ نظام بھی برحق ہے اور اس کے خلاف کوئی دوسرا نظام ہو تو وہ بھی برحق؟ یا اس کی یہ حیثیت ہوتی ہے کہ یہی ایک برحق نظامِ حکومت ہے اور اس کے خلاف جو نظام ہے وہ باطل ہے؟ اگر آپ پہلی بات کے قائل ہیں (باقی صفحہ ۱۲۹ پر)

۳۔ مشکلات

اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی جتنی مستقل سیاسی جماعتیں ہیں، قریب قریب اُن سب کا دعویٰ یہی ہے کہ ہمارا نصب العین اسلامی نصب العین ہی ہے مگر ان سب نے اُس راہِ راست کو چھوڑ دیا ہے جس کی تشریح ابھی میں نے بیان کی ہے۔ وہ نہ تو "الھدیٰ" اور "دینِ حق" کی خالص، بے آمیز دعوتِ عام دیتی ہیں، نہ اُس پارٹی کی تشکیل کرتی ہیں جس کی قیادت و رکنیت صرف اُن لوگوں تک محدود ہو جو واقعی اپنی بندگی و اطاعت کو اللہ کے لیے خالص کرتے ہوں، اور نہ وہ غیر متعلق مقاصد کو چھوڑ کر صرف اُس ایک مقصد کو اپنی کوششوں کا ہدف بناتی ہیں جس کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے۔ راہِ راست کے اِن تینوں اجزاء سے یہ سب جماعتیں منحرف ہیں۔

اِس انحراف نے مختلف جماعتوں کے مسلک میں کیا کیا صورتیں اختیار کی ہیں؟ اس کی تفصیل تو میں بعد میں بیان کروں گا۔ پہلے میں اِس انحراف کا سبب بتا دینا چاہتا ہوں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اِن لوگوں کو اصل اِسلامی نصب العین کی طرف براہ راست پیشقدمی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۸ سے) تو گویا آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ اسلام کی حکومت اور کفر کی حکومت دونوں یکساں ہیں۔ اور اگر آپ دوسری بات کے قائل ہیں تو براہِ کرم اچھی طرح غور کر کے بتائیے کہ حکومتِ اسلام اور حکومتِ کفر کے درمیان بنیادی فرق کیا ہے اور ایک کے برحق اور دوسرے کے باطل ہونے کی توجیہ آپ کس طرح کریں گے؟ کاش اِن باتوں پر غور کیا گیا ہوتا تو سمجھ میں خود یہ بات آجاتی کہ حکومتِ اِسلامی کا بنیادی نظریہ اِسلام کے عقیدۂ توحید و رسالت سے گہرا تعلق رکھتا ہے اور یہ چیز ضمنی نہیں ہے بلکہ اساسی اہمیت رکھتی ہے۔ لا الٰہ کی نفی میں حاکمیتِ غیر اللہ کا انکار اور اِلّا اللہ کے اثبات ہی میں حاکمیتِ اللہ کا اقرار شامل ہے اور یہی بُنیاد ہے اِسلامی حکومت کی۔

(ترجمان القرآن۔ ستمبر، اکتوبر، نومبر ۱۹۴۱ء)

کرنے میں تین بڑی مشکلات نظر آتی ہیں جن کا کوئی حل اِن کی سمجھ میں نہیں آتا۔

(۱) سب سے پہلی مشکل جو ان کے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ "اُلُوہیت" اور "دینِ حق" کی طرف دعوتِ عام کا نتیجہ خیز اور کامیاب ہونا موجودہ حالات میں ان کو محال نظر آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دوسری تحریکیں تو محض سیاسی، تمدنی اور معاشی مسائل کا حل پیش کرتی ہیں اور جن لوگوں کو اُن کا تجویز کردہ حل اپیل کرتا ہے وہ اپنا مذہب اور اپنی قومیت تبدیل کیے بغیر ان تحریکوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ مگر اسلام محض دُنیوی مسائل کا حل پیش نہیں کرتا بلکہ عقائد کا ایک نظام اور عبادات اور قوانینِ شرعیہ کا ایک ضابطہ بھی پیش کرتا ہے، اور اس تحریک میں شامل ہونے کے لیے ناگزیر ہے کہ لوگ اپنا مذہب اور اپنی قومیت تبدیل کر دیں۔ پھر یہ کیسے اُمید کی جا سکتی ہے کہ اسلام کی دعوتِ عام اُس طرح پھیل سکے گی جس طرح دوسری تحریکیں پھیلتی ہیں؟

(۲) دوسری مشکل جو انہیں اِس راستہ میں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کے خلاف لوگوں میں شدید تعصبات پھیلے ہوتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ دوسری تحریکوں کا پھیلنا آسان ہے کیونکہ ان کے خلاف تعصّبات موجود نہیں ہیں، مگر اسلام کا پھیلنا مشکل ہے کیونکہ اس کا نام سُنتے ہی ماضی اور حال کے تعصّبات کا ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

(۳) تیسری مشکل اُن کی نگاہ میں یہ ہے کہ کروڑوں مسلمانوں کی ایک قوم یہاں موجود ہے جو "قومیت" کے اعتبار سے تو "مسلمان" ہے، مگر اس کا اخلاقی مرتبہ اتنا بلند نہیں ہے کہ وہ اسلامی نصب العین کے لیے جِدّوجہد کر سکے۔ اِس قوم کو لے کر اُس راستہ پر چلنا چاہیں تو چل نہیں سکتے۔ اِس کو چھوڑ کر چلنے کو جی نہیں چاہتا۔ اور پھر یہ سوال بھی دماغ کو پریشان کرتا ہے کہ اگر تمام مقاصد کو نظر انداز کر کے صرف ایک حکومتِ الٰہی کے مقصد پر توجہات مرکوز کر دی جائیں تو آخر موجودہ سیاسی حالات اور آئندہ کے دستوری تغیرات میں "مسلمانوں" کے قومی مفاد کا کیا حشر ہوگا۔

۴۔ انحراف کی راہیں

یہی تین مشکلات ہیں جن کو اس راہ میں حائل دیکھ کر لوگ دائیں اور بائیں رُخ پر راستہ کترا کر نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جزئیات کے اعتبار سے مختلف لوگوں کے نظریات اور عملی طریقوں میں جو اختلافات ہیں اُن کو نظر انداز کر کے بڑی اور اصولی تقسیم اگر کی جائے تو یہ صرف تین گروہوں میں منقسم ہو جاتے ہیں۔

ایک وہ گروہ جو کہتا ہے کہ پہلے ہمیں ہندوستان کی غیر مسلم آبادی کے ساتھ موافقت کر کے اِس ملک کو انگریزی اقتدار سے آزاد کرا لینا چاہیئے تاکہ یہاں ایک مشترک جمہوری اسٹیٹ قائم ہو جائے۔ یہ مرحلہ طے ہو جانے کے بعد ہم بتدریج اُس اسٹیٹ کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کرنے کے لیے کوشش کریں گے۔

دوسرا وہ گروہ جس کا خیال ہے کہ پہلے انگریزی اقتدار کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر ہمیں مستقل ہندو اکثریت کے تسلط کا سدِباب کرنا چاہیئے، اور ایسی تدبیر کرنی چاہیئے کہ اس ملک میں ایک جمہوری اسٹیٹ کے بجائے دو اسٹیٹ قائم ہوں۔ ایک وہ اسٹیٹ جس میں مسلم اکثریت کی وجہ سے اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں آئے اور دوسرا وہ اسٹیٹ جس میں ہندو اکثریت کی وجہ سے اقتدار ہندوؤں کے ہاتھ میں جائے مگر زیادہ سے زیادہ جو آئینی تحفظات ممکن ہیں ان کے ذریعہ سے مسلمانوں کی پوزیشن محفوظ ہو جائے۔ یہ مرحلہ طے ہو جانے کے بعد ہم مسلم اکثریت والے اسٹیٹ کو بتدریج اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کریں گے اور پھر ہندو اکثریت والے اسٹیٹ میں تغیر و اصلاح کی کوشش کریں گے۔

تیسرا گروہ جو موجودہ حالات میں دعوتِ عام اور ایک انقلابی پارٹی کی تشکیل کو آسان بنانے کے لیے اسلام کو ایک دوسرے سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے، تاکہ وہ اُن لوگوں کے لیے قابلِ قبول ہو جائے جو اسلامی عقائد اور عبادات اور نظامِ شریعت کی بندشوں سے گھبراتے ہیں۔ اِس گروہ نے اگرچہ کوئی مستقل جماعتی صورت اختیار نہیں کی ہے، مگر مجھے معلوم

ہے کہ اس طرزِ خیال کے لوگ ایک اچھی خاصی تعداد میں پیدا ہو گئے ہیں اور اُن کی تجویزیں اِس وقت حالتِ جنینی سے گزر رہی ہیں۔

۵۔ منحرف راستوں کی غلطی

اب میں ان میں سے ایک ایک گروہ کے طریقہ پر الگ الگ تنقید کر کے بتاؤں گا کہ ان طریقوں میں غلطی کیا ہے، ان میں سے ہر ایک نے اسلام کی راہِ راست سے انحراف کس طرح کیا ہے، اور ان پھیر کے راستوں سے اصلی اسلامی نصب العین تک پہنچنا ابداً غیر ممکن الوقوع کیوں ہے۔

"آزادیٔ ہند" کو مقدم رکھنے والے

پہلا گروہ زیادہ تر علماء و مذہبی خیالات کے لوگوں پر مشتمل ہے اور بالعموم اس گروہ کے لوگ دوسرے گروہ کی بہ نسبت زیادہ مذہبی ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے انحراف پر مجھ کو سب سے زیادہ افسوس ہے۔ ان حضرات نے مذکورۂ بالا مشکلات سے خوف زدہ ہو کر یہ خیال قائم کر لیا کہ موجودہ حالات میں اصل اسلامی نصب العین کی طرف براہِ راست پیش قدمی نہیں کی جا سکتی، اس لیے انہوں نے اپنی کوششوں کا مقصود یہ ٹھیرایا کہ "ہندوستان انگریزی اقتدار سے آزاد ہو جائے"۔ مقصود بدل جانے سے لامحالہ راستہ بھی بدل گیا۔ اسلام کی راہِ راست کے تین اجزا جو میں نے بیان کیے ہیں، ان کا راستہ ہر جُز میں اُس سے مختلف ہے:

(۱) دعوت کے باب میں اسلام کا طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کو اللہ کی حاکمیت و اقتدارِ اعلیٰ تسلیم کرنے کی طرف بلایا جائے۔ مگر یہ ہندوستان کے باشندوں کو اس طرف بلاتے ہیں کہ تم خود مالک الملک بنو۔ یہ غیر الٰہی اقتدارِ اعلیٰ کی نفی نہیں کرتے بلکہ صرف انگریزی اقتدارِ اعلیٰ کی نفی کرتے ہیں۔ اور یہ الٰہی اقتدارِ اعلیٰ کا اثبات بھی نہیں کرتے بلکہ اُس کی جگہ باشندگانِ مُلک کی خود اختیاری اور جمہوری اقتدارِ اعلیٰ کا اثبات کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ شرک ہونے کی حیثیت سے انگریزی اقتدارِ اعلیٰ اور جمہوری اقتدارِ اعلیٰ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ لہٰذا ان لوگوں کی دعوت سراسر غیر اسلامی بلکہ مخالفِ اسلام دعوت ہے۔

اِن کے نزدیک انگریزی اقتدار کے مقابلہ میں جمہورِ اہلِ ہند کا اختیار، اور انگریزی شریعت کے مقابلہ میں ہندوستانیوں کی قانون سازی قابلِ ترجیح ہے، حالانکہ اسلامی نقطۂ نظر سے دونوں یکساں بغاوت، یکساں کُفر اور یکساں طُغیان و معصیت ہیں۔

پھر یہ انگریز اور ہندوستانی کے درمیان قومی و وطنی عداوت و تعصب کی آگ بھڑکانے میں حصّہ لیتے ہیں، حالانکہ اسلام کی دعوتِ عام کے راستہ میں یہ رکاوٹ ہے۔ اسلام کی نگاہ میں انگریز اور ہندوستانی دونوں انسان ہیں۔ وہ دونوں کو یکساں اپنی دعوت کا مخاطب بناتا ہے۔ اس کا جھگڑا انگریز سے اِس بات پر نہیں ہے کہ وہ ایک ملک کا باشندہ ہو کر دوسرے ملک پر حکومت کیوں کرتا ہے، بلکہ اس بات پر ہے کہ وہ خدا کی حاکمیت اور اس کے قانون کی اطاعت کیوں نہیں تسلیم کرتا، بعینہٖ اسی بات پر اس کا جھگڑا ہندوستانی سے بھی ہے۔ وہ دونوں کو ایک ہی بات کی طرف بُلاتا ہے۔ ایک کا حامی بن کر دوسرے سے لڑنا اس کی حیثیت کے منافی ہے[1]۔ کیونکہ اگر وہ ہندوستانی اور انگریز کے وطنی و قومی جھگڑے میں ایک کا طرفدار اور دوسرے کا مخالف بن جائے تو انگریز کے دل کا دروازہ اس کی دعوت کے لیے بند ہو جائے گا۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جو لوگ ایک طرف اسلام کے داعی بنتے ہیں اور دوسری طرف اِس وطنی اور قومی جھگڑے میں فریق بھی بنتے ہیں وہ دراصل اسلام کے مفاد کو ہندوستانیت کے مفاد پر قربان کرتے ہیں۔

اِن تمام بنیادی غلطیوں کے ساتھ یہ حضرات کبھی کبھی اسلام کی تبلیغ بھی فرمایا کرتے ہیں۔

---

[1] اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر ایک قوم دوسری قوم پر ظلم کرے یا اس کے حقوق تلف کرے تو اسلام مظلوم قوم کی حمایت نہ کرے گا۔ بلکہ درحقیقت اس کا مطلب یہ ہے کہ قومیت اور وطنیت کی بنیاد پر دونوں قوموں میں جو نزاع ہو گی، اسلام اس میں کوئی حصّہ نہ لے گا۔ وہ ظالم کو ملامت کرے گا، نہ اس لیے کہ وہ فلاں قوم کا آدمی ہے، بلکہ اس لیے کہ وہ ظالم ہے۔ اور اسی طرح وہ مظلوم کی حمایت بھی اس حیثیت سے نہ کرے گا کہ وہ فلاں قوم سے تعلق رکھتا ہے بلکہ صرف اس لیے کہ وہ مظلوم ہے۔ (قدیم)

مگر ایسی تبلیغ کبھی مؤثر نہیں ہو سکتی۔ ایک ساز سے دو بالکل مختلف آوازیں سن کر اور ایک زبان سے دو قطعی متضاد باتیں سماعت کر کے آخر کون متاثر ہو سکتا ہے؟

(۲) تشکیل جماعت کے باب میں یہ حضرات اس سے بھی زیادہ مُختلِط ہیں۔ اوّل تو دعوت کی نوعیت بدل جانے کی وجہ سے خود ہی جماعت کی ترکیب اور اجزائے ترکیبی کے متعلق ان کا نقطۂ نظر بدل گیا ہے۔ پھر "مسلمان قوم" کے تخیل نے پریشان خیالی کے لیے ایک اور وجہ بھی پیدا کر دی ہے۔ ان اسباب سے یہ ہر قسم کے رطب و یابس آدمی اکٹھے کر لیتے ہیں، اور اُن آدمیوں کے اقوال و افعال میں بیک وقت بیسیوں قسم کی متضاد باتوں کا ظہور ہوتا ہے۔ ایک متحد المزاج نظریہ کی حمایت کے لیے آپ اُٹھیں تو لامحالہ آپ اپنی پارٹی کے لیے انہی آدمیوں کا انتخاب کریں گے جو یکسوئی کے ساتھ اس خاص نظریہ کے متبع ہوں۔ بخلاف اس کے ایک مخلوط اور غیر معیّن مزاج رکھنے والے نظریہ کو لے کر جب آپ اُٹھیں گے تو آپ کا معیارِ انتخاب، اکثر اُن قیود سے آزاد ہو جاتے گا جو متحد المزاج نظریہ کے لیے ناگزیر ہیں۔ کچھ مدت ہوئی مجھے ایک مجلس میں شریک ہونے کا موقع ملا تھا جہاں ہندوستان کی ایک بہت بڑی ذمہ دار جمعیت کی مقامی شاخ کو منظم کرنے پر گفتگو ہو رہی تھی۔ کچھ دیر کی بحث و تمحیص کے بعد جو بات قرار پائی وہ یہ تھی کہ رکنیت کے فارم طبع کرا لیے جائیں اور پندرہ دن کے اندر زیادہ سے زیادہ ممبر بھرتی کر کے ارکان کا ایک جلسۂ عام کر لیا جائے جس میں عہدداروں کا انتخاب ہو جائے۔ لیجیے، بس جمعیت کی شاخ منظم ہو گئی۔ اس طرح بھانت بھانت کے آدمی محض رکنیت کے فارموں پر دستخط کر کے اور چار آنہ سالانہ فیس ادا کر کے ان جماعتوں میں داخل ہو جاتے ہیں، پھر انہی آدمیوں کے ووٹوں سے منتخب ہو کر وہ لوگ برسرِ کار آتے ہیں جن کا کام رہنمائی و سربراہ کاری ہوتا ہے، اور ایسے ہی لوگوں کی متفقہ خواہشات سے پالیسیاں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ کیا کوئی شخص توقع کر سکتا ہے کہ جماعتی تشکیل کے اس طریقہ سے کبھی اسلامی نصب العین کی طرف بھی کوئی پیش قدمی کی جا سکتی ہے؟

(۳) اسی طرح تیسرے جُز میں بھی ان کا طریقہ اسلام کی راہِ راست سے ہٹا ہوا ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا اسلام براہِ راست غیر اسلامی نظامِ اطاعت پر حملہ کرتا ہے اور

اس کا تقاضا یہ ہے کہ تمام مساعی کو حاکمیتِ رب العالمین کے قیام و اثبات پر مرکوز کر دیا جاتے۔
لیکن اس کے برعکس یہ لوگ اپنی سعی و جہد کا رُخ برطانوی نظامِ اطاعت کی تخریب اور حاکمیتِ
عوام کے قیام کی طرف پھیر دیتے ہیں۔ یہ صریح انحراف ہے صراطِ مستقیم سے۔ اِس انحراف
پر جب اعتراض کیا جاتا ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ برطانوی نظامِ اطاعت اسلامی نصب العین
کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے، ہم تنہا اِس رکاوٹ کو دُور نہیں کر سکتے، اس لیے
پہلے دوسروں کی مدد سے اس کو دُور کر لیں، پھر اصل منزلِ مقصود کی طرف بڑھنے کے لیے راستہ
آسان ہو جاتے گا۔ مگر میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ راستہ آسان کیسے ہو جاتے گا؟ ظاہر بات ہے
کہ ایک نظامِ اطاعت یا دین کو ہٹا کر اس کی جگہ دوسرا نظامِ اطاعت یا دین کبھی قائم نہیں
کیا جا سکتا جب تک کہ نفوسِ انسانی میں پہلے نظام کی تخریب اور دوسرے نظام کی تعمیر
کا خیال اور ارادہ کمال درجہ قوت کے ساتھ مستحکم نہ کر دیا جاتے۔ اگر ہندوستان کے موجودہ
انگریزی نظامِ اطاعت کی جگہ آپ جمہوری نظامِ اطاعت قائم کرنا چاہیں تو یہ انقلاب صرف
اِسی طرح ممکن ہے کہ آپ باشندگانِ ہند کے دلوں میں حاکمیتِ انگریز کے بجاتے خود
اپنی حاکمیت کے برحق ہونے کا تخیل اور عملاً مالک الملک بن جانے کا عزم پوری شدت
کے ساتھ پیدا کر دیں۔ برعکس اس کے اگر آپ ہندوستان میں الٰہی نظامِ اطاعت قائم
کرنا چاہیں تو یہ انقلاب بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ عوام الناس کو خود اپنی حاکمیت سے
دست بردار ہونے اور غیر اللہ کی حاکمیت کا انکار کرنے پر آمادہ کریں اور اللہ کے مالک
الملک ہونے کا عقیدہ اُن کے دلوں میں اتنی قوت کے ساتھ بٹھائیں کہ وہ اُس کی حاکمیت
کے آگے برضا و رغبت سر جُھکا دیں۔ اب سوال یہ ہے کہ جن لوگوں کا آخری مقصد الٰہی نظامِ
اطاعت کا قیام ہے وہ کس طرح بحالتِ ہوش و حواس اپنے مقصد تک پہنچنے کے لیے
ذریعہ کے طور پر یہ تدبیر اختیار کر سکتے ہیں کہ عوام الناس کے دل میں خود اپنی حاکمیت کا عقیدہ
اور ارادہ اتنی قوت کے ساتھ بٹھا دیں کہ اس کے زور سے دینِ انگریز کی مضبوط جمی ہوئی جڑیں
اُکھڑ جائیں اور دینِ جمہور کی جڑیں زمین میں جگہ پکڑ لیں؟ جہاں عامۃ خلائق کے دلوں میں اپنی
حاکمیت کا عقیدہ اور عزم اتنی قوت کے ساتھ جم گیا ہو کیا وہاں لوگوں کو خداوندِ عالَم کے آگے

اپنی حاکمیت سے دست بردار ہو جانے پر آمادہ کرنا موجودہ انگریزی حاکمیت کی جڑیں اکھاڑنے سے کچھ کم مشکل ہے؟ کیا امریکہ، جاپان، جرمنی اور انگلستان جیسے اصطلاحاً "آزاد" ممالک میں حکومتِ الٰہی کا قیام اس سے کچھ کم دشوار ہے جتنا ہندوستان جیسے اصطلاحاً "غلام" ملک میں دشوار نظر آتا ہے؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے، اور یقیناً نفی ہی میں دیا جا سکتا ہے، تو میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ برطانوی اقتدار کی جگہ ہندوستانی اقتدار کا قیام آخر کس معنی میں حکومتِ الٰہی کے قیام کی طرف ایک گونہ پیش قدمی ہے؟

تاہم اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ تدبیر عملاً کارگر ہو سکتی ہے تب بھی میں اس کے صحیح ہونے سے انکار کرتا ہوں ـــــ لازم نہیں کہ ہر تدبیر جو کارگر ہو وہ صحیح بھی ہو ـــــ دراصل یہ سخت ناپاک تدبیر ہے جسے اختیار کرنے کا خیال بھی ایک مسلمان دل میں نہیں لا سکتا۔ جو شخص درحقیقت پوری سچائی کے ساتھ اللہ کے مالک الملک ہونے پر ایمان رکھتا ہو وہ آخر کس دل سے یہ گوارا کر سکتا ہے کہ اپنے ایمان کے خلاف عوام الناس میں اس عقیدے کی تبلیغ کرے کہ تم خود مالک الملک ہو؟ جس شخص کا اعتقاد یہ ہو کہ انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی صرف حدود اللہ کی پابند ہونی چاہیئے اور حکومت وہ ہونی چاہیئے جو اللہ کے سامنے جوابدہ ہو وہ کیونکر اپنی کوششوں کا مقصود یہ قرار دے سکتا ہے کہ انفرادی و اجتماعی زندگی پر حدودِ جمہور کا تسلط قائم ہو اور حکومت جمہور کے سامنے جواب دہ ہو؟ کس طرح ایک سچے آدمی کی زبان ایسے عقیدے کی اشاعت یا حمایت میں کھل سکتی ہے جس کو وہ فی الواقع باطل سمجھتا ہے؟ اور کس طرح وہ اُس چیز کے قیام کی راہ میں جان و مال سے جہاد کر سکتا ہے جو اس کے اعتقاد میں حق نہیں بلکہ طاغوت ہے؟

یہ جو کچھ میں نے عرض کیا، یہ تو محض اس امر کا ثبوت ہے کہ ان لوگوں کا راستہ اسلام کی راہِ راست سے منحرف ہے۔ رہی یہ بات کہ اس پھیر کے راستے سے یہ لوگ کبھی اسلام کے نصب العین تک نہیں پہنچ سکتے، تو اس دعوے پر میرے پاس یہ دلیل ہے کہ جن مشکلات سے خوفزدہ ہو کر انہوں نے یہ پھیر کی راہ اختیار کی ہے وہ ہندوستان کے انگریزی اقتدار سے آزاد ہونے کے بعد بھی جوں کی توں قائم رہیں گی۔ اوپر میں نے مشکلات کی جو تشریح کی

ہے ان پر ایک مرتبہ پھر نظر ڈال کر دیکھ لیجیے۔ کیا ان میں سے کوئی مشکل بھی آزاد ہندوستان کے دَور میں دُور ہو جائے گی؟ اگر نہیں تو جو لوگ آج اِن مشکلات کا مقابلہ کرنے کی حکمت اور ہمت نہ رکھنے کی وجہ سے راستہ کترا کر نکل رہے ہیں وہ کل بھی اِسی وجہ سے اصل مقصدِ اسلامی کی طرف براہِ راست پیش قدمی کرنے سے جی چرائیں گے۔ خوب جان لیجیے کہ اِس مقصد کی طرف جب بھی آپ اقدام کرنا چاہیں گے، بہر حال آپ کو اِن مشکلات سے سابقہ پیش آئے گا۔ جو لوگ اِن کا مقابلہ کرنے کی تدبیر اور عزم نہیں رکھتے وہ موجودہ حالات ہی میں نہیں بلکہ کسی حال میں بھی اِس طرف اِقدام نہیں کر سکتے۔ اور جن کے پاس تدبیر اور عزم دونوں موجود ہیں، اُن کے لیے کسی پھیر کے راستے پر چلنا تضییعِ وقت اور حماقت ہے۔ وہ تو اس پہاڑ کو کاٹ کر براہِ راست ہی اپنے مقصد کی طرف قدم بڑھائیں گے۔

پاکستانی خیال کے لوگ

دوسرا گروہ زیادہ تر اُس طبقہ پر مشتمل ہے جس نے تمام تر مغربی طرز پر ذہنی تربیت پائی ہے[1]۔ یہ لوگ سیاسی فکر تو مغربی مآخذ سے لیتے ہیں، مگر چونکہ موروثی طور پر اسلام کے حق میں ایک تعصب اِن کے اندر موجود ہے اور "مسلمان قوم" ہونے کا شعور ان کے اندر بیدار ہو گیا ہے اس لیے جو کچھ یہ کرنا چاہتے ہیں "مسلمان قوم" کے لیے اسلام کے نام ہی سے کرنا چاہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اِن کے اقوال اور اعمال میں اسلامی اصطلاحات اور مغربی طرزِ فکر و عمل عجیب طریقہ سے خلط ملط ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس مضمون میں یہ موقع نہیں ہے کہ میں اس خلطِ مبحث کا تجزیہ کر کے تفصیل کے ساتھ اس مخلوطہ کے ایک ایک جزو کی اصل و نوعیت کی نشان دہی کر سکوں۔ اپنے موضوع کے لحاظ سے میں صرف

---

[1] جس زمانے میں یہ مضمون لکھا گیا تھا اُس وقت تک علماء کا کوئی قابلِ ذکر گروہ اس طبقے کے ساتھ شامل نہیں ہوا تھا۔ بعد میں ایک اچھی خاصی تعداد اس میں شامل ہوئی، مگر اس کی پالیسی اور طرزِ عمل پر وہ کبھی اثر انداز نہ ہو سکی۔ (جدید)

یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ پہلے گروہ کی طرح اِس گروہ کا راستہ بھی راہِ راست کے تینوں اجزا سے منحرف ہے۔

(۱) پہلے دعوت کو لیجیے۔ ان کے ذمّہ دار لیڈروں کی تقریریں، ان کی نمائندہ مجالس کی قراردادیں، ان کے کارکنوں کی باتیں، ان کے اہلِ علم کی تحریریں، سب کی سب اس امر کی شہادت دیتی ہیں کہ اِن کی دعوت اصل میں ایک قوم پرستانہ دعوت ہے، یعنی اِن کی پکار اسلام کے نصب العین کی طرف نہیں ہے، بلکہ اِس طرف ہے کہ ان کی قوم متفق و متحد ہو کر ہندو قوم کے مقابلہ میں اپنے دنیوی مفاد کی حفاظت کرے۔ گویا جس طرح آزادی پسند لوگوں نے انگریزوں کو اپنا قومی حریف بنایا ہے اسی طرح انہوں نے ہندوؤں کو اپنا قومی حریف بنا لیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ اور "آزادی پسند" حضرات ایک سطح پر کھڑے ہیں۔ لیکن جس چیز نے اُن کی بہ نسبت اِن کی روش کو اسلام کے لیے اور زیادہ مضر بنا دیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ تو وطن اور وطنی مفاد کے نام پر لڑتے ہیں، مگر یہ اپنی قومی اور دُنیوی لڑائی میں بار بار اسلام اور مسلم کا نام لیتے ہیں جس کی وجہ سے اِسلام خواہ مخواہ ایک فریقِ جنگ بن کر رہ گیا ہے اور غیر مسلم قومیں اُس کو اپنا سیاسی اور معاشی حریف سمجھنے لگی ہیں۔ اس طرح انہوں نے نہ صرف اپنے آپ کو اسلام کی طرف دعوت دینے کے قابل نہیں رکھا ہے بلکہ اسلام کی اشاعت کے راستے میں اتنی بڑی رکاوٹ پیدا کر دی ہے کہ اگر دوسرے مسلمان بھی یہ کام کرنا چاہیں تو غیر مسلموں کے دلوں کو اسلام کے لیے مقفل پائیں گے۔

اِس میں شک نہیں کہ اِس قوم پرستانہ دعوت کے ساتھ یہ لوگ کبھی کبھی اسلام کی خوبیاں اور اس کے اصولوں کی فضیلت بھی بیان کیا کرتے ہیں۔ مگر اوّل تو قوم پرستی کے پیش منظر میں یہ چیز ایک اصولی دعوت کے بجائے محض ایک قومی تفاخر بن کر رہ جاتی ہے۔ اور مزید برآں دعوتِ اسلام کے ساتھ جن دوسری باتوں کی یہ آمیزش کرتے ہیں وہ بالکل اس دعوت کی ضد ہیں۔ ایک طرف اسلامی نظامِ حکومت کی تبلیغ اور دوسری طرف اُن "مسلمان" ریاستوں اور حکومتوں کی حمایت جن کا نظام بالکل غیر اسلامی ہے،

ایک طرف اسلامی نظامِ معاشی کی تشریح اور دوسری طرف خود اپنی قوم کے قارونوں کی تائید و مدافعت، ایک طرف انسانی قانون سازی کا اصولی ابطال اور دوسری طرف خود قانون ساز مجالس میں اپنے حصّہ کا مطالبہ، ایک طرف حاکمیتِ ربُّ العالمین کا اقرار و اِثبات اور دوسری طرف حاکمیتِ جمہور کے اصول پر خود اپنی قومی حکومت کے قیام کی فکر، ایک طرف انسانیت کی نسلی، قومی اور وطنی تقسیم کا ابطال اور دوسری طرف ہر وقت قوم قوم کا شور اور خود قومیت ہی کے اصولوں پر دوسری قوموں سے جدال و کشمکش، ایک طرف بے غرضانہ حق پرستی کا دعویٰ اور دوسری طرف شب و روز اپنے دنیوی مفاد کا نوحہ و ماتم، ایک طرف اسلامی تہذیب و تمدّن پر فخر و ناز اور اس کی حفاظت کے لیے پُرشور لام بندی اور دوسری طرف اُسی تہذیب و تمدّن کے باغیوں اور قاتلوں کی سرداری و پیشوائی، یہ دونوں چیزیں آخر کس طرح ایک ساتھ نبھ سکتی ہیں؟ "منکرِ مے بودن و ہمرنگِ مستاں زیستن"۔ ایسی متضاد باتوں سے دنیا نے کب اثر قبول کیا ہے کہ آج ان سے اسلام کا جھنڈا زمین میں گڑ جانے کی اُمید کی جاتی ہے؟

(۲) اب دیکھیے کہ یہ اپنی جماعتی تشکیل کس ڈھنگ پر کرتے ہیں۔ اِن کا قاعدہ یہ ہے کہ یہ اُن سب لوگوں کو جو ازروئے پیدائش مسلمان قوم سے تعلق رکھتے ہیں اپنی جماعت کی رُکنیت کا بلاوا دیتے ہیں اور جو اس کو قبول کرلے اُسے ابتدائی رُکن بنا لیتے ہیں۔ پھر انہی ابتدائی ارکان کے ووٹوں سے ذمّہ دار کارکن اور عہدہ دار منتخب ہوتے ہیں اور انہی کی کثرتِ رائے سے تمام معاملات انجام دیے جاتے ہیں ظاہر ہے کہ یہ طریقہ صرف قومی تنظیم ہی کے لیے موزوں ہو سکتا ہے اور اس طریقہ سے جو نظام بنے وہ اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتا کہ ایک قوم کی خواہشات جیسی کچھ بھی ہوں اُن کے حصول کی کوشش کرے۔ رہی ایک اصولی تحریک، تو اُس کو چلانے کے لیے یہ طریقِ جماعت سازی نہ صرف بے کار بلکہ مضر ہے۔ ایک قوم کے تمام افراد کو محض اس وجہ سے کہ وہ نسلاً مسلمان ہیں، حقیقی معنی میں مسلمان فرض کر لینا اور یہ امید رکھنا کہ ان کے اجتماع سے جو کام بھی ہوگا اسلامی اصول ہی پر ہوگا، پہلی اور بنیادی غلطی ہے۔ یہ انبوہِ عظیم جس کو

مسلمان قوم کہا جاتا ہے۔ اس کا حال یہ ہے کہ اس کے ۹۹۹ فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں، نہ حق اور باطل کی تمیز سے آشنا ہیں، نہ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر اور ذہنی رویّہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو بس مسلمان کا نام ملتا چلا آ رہا ہے اس لیے یہ مسلمان ہیں۔ نہ انہوں نے حق کو حق جان کر اُسے قبول کیا ہے، نہ باطل کو باطل جان کر اسے ترک کیا ہے۔ اِن کی کثرتِ رائے کے ہاتھ میں باگیں دے کر اگر کوئی شخص یہ اُمید رکھتا ہے کہ گاڑی اسلام کے راستے پر چلے گی تو اس کی خوش فہمی قابلِ داد ہے۔

(۳) اس کے بعد اس طریقہ کا جائزہ لیجیے جس سے یہ بزعمِ خود اسلامی نصب العین تک پہنچنے کی اُمید رکھتے ہیں۔ اِن کی تجویز یہ ہے کہ پہلے اُسی جمہوری دستور کے مطابق، جو انگریزی حکومت یہاں نافذ کرنا چاہتی ہے، مسلم اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کی اپنی حکومت قائم ہو جائے، پھر کوشش کی جائے گی کہ یہ قومی حکومت اسلامی نظامِ حکومت میں بتدریج تبدیل ہو جائے[1]۔ لیکن یہ ویسی ہی غلطی ہے جیسی "آزادیِ ہند" کو

---

[1] اس موقع پر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مسلم لیگ کے کسی ریزولیوشن اور لیگ کے ذمّہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمحِ نظر پاکستان میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنا ہے۔ برعکس اِس کے ان کی طرف سے بصراحت اور بتکرار جس چیز کا اظہار کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ان کے پیشِ نظر ایک ایسی جمہوری حکومت ہے جس میں دوسری غیر مسلم قومیں بھی حصّہ دار ہوں، مگر اکثریت کے حق کی بنا پر مسلمانوں کا حصّہ غالب ہو۔ بالفاظِ دیگر ان کو مطمئن کرنے کے لیے صرف اتنی بات کافی ہے کہ ہندو اکثریت کے تسلط سے وہ صوبے آزاد ہو جائیں جہاں مسلمانوں کی کثرت ہے۔ باقی رہا نظامِ حکومت تو وہ "پاکستان" میں بھی ویسا ہی ہوگا جیسا "ہندوستان" میں ہوگا۔ ان کے اس نصب العین پر جب یہ اعتراض کیا گیا کہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت اسلامی نقطۂ نظر سے غیر مسلموں کی کافرانہ حکومت کے مقابلہ میں کچھ بھی قابلِ ترجیح نہیں ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ قابلِ لعنت ہے، تو ذمّہ دار لیڈروں میں سے تو کسی نے اس کا جواب نہ دیا۔ البتہ جو لوگ پاکستانی حلقوں کی صفِ آخر میں شمار ہوتے ہیں اور جن کی کوئی ذمّہ دارانہ حیثیت نہیں ہے انہوں نے کہنا شروع کیا کہ مسلم اکثریت کو جب خود اختیاری حاصل ہو جائے گی تب ہم نظامِ حکومت بدلنے کی کوشش کریں گے۔ واضح رہے کہ یہ اُس وقت تک کی پوزیشن تھی جب یہ مضمون لکھا گیا تھا۔ (جدید)

مقدم رکھنے والے حضرات کر رہے ہیں۔ اُن کی تجویز پر مجھے جو اعتراضات ہیں بعینہٖ وہی اعتراضات ان کی تجویز پر بھی ہیں۔ اِن کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں حاکمیتِ جمہور کے اصول پر خود مختار حکومت کا قیام آخر کار حاکمیتِ رب العالمین کے قیام میں مددگار ہو سکتا ہے۔ جیسی مسلم اکثریت اس مجوزہ پاکستان میں ہے، ویسی ہی، بلکہ عددی حیثیت سے بہت زیادہ زبردست اکثریت افغانستان، ایران، عراق، ٹرکی اور مصر میں موجود ہے، اور وہاں اُس کو وہ "پاکستان" حاصل ہے جس کا یہاں مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ پھر کیا وہاں مسلمانوں کی خود مختار حکومت کسی درجہ میں بھی حکومتِ الٰہیہ کے قیام میں مددگار ہے یا ہوتی نظر آتی ہے؟ مددگار ہونا تو درکنار، میں پوچھتا ہوں، کیا آپ وہاں حکومتِ الٰہی کی تبلیغ کر کے پھانسی یا جلاوطنی سے کم کوئی سزا پانے کی امید کر سکتے ہیں؟ اگر آپ وہاں کے حالات سے کچھ بھی واقف ہیں تو آپ اس سوال کا جواب اثبات میں دینے کی جرأت نہ کر سکیں گے۔ اور جب صورتِ حال یہ ہے تو آپ کو غور کرنا چاہیئے کہ آخر اسلامی انقلاب کے راستہ میں مسلمان قوموں کی اِن آزاد حکومتوں کے سدِّ راہ ہونے کا سبب کیا ہے۔ اس معاملہ کی جتنی تحقیق آپ کریں گے جواب اس کے سوا کچھ نہ پائیں گے کہ دراصل اصطلاحاً و نسلاً مسلمان ہونا اور چیز ہے اور نظریۂ حیات و مقصدِ زندگی کا اسلامی ہونا بالکل ایک دوسری چیز۔ جو لوگ روح و اخلاق کے اعتبار سے مسلم نہ ہوں بلکہ محض اصطلاحی و نسلی حیثیت سے مسلمان ہوں ان کو اگر بیرونی اثر و اقتدار سے کامل آزادی نصیب بھی ہو جاتے، اور اگر ان کے جمہور کو خود اپنی پسند کے مطابق نظامِ حکومت قائم کرنے کا پورا اختیار بھی حاصل ہو، تب بھی حکومتِ الٰہی وجود میں نہیں آسکتی۔ وہ اپنے دُنیوی مفاد کے پرستار ہوتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ان میں حق اور صداقت کے لیے اپنے مفاد کو قربان کرنے کی طاقت نہیں ہوتی، بلکہ اس کے برعکس جب کبھی ان کی اغراضِ دنیوی سے حق اور صداقت کا تصادم ہوتا ہے، وہ حق کو چھوڑ کر ہمیشہ اُس طرف جاتے ہیں جس طرف ان کی اغراض پوری ہوتی ہیں۔ جہاں ایسے لوگوں کی اکثریت ہو وہاں کبھی یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ عام انتخاب میں ان کے ووٹوں سے وہ صالحین منتخب ہوں گے جو منہاجِ نبوّت پر حکومت کرنے والے ہوں۔ جمہوری انتخاب کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے

دودھ کو بلو کر مکھن نکالا جاتا ہے۔ اگر دودھ زہریلا ہو تو اس سے جو مکھن نکلے گا قدرتی بات ہے کہ وہ دودھ سے زیادہ زہریلا ہوگا۔ اسی طرح سوسائٹی اگر بگڑی ہوئی ہو تو اس کے ووٹوں سے وہی لوگ منتخب ہو کر برسرِ اقتدار آئیں گے جو اس سوسائٹی کی خواہشاتِ نفس سے سندِ قبولیت حاصل کر سکیں گے۔ پس جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومتِ الٰہی قائم ہو جائے گی، ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجہ میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔ اس کا نام حکومتِ الٰہی رکھنا اس پاک نام کو ذلیل کرنا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ عوام کی اخلاقی و ذہنی تربیت کر کے، اُن کے نقطۂ نظر کو تبدیل کر کے اور ان کے نفسیات میں انقلاب برپا کر کے ایک جمہوری نظام کو الٰہی حکومت میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس اخلاقی و نفسیاتی انقلاب کے برپا کرنے میں کیا مسلمانوں کی کافرانہ حکومت کچھ بھی مددگار ہوگی؟ کیا وہ لوگ جو موجودہ بگڑی ہوئی سوسائٹی کے مادی مفاد سے اپیل کر کے اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہوں گے ان سے آپ یہ امید کر سکتے ہیں کہ وہ حکومت کا رقبہ، اس کے وسائل اور اس کے اختیارات کسی ایسی تحریک کی اعانت میں صرف کریں گے جس کا مقصد عوام کی ذہنیت تبدیل کرنا اور انہیں حکومتِ الٰہی کے لیے تیار کرنا ہو؟ اس کا جواب عقل اور تجربہ دونوں کی روشنی میں نفی کے سوا کچھ نہیں دیا جا سکتا۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ یہ لوگ اس انقلاب میں مدد دینے کے بجائے اُلٹی اس کی مزاحمت کریں گے کیونکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ اگر عوام کے نفسیات میں تغیر واقع ہو گیا تو اُس بدلی ہوئی سوسائٹی میں ان کا چراغ نہ جل سکے گا۔ یہی نہیں، اس سے زیادہ خوفناک حقیقت یہ ہے کہ نام کے مسلمان ہونے کی وجہ سے یہ لوگ کفار کی بہ نسبت بہت زیادہ جسارت و بے باکی کے ساتھ ایسی ہر کوشش کو کچلیں گے اور ان کے نام اُن کے ظلم کی پردہ پوشی کے لیے کافی ہوں گے۔ جب صورتِ معاملہ یہ ہے تو کیا وہ شخص نادان نہیں ہے جو اسلامی انقلاب کا نصب العین سامنے رکھ کر ایسی جمہوری حکومت کے قیام

کی کوشش کرے جو ہر کافرانہ حکومت سے بڑھ چڑھ کر اس کے مقصد کی راہ میں حائل ہوگی؟

تحریف دین کے مجوزین

اب تیسرے گروہ کو لیجیے۔ یہ لوگ مختلف قسم کی تجویزیں سوچ رہے ہیں۔ کوئی فکر اسلامی کے ساتھ غیر اسلامی افکار کا جوڑ لگا کر ایک نئی "خوشگوار" معجون بنانا چاہتا ہے۔ کوئی اس خیال میں ہے کہ "ہندوستانی اسلام" کا ایک نیا ایڈیشن نکالے۔ کوئی یہ چاہتا ہے کہ اسلام کے مجموعی نظام میں سے محض اس کے سیاسی و معاشی اصولوں کو لے لیا جائے اور ان کی بنیاد پر ایک ایسی سیاسی جماعت بنائی جائے جس میں شامل ہونے کے لیے عقائد، عبادات اور احکام شرعیہ کی پابندی لازم نہ ہو۔ یہ سب لوگ اپنے نزدیک نیک نیتی کے ساتھ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ان طریقوں سے رفتہ رفتہ وہ "تنفر" دور ہو جائے گا جو اسلام کے خلاف طبیعتوں میں پیدا ہو گیا ہے، اور جب وہ بعضِ اسلام سے کسی حد تک مانوس ہو جائیں گے تو پورے اسلام سے مانوس ہونے میں زیادہ دیر نہ لگے گی۔

لیکن یہ سب خیالاتِ خام ہیں۔ نہ اصولی حیثیت سے ان کو صحیح کہا جا سکتا ہے اور نہ عملی حیثیت سے ہی ان کی کوئی قدر و قیمت ہے۔ میرے نزدیک ایسی تمام تجویزیں ضعفِ دل اور ضعفِ دماغ کا نتیجہ ہیں۔

اصولی حیثیت سے درحقیقت ہم اسلام میں کسی ردّ و بدل، کسی کمی و بیشی، اور کسی ترمیم و تشکیلِ جدید کے مجاز ہی نہیں ہیں۔ ہم اسلام کے مالک نہیں ہیں، اُس کے صانع نہیں ہیں، اُس کے شارع نہیں ہیں۔ اسلام ہمارا مال نہیں ہے کہ مارکیٹ میں جیسی طلب ہو اس کے مطابق اپنے اس مال کو بنا کر بازار میں لائیں۔ ہماری حیثیت صرف پیرو اور مبلّغ کی ہے۔ مالک نے عقائد، عبادات اور احکام کا یہ پورا مجموعہ ہمیں دیا ہے تاکہ ہم خود اس کی پیروی کریں اور دوسروں تک اسے پہنچائیں۔ اس مجموعہ میں کوئی ترمیم کرنے کا، یا اس کی اصلی صورت کو بدل کر اس کی کوئی اور صورت بنانے کا ہم کو ہرگز کوئی حق نہیں پہنچتا۔ جس کو لینا ہے اُسے پورے مجموعہ کو لینا پڑے گا اور اُسی صورت میں لینا ہوگا جس میں مالک نے اسے

دیا ہے۔ اور جو اُس کو اِس حیثیتِ مجموعی اور اِس مقررہ صورت کے ساتھ نہ لینا چاہے اُس
کی خوشامد کرنے اور اُسے کم و بیش پر راضی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسلام تو ایک
حکم ہے خالق کی طرف سے مخلوق کی طرف۔ خالق کا کام مخلوق کی خوشامد کرنا اور اس کو راضی
کرنا نہیں ہے۔ مخلوق کو دیا تو اس کا حکم، جیسا کہ وہ ہے، جوں کا توں ماننا پڑے گا۔ ورنہ وہ
خود اپنا ہی کچھ بگاڑے گی، خالق کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے گی۔ اسی لیے اللہ کی طرف سے اس
کے جو رسول دنیا میں آئے انہوں نے پورے حکم کو لوگوں کے سامنے بعینہٖ پیش کر دیا اور صاف
کہہ دیا کہ چاہو اس کو لو اور چاہو رد کر دو، بہر حال تمہاری خواہشات کے مطابق اس میں
کوئی تغیر و تبدل نہیں کیا جائے گا۔ ٹھیک یہی پوزیشن رسول کے نائب ہونے کی حیثیت سے
ہماری بھی ہے۔

پھر یہ کتنی غیر معقول تجویز ہے کہ اسلام کے مجموعی نظام میں سے محض اُس کے
معاشی و سیاسی اصولوں کو لے لیا جائے اور انہی کی بنیاد پر ایک پارٹی ایسی بنائی جائے
جس میں شامل ہونے کے لیے توحید، آخرت، قرآن، رسالت، کسی چیز پر بھی ایمان لانے
کی ضرورت نہ ہو اور نہ عبادات کی بجا آوری اور احکامِ شرعیہ کی پابندی ضروری ہو۔ کیا کوئی
صاحبِ نظر آدمی ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خیال کر سکتا ہے کہ کسی اجتماعی نظریہ اور لائحہ عمل
کو اس کے بنیادی فلسفے، اس کے نظامِ اخلاق اور اس کے تعمیرِ سیرت کرنے والے ارکان سے
الگ کر کے چلایا جا سکتا ہے؟ اللہ کی حاکمیت کا تصور نکال دینے کے بعد اسلام کا سیاسی
نظام آخر ہے کس چیز کا نام؟ اور اگر قرآن کو ماخذِ قانون اور محمد رسول اللہ کو رعیت
(انسان) اور بادشاہ (اللہ) کے درمیان نزولِ احکام کا واحد مستند ذریعہ نہ مانا جائے، تو
کیا اسلامی طرز کے اسٹیٹ کی تعمیر ہوا پر کی جائے گی؟ نیز وہ کون سا نظامِ تمدن و سیاست
ہے جو کسی نظامِ اخلاق کا سہارا لیے بغیر قائم ہو سکتا ہو؟ اور کیا اللہ کے سامنے انسان کی
ذمہ داری و جواب دہی کا تخیل نکال دینے کے بعد اُس نظامِ تمدن و سیاست کے لیے
کوئی اخلاقی سہارا باقی رہ جاتا ہے جس کا نقشہ اسلام نے پیش کیا ہے؟ کیا اس نظام کو
آپ مادہ پرستانہ اخلاقیات کے بل پر ایک دن کے لیے بھی قائم کر سکتے ہیں؟ مزید برآں

وہ خاص قسم کی انفرادی سیرت اور جماعتی زندگی جو اس نظامِ تمدن و سیاست کے لیے درکار ہے، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے سوا اور کس ذریعہ سے پیدا ہو سکتی ہے؟ اور وہ نہ ہو تو یہ نظام چل کہاں سکتا ہے؟ پس یہ غایت درجہ کا افلاسِ فکر ہے کہ کوئی شخص محض شاخوں کا حسن دیکھ کر کہنے لگے کہ اکھڑ جڑ کے بغیر ان شاخوں ہی سے درخت قائم کریں۔

عملی حیثیت سے بھی اس قسم کی تمام تجویزیں سراسر غلط ہیں۔ ان سے اصل مقصد تک پہنچنے کے بجائے خطرہ یہ ہے کہ کہیں ہم خود ہی راستہ میں گم نہ ہو جائیں۔ ترمیم شدہ صورت میں جس نام نہاد اسلام کی تبلیغ کی جائے گی، ایک روز وہی اصل معیار بن جائے گا، اور جو لوگ اس پر ایمان لا کر جماعت میں شریک ہوں گے، نہ صرف وہ خود اصل اسلام کی طرف رجوع کرنے سے انکار کریں گے، بلکہ وہ مصلحت پرست مسلمان بھی جنہوں نے اُن سے کم و بیش پر سودا کیا تھا اُن کے ساتھ ان کی گمراہی میں شریک ہو جائیں گے۔ مدارات (Compromises) پر جو کام مبنی ہوتے ہیں اُن میں ہمیشہ یہی خرابی ہوتی ہے۔

۶۔ مشکلات کا جائزہ

اب ہمیں ایک نظر اُن مشکلات پر ڈالنی چاہیئے جن سے خوف زدہ ہو کر یہ انحراف کی راہیں اختیار کی جا رہی ہیں۔ کیا حقیقت میں وہ ایسی ہی مشکلات ہیں کہ ان کو حل نہیں کیا جا سکتا؟۔

تکرارِ بیان سے بچنے کے لیے میں ناظرین کو پھر ایک مرتبہ تکلیف دوں گا کہ پیچھے پلٹ کر مضمون کے اُس حصہ پر نگاہ ڈال لیں جہاں میں نے اِن مشکلات کی تشریح کی ہے۔

پہلی مشکل

پہلی مشکل کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام صرف تمدنی، سیاسی، اور معاشی مسائل کا حل ہی پیش نہیں کرتا بلکہ عقائد، عبادات اور ضوابطِ شرعیہ کا ایک مجموعہ بھی اس کے ساتھ دیتا ہے، اور اس کو قبول کرنے کے معنی انسان کی پوری زندگی تبدیل ہو جانے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ چیز اسلام کو اُس طرح پھیلنے نہیں دیتی جس طرح دوسری تحریکیں پھیلتی ہیں۔ لیکن

یہ مشکل بظاہر جتنی زبردست نظر آتی ہے، بباطن اتنی ہی کمزور اور بے حقیقت ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی اجتماعی نظریہ اور مسلک بھی ایسا نہیں ہے جو انسانی زندگی کے عملی مسائل کا مجرد حل پیش کرتا ہو اور اس کے ساتھ اپنے کچھ اعتقادات اور اپنا ایک مخصوص فلسفہ نہ رکھتا ہو۔ چند امورِ مابعد الطبیعت (Metaphysical Problems) ایسے ہیں جن کے متعلق سلبی یا ایجابی حیثیت سے ایک نہ ایک رائے قائم کرنا بہرحال ہر اُس مسلک کے لیے ناگزیر ہے جو انسان کے لیے ایک لائحۂ زندگی بنانے کا عزم کرے۔ یہ سوالات کہ کائنات کا یہ نظام کس نوعیت کا ہے؟ اور اس نظام میں انسان کی کیا حیثیت ہے؟ اور انسان کی زندگی کا مآل کیا ہے؟ اور یہ کہ دنیا میں سب کچھ تو انسان کیلیے ہے مگر انسان خود کس کیلیے ہے؟ یہ دراصل انسانی زندگی کے بنیادی سوالات ہیں جن کا ایک قابلِ عمل حل (Workable Solution) پیش کیے بغیر کوئی ذہنی، اخلاقی، تعلیمی اور تمدنی نظام بنایا ہی نہیں جاسکتا اور کسی نظام کے بھی محض عملی پہلوؤں کو لے کر آدمی کام نہیں کرسکتا جب تک کہ ساتھ ساتھ اس کے بنیادی فلسفے، یا بالفاظِ دیگر اس کے اعتقادات کو بھی قبول نہ کرے۔ پس ایک اعتقادی نظام ہونا تنہا اسلام ہی کی کوئی انوکھی خصوصیت نہیں ہے۔ اس جہت سے اگر اسلام کی راہ میں کوئی مشکل حائل ہے تو ایسی مشکل ہر اجتماعی مسلک کی راہ میں حائل ہے۔ ہر اجتماعی مسلک فی الواقع ایک مذہب ہی ہے اور جو بھی اس کی پیروی اختیار کرتا ہے وہ حقیقت میں ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرتا ہے، خواہ اپنی سادہ لوحی کی بنا پر وہ یہ کہتا اور سمجھتا رہے کہ میں بدستور اپنے پہلے مذہب پر ہوں۔

میں ایک سیدھی سی مثال سے اس نکتہ کی مزید توضیح کروں گا۔ یہ کمیونزم آپ کے سامنے ہے۔ اسی کو مثال میں لے لیجیے۔ اگر اسلام اس مابعد الطبیعی نظریہ سے اپنے مسلک کی ابتدا کرتا ہے کہ خدا ہے، تو کمیونزم اس نظریہ سے چلتا ہے کہ خدا نہیں ہے یا کم از کم اس کا وجود ہمارے لیے خارج از بحث ہے۔ اگر اسلام یہ نقطۂ نظر اختیار کرتا ہے کہ یہ دنیا خدا کی سلطنت ہے اور انسان یہاں اس کا تابع امر ہے تو کمیونزم یہ نقطۂ نظر اختیار کرتا ہے کہ یہ دنیا ایک اتفاقی بساط ہے اور انسان یہاں مطلقاً خود مختار (Independent) ہے۔ اگر اسلام یہ

پہلو لیتا ہے کہ انسان کو یہاں کام کرنے کے لیے خدا کی ہدایت درکار ہے اور وہ وحی کے ذریعہ سے آتی ہے تو کمیونزم یہ پہلو لیتا ہے کہ کوئی ہدایت درکار نہیں اور کوئی وحی نہیں آتی۔ اگر اسلام اس مقام سے سلوک کا آغاز کرتا ہے کہ اس زندگی کے بعد ایک اور زندگی ہے جس میں انسانوں کو موجودہ زندگی کے پورے کارنامے کا حساب دینا ہے، تو کمیونزم اس مقام سے چلتا ہے کہ جو کچھ ہے یہی زندگی ہے اور بعد میں نہ کوئی زندگی ہے نہ حساب نہ کتاب۔ دیکھیے یہ دونوں یکساں مابعد الطبیعی نظریے ہیں اور دونوں میں سے کسی کو بھی تجربہ یا مشاہدہ سے ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ اب اگر کسی سائنٹیفک ثبوت کے بغیر محض استدلال اور عقلی شہادت کی بنا پر بہت سے وہ لوگ جو کل تک کمیونسٹ نہ تھے، آج کمیونزم کے نقطۂ نظر کو قبول کر سکتے ہیں، تو سوال یہ ہے کہ آخر انہی دو بنیادوں پر بہت سے وہ لوگ جو آج مسلم نہیں ہیں، کل اسلام کا نقطۂ نظر کیوں قبول نہیں کر سکتے؟

اسی طرح ایک ہادی پر ایمان لانے کا معاملہ بھی دونوں میں مشترک ہے۔ اگر مسلم ہونے کے لیے محمد رسول اللہ پر ایمان لانا پڑتا ہے تو کمیونسٹ بھی آخر مارکس پر ایمان لاتا ہی ہے۔ پھر اگر ایک شخص جو کل تک مارکسی نہ تھا، آج مارکس کی تعلیمات کو دیکھ کر اس کو اپنا رہنما تسلیم کر سکتا ہے، تو آخر کون سی چیز مانع ہے کہ ایک وہ شخص جو کل تک مسلم نہ تھا، آج محمدؐ رسول اللہ کی زندگی، انؐ کی تعلیمات اور انؐ کے کارنامے کو دیکھ کر انؐ کو اپنا ہادی و رہبر تسلیم نہ کرے؟

ایسا ہی معاملہ جماعتی ضوابط (Party Discipline) کا بھی ہے۔ اگر اسلام اُن لوگوں کو جو اس کی جماعت میں شامل ہوں، اپنے کچھ ضوابط کا پابند بناتا ہے تو کیا کمیونسٹ پارٹی ان لوگوں کو جو اُس کی جماعت میں شامل ہیں، کسی ضابطہ اور کسی قاعدے میں نہیں جکڑتی؟ پھر جب بہت سے انسان کمیونزم کے اصولوں پر ایمان لانے کے بعد کمیونسٹ پارٹی کے ضوابط کی پابندی قبول کر لیتے ہیں تو آخر اسلام ہی کے جماعتی ضوابط میں کونسا ہوّا چھپا ہوا ہے کہ جو لوگ اسلام کے اصولوں کو جانچ کر ان پر ایمان لانے کے لیے تیار ہوں گے اُن کو یہ ہوّا اپنی صورت دکھا کر بھگا دے گا؟

اس مثال سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اسلام میں خدا کی ہستی اور اس کی توحید کا اعتقاد یا آخرت کا اعتقاد یا پیغمبر کی ناقابلِ منازعت پیشوائی (Indisputable Leadership) اور قرآن کے آخری منبعِ قانون ہونے کا اعتقاد شرط لازم ہونا، اور نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے ضوابط کی پابندی فرض ہونا، ہرگز کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اس کے پھیلنے اور غیر مسلموں کے اس کی طرف کھنچ کر آنے میں سدِّ راہ ہو۔ مابعد الطبیعی اعتقادات اور جماعتی ضوابط دوسرے مسلکوں میں بھی موجود ہیں، اور جو انسان اِن مسلکوں میں اپنی زندگی کے مسائل کا حل اپنی سمجھ کے مطابق صحیح پاتے ہیں وہ اِن کے عقائد اور ضوابط دونوں کو قبول کرتے ہی ہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ اگر اسلام اُن کے سامنے تمام مسائلِ زندگی کا بہترین حل پیش کرے اور ان کی اپنی فلاح و سعادت کا راستہ کھول کر ان کے سامنے رکھ دے تو عقائد اور ضوابط کی شرط صرف اسلام ہی کے معاملہ میں ان کے لیے غیر معمولی رکاوٹ ثابت ہو۔ رکاوٹ اگر ہے تو فی الواقع صرف اِسی حد تک ہے کہ لوگوں کے لیے بالعموم اپنے پُرانے مسلک کو چھوڑ کر کوئی دوسرا مسلک اختیار کرنا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن جو تحریک بھی دنیا میں پھیلتی ہے اُسے بہرحال اس رکاوٹ سے سابقہ پیش آتا ہی ہے اور جو لوگ کسی تحریک پر ایمان لاتے ہیں وہ بہرحال اس رکاوٹ کو عبور کر کے ہی آگے قدم بڑھاتے ہیں۔ اس کو سامنے کھڑا دیکھ کر راستہ کترانے کی کوشش صرف وہی شخص کرے گا جو یا تو اپنے ایمان ہی میں صادق نہیں ہے یا پست ہمت اور ناکارداں ہے۔

البتہ اسلام کے حق میں اس رکاوٹ کو جس چیز نے شدید تر رکاوٹ بنا دیا ہے وہ ہماری یہ جامد اور بے روح مذہبیت ہے جسے آج کل اسلام سمجھا جا رہا ہے۔

اس بے رُوح مذہبیت کا پہلا بنیادی نقص یہ ہے کہ اس میں اسلام کے عقائد محض ایک دھرم (Religion) کے مزعومات (Dogmas) بنا کر رکھ دیئے گئے ہیں حالانکہ وہ ایک مکمل فلسفۂ اجتماع اور نظامِ تمدن کی منطقی بنیاد ہیں۔ اور اسی طرح اُس کی عبادات محض پوجا اور تپسیا بنا کر رکھ دی گئی ہیں، حالانکہ وہ اُن ذہنی اور اخلاقی بنیادوں کو مضبوط و مستحکم کرنے کے وسائل ہیں جن پر اسلام نے اپنا نظامِ اجتماعی تعمیر کیا ہے۔ اس عمل تحریف

کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں کی سمجھ میں کسی طرح یہ بات نہیں آتی کہ آخر ایک سیاسی، معاشی اور تمدنی لائحہ عمل کو چلانے کے لیے اِن عقائد اور اِن عبادات کی ضرورت ہی کیا ہے۔

دوسرا بنیادی نقص اِس مسخ شدہ مذہبیت میں یہ ہے کہ اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس میں صدیوں سے اجتہاد کا دروازہ بند ہے جس کی وجہ سے اسلام ایک زندہ تحریک کے بجائے محض عہدِ گزشتہ کی ایک تاریخی یادگار بن کر رہ گیا ہے اور اسلام کی تعلیم دینے والی درس گاہیں آثارِ قدیمہ کے محافظ خانوں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اجنبی لوگ اس چیز کو دیکھ کر زیادہ سے زیادہ تاریخی ذوق کی بنا پر اظہارِ قدر شناسی تو کر سکتے ہیں، مگر یہ توقع اُن سے نہیں کی جا سکتی کہ وہ حال کی تدبیر اور مستقبل کی تعمیر کے لیے اس سے ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت محسوس کریں گے۔

تیسرا اہم نقص اس میں یہ ہے کہ جزئیات کی ناپ تول، مقداروں کے غیر منصوص تعیّن، اور رُوح سے بڑھ کر مظاہر پہ مدارِ دین داری رکھنے کی بیماری اِس میں حد سے بڑھ گئی ہے، اور وہ غیروں کی تالیف تو کیا کرے گی اُلٹی اپنوں کی تنفیر کا باعث بن رہی ہے۔ اِس غلط مذہبیت کے علمبرداروں کی زندگی دیکھ کر اور ان کی باتیں سُن کر آدمی اس سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ انسان کی ابدی فلاح و خسران کا مدار کیا انہی چھوٹی چھوٹی چیزوں پر ہے جن پر یہ لوگ اتنا زور دیتے ہیں؟

اِسلام کے راستے میں یہ بہت بڑی رکاوٹ ہے مگر یہ اسلام کا قصور نہیں ہمارا اپنا قصور ہے اور ہمارا فرض ہے کہ اپنے اُس نظامِ تعلیم کو بدلیں جس نے دین کے تصور کو اتنا غلط اور شریعت کے علم کو اس قدر جامد بنا دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک زندہ تحریک محض عقائد کے بل پر تو نہیں اُٹھ سکتی۔ ہمیں اس کے عقائد کو معقول دلائل کے ساتھ پیش کرنا ہوگا۔ پھر عقائد کے ساتھ عبادات کا اور عبادات کے ساتھ زندگی کے قوانین کا منطقی ربط واضح کرنا پڑے گا۔ پھر ان قوانین کو زندگی کے تمام عملی مسائل پر منطبق کر کے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ جتنی انسانی ضروریات ہیں اُن سب کا حل اِن قوانین میں موجود ہے۔ تب

کہیں لوگ اس نظام کو ایک معقول نظام کی حیثیت سے سمجھ سکیں گے، اور جب وہ اسے سمجھیں گے تو قبول بھی کرنے پر آمادہ ہوں گے۔ یہ تعمیری کام چونکہ محنت طلب ہے اس لیے اس محنت سے جی چرا کر لوگ بنے بنائے آسان طریقوں کی طرف دوڑ جاتے ہیں، مگر یہ نہیں سوچتے کہ اپنے مقصد تک پہنچنے کے لیے راستہ بنانے کی زحمت بہر حال ہمیں اٹھانی ہی پڑے گی۔ جس نے بھی کوئی مقصدِ عظیم پیش نظر رکھا ہے اُسے یہ زحمت اٹھانی پڑی ہے، اور اگر واقعی ہم اپنے مقصد میں صادق ہیں تو ہمیں اس کام کے لیے تیار ہونا چاہیئے۔

دُوسری مشکل

اب دوسری مشکل کو لیجیے۔ جن تعصبات کو اسلام کی راہ میں حائل بتایا جاتا ہے اُن کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ:-

ایک قسم کا تعصب تو وہ ہے جو طبعاً ہر شخص کے اندر اُس چیز کے خلاف ہوتا ہے جو اس کے لیے نئی ہو، جس پر اُس نے اپنے باپ دادا کو نہ پایا ہو، اور جس سے وہ مانوس نہ ہو۔ یہ تعصب صرف آج ہی اسلام کی راہ میں حائل نہیں ہے، پہلے بھی حائل تھا، اور جیسا کہ میں اوپر اشارہ کر چکا ہوں، یہ صرف اسلام ہی کی راہ میں حائل نہیں ہے، ہر تحریک کی راہ میں حائل ہوتا ہے۔ تاہم یہ ایسی رکاوٹ نہیں ہے جس کو دُور نہ کیا جا سکتا ہو۔ پہلے بھی اس رکاوٹ کے باوجود اسلام پھیلا ہے اور اب بھی پھیل سکتا ہے۔

دوسری قسم کا تعصب وہ ہے جو دراصل اسلام کے خلاف نہیں بلکہ مسلمانوں کے خلاف پیدا ہوا ہے اور مسلمانوں کے واسطے سے اسلام کی راہ میں حائل ہو گیا ہے۔ مسلمانوں نے پچھلی کئی صدیوں میں جو غیر اسلامی طریقے اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی میں اختیار کیے اور اب بھی اپنے انفرادی کردار اور اجتماعی رویے میں جس غیر اسلامی سیرت کا وہ اظہار کر رہے ہیں، یہ سارے تعصبات فی الحقیقت اسی کے بھڑکائے ہوئے ہیں۔

اِس واقعہ سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہندوستان کو اصلی اسلامی حکومت، خالص اسلامی اخلاق اور حقیقی اسلامی تمدن سے لذت آشنا ہونے کا کبھی موقع ملا ہی نہیں۔ گزشتہ زمانہ میں مسلمان بادشاہوں نے، مسلمان امراء نے، مسلمان حکّام اور اہل کاروں اور سپاہیوں

نے، مسلمان زمینداروں اور رئیسوں نے اور مسلمان عوام نے اپنے برتاؤ سے اسلام کا جو نمونہ پیش کیا وہ ہرگز ایسا نہ تھا کہ اِس ملک کے عام باشندوں کو اسلام کا گرویدہ بنا سکتا۔ بلکہ اس کے برعکس نفسانی اغراض کے لیے جو کشمکش ان کے اور غیر مسلم عناصر کے درمیان مدتہائے دراز تک برپا ہوتی رہی اس نے اسلام کے خلاف مستقل تاریخی تعصبات پیدا کر دیے۔

اس تاریخی پس منظر کے ساتھ اسلام کا جو نمونہ آج اِس زمانہ میں مسلمان اپنی انفرادی زندگی اور اجتماعی طریق کار سے پیش کر رہے ہیں وہ بھی کچھ ایسا خوبصورت نہیں ہے کہ اس قسم کے نمونے کو دیکھ کر لوگ اُس تحریک کے عاشق ہو جائیں جس کی نمائندگی اس شان سے کی جا رہی ہو۔ انفرادی زندگی میں ایک عام مسلمان ایک عام غیر مسلم سے آخر کس چیز میں برتر نظر آتا ہے کہ لوگ اِس برتری کے منبع کی جستجو کریں؟ اس کے برتاؤ میں، اس کے اخلاق میں، اس کے معاملات میں کہاں کوئی خفیف سی چمک بھی ایسی نمودار ہوتی ہے جس سے یہ ظاہر ہو کہ یہ شخص فائق تر اور پاکیزہ تر اصولوں کی پیروی کرتا ہے؟ کیا ایک مسلمان زمیندار یا "شریف" اصطلاحی "کمینوں" کے مقابلہ میں اپنے طبقہ کے کسی غیر مسلم "شریف" یا رئیس سے کچھ کم نخوت برتتا ہے؟ کیا ایک مسلمان تاجر یا پیشہ ور آدمی اپنے ہم پیشہ غیر مسلم سے کچھ زیادہ متدین ہوتا ہے؟ کیا ایک مسلمان حاکم یا عہدہ دار اپنے اختیارات کے استعمال میں کسی غیر مسلم ہمسر سے کچھ بہتر اخلاقی اصولوں کی پیروی کرتا ہے؟ کیا دفتروں کے مسلمان ملازم رات دن انہی تمام ذلیل طریقوں کی پیروی نہیں کر رہے ہیں جن کی پیروی اُن کے غیر مسلم ساتھی کرتے ہیں؟ کیا وہی جائز و ناجائز طریقوں سے اپنی قوم کا تعصب، وہی کمینہ چالوں سے غیر قوم والوں کو نقصان پہنچانے کی کوششیں کرنا، اور انہی چھوٹی چھوٹی دنیوی اغراض کے پیچھے لڑے مرنا، جس کی شکایت یہ غیر مسلموں سے کرتے ہیں، خود ان کا بھی رات دن کا مشغلہ نہیں ہے؟ پھر جب ایک غیر مسلم اسلام کے اِن نمائندوں کی زندگی میں کہیں بھی کوئی فوقیت کا نشان نہیں پاتا، جب وہ انہیں بھی وہی سب کچھ کرتے دیکھتا ہے جو وہ خود کرتا ہے، اور جب وہ انہیں بھی اُنہی مقاصد کے لیے لڑتے جھگڑتے اور کشمکش کرتے دیکھتا ہے جن کے لیے وہ خود لڑتا جھگڑتا اور کشمکش کرتا ہے، تو آخر کون سی چیز اُس کو اُس

مسلک کی طرف مائل کر سکتی ہے جس کی نمائندگی یہ لوگ کر رہے ہیں؟ بلکہ جب ایک ہی نفسانیت اور دنیا پرستی کے میدان میں وہ اور یہ برابر کے حریف ہیں تو اپنے حریفوں کے مسلک پر وہ کھلے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہی کیوں محسوس کرنے لگا؟ ایک طرف پچھلے تاریخی تعصبات، اور پھر آج کی نفسانی کشمکش، کیا یہ دونوں چیزیں اس کے دل کے دروازوں پر قفل چڑھانے کے لیے کافی نہیں ہیں؟

انفرادی زندگی سے وسیع تر، قومی دائرے میں مسلمان اس وقت تک جس پالیسی پر مصر ہیں، بلکہ جسے اپنی حیاتِ اجتماعی کا ضامن سمجھ رہے ہیں وہ کیا ہے؟ اصول اسلام اور مقاصدِ اسلام کا کہیں نام تک نہیں آتا۔ کسی خطبے، کسی تقریر، کسی ریزولیوشن میں آپ ایک فقرہ تک ایسا نہیں پا سکتے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ یہ لوگ اپنی اغراض اور اپنے دنیوی مقاصد کے لیے نہیں بلکہ انسانوں کی فلاح کے لیے عالمگیر حق اصول لے کر اٹھے ہیں اور ان کی لڑائی محض اصولِ حق کی خاطر ہے۔ اس کے برعکس آپ یہ دیکھیں گے کہ ان کے اور دوسری قوموں کے درمیان بالکل برابر کی قوم پرستانہ جنگ برپا ہے، دونوں ایک سطح پر اُتر آئے ہیں، ایک ہی مرتبے کی دُنیوی اغراض کے لیے کشمکش کر رہے ہیں، ایک ہی قسم کی چالیں (Tactics)، زبان، اصطلاحات اور اصولِ نزاع اختیار کر رہے ہیں، اور سارا رونا دھونا اور لڑائی جھگڑا اُنہی چیزوں کے لیے ہے جن کے لیے ان کے حریفوں کا رونا دھونا اور لڑائی جھگڑا ہے۔ پھر کس طرح یہ بات عقل میں آسکتی ہے کہ جن لوگوں سے آپ دُنیوی اغراض کے لیے مساوی مرتبے پر لڑ رہے ہوں، جن سے آپ رقابت اور حریفی کا پُرانا اور تازہ رشتہ رکھتے ہوں، جن کے ساتھ آپ کی سیاسی اور معاشی مفاد کے لیے کشمکش برپا ہو، وہ آپ کی طرف سے کسی اصولی تحریک کی دعوت پر اُسی طرح کھلے دل سے غور کرنے کے لیے تیار ہوں گے جس طرح وہ اشتراکیت یا ڈیموکریسی یا کسی اور مسلک کی دعوت کے لیے تیار ہوتے ہیں؟

یہ تعصّبات اسلام کے راستے میں دوسری عظیم الشان رکاوٹ ہیں، مگر ان کا علاج ہے کہ ہم ان تعصبات کی پیدائش کے سبب کو باقی رکھیں اور پھر ان کی موجودگی کو

بہانہ بنا کر اپنے مقصد کی طرف براہِ راست پیش قدمی کرنے سے مُنہ موڑیں، بلکہ ان کا اصلی علاج یہ ہے کہ ہم اپنے انفرادی اور اجتماعی طرزِ عمل کو بدلیں اور اِس طرح تمام تعصبات کی جڑ کاٹ کر اپنے مقصد کی طرف بڑھنے کے لیے سیدھا راستہ تیار کریں۔ جو لوگ محض سرسری نگاہ میں یہ دیکھ کر کہ اسلام کے خلاف ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی، تمام قوموں میں سخت تعصبات پھیلے ہوتے ہیں، یہ فیصلہ صادر کر دیتے ہیں کہ اس حالت میں اسلام ایک خالص اصولی تحریک کی حیثیت سے نہیں پھیل سکتا، وہ دراصل واقعات کو غلط رنگ میں دیکھتے اور غلط نتائج نکالتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے اوپر ثابت کیا ہے، یہ تعصبات اسلام اور اسلامی سیرت کے بھڑکائے ہوئے نہیں ہیں (جس سے اِن قوموں کو ہندوستان میں کم ہی سابقہ پیش آیا ہے) بلکہ اسلام کے اُن غلط نمائندوں کی روش سے پیدا ہوئے ہیں جو مسلمان ہونے کے باوجود غیر اسلامی طریقوں پر چلتے رہے اور خالصتہً للّٰہ کام کرنے کے بجائے اپنی دُنیوی اغراض اور نفسانی خواہشات کے لیے کام کرتے رہے۔

لہٰذا اِن تعصبات کے تدارک کی صحیح صورت یہ ہے کہ اب اپنی سیرت، اپنے اعمال، اور اپنی اجتماعی جدوجہد سے اسلام کی صحیح نمائندگی کیجیے، نہ یہ کہ تعصبات کی موجودگی کو اُسی غلط روش پر چلنے کے لیے حجت بنا لیجیے جس کی وجہ سے تعصبات پیدا ہوتے ہیں۔ بالفرض اگر یہ مان لیا جائے کہ قومی تعصبات کی موجودگی میں اسلام کا ایک خالص اصولی تحریک کی حیثیت سے چلنا محال ہے، تو سوال یہ ہے کہ اسلامی مقاصد کے بجائے مسلمانوں کے دُنیوی مفاد کے لیے جو کشمکش آپ کے اور دوسری قوموں کے درمیان برپا ہے اور اس کے قوم پرستانہ طریقوں کے جواب میں ویسے ہی قوم پرستانہ طریقے جس طرح آپ اختیار کر رہے ہیں، کیا اُس سے یہ تعصبات کبھی قیامت تک بھی دُور ہو سکتے ہیں؟ اگر نہیں تو پھر یہ نہ کہیے کہ اِس وقت کچھ خاص حالات ایسے ہیں جن کی وجہ سے اسلام ایک خالص اصولی تحریک کی حیثیت سے نہیں چل سکتا، بلکہ یوں فرمائیے کہ آئندہ بھی ہمیشہ ایسے ہی حالات موجود رہیں گے اور اگر اسلام آپ ہی کا ورثۂ آبائی بنا رہا تو وہ ہمیشہ بنی اسرائیل کی طرح محض آپ کا قومی مذہب بن کر رہے گا، کبھی ایک عالمگیر دعوت نہ بن سکے گا۔

یہ انسانی فطرت کا اقتضاء ہے کہ خود غرضی کے جواب میں خود غرضی اور قوم پرستی کے جواب میں قوم پرستی پیدا ہوتی ہے۔ بخلاف اس کے بے غرضانہ حق پرستی کے مقابلہ میں تمام تعصبات اور تمام مخالفانہ جذبات آخرکار ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور ایک سچے بے لوث حق پرست کے آگے انسان عقیدت و محبت کے سوا اور کوئی چیز پیش کرنے پر قادر ہی نہیں رہتا۔ اگر مسلمان اپنی وہی حیثیت قائم رکھتے جو دراصل ان کی تھی تو یہ ممکن نہ تھا کہ ہندوستان میں ان کے خلاف وہ تعصبات پلتے جاتے جن کی آج شکایت کی جاتی ہے۔ لیکن انہوں نے خود اپنی وہ حیثیت کھو دی۔ دُنیوی فائدوں کے لیے دوسری قوموں سے لڑنے جھگڑنے لگے اور اصولِ حق کے بجائے اپنی اغراضِ ذاتی و قومی کو انہوں نے اپنی جدوجہد کا محور بنا لیا۔ اس کے جواب میں اگر دوسروں کے اندر تعصب نہ پیدا ہوتا تو تعجب کی بات تھی۔ جن اصولوں کا آپ نام لیتے ہیں اُن کی آپ خود پیروی نہیں کرتے بلکہ رات دن اپنی شخصی اور اجتماعی زندگی میں ان کے خلاف عمل کرتے رہتے ہیں۔ جس مقصدِ عالی کا آپ اظہار کرتے ہیں، آپ کی عملی جدوجہد اس مقصد کے لیے نہیں ہے بلکہ آپ کے افراد انفرادی طور پر اور آپ کی پوری جماعت بحیثیتِ مجموعی اس کو پسِ پُشت ڈال کر دوسرے مقاصد کے پیچھے چلی جا رہی ہے۔ اس صورت میں اگر اپنے خیالی نصب العین اور اپنے محض زبانی اصولوں کے لیے آپ کی اپیل دوسروں پر کارگر نہ ہو، اگر وہ اس اپیل میں آپ کو جھوٹا سمجھیں اور آپ کی تبلیغ کو محض خود غرضانہ چال سمجھ کر حقارت سے رد کر دیں تو آخر اس میں حیرت کی بات ہی کون سی ہے؟

ظاہر ہے کہ کوئی غیر مسلم مسٹر جناح کے ۱۴ یا ۱۴[1] نکات پر تو ایمان نہیں لا سکتا۔ نہ

---

[1] مرحوم کے اُن ۱۴ نکات کی طرف اشارہ ہے جو مسلمانوں کے سیاسی حقوق کے تحفظ کے لیے انہوں نے مارچ ۱۹۲۹ء میں پیش کیے تھے۔ ان نکات کی اصل عبارت مسٹر جی الانہ کی کتاب (Pakistan Movement : Historic Documents) صفحہ ۷۰-۷۲، میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ان نکات کو بغور پڑھا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ اسی وقت تک مسلمانوں کو تحفظ دے سکتے تھے جب تک (باقی صفحہ ۱۵۵ پر)

مسلم لیگ یا مجلسِ احرار یا جمعیت العلماء کے ریزولیوشنوں میں کوئی ایسی چیز ہے جس پر کوئی ایمان لائے۔ ایمان اگر کوئی لا سکتا ہے تو لا الٰہ الا اللہ پر لا سکتا ہے بشرطیکہ ایک جماعت اسی کلمہ کے لیے جینے اور اسی پر مرنے والی اس کے سامنے موجود ہو۔ مگر وہ ہے کہاں؟ کون سی جماعت آپ کے اندر ایسی موجود ہے جس نے خالص اطاعتِ حق کو اپنا مسلک اور خالص دین کے قیام کو اپنی کوششوں کا مرکز و محور بنا لیا ہو؟ لوگ اسلام کی دعوت اور اس کے اصولِ حق کو کتابوں میں دیکھتے ہیں اور ان کے معترف ہو جاتے ہیں۔ مگر اس پر عمل کرنیوالی اور اس کے نصب العین کے لیے کام کرنے والی سوسائٹی اُن کو کہیں نہیں ملتی۔ پھر وہ جائیں تو آخر کہاں جائیں؟ کیا اس سوسائٹی میں شامل ہوں جو رات دن دنیا ہی کے پیچھے مری جاتی ہے اور انہی راستوں پر چلی جا رہی ہے جن پر غیر مسلم چلتے ہیں؟ آپ کی ایک جماعت لڑتی ہے اس لیے کہ ارضِ ہند پر انگریز کے بجائے ہندوستانی کا اقتدار قائم ہو۔ بعینہ یہی چیز ایک شخص کو غیر مسلم جماعتوں میں بھی مل جاتی ہے۔ پھر وہ آپ کے پاس کیوں آئے؟ آپ کی دوسری جماعت لڑتی ہے اس لیے کہ ہندو کے مقابلہ میں نسلی مسلمانوں کے دنیوی مفاد کا تحفظ کیا جائے۔ یہ چیز اس کو خود اپنی قوم پرستی کی مدِ مقابل نظر آتی ہے۔ پھر وہ اپنی قوم پرستی کو چھوڑ کر آپ کی قوم پرستی پر کیوں ایمان لائے؟ انسان کو غیر اللہ کے تسلط سے آزاد کرانے والی جماعت آپ میں ہے کہاں کہ کوئی اس کے اصول و مقاصد پر ایمان لائے اور اس میں شامل ہونے کے لیے آگے بڑھے؟

تیسری مشکل

سب سے بڑی گتھی جو ہمارے سوچنے والے دماغوں کے لیے ناقابلِ حل بن گئی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں کروڑوں کی تعداد میں ایک ایسی قوم بستی ہے جو نہ پوری مسلمان ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۴ سے) انگریزی حکومت ملک میں رہتی۔ ہندوستان کے ایک آزاد مملکت بن جانے کی صورت میں یہ تحفظات کسی کام نہ آ سکتے تھے۔ اس لیے دعوتِ اسلام تو درکنار خود مسلمانوں کے آئینی تحفظ کے لیے بھی ان کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔ (جدید)

زپوری غیر مسلم۔ اس قوم کے اس حال میں یہاں موجود ہونے سے متعدد پیچیدہ مسائل پیدا ہو گئے ہیں جن کا کوئی حل لوگوں کو نہیں ملتا اور اسی وجہ سے رہنما اور کارکن سب پراگندہ عمل ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پر میں ان چند بڑی بڑی الجھنوں کی طرف اشارہ کروں گا جو اس صورتِ حال نے پیدا کر دی ہیں:۔

بعض لوگ لفظ مسلمان سے دھوکا کھا کر اس غلط فہمی میں پڑ گئے ہیں کہ اصل سوال اسلام کے احیاء (Revival) کا نہیں بلکہ مسلمانوں کے احیاء کا ہے۔ یعنی یہ قوم جو مسلمان کے نام سے پائی جاتی ہے، اس کو ایک زندہ اور طاقت ور قوم بنانا اور برسرِ عروج لانا اصل مقصود ہے اور اسی کا نام اسلام کا احیاء ہے۔ یہ غلط فہمی ان کو "مسلم قوم پرستی" کی حد تک کھینچ لے گئی ہے۔ جس طرح مونجے اور ساورکر[1] کے لیے سوال ہندو قوم کے عروج کا ہے؛ جس طرح مسولینی کے لیے اطالوی قوم اور ہٹلر کے لیے جرمن قوم کے عروج کا سوال ہے، اسی طرح اِن "مسلم قوم پرستوں" کے لیے اصل سوال اس مسلمان قوم کے عروج کا ہے جس میں یہ پیدا ہوتے ہیں اور جس کے ساتھ ان کی قسمتیں وابستہ ہیں۔ یہ اسلام کی خدمت اس کو سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کی تعلیم (قطع نظر اس سے کہ وہ تعلیم کیسی ہی ہو)، اُن کی معاشی خوش حالی (خواہ وہ کسی قسم کے ذرائع سے حاصل ہو)، اور اُن کی سیاسی و عسکری تنظیم (مجرد قومی تنظیم) پر اپنا زور صرف کیا جائے، اور اُن کو ایک زبردست قوم بنا دیا جائے۔ پھر جب یہ اِن کا مقصد قرار پایا تو انہوں نے معاملات کو اس نظر سے دیکھنا شروع کیا کہ کون سی تدابیر اس مقصد تک پہنچنے میں مددگار ہو سکتی ہیں، اور جو تدبیریں بھی ان کو دنیا میں قومی عروج کے لیے مفید و کارگر نظر آئیں اس کو بے تکلف انہوں نے استعمال کرنا شروع کر دیا، خواہ وہ اسلام سے ان کو کتنی ہی دُور لے جانے والی ہوں۔ یہ ذہنیت سرسید احمد خاں کے وقت سے آج تک مسلمانوں کے اکثر و بیشتر رہنماؤں، کارکنوں اور اداروں پر مسلط ہے۔ اسلام کے نام سے جو کچھ سوچا جا رہا ہے مسلمانوں کے لیے سوچا جا رہا ہے اور اسلام کی قید سے آزاد ہو کر سوچا جا رہا ہے۔

---

[1] یہ اُس زمانے کے مشہور متعصب ہندو لیڈر تھے۔ (جدید)

کچھ دوسرے لوگ اسلام اور مسلمان کو اس حیثیت سے تو خلط ملط نہیں کرتے لیکن ایک دوسری حیثیت سے وہ اسلام کے مستقبل کو موجودہ نسلی مسلمانوں کے دامن سے باندھ دیتے ہیں۔ وہ چاہتے تو اسلام ہی کا احیاء ہیں، مگر ان کا خیال یہ ہے کہ اسلام کا احیاء موقوف ہے اُن سب مسلمانوں کے مکمل مسلمان بن جانے پر جو اِس وقت قومی و نسلی حیثیت سے مسلمان ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جب تک یہ سارے کے سارے مسلمان ذہنی، اخلاقی اور عملی حیثیت سے تبدیل نہ ہو جائیں، قدم آگے نہیں بڑھایا جا سکتا۔ اور یہ چیز چونکہ سخت دشوار بلکہ محال نظر آتی ہے، اس لیے یہ لوگ اصل مقصد کی طرف پیش قدمی کرنے کے بجائے اِدھر اُدھر کے فضول کاموں میں مختلف ضمنی مقاصد کے پیچھے اپنی قوتیں ضائع کر رہے ہیں۔

کچھ اور لوگ ہیں جن کے سامنے اسلامی نصب العین قریب قریب بالکل واضح ہو چکا ہے اور وہ اُس کی طرف بڑھنا بھی چاہتے ہیں، مگر یہ سوال ان کو بار بار پریشان کرتا ہے کہ اگر ہمارے کارفرما دماغ اور کارکن ہاتھ سب کے سب اسلامی نصب العین کے لیے جدوجہد کرنے میں لگ جائیں تو آخر موجودہ کافرانہ نظامِ تمدن و سیاست اور اس کے آئندہ تغیرات میں ہماری قوم کے سیاسی و معاشی مفاد کا کیا حشر ہو گا۔ اس سوال کی اہمیت اُن کی نگاہ میں اتنی زیادہ ہے کہ وہ اپنے عزمِ سفر کو ملتوی کر کے کہتے ہیں کہ پہلے اِس سوال کو حل کیا جائے اور اصل مقصد کی طرف قدم اُس وقت بڑھایا جائے جب اپنی قوم کا کوئی مسئلہ ہمارے لیے حل طلب باقی نہ رہے۔

لیکن یہ تمام اُلجھنیں غیر اسلامی طرزِ فکر اور غیر اسلامی ذہنیت کی پیداوار ہیں۔ اگر خالص مسلمان ہونے کی حیثیت سے دیکھا جائے تو ان میں سے کوئی الجھن بھی ہمارے لیے الجھن نہیں رہتی۔ ہمارے سامنے اصل سوال کسی قوم کے احیاء کا نہیں بلکہ مسلکِ اسلام کے احیاء کا ہے۔ قوم کے احیاء کا خیال دماغ سے نکالتے ہی وہ تمام مسائل کافور کی طرح اُڑ جاتے جو قومیت کی اصطلاحوں میں سوچنے والے لوگوں کو پریشان کیا کرتے ہیں۔ جب ہم مسلکِ اسلام کے پیرو ہیں اور اس کو فروغ دینا ہمارا مقصد ہے تو ہمیں کسی ایسے مفاد سے کوئی دلچسپی یا ہمدردی نہیں ہو سکتی جو کسی غیر اسلامی نظام سے وابستہ ہو یا اصولِ اسلام سے متصادم ہو۔ ہم اپنے دماغ کو اُس کے لیے

سوچنے کی کچھ بھی زحمت نہ دیں گے۔ قومی احیاء کی اُن تمام تدبیروں سے بھی ہمارا کوئی تعلق نہ ہو گا جو غیر اسلامی اصول پر مبنی ہوں۔ ایک قوم اور دوسری قوم کی باہمی کشمکش، اور ایک قوم پر دوسری قوم کے تفوّق کی کوششوں سے بھی ہم پوری تبرّی کریں گے۔ ہم کو جو کچھ بھی دلچسپی ہو گی اسلامی نظام فکر و عمل سے ہے، اس کی تبلیغ و اشاعت سے ہے، اور اس کو حکمراں بنانے کی سعی و جہد سے ہو گی۔ مسلمانوں سے ہمارا تعلق صرف اُسی حد تک ہو گا جس حد تک اُن کا تعلق اسلام سے ہے۔ جو اپنی خواہشِ نفس اور ہر غیر اللہ کی بندگی چھوڑ کر صرف اللہ کی بندگی میں آجائے وہ ہمارا بھائی اور رفیق ہے، خواہ وہ نسلی مسلمانوں میں سے آئے یا غیر مسلموں میں سے۔ ہم پیدائشی مسلمانوں کو بھی اِسی مسلک کی طرف دعوت دیں گے اور غیر مسلموں کو بھی۔ ہمارے نزدیک اسلام کا دامن نسلی مسلمانوں کے دامن سے بندھا ہوا نہ ہو گا کہ یہ اُٹھیں تو وہ بھی اُٹھے اور یہ نہ اُٹھیں تو وہ بھی نہ اُٹھے۔ اسلام اِن کے باپ دادا کی جائداد نہیں ہے۔ یہ اس کے لیے جینے اور اُسی کے لیے مرنے پر تیار ہوں تو ہم خوش اور ہمارا خدا خوش۔ ورنہ جس جہنم میں ان کا جی چاہے جا کر گر جائیں۔ ہم اللہ کا کلمہ دوسرے انسانوں کے پاس لے جائیں گے۔

یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں بعینہٖ یہی طرزِ عمل انبیاءؑ و رسلؑ کا تھا اور اسی کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کیا۔ قرآن میں جن کو اہلِ کتاب کہا گیا ہے وہ آخر "نسلی مسلمان" ہی تو تھے۔ خدا اور ملائکہ اور نبی اور کتاب اور آخرت سب کو مانتے تھے، اور عبادات اور احکام کی رسمی پیروی بھی کرتے تھے۔ البتہ اسلام کی اصلی روح، یعنی بندگی و اطاعت کو اللہ کے لیے خالص کر دینا اور دین میں شرک نہ کرنا، یہ چیز اُن میں سے نکل گئی تھی۔ اب دیکھیے، کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس "نسلی مسلمان" قوم کے احیاء پر اپنی کوششوں کو مرکوز فرمایا تھا؟ نہیں۔ کیا آپ نے یہ عہد کر لیا تھا کہ جب تک یہ سارے کے سارے "نسلی مسلمان" "اصلی مسلمان" نہ بن جائیں گے قدم آگے نہ بڑھایا جائے گا؟ یہ بھی نہیں۔ کیا آپ نے ان "نسلی مسلمانوں" کے دُنیوی مسائل کو حل کرنے تک اقامتِ دین کی کوششوں کو ملتوی رکھا تھا؟ یہ بھی نہیں۔ پھر آپ نے کیا کیا؟ سب جانتے ہیں کہ آپ نے تمام معاملات اور تمام مسائل سے قطع نظر کر کے

"نسلی مسلمانوں" اور غیر مسلموں سب کو خالص اللہ کی بندگی کی طرف دعوت دی، جس نے اسے قبول کیا اور غیر اللہ کی بندگی و اطاعت ترک کر دی اُسے اپنے جتھے میں شامل کر لیا اور پھر ان لوگوں کو لے کر الٰہی نظام اطاعت یعنی دینِ حق کو قائم کرنے کے لیے براہِ راست جدّ و جہد شروع کر دی یہاں تک کہ اس کو قائم کر کے چھوڑا۔

ٹھیک یہی طریقہ ہے جس کی پیروی کو میں حق سمجھتا ہوں، اسی کی پیروی خود کرنا چاہتا ہوں، اور اسی کا مشورہ ان سب لوگوں کو دیتا ہوں جن کا نصب العین اسلامی ہے۔

(ترجمان القرآن - جنوری ۱۹۴۱ء)

اِسلامی حکومت کسِطرح قائم ہوتی ہے؟[1]

اس مقالہ میں مجھے اُس عمل (Process) کی تشریح کرنی ہے جس سے ایک طبعی نتیجہ کے طور پر اسلامی حکومت وجود میں آتی ہے۔ آج کل مَیں دیکھ رہا ہوں کہ اسلامی حکومت کا نام بازیچۂ اطفال بنا ہوا ہے۔ مختلف حلقوں سے اِس تصوّر اور اِس مقصد کا اظہار ہو رہا ہے مگر ایسے ایسے عجیب راستے اس منزل تک پہنچنے کے لیے تجویز کیے جا رہے ہیں جن سے وہاں تک پہنچنا اتنا ہی محال ہے جتنا موٹر کار کے ذریعہ سے امریکہ تک پہنچنا۔ اِس خام خیالی (Loose Thinking) کی تمام تر وجہ یہ ہے کہ بعض سیاسی و تاریخی اسباب سے کسی ایسی چیز کی خواہش تو پیدا ہو گئی ہے جس کا نام "اسلامی حکومت" ہو مگر خالص علمی (Scientific) طریقہ پر نہ تو یہ سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس حکومت کی نوعیت کیا ہے اور نہ یہ جاننے کی کوشش کی گئی کہ وہ قائم کیونکر ہُوا کرتی ہے۔ ایسی حالت میں یہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ علمی طریقہ پر اس مسئلہ کی پوری تحقیق کی جائے۔

نظامِ حکومت کا طبعی ارتقاء

جو لوگ اجتماعیات میں کچھ بھی نظر رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ حکومت خواہ کسی نوعیت

---

[1] یہ ایک مقالہ ہے جو ۱۲ ستمبر ۱۹۴۰ء کو اسٹریچی ہال، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پڑھا گیا تھا۔

کی ہو، مصنوعی طریقہ سے نہیں بنا کرتی۔ وہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ کہیں وہ بن کر تیار ہو اور پھر اُدھر سے لا کر اس کو کسی جگہ جما دیا جاتے۔ اس کی پیدائش تو ایک سوسائٹی کے اندر اخلاقی، نفسیاتی، تمدنی اور تاریخی اسباب کے تعامل سے طبعی طور پر ہوتی ہے۔ اس کے لیے کچھ ابتدائی لوازم (Prerequisites) ، کچھ اجتماعی محرکات، کچھ فطری مقتضیات ہوتے ہیں جن کے فراہم ہونے اور زور کرنے سے وہ وجود میں آتی ہے۔ جس طرح منطق میں آپ دیکھتے ہیں کہ نتیجہ ہمیشہ مقدمات (Premises) کی ترتیب ہی سے برآمد ہوتا ہے، جس طرح علم الکیمیا میں آپ دیکھتے ہیں کہ ایک کیمیاوی مرکب ہمیشہ کیمیاوی کشش رکھنے والے اجزا کے مخصوص طریقہ پر ملنے ہی سے برآمد ہوتا ہے، اُسی طرح اجتماعیات میں بھی یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ ایک حکومت صرف اُن حالات کے اقتضاء کا نتیجہ ہوتی ہے جو کسی سوسائٹی میں بہم ہو گئے ہوں۔ پھر حکومت کی نوعیت کا تعیّن بھی بالکلیہ اُن حالات کی کیفیت پر منحصر ہوتا ہے جو اس کی پیدائش کے مقتضی ہوتے ہیں۔ جس طرح یہ ممکن نہیں کہ مقدمات کسی نوعیت کے ہوں اور ان کی ترتیب سے نتیجہ کچھ اور نکل آئے، کیمیاوی اجزا کسی خاصیت کے ہوں اور ان کو ملانے سے مرکب کسی اور قسم کا بن جائے، درخت لیموں کا لگایا جائے اور نشوونما پا کر وہ پھل آم کے دینے لگے، اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ اسباب ایک خاص نوعیت کی حکومت کے فراہم ہوں، اُن کے مل کر کام کرنے کا ڈھنگ بھی اسی نوعیت کی حکومت کے نشوونما پانے کے لیے مناسب ہو، مگر ارتقائی مراحل سے گزر کر جب وہ تکمیل کے قریب پہنچے تو انہی اسباب اور اُسی عمل کے نتیجہ میں بالکل ایک دوسری ہی نوعیت کی حکومت بن جائے۔

یہ گمان نہ کیجیے کہ میں یہاں جبریت (Determinism) کو دخل دے رہا ہوں اور انسانی ارادہ و اختیار کی نفی کر رہا ہوں۔ بلاشبہ حکومت کی نوعیت متعین کرنے میں افراد اور جماعتوں کے ارادہ و عمل کا بہت بڑا حصہ ہے، مگر در اصل میں یہ ثابت کر رہا ہوں کہ جس نوعیت کا بھی نظامِ حکومت پیدا کرنا مقصود ہو، اُسی کے مزاج اور اُسی کی فطرت کے مناسب اسباب فراہم کرنا اور اُسی کی طرف لے جانے والا طرزِ عمل اختیار کرنا بہرحال

ناگزیر ہے۔ اُس کے لیے ضروری ہے کہ ویسی ہی تحریک اُٹھے، اُسی قسم کے انفرادی کیرکٹر تیار ہوں، اُسی طرح کا اجتماعی اخلاق بنے، اُسی طرز کی لیڈرشپ ہو، اور اُسی کیفیت کا اجتماعی عمل ہو جس کا اقتضاء اُس خاص نظامِ حکومت کی نوعیت فطرۃً کرتی ہے جسے ہم بنانا چاہتے ہیں۔ یہ سارے اسباب و عوامل جب بہم ہوتے ہیں اور جب ایک طویل مدت تک جدوجہد کرنے سے اُن کے اندر اتنی طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ اُن کی تیار کی ہوئی سوسائٹی میں کسی دوسری نوعیت کے نظامِ حکومت کا جینا دشوار ہو جاتا ہے تب ایک طبعی نتیجہ کے طور پر وہ خاص نظامِ حکومت اُبھر آتا ہے جس کے لیے اِن طاقت ور اسباب نے جدوجہد کی ہو۔ بالکل اُسی طرح جس طرح کہ ایک بیج سے جب درخت پیدا ہوتا ہے اور اپنے زور میں بڑھتا چلا جاتا ہے تو نشوونما کی ایک خاص حد پر پہنچ کر اس میں وہی پھل آنے شروع ہو جاتے ہیں جن کے لیے اُس کی فطری ساخت زور کر رہی تھی۔ اس حقیقت پر جب آپ غور کریں گے تو آپ کو یہ تسلیم کرنے میں ذرا تامل نہ ہوگا کہ جہاں تحریک، لیڈرشپ، انفرادی سیرت، جماعتی اخلاق، اور حکمتِ عملی ہر ایک چیز ایک نوعیت کا نظام حکومت پیدا کرنے کے لیے موزوں و مناسب ہو، اور اُمید یہ کی جاتی ہے کہ اُن کے نتیجہ میں بالکل ہی ایک دوسری نوعیت کا نظام پیدا ہوگا، وہاں بے شعوری، خام خیالی اور خام کاری کے سوا کوئی چیز کام نہیں کر رہی ہے۔

اصولی حکومت

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ حکومت جس کو ہم اسلامی حکومت کہتے ہیں، اُس کی نوعیت کیا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی خصوصیت جو اسلامی حکومت کو تمام دوسری حکومتوں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ قومیت کا عنصر اس میں قطعی ناپید ہے۔ وہ مجرّد ایک اصولی حکومت ہے۔ انگریزی میں مَیں اس کو (Ideological State) کہوں گا۔ یہ "اصولی حکومت" وہ چیز ہے جس سے دنیا ہمیشہ ناآشنا رہی ہے اور آج تک ناآشنا ہے۔ قدیم زمانہ میں لوگ صرف خاندانوں یا طبقوں کی حکومت سے

واقف تھے۔ بعد میں نسلی اور قومی حکومتوں سے واقف ہوئے۔ محض ایک اصولی حکومت، اس بنیاد پر کہ جو اس اصول کو قبول کرلے وہ بلا لحاظِ قومیت اسٹیٹ کو چلانے میں حصّہ دار ہوگا، دنیا کے تنگ ذہن میں کبھی نہ سما سکی۔ عیسائیت نے اِس تخیل کا بہت ہی دھندلا سا نقش پایا، مگر اس کو وہ مکمل نظامِ فکر نہ مل سکا جس کی بنیاد پر کوئی اسٹیٹ تعمیر ہوتا۔ انقلابِ فرانس میں اصولی حکومت کے تخیل کی ایک ذراسی جھلک انسان کی نظر کے سامنے آئی مگر نیشنلزم کی تاریکی میں گم ہوگئی۔[1] اشتراکیت نے اس تخیل کا خاصا چرچا کیا حتیٰ کہ ایک حکومت بھی اس کی بنیاد پر تعمیر کرنے کی کوشش کی، اور اس کی وجہ سے دنیا کی سمجھ میں یہ تخیل کچھ کچھ آنے لگا تھا، مگر اس کی رگ رگ میں بھی آخر کار نیشنلزم گھس گیا۔ ابتدا سے آج تک تمام دنیا میں صرف اسلام ہی وہ مسلک ہے جو قومیت کے ہر شائبہ سے پاک کرکے حکومت کا ایک نظام خالص آئیڈیالوجی کی بنیاد پر تعمیر کرتا ہے اور تمام انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ اس آئیڈیالوجی کو قبول کرکے غیر قومی حکومت بنائیں۔

یہ چیز چونکہ نرالی ہے، اور گرد وپیش کی تمام دنیا اس کے خلاف چل رہی ہے اس لیے نہ صرف غیر مسلم بلکہ خود مسلمان بھی اس کو اور اس کے جملہ مُضمرات (Implications) کو سمجھنے سے قاصر ہو رہے ہیں۔ جو لوگ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوتے ہیں، مگر جن کے اجتماعی تصوّرات تمام تر یورپ کی تاریخ اور یورپ ہی کے سیاسیات اور علوم عمران (Social Sciences) سے بنے ہیں، اُن کے ذہن کی گرفت میں یہ تصوّر کسی طرح نہیں آتا۔ بیرونِ ہند کے وہ ممالک جن کی بیشتر آبادی مسلمان اور سیاسی حیثیت سے آزاد ہے، وہاں اِس قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں جب زمامِ حکومت آئی تو ان کو حکومت کا کوئی نقشہ قومی حکومت (National State) کے سوا نہ سوجھا کیونکہ وہ اسلام کے علم وشعور

---

[1] اس کی بنیاد نفرت پر تھی اس لیے شروع ہی سے خود اپنی قوم کے لوگوں پر وہ ظلم وستم توڑے گئے اور اس قدر بے دردی سے قتل عام کیا گیا کہ چنگیز اور ہلاکو کے قصے مات پڑ گئے۔ اس کے بعد اس کا رُخ نیشنلزم کی طرف پھر گیا۔ (جدید)

اور اصولِ حکومت کے تصور سے بالکل خالی الذہن تھے۔ ہندوستان میں بھی جن لوگوں نے اس طرز کی دماغی تربیت پائی ہے وہ اسی مشکل میں مبتلا ہیں۔ اسلامی حکومت کا نام لیتے ہیں مگر بے چارے اپنے ذہن کی ساخت سے مجبور ہیں کہ ہر پھر کر جو نقشہ بھی نظر کے سامنے آتا ہے قومی حکومت ہی کا آتا ہے، قوم پرستانہ طرزِ فکر (Nationalistic Ideology) ہی میں دانستہ و نادانستہ پھنس جاتے ہیں، اور جو پروگرام سوچتے ہیں وہ بنیادی طور پر قوم پرستانہ ہی ہوتا ہے۔ اُن کے نزدیک پیشِ نظر مسئلہ کی نوعیت بس یہ ہے کہ "مسلمان" کے نام سے جو ایک "قوم" بن گئی ہے اس کے ہاتھ میں حکومت آجائے یا کم از کم اس کو سیاسی اقتدار نصیب ہو جائے۔ اس نصب العین تک پہنچنے کے لیے یہ جتنا بھی دماغ پر زور ڈالتے ہیں، اس کے سوا کوئی طریقِ کار انہیں نظر نہیں آتا کہ دنیا کی قومیں عموماً جو تدابیر اختیار کیا کرتی ہیں وہی اس قوم کے لیے بھی اختیار کی جائیں۔ جن اجزاء سے یہ قوم مرکب ہے ان کو جوڑ کر ایک ٹھوس مجموعہ بنایا جائے، ان میں نیشنلزم کا جوش پھونکا جائے[1]، ان کے اندر مرکزی اقتدار ہو، ان کے نیشنل گارڈس منظم ہوں، ان کی ایک قومی ملیشیا تیار ہو، وہ جہاں اکثریت میں ہوں وہاں اقتدارِ اکثریت (Majority Rule) کے مسلّم جمہوری اصول پر اُن کے قومی اسٹیٹ بن جائیں، اور جہاں ان کی تعداد کم ہو وہاں ان کے "حقوق" کا تحفظ ہو جائے، ان کی انفرادیت اسی طرح محفوظ ہو جس طرح دنیا کے ہر ملک میں

---

[1] ہندوستان کے مسلمانوں کو محض ایک قوم سمجھتے ہوئے اُن کو نیشنلزم کی بنیاد پر اٹھانے کے نتائج اُس وقت تو کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہے تھے جب ۱۹۴۰ء میں یہ تقریر کی گئی تھی، لیکن ۱۹۷۱ء میں یہ بات سب کے سامنے آگئی کہ مشرقی پاکستان میں زبان کی بنیاد پر ایک نئے نیشنلزم نے مسلمان کو مسلمان سے پھاڑ دیا اور خود مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا وہ قتلِ عام ہوا جس کی نظیر مسلمانوں کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ پھر ۱۹۷۲ء میں یہ بھی دنیا نے دیکھ لیا کہ سندھ میں علی الاعلان یہ تحریک اٹھی کہ سندھی زبان بولنے والے مسلم اور غیر مسلم ایک قوم ہیں، اور جو مسلمان سندھی نہیں بولتے وہ تو صرف دوسری قوم ہیں، بلکہ کہنے والوں نے یہاں تک کہا کہ سندھ میں ان کو رہنے کا حق بھی نہیں ہے۔ (جدید)

ہر قومی اقلیت (National Minority) اپنی انفرادیت محفوظ کرنا چاہتی ہے، ملازمتوں اور تعلیمی و انتخابی اداروں میں ان کا حصہ مقرر ہو، اپنے نمائندے یہ خود چنیں، وزارتوں میں ایک قوم کی حیثیت سے یہ شریک کیے جائیں، وغیر ذالک من القومیات۔ یہ سب باتیں کرتے ہوئے یہ لوگ امت، جماعت، ملت، ملیت، امیر، اطاعت امیر اور اسی قسم کے دوسرے الفاظ اسلامی اصطلاحات سے لے کر بولتے ہیں، مگر اسلامی فکر کے اعتبار سے یہ سب ان کے لیے مذہب قوم پرستی کی اصطلاحوں کے مترادفات ہیں جو خوش قسمتی سے پرانے ذخیرے میں گھڑے گھڑائے مل گئے اور غیر اسلامی رنگ کے لیے اسلامی رنگ کے غلاف کا کام دینے لگے۔

اصول حکومت کی نوعیت آپ سمجھ لیں تو آپ کو یہ بات سمجھنے میں ذرہ برابر بھی دقت پیش نہ آئے گی کہ اُس کی بنا رکھنے کے لیے یہ طرزِ فکر، یہ اندازِ تحریک، یہ عملی پروگرام نقطۂ آغاز کا بھی کام نہیں دے سکتا چہ جائیکہ تعمیر کے انجام تک پہنچا سکے۔ بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ اس کا ہر جُز ایک تیشہ ہے جس سے اصولی حکومت کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ اصولی حکومت کے تخیل کی تو بنیاد ہی یہ ہے کہ ہمارے سامنے قومیں اور قومیتیں نہیں، صرف انسان ہیں۔ ہم اُن کے سامنے ایک اصول اِس حیثیت سے پیش کرتے ہیں کہ اُسی پر تمدن کا نظام اور حکومت کا ڈھانچہ تعمیر کرنے میں اُن کی فلاح ہے اور جو اُس کو قبول کرلے وہ اُس نظام کو چلانے میں برابر کا حصہ دار ہے۔ غور کیجیے، اِس تخیل کو لے کر وہ شخص کس طرح اُٹھ سکتا ہے جس کے دماغ، زبان، افعال و حرکات، ہر چیز پر قومیت اور قوم پرستی کا ٹھپّا لگا ہوا ہو۔ اس نے تو دعوتِ انسانیت کو اپیل کرنے کا دروازہ خود ہی بند کر دیا، پہلے ہی قدم پر اپنی پوزیشن کو آپ غلط کر کے رکھ دیا۔ قوم پرستی کے تعصب میں جو قومیں اندھی ہو رہی ہیں، جن کے لڑائی جھگڑوں کی ساری بنیاد ہی قوم پرستی اور قومی ریاستیں ہیں، اُن کو انسانیت کے نام پر پکارنے اور انسانی فلاح کے اصول کی طرف بلانے کا آخر یہ کونسا ڈھنگ ہے کہ ہم خود اپنے قومی حقوق کے جھگڑے اور قومی اسٹیٹ کے مطالبہ سے اس دعوت کی ابتدا کریں؟ کس طرح آپ کی عقل یہ بات قبول کرتی ہے کہ مقدمہ بازی سے لوگوں

کو رد کرنے کی تحریک خود ایک مقدمہ عدالت میں دائر کرنے سے شروع کی جا سکتی ہے؟

خلافتِ الٰہیہ

اسلامی حکومت کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اُس کی پوری عمارت خدا کی حاکمیت کے تصور پر قائم کی گئی ہے۔ اس کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ ملک خدا کا ہے۔ وہی اس کا حاکم ہے۔ کسی شخص یا خاندان یا طبقہ یا قوم کو بلکہ پوری انسانیت کو بھی حاکمیت (Sovereignty) کے حقوق حاصل نہیں ہیں۔ حکم دینے اور قانون بنانے کا حق صرف خدا کے لیے خاص ہے۔ حکومت کی صحیح شکل اس کے سوا کوئی نہیں کہ انسان خدا کے خلیفہ کی حیثیت سے کام کرے، اور یہ حیثیت صحیح طور پر صرف دو صورتوں سے قائم ہو سکتی ہے: یا تو کسی انسان کے پاس براہِ راست خدا کی طرف سے قانون اور دستورِ حکومت آیا ہو، یا وہ اُس شخص کی پیروی اختیار کرے جس کے پاس خدا کی طرف سے قانون اور دستور آیا ہے۔ اس خلافت کے کام میں تمام وہ لوگ شریک ہوں گے جو اس قانون پر ایمان لائیں اور اس کی پیروی کرنے پر تیار ہوں۔ یہ کام اس احساس کے ساتھ چلایا جائے گا کہ ہم سب بہ حیثیتِ مجموعی، اور ہم میں سے ہر ایک فرداً فرداً خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔ اُس خدا کے سامنے جو ظاہر اور پوشیدہ ہر چیز کو جاننے والا ہے، جس کے علم سے کوئی چیز چھپی نہیں رہ سکتی، اور جس کی گرفت سے ہم مر کر بھی نہیں چھوٹ سکتے۔ خلافت کی ذمہ داری جو ہمارے سپرد کی گئی ہے، یہ اس لیے نہیں ہے کہ ہم لوگوں پر اپنا حکم چلائیں، اُن کو اپنا غلام بنائیں، ان کے سر اپنے آگے جھکوائیں، اُن سے ٹیکس وصول کر کے اپنے محل تعمیر کریں، حاکمانہ اختیارات سے کام لے کر اپنے عیش، اپنی نفس پرستی اور اپنی کبریائی کا سامان کریں، بلکہ یہ سارا بار ہم پر اس لیے ڈالا گیا ہے کہ ہم خدا کے قانونِ عدل کو اس کے بندوں پر جاری کریں۔ اُس قانون کی پابندی

---

[۱] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو میرا رسالہ "اسلام کا نظریۂ سیاسی"۔ (قدیم)

اور اس کے نفاذ میں ہم نے اگر ذرا سی کوتاہی بھی کی، اگر ہم نے اس کام میں ذرہ برابر بھی خود غرضی، نفس پرستی، تعصب، جانب داری یا بددیانتی کو دخل دیا تو ہم خدا کی عدالت سے سزا پائیں گے خواہ دنیا میں ہر سزا سے محفوظ رہ جائیں۔

اس نظریہ کی بنیاد پہ جو عمارت اٹھتی ہے وہ اپنی جڑ سے لے کر چھوٹی سے چھوٹی شاخوں تک ہر چیز میں دنیوی حکومتوں (Secular States) سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اُس کی ترکیب، اُس کا مزاج، اُس کی فطرت، کوئی چیز بھی اُن سے نہیں ملتی۔ اُس کو بنانے اور چلانے کے لیے ایک خاص قسم کی ذہنیت، خاص طرز کی سیرت، اور خاص نوعیت کے کردار کی ضرورت ہے۔ اُس کی فوج، اُس کی پولیس، اُس کی عدالت، اُس کے مالیات، اُس کے قوانین، اُس کے محاصل، اُس کی انتظامی پالیسی، اُس کی خارجی سیاست، اُس کی صلح و جنگ کے معاملات، سب کے سب دنیوی ریاستوں سے مختلف ہیں۔ اِن کی عدالتوں کے چیف جسٹس اُس کی عدالت کے کلرک بلکہ چپراسی تک بننے کے اہل نہیں ہو سکتے۔ اِن کی پولیس کے انسپکٹر جنرل وہاں کانسٹیبل کی جگہ کے لیے بھی موزوں نہیں ٹھیرتے۔ اِن کے جنرل اور فیلڈ مارشل وہاں سپاہیوں میں بھرتی کرنے کے قابل بھی نہیں۔ اِن کے وزرائے خارجہ وہاں کسی منصب پر تو کیا فائز ہوں گے، شاید اپنے جھوٹ، دغا، اور بددیانتیوں کی بدولت جیل جانے سے بھی محفوظ نہ رہ سکیں۔ غرض وہ تمام لوگ جو اِن حکومتوں کے کاروبار چلانے کے لیے تیار کیے گئے ہوں، جن کی اخلاقی و ذہنی تربیت اِن کے مزاج کے مناسبِ حال کی گئی ہو، اسلامی حکومت کے لیے قطعی ناکارہ ہیں۔ اُس کو اپنے شہری، اپنے ووٹر، اپنے کونسلر، اپنے اہل کار، اپنے سپاہی، اپنے جج اور مجسٹریٹ، اپنے محکموں کے ڈائرکٹر، اپنی فوجوں کے قائد، اپنے خارجی سفراء اور اپنے وزیر، غرض اپنی اجتماعی زندگی کے تمام اجزاء، اپنی انتظامی مشین کے تمام پُرزے، بالکل ایک نئی ساخت کے درکار ہیں۔ اس کو ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جن کے دلوں میں خدا کا خوف ہو، جو خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری کا احساس رکھتے ہوں، جو دنیا پر آخرت کو ترجیح دینے والے ہوں، جن کی نگاہ میں اخلاقی نفع و نقصان کا وزن دنیوی نفع و نقصان سے زیادہ ہو، جو ہر حال میں اُس

ضابطے اور اُس طرزِ عمل کے پابند ہوں جو ان کے لیے مستقل طور پر بنا دیا گیا ہے، جن کی تمام سعی و جہد کا ہدفِ مقصود خدا کی رضا ہو، جن پر شخصی یا قومی اغراض کی بندگی اور ہوا و ہوس کی غلامی مسلط نہ ہو، جو تنگ نظری و تعصب سے پاک ہوں، جو مال اور حکومت کے نشہ میں بدمست ہو جانے والے نہ ہوں، جو دولت کے حریص اور اقتدار کے بھوکے نہ ہوں، جن کی سیرتوں میں یہ طاقت ہو کہ جب زمین کے خزانے اُن کے دستِ قدرت میں آئیں تو وہ پکّے امانت دار ثابت ہوں، جب بستیوں کی حکومت ان کے ہاتھ میں آئے تو وہ راتوں کی نیند سے محروم ہو جائیں اور لوگ ان کی حفاظت میں اپنی جان، مال، آبرو، ہر چیز کی طرف سے بے خوف رہیں، جب وہ فاتح کی حیثیت سے کسی ملک میں داخل ہوں تو لوگوں کو ان سے قتل و غارت گری، ظلم و ستم اور بدکاری و شہوت رانی کا کوئی اندیشہ نہ ہو، بلکہ ان کے ہر سپاہی کو مفتوح ملک کے باشندے اپنی جان و مال اور اپنی عورتوں کی عصمت کا محافظ پائیں، جن کی دھاک بین الاقوامی سیاست میں اس درجہ کی ہو کہ اُن کی راستی، انصاف پسندی، اصولِ اخلاق کی پابندی اور عہد و پیمان پر تمام دنیا میں اعتماد کیا جائے۔ اس قسم کے اور صرف اسی قسم کے لوگوں سے اسلامی حکومت بن سکتی ہے۔ اور یہی لوگ اس کو چلا سکتے ہیں۔ رہے مادہ پرست، افادی ذہنیت (Utilitarian Mentality) رکھنے والے لوگ، جو دنیوی فائدوں اور شخصی یا قومی مصلحتوں کی خاطر ہمیشہ ایک نیا اصول بناتے ہوں، جن کے پیشِ نظر نہ خدا ہو، نہ آخرت، بلکہ جن کی ساری کوششوں کا مرکز و محور اور ساری پالیسیوں کا مدار صرف دنیوی فائدہ و نقصان ہی کا خیال ہو، وہ ایسی حکومت بنانے یا چلانے کے قابل تو کیا ہوں گے، اُن کا اِس حکومت کے دائرے میں موجود ہونا ہی ایک عمارت میں دیمک کی موجودگی کا حکم رکھتا ہے۔

اِسلامی اِنقلاب کی سبیل

اسلامی حکومت کی اس نوعیت کو ذہن میں رکھ کر غور کیجیے کہ اس منزل تک پہنچنے کی کیا سبیل ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ میں ابتدا میں عرض کر چکا ہوں، کسی سوسائٹی میں جس قسم

کے فکری، اخلاقی، تمدنی اسباب و محرکات فراہم ہوتے ہیں، اُن کے تعامل سے اُسی قسم کی حکومت وجود میں آتی ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک درخت اپنی ابتدائی کونپل سے لے کر پورا درخت بننے تک تو لیموں کی حیثیت سے نشو ونما پائے، مگر بار آوری کے مرحلے پر پہنچ کر یکایک آم کے پھل دینے لگے۔ درحقیقت اسلامی حکومت کسی معجزے کی شکل میں صادر نہیں ہوتی۔ اس کے پیدا ہونے کے لیے ناگزیر ہے کہ ابتداء میں ایک ایسی تحریک اُٹھے جس کی بنیاد میں وہ نظریۂ حیات، وہ مقصدِ زندگی، وہ معیارِ اخلاق، وہ سیرت و کردار ہو جو اسلام کے مزاج سے مناسبت رکھتا ہے۔ اس کے لیڈر اور کارکن صرف وہی لوگ ہوں جو اس خاص طرز کی انسانیت کے سانچے میں ڈھلنے کے لیے مستعد ہوں۔ پھر وہ اپنی جدوجہد سے سوسائٹی میں اسی ذہنیت اور اُسی اخلاقی رُوح کو پھیلانے کی کوشش کریں۔ پھر اسی بنیاد پر تعلیم و تربیت کا ایک نیا نظام اُٹھے جو اس مخصوص ٹائپ کے آدمی تیار کرے۔ اس سے مسلم سائنٹسٹ، مسلم فلسفی، مسلم مؤرخ، مسلم ماہرینِ مالیات و معاشیات، مسلم ماہرینِ قانون، مسلم ماہرینِ سیاست، غرض ہر شعبۂ علم و فن میں ایسے آدمی پیدا ہوں جو اپنی نظر و فکر کے اعتبار سے مسلم ہوں، جن میں یہ قابلیت ہو کہ افکار و نظریات کا ایک پورا نظام اور عملی زندگی کا ایک مکمل خاکہ اسلامی اصولوں پر مرتب کرسکیں، اور جن میں اتنی طاقت ہو کہ دنیا کے ناخدا شناس ائمۂ فکر کے مقابلہ میں اپنی عقلی و ذہنی ریاست (Intellectual Leadership) کا سکہ جما دیں[1]۔

اس دماغی پس منظر کے ساتھ یہ تحریک عملاً اس غلط نظامِ زندگی کے خلاف جدوجہد کرے جو گرد و پیش پھیلا ہوا ہے۔ اس جدوجہد میں اس کے علمبردار مصیبتیں اُٹھا کر سختیاں جھیل کر، قربانیاں دے کر، مار کھا کر اور جانیں دے کر اپنے خلوص اور اپنے ارادے کی مضبوطی کا ثبوت دیں۔ آزمائشوں کی بھٹی میں تپائے جائیں اور ایسا سونا بن کر نکلیں جس کو ہر پرکھنے والا ہر طرح سے جانچ کر بے کھوٹ کامل العیار (Finest Standard) سونا ہی

---

[1] ملاحظہ ہو میرا رسالہ "نیا نظامِ تعلیم"۔ (قدیم)

پائے۔ اپنی لڑائی کے دوران میں اپنے ہر قول اور ہر فعل سے اپنی اُس مخصوص آئیڈیالوجی کا مظاہرہ کریں جس کے علمبردار بن کر وہ اُٹھے ہیں۔ اور ان کی ہر بات سے عیاں ہو کہ ایسے بے لوث، بے غرض، راست باز، پاک سیرت، ایثار پیشہ، با اصول، خدا ترس لوگ انسانیت کی فلاح کے لیے جس اصولی حکومت کی طرف دعوت دے رہے ہیں اُس میں ضرور انسان کے لیے عدل اور امن ہوگا۔ اِس طرح کی جدوجہد سے سوسائٹی کے وہ تمام عناصر جن کی فطرت میں کچھ بھی نیکی اور راستی موجود ہے اس تحریک میں کھنچ آئیں گے، پست سیرت لوگوں اور ادنیٰ درجہ کے طریقوں پر چلنے والوں کے اثرات اُس کے مقابلہ میں دبتے چلے جائیں گے، عوام کی ذہنیت میں ایک انقلاب رونما ہوگا، اجتماعی زندگی میں اُس مخصوص نظامِ حکومت کی پیاس پیدا ہو جائے گی، اور اس بدلی ہوئی سوسائٹی میں کسی دوسرے طرز کے نظام کا چلنا مشکل ہو جائے گا۔ آخر کار ایک لازمی اور طبعی نتیجہ کے طور پر وہی نظامِ حکومت قائم ہو جائے گا جس کے لیے اِس طور پر زمین تیار کی گئی ہو۔ اور جوں ہی کہ وہ نظام قائم ہوگا، اس کو چلانے کے لیے ابتدائی اہل کاروں سے لے کر وزراء اور نظماء تک ہر درجہ کے مناسب کل پُرزے اُس نظامِ تعلیم و تربیت کی بدولت موجود ہوں گے جس کا ذکر ابھی میں کر چکا ہوں۔

یہ ہے اس انقلاب کے ظہور اور اس حکومت کی پیدائش کا فطری طریقہ جس کو اسلامی انقلاب اور اسلامی حکومت کہا جاتا ہے۔ دنیا کے انقلابات کی تاریخ آپ کے سامنے ہے۔ آپ سے یہ بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ ایک خاص نوعیت کا انقلاب اُسی نوعیت کی تحریک، اُسی نوعیت کے لیڈر اور کارکن اور اُسی نوعیت کا اجتماعی شعور اور تمدنی و اخلاقی ماحول چاہتا ہے۔ انقلابِ فرانس کو وہی خاص اخلاقی و ذہنی اساس درکار تھی جو روسو، والٹیر اور مونٹسکیو جیسے لیڈروں نے تیار کی۔ انقلابِ روس صرف مارکس کے افکار اور لینن اور ٹراٹسکی کی لیڈرشپ اور اُن ہزارہا اشتراکی کارکنوں ہی کی بدولت رونما ہو سکتا تھا جن کی زندگیاں اشتراکیت کے سانچے میں ڈھل چکی تھیں۔ جرمنی کا نیشنل سوشلزم اُسی مخصوص اخلاقی، نفسیاتی اور تمدنی زمین ہی میں جڑ پکڑ سکتا تھا جو ہیگل،

فشتے، گوتھے، نیتشے، اور بہت سے مفکرین کے نظریات اور ہٹلر کی لیڈرشپ نے تیار کیا۔
اسی طرح سے اسلامی انقلاب بھی صرف اُسی صورت میں برپا ہو سکتا ہے جب کہ ایک عمومی تحریک قرآنی نظریات و تصورات اور محمدی سیرت و کردار کی بنیاد پر اُٹھے اور اجتماعی زندگی کی ساری ذہنی، اخلاقی، نفسیاتی اور تہذیبی بنیادوں کو طاقت ور جدوجہد سے بدل ڈالے۔
یہ بات کم از کم میری سمجھ میں نہیں آتی کہ قوم پرستانہ نوعیت کی کوئی تحریک، جس کا پس منظر یہ ناقص نظامِ تعلیم ہو جو اس وقت ہمارے ہاں پایا جاتا ہے، اور جس کی بنیاد افادی اخلاقیات (Utilitarian Morals) اور مصلحت پرستی (Pragmatism) پر ہو، اسلامی انقلاب آخر کس طرح برپا سکتی ہے؟ میں اُس قسم کے معجزات پر یقین نہیں رکھتا جن پر فرانس کے سابق وزیرِ اعظم موسیو ریو یقین رکھتے تھے[1]۔ میں تو اس کا قائل ہوں کہ جیسی تدبیر کی جائے گی ویسے ہی نتائج برآمد ہوں گے۔

خام خیالیاں

ہمارے ہاں یہ سمجھا جا رہا ہے کہ بس مسلمانوں کی تنظیم ان کے تمام دردوں کی دوا ہے۔ "اسلامی حکومت" یا "آزاد ہندوستان میں آزاد اسلام" کے مقصد تک پہنچنے کی سبیل یہ سمجھی جا رہی ہے کہ مسلمان قوم جن افراد سے مرکب ہے وہ سب ایک مرکز پر جمع ہوں، متحد ہوں، اور ایک مرکزی قیادت کی اطاعت میں کام کریں۔ لیکن دراصل یہ قوم پرستانہ پروگرام ہے۔ جو قوم بھی اپنا بول بالا کرنے کے لیے جدوجہد کرنا چاہے گی وہ یہی طریقِ کار اختیار کرے گی خواہ وہ ہندو قوم ہو، یا سکھ، یا جرمن، یا اطالوی۔ قوم کے عشق میں ڈوبا ہوا ایک لیڈر، جو موقع و محل کے لحاظ سے مناسب چالیں چلنے میں ماہر ہو اور جس میں حکم چلانے کی خاص قابلیت موجود ہو، ہر قوم کی سربلندی کے لیے مفید ہوتا ہے، خواہ

---

[1] دوسری جنگِ عظیم میں فرانس کی شکست سے چند روز پہلے موسیو رینو نے، جو اُس وقت وزیرِ اعظم تھے، ریڈیو پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ "اب فرانس کو صرف ایک معجزہ ہی بچا سکتا ہے اور میں معجزات کا قائل ہوں۔" (قدیم)

وہ مونجے یا ساورکر ہو، یا ہٹلر یا مسولینی۔ ایسے ہزاروں لاکھوں نوجوان جو قومی عزائم کے لیے اپنے لیڈر کی اطاعت میں منظم حرکت کر سکتے ہوں، ہر قوم کا جھنڈا بلند کر سکتے ہیں، قطع نظر اس سے کہ وہ جاپانیت پر ایمان رکھتے ہوں یا چینیت پر۔ پس اگر "مسلمان" ایک نسلی و تاریخی قومیت کا نام ہے اور پیشِ نظر مقصد صرف اُس کا بول بالا کرنا ہے تو اس کے لیے واقعی یہی سبیل ہے جو تجویز کی جا رہی ہے۔ اس کے نتیجہ میں ایک قومی حکومت بھی میسّر آسکتی ہے اور بدرجۂ اقل وطنی حکومت میں اچھا خاصا حصّہ بھی مل سکتا ہے۔ لیکن اسلامی انقلاب اور اسلامی حکومت کے مقصد تک پہنچنے کے لیے یہ پہلا قدم بھی نہیں بلکہ اُلٹا قدم ہے۔

یہاں جس قوم کا نام مسلمان ہے وہ ہر قسم کے رطب و یابس لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ کیرکٹر کے اعتبار سے جتنے ٹائپ کافر قوموں میں پائے جاتے ہیں، اتنے ہی اس قوم میں بھی موجود ہیں۔ عدالتوں میں جھوٹی گواہیاں دینے والے جس قدر کافر قومیں فراہم کرتی ہیں غالباً اسی تناسب سے یہ بھی فراہم کرتی ہے۔ رشوت، چوری، زنا، جھوٹ، اور دوسرے تمام ذمائم اخلاق میں یہ کفار سے کچھ کم نہیں ہے۔ پیٹ بھرنے اور دولت کمانے کے لیے جو تدبیریں کفار کرتے ہیں وہی اس قوم کے لوگ بھی کرتے ہیں۔ ایک مسلمان وکیل جان بوجھ کر حق کے خلاف اپنے موکل کی پیروی کرتے وقت خدا کے خوف سے اُتنا ہی خالی ہوتا ہے جتنا ایک غیر مسلم وکیل ہوتا ہے۔ ایک مسلمان رئیس دولت پا کر یا ایک مسلمان عہدہ دار حکومت پا کر وہی سب کچھ کرتا ہے جو غیر مسلم کرتا ہے۔ یہ اخلاقی حالت جس قوم کی ہو اس کی تمام کالی اور سفید بھیڑوں کو جمع کر کے ایک منظم گلّہ بنا دینا اور سیاسی تربیت سے ان کو لومڑی کی ہشیاری سکھانا، یا فوجی تربیت سے اُن میں بھیڑیے کی درندگی پیدا کر دینا جنگل کی فرماں روائی حاصل کرنے کے لیے تو مفید ہو سکتا ہے، مگر میں نہیں سمجھتا کہ اس سے اعلائے کلمۃ اللہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ کون اُن کی اخلاقی برتری تسلیم کرے گا؟ کس کی نگاہیں ان کے سامنے عزت سے جھکیں گی؟ کس کے دل میں انہیں دیکھ کر اسلام کے لیے جذبۂ احترام پیدا ہوگا؟ کہاں ان کے "انفاسِ قدسیہ" سے

يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا کا منظر دکھائی دے سکے گا؟ کس جگہ ان کی روحانی امامت کا سکہ جمے گا؟ اور زمین پر بسنے والے کہاں اُن کا خیر مقدم اپنے نجات دہندوں کی حیثیت سے کریں گے؟ اعلائے کلمۃ الحق جس چیز کا نام ہے اُس کے لیے تو صرف اُن کارکنوں کی ضرورت ہے جو خدا سے ڈرنے والے اور خدا کے قانون پر فائدہ و نقصان کی پروا کیے بغیر جمنے والے ہوں، خواہ وہ اِس نسلی مسلمان قوم میں سے ملیں یا کسی دوسری قوم سے بھرتی ہو کر آئیں۔ ایسے دس آدمی اس مقصد کے لیے زیادہ قیمتی ہیں بہ نسبت اس کے کہ وہ انبوہ جس کا میں اوپر ذکر کر آیا ہوں ۲۵ لاکھ یا پچاس لاکھ کی تعداد میں بھرتی ہو جائے۔ اسلام کو تانبے کے اُن سکّوں کا خزانہ مطلوب نہیں ہے جن پر اشرفی کا ٹھپہ لگا دیا گیا ہو۔ وہ سکّہ کے نقوش دیکھنے سے پہلے یہ دریافت کرتا ہے کہ ان نقوش کے نیچے خالص سونے کا جوہر بھی ہے یا نہیں۔ ایسا ایک سکہ جعلی اشرفیوں کے ڈھیر سے اس کے نزدیک زیادہ قیمتی ہے۔

پھر جس لیڈر شپ کی اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے ضرورت ہے وہ ایسی لیڈر شپ ہے جو اُن اصولوں سے ایک انچ بھی ہٹنے کے لیے تیار نہ ہو جن کا بول بالا کرنے کے لیے اسلام اُٹھا ہے، خواہ اِس ہٹ کی بدولت تمام مسلمان بھوکے ہی کیوں نہ مر جائیں بلکہ تہ تیغ ہی کیوں نہ کر دیئے جائیں۔ ہر معاملہ میں اپنی قوم کا فائدہ تلاش کرنے والی اور اصول سے بے نیاز ہو کر ہر اُس تدبیر کو جس میں قوم کی دنیوی فلاح نظر آئے، اختیار کر لینے والی لیڈر شپ اور وہ لیڈر شپ جس میں تقویٰ اور خدا ترسی کا رنگ مفقود ہو، اُس مقصد کے لیے قطعی ناکارہ ہے جس پر اسلام نے اپنی نظر جما رکھی ہے۔

پھر وہ نظامِ تعلیم و تربیت جس کی بنیاد اس مشہور مقولہ پر رکھی گئی ہے کہ "چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی" اُس اسلام کی خدمت کے لیے کس طرح موزوں ہو سکتا ہے جس کا قطعی ناقابلِ ترمیم فیصلہ یہ ہے کہ ہوا خواہ کسی طرف کی ہو تاہم بہر حال اُس راستہ پر چلو جو خدا نے تمہارے لیے معیّن کر دیا ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آج اگر آپ کو ایک خطّۂ زمین حکومت کرنے کے لیے دے بھی دیا جائے تو آپ اِسلامی اصول پر

اس کا انتظام ایک دن بھی نہ چلا سکیں گے۔ اسلامی حکومت کی پولیس، عدالت، فوج، مال گذاری، فینانس، تعلیمات، اور خارجی پالیسی کو چلانے کے لیے جس ذہنیت اور جس اخلاقی روح رکھنے والے آدمیوں کی ضرورت ہے اُن کو فراہم کرنے کا کوئی بندوبست آپ نے نہیں کیا ہے۔ یہ تعلیم جو آپ کے کالجوں میں دی جا رہی ہے، غیر اسلامی حکومت کے لیے سیکرٹری اور وزراء تک فراہم کر سکتی ہے، مگر بُرا نہ مانیے، اسلامی عدالت کے لیے چپراسی اور اسلامی پولیس کے لیے کانسٹیبل تک فراہم نہیں کر سکتی۔ اور یہ بات جدید تعلیم ہی تک محدود نہیں ہے۔ ہمارا وہ پرانا نظامِ تعلیم جو حرکتِ زمین کا سرے سے قائل ہی نہیں ہے، وہ بھی اس معاملہ میں اتنا ناکارہ ہے کہ اس دورِ جدید میں اسلامی حکومت کے لیے ایک قاضی، ایک وزیرِ مال، ایک وزیرِ جنگ، ایک ناظمِ تعلیمات اور ایک سفیر بھی مہیا نہیں کر سکتا۔ اس تیاری پر اسلامی حکومت کا حوصلہ! سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ جو لوگ یہ نام زبان پر لاتے ہیں اُن کے ذہن اسلامی حکومت کے صحیح تصور سے خالی ہیں۔

بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز ہی کا سہی، مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ قائم تو ہو جائے، پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعہ سے اس کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ مگر میں نے تاریخ، سیاسیات اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اس کی بنا پر میں اس کو ناممکن سمجھتا ہوں، اور اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو جائے تو میں اس کو ایک معجزہ سمجھوں گا۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، حکومت کا نظام اجتماعی زندگی میں بڑی گہری جڑیں رکھتا ہے۔ جب تک اجتماعی زندگی میں تغیر واقع نہ ہو، کسی مصنوعی تدبیر سے نظامِ حکومت میں کوئی مستقل تغیر پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ عمر ابن عبدالعزیز جیسا فرمانروا جس کی پشت پر تابعین و تبع تابعین کی ایک بڑی جماعت بھی تھی، اس معاملہ میں قطعی ناکام ہو چکا ہے، کیونکہ سوسائٹی بحیثیت مجموعی اس اصلاح کیلیے تیار نہ تھی۔ محمد تغلق اور عالمگیر جیسے طاقتور بادشاہ اپنی شخصی دین داری کے باوجود نظامِ حکومت میں کوئی تغیر نہ کر سکے۔ مامون الرشید جیسا باجبروت حکمران نظامِ حکومت میں نہیں بلکہ صرف

اس کی اوپری شکل میں خفیف سی تبدیلی پیدا کرنا چاہتا تھا اور اس میں بھی ناکام ہوا۔ یہ اُس وقت کا حال ہے جب کہ ایک شخص کی طاقت بہت کچھ کر سکتی تھی۔ اب میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جو قومی اسٹیٹ جمہوری طرز پر قائم ہوگا وہ اس بنیادی اصلاح میں آخر کس طرح مددگار ہو سکتا ہے۔ جمہوری حکومت میں اقتدار اُن لوگوں کے ہاتھ میں آتا ہے جن کو ووٹروں کی پسندیدگی حاصل ہو۔ ووٹروں میں اگر اسلامی ذہنیت اور اسلامی فکر نہیں ہے، اگر وہ صحیح اسلامی سیرت و کردار کے عاشق نہیں ہیں، اگر وہ اُس بے لاگ عدل اور اُن بے لچک اصولوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں جن پر اسلامی حکومت چلائی جاتی ہے، تو ان کے ووٹوں سے کبھی "مسلمان" قسم کے آدمی منتخب ہو کر پارلیمنٹ یا اسمبلی میں نہیں آسکتے۔ اس ذریعہ سے تو اقتدار انہی لوگوں کو ملے گا جو مردم شماری کے رجسٹر میں چاہے مسلمان ہوں، مگر اپنے نظریات اور طریق کار کے اعتبار سے جن کو اسلام کی ہوا بھی نہ لگی ہو۔ اس قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اُسی مقام پر کھڑے ہیں جس پر غیر مسلم حکومت میں تھے۔ بلکہ اس سے بھی بدتر مقام پر، کیونکہ وہ "قومی حکومت" جس پر اسلام کا نمائشی لیبل لگا ہوگا، انقلاب کا راستہ روکنے میں اُس سے بھی زیادہ جری اور بے باک ہوگی جتنی غیر مسلم حکومت ہوتی ہے۔ غیر مسلم حکومت جن کاموں پر قید کی سزا دیتی ہے، وہ "مسلم قومی حکومت" ان کی سزا پھانسی اور جلاوطنی کی صورت میں دے گی اور پھر بھی اس حکومت کے لیڈر جیتے جی غازی اور مرنے پر رحمۃ اللہ علیہ ہی رہیں گے۔ پس یہ سمجھنا قطعی غلط ہے کہ اس قسم کی "قومی حکومت" کسی معنی میں بھی اسلامی انقلاب لانے میں مددگار ہو سکتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر ہم کو اُس حکومت میں بھی اجتماعی زندگی کی بنیادیں بدلنے ہی کی کوشش کرنی پڑے گی، اور اگر ہمیں یہ کام حکومت کی امداد کے بغیر، بلکہ اس کی مزاحمت کے باوجود اپنی قربانیوں ہی سے کرنا ہوگا، تو ہم آج ہی سے یہ راہ عمل کیوں نہ اختیار کریں؟ اُس نام نہاد "مسلم حکومت" کے انتظار میں اپنا وقت یا اُس کے قیام کی کوشش میں اپنی قوت ضائع کرنے کی حماقت آخر ہم کیوں کریں جس کے متعلق ہمیں یہ معلوم ہے

کہ وہ ہمارے مقصد کے لیے نہ صرف غیر مفید ہوگی بلکہ کچھ زیادہ ہی سدِّ راہ ثابت ہوگی۔[1]

اسلامی تحریک کا مخصوص طریقِ کار

اب میں ایک مختصر تاریخی بیان کے ذریعہ سے اس امر کی تشریح کرنا چاہتا ہوں کہ اسلامی انقلاب کے لیے اجتماعی زندگی کی بنیادیں بدلنے اور از سرِ نو تیار کرنے کی صورت کیا ہوتی ہے، اور اس جدوجہد کا وہ مخصوص طریقِ کار (Technique) کیا ہے جس سے یہ کامیابی کی منزل تک پہنچتی ہے۔

اسلام دراصل اُس تحریک کا نام ہے جو خدائے واحد کی حاکمیت کے نظریہ پر انسانی زندگی کی پوری عمارت تعمیر کرنا چاہتی ہے۔ یہ تحریک قدیم ترین زمانہ سے ایک ہی بنیاد اور ایک ہی ڈھنگ پر چلی آرہی ہے۔ اِس کے لیڈر وہ لوگ تھے جن کو رُسُل اللّٰہ (خدا کے فرستادے) کہا جاتا ہے۔ ہمیں اگر اس تحریک کو چلانا ہے تو لامحالہ انہی لیڈروں کے طرزِ عمل کی پیروی کرنی ہوگی، کیونکہ اِس کے سوا کوئی اور طرزِ عمل اِس خاص نوعیت کی تحریک کے لیے نہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں جب ہم انبیاء علیہم السلام کے نقشِ قدم کا سراغ لگانے کے لیے نکلتے ہیں تو ہمیں ایک بڑی دقّت کا سامنا ہوتا ہے۔ قدیم زمانہ میں جو انبیاء گزرے ہیں اُن کے کام کے متعلق ہمیں کچھ زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔ قرآن میں کچھ مختصر اشارات ملتے ہیں مگر ان سے مکمل اسکیم نہیں بن سکتی۔ بائبل کے عہدِ جدید (New Testament) میں سیدنا مسیح علیہ السلام کے کچھ غیر مستند اقوال بھی ملتے ہیں جن سے کسی حد تک اس پہلو پر روشنی پڑتی ہے کہ اسلامی تحریک اپنے بالکل ابتدائی مرحلہ میں کس طرح چلائی جاتی ہے اور کن مسائل سے اس کو سابقہ پیش آتا ہے۔ لیکن بعد کے مراحل حضرت مسیح کو پیش ہی نہیں آئے کہ ان کے متعلق کوئی اشارہ وہاں سے مل سکے۔[2] اس معاملہ

---

[1] پاکستان کی پچیس سالہ تاریخ سے یہ بات کس حد تک ثابت ہوتی ہے وہ ناظرین کے سامنے ہے۔ (جدید)

[2] چونکہ مسیح کا طریقِ تعلیم و تربیت بھی اس تحریک کے ابتدائی مرحلے کو سمجھنے کے لیے مفید ہے اس لیے انجیل متی و لوقا کے چند اقتباسات اِس مضمون کے ضمیمہ کے طور پر آخر میں درج کر دیئے گئے ہیں۔ (قدیم)

میں ہم کو صرف ایک ہی جگہ سے صاف اور مکمل رہنمائی ملتی ہے اور وہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے۔ اس طرف ہمارے رجوع کرنے کی وجہ نری عقیدت مندی ہی نہیں ہے بلکہ دراصل اس راہ کے نشیب و فراز معلوم کرنے کے لیے اسی طرف رجوع کرنے پر ہم مجبور ہیں۔ اسلامی تحریک کے تمام لیڈروں میں سے صرف ایک محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ تنہا لیڈر ہیں جن کی زندگی میں ہم کو اس تحریک کی ابتدائی دعوت سے لے کر اسلامی اسٹیٹ کے قیام تک اور پھر قیام کے بعد اس اسٹیٹ کی شکل، دستور، داخلی و خارجی پالیسی، اور نظم مملکت کے نہج تک ایک ایک مرحلے اور ایک ایک پہلو کی پوری تفصیلات اور نہایت مستند تفصیلات ملتی ہیں۔ لہٰذا میں اسی ماخذ سے اس تحریک کے طریق کار کا ایک مختصر نقشہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اسلام کی دعوت پر مامور ہوتے ہیں تو آپ کو معلوم ہے کہ دنیا میں بہت سے اخلاقی، تمدنی، معاشی اور سیاسی مسائل حل طلب تھے۔ رومی اور ایرانی امپیریلزم بھی موجود تھا۔ طبقاتی امتیازات بھی تھے۔ ناجائز معاشی انتفاع (Economic Exploitation) بھی ہو رہا تھا اور اخلاقی ذمائم بھی پھیلے ہوئے تھے۔ خود آپ کے اپنے ملک میں بہت سے ایسے پیچیدہ مسائل موجود تھے جو ایک لیڈر کے ناخنِ تدبیر کا انتظار کر رہے تھے۔ ساری قوم جہالت، اخلاقی پستی، افلاس، طوائف الملوکی اور خانہ جنگی میں مبتلا تھی۔ کویت سے یمن تک مشرقی اور جنوبی عرب کے تمام ساحلی علاقے، عراق کے زرخیز صوبے سمیت ایرانی تسلط میں تھے، شمال میں حجاز کی سرحد تک رومی تسلط پہنچ چکا تھا۔ خود حجاز میں یہودی سرمایہ داروں کے بڑے بڑے گڑھ بنے ہوئے تھے اور انہوں نے عربوں کو اپنی سودخواری کے جال میں پھانس رکھا تھا۔ مغربی ساحل کے عین مقابل حبش کی عیسائی حکومت موجود تھی جو چند ہی سال پہلے مکہ پر چڑھائی کر چکی تھی۔ اس کے ہم مذہب اور اس سے ایک گونہ معاشی و سیاسی تعلق رکھنے والوں کا ایک جتھا خود حجاز اور یمن کے درمیان نجران کے مقام پر موجود تھا۔ یہ سب کچھ تھا مگر جس لیڈر کو اللہ نے رہنمائی کے لیے مقرر کیا تھا اس نے دنیا کے اور خود اپنے ملک کے ان بہت سے مسائل میں سے کسی ایک مسئلہ کی طرف

بھی توجہ نہ کی، بلکہ دعوت اس چیز کی طرف دی کہ خدا کے سوا تمام الٰہوں کو چھوڑ دو اور صرف اسی ایک اللہ کی بندگی قبول کرو۔

اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اُس رہنما کی نگاہ میں وہ دوسرے مسائل کوئی اہمیت نہ رکھتے تھے، یا وہ کسی توجہ کے لائق ہی نہ تھے۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ آگے چل کر اس نے ان سب مسئلوں کی طرف توجہ کی اور ان سب کو ایک ایک کرکے حل کیا۔ مگر ابتدا میں ان سب کی طرف سے نظر پھیر کر اسی ایک چیز پر تمام زور صرف کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اسلامی تحریک کے نقطۂ نظر سے انسان کی اخلاقی و تمدّنی زندگی میں جتنی خرابیاں بھی پیدا ہوتی ہیں ان سب کی بنیادی علت انسان کا اپنے آپ کو خود مختار (Independent) اور غیر ذمّہ دار (Irresponsible) سمجھنا، بالفاظِ دیگر آپ اپنا الٰہ بننا ہے، یا پھر یہ ہے کہ وہ اللہ العالمین کے سوا کسی دوسرے کو صاحبِ امر تسلیم کرے، خواہ وہ دوسرا کوئی انسان ہو یا غیر انسان۔ یہ چیز جب تک جڑ میں موجود ہے اسلامی نظریہ کی رُو سے کوئی اُوپری اصلاح، انفرادی بگاڑ یا اجتماعی خرابیوں کو دُور کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ایک طرف سے خرابی کو دُور کیا جائے گا اور کسی دوسری طرف سے وہ سر نکال لے گی۔ لہٰذا اصلاح کا آغاز اگر ہو سکتا ہے تو صرف اسی چیز سے ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو انسان کے دماغ سے خود مختاری کی ہوا کو نکالا جائے اور اسے بتایا جائے کہ تو جس دنیا میں رہتا ہے وہ درحقیقت بے بادشاہ کی سلطنت نہیں ہے، بلکہ فی الواقع اس کا ایک بادشاہ موجود ہے، اور اس کی بادشاہی نہ تیرے تسلیم کرنے کی محتاج ہے، نہ تیرے مٹائے سے مٹ سکتی ہے، نہ تو اس کے حدودِ سلطنت سے نکل کر کہیں جا سکتا ہے۔ اس اٹل اور اٹل واقعہ کی موجودگی میں تیرا خود مختاری کا زعم ایک احمقانہ غلط فہمی کے سوا کچھ نہیں ہے جس کا نقصان لامحالہ تیرے ہی اوپر عائد ہو گا۔ عقل اور حقیقت پسندی (Realism) کا تقاضا یہ ہے کہ سیدھی طرح اُس کے حکم کے آگے سر جھکا دے اور مطیع بندہ بن کر رہ۔ دوسری طرف اُس کو واقعہ کا یہ پہلو بھی دکھا دیا جائے کہ اس پوری کائنات میں صرف ایک ہی بادشاہ، ایک ہی مالک اور ایک ہی مختارِ کار ہے۔ کسی دوسرے کو نہ یہاں حکم چلانے کا حق ہے اور نہ واقع میں کسی کا

حکم چلتا ہے۔ اس لیے تُو اس کے سوا کسی کا بندہ نہ بن۔ کسی کا حکم نہ مان۔ کسی کے آگے سر نہ جھکا۔ یہاں کوئی ہز ہائینس نہیں ہے، ہائینس صرف ایک ہی کو زیبا ہے۔ یہاں کوئی ہز ہولی نس نہیں ہے، ہولی نس ساری کی ساری اسی ایک کے لیے خاص ہے۔ یہاں کوئی ہز لارڈشپ نہیں ہے، لارڈشپ بالکلیہ اسی ایک کا حصہ ہے۔ یہاں کوئی قانون ساز (Law Giver) نہیں ہے، قانون اُسی کا ہے اور وہی قانون بنانے کا حق دار و سزاوار ہے۔ یہاں کوئی سرکار، کوئی اَن داتا، کوئی ولی و کارساز، کوئی دُعائیں سُننے والا اور فریاد رس نہیں ہے۔ کسی کے پاس اقتدار کی کُنجیاں نہیں ہیں۔ کسی کو برتری و فوقیت حاصل نہیں ہے۔ زمین سے آسمان تک سب بندے ہی بندے ہیں۔ رب اور مولیٰ صرف ایک ہے۔ لہٰذا تو ہر غلامی، ہر اطاعت، ہر پابندی سے انکار کر دے اور اُسی ایک کا غلام، مطیع اور پابندِ حکم بن جا۔ یہ تمام اصلاحات کی جڑ اور بنیاد ہے۔ اسی بنیاد پر انفرادی سیرت اور اجتماعی نظام کی پوری عمارت اُدھڑ کر از سرِ نو ایک نئے نقشے پر بنتی ہے اور سارے مسائل جو انسانی زندگی میں آدمؑ سے لے کر اب تک پیدا ہوئے اور اب سے قیامت تک پیدا ہوں گے، اسی بنیاد پر ایک نئے طریقے سے حل ہوتے ہیں۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بنیادی اصلاح کی دعوت کو بغیر کسی سابق تیاری اور بغیر کسی تمہیدی کارروائی کے براہِ راست پیش کر دیا۔ انہوں نے اس دعوت کی منزل تک پہنچنے کے لیے کوئی ہیر پھیر کا راستہ اختیار نہ کیا کہ پہلے کچھ سیاسی یا سوشل طرز کا کام کر کے لوگوں میں اثر پیدا کیا جاتا، پھر اس اثر سے کام لے کر کچھ حاکمانہ اختیارات حاصل کیے جائیں، پھر ان اختیارات سے کام لے کر رفتہ رفتہ لوگوں کو چلاتے ہوئے اس مقام تک لے آئیں۔ یہ سب کچھ، کچھ نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں ایک شخص اٹھا، اور چھوٹتے ہی اس نے لا الٰہ الا اللہ کا اعلان کر دیا۔ اس سے کم کسی چیز پر ایک لمحہ کے لیے بھی اس کی نظر نہ ٹھیری۔ اس کی وجہ محض پیغمبرانہ جرأت اور جوش نہیں ہے۔ دراصل اسلامی تحریک کا طریقِ کار ہی یہی ہے۔ وہ اثر یا نفوذ و اقتدار جو دوسرے ذرائع سے

پیدا کیا جائے، اِس اصلاح کے کام میں کچھ بھی مددگار نہیں۔ جو لوگ لا الٰہ الا اللہ کے سوا کسی اور بنیاد پر آپ کا ساتھ دیتے رہے ہوں وہ اِس بنیاد پر تعمیرِ جدید کرنے میں آپ کے کسی کام نہیں آسکتے۔ اِس کام میں تو وہی لوگ مفید ہو سکتے ہیں جو آپ کی طرف لا الٰہ الا اللہ کی آواز سُن کر ہی آئیں، اِسی چیز میں ان کے لیے کشش ہو، اِسی حقیقت کو وہ زندگی کی بنیاد بنائیں، اور اِسی اساس پر وہ کام کرنے کے لیے اُٹھیں۔ لہٰذا اسلامی تحریک کو چلانے کے لیے جس خاص قسم کے تدبّر اور حکمتِ عملی کی ضرورت ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ کسی تمہید کے بغیر کام کا آغاز اِسی دعوتِ توحید سے کیا جائے۔

توحید کا یہ تصوّر محض ایک مذہبی عقیدہ نہیں ہے۔ جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں، اِس سے اجتماعی زندگی کا وہ پورا نظام جو انسان کی خود مختاری، یا غیر اللہ کی حاکمیت و الوہیت کی بنیاد پر بنا ہو، جڑ بنیاد سے اُکھڑ جاتا ہے اور ایک دوسری اساس پر نئی عمارت تیار ہوتی ہے۔ آج دنیا آپ کے مؤذن کو اشھد ان لا الٰہ الا اللہ کی صدا بلند کرتے ہوئے اس لیے ٹھنڈے پیٹوں سُن لیتی ہے کہ نہ پکارنے والا جانتا ہے کہ کیا پکار رہا ہوں، نہ سُننے والوں کو اس میں کوئی معنی اور کوئی مقصد نظر آتا ہے، لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اِس اعلان کا مقصد یہ ہے، اور اعلان کرنے والا جان بوجھ کر اِس بات کا اعلان کر رہا ہے کہ میرا کوئی بادشاہ و یا فرمانروا نہیں ہے، کوئی حکومت میں تسلیم نہیں کرتا، کسی قانون کو میں نہیں مانتا، کسی عدالت کے حدود و اختیارات (Jurisdiction) مجھ تک نہیں پہنچتے، کسی کا حکم میرے لیے حکم نہیں ہے، کوئی رواج اور کوئی رسم مجھے تسلیم نہیں، کسی کے امتیازی حقوق، کسی کی ریاست، کسی کا تقدس، کسی کے اختیارات میں نہیں مانتا، ایک اللہ کے سوا میں سب کا باغی اور سب سے منحرف ہوں، تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس صدا کو کہیں بھی ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ آپ خواہ کسی سے لڑنے جائیں یا نہ جائیں، دنیا خود آپ سے لڑنے آجائے گی۔ یہ آواز بلند کرتے ہی آپ کو یوں محسوس ہوگا کہ یکایک زمین و آسمان آپ کے دشمن ہو گئے ہیں اور ہر طرف آپ کے لیے سانپ، بچھو

اور درندے ہی درندے ہیں۔

یہی صورت اس وقت پیش آئی جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آواز بلند کی۔ پکارنے والے نے جان کر پکارا تھا اور سننے والے سمجھتے تھے کہ کیا پکار رہا ہے، اس لیے جس جس پر جس پہلو سے بھی اس پکار کی ضرب پڑتی تھی وہ اس کو دبانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ پجاریوں کو اپنی برہمنیت و پاپائیت کا خطرہ اس میں نظر آیا۔ رئیسوں کو اپنی ریاست کا، ساہوکاروں کو اپنی ساہوکاری کا، نسل پرستوں کو اپنے نسلی تفوق (Racial Superiority) کا، قوم پرستوں کو اپنی قومیت کا، اجداد پرستوں کو اپنے باپ دادا کے موروثی طریقہ کا، غرض ہر بُت کے پرستار کو اپنے بُت کے ٹوٹنے کا خطرہ اسی ایک آواز میں محسوس ہوا، اس لیے اَلْكُفْرُ مِلَّةٌ وَاحِدَةٌ، وہ سب جو آپس میں لڑا کرتے تھے، اِس نئی تحریک سے لڑنے کے لیے ایک ہو گئے۔ اس حالت میں صرف وہی لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آ سکے جن کا ذہن صاف تھا، جو حقیقت کو سمجھنے اور تسلیم کرنے کی استعداد رکھتے تھے، جن کے اندر اتنی صداقت پسندی موجود تھی کہ جب ایک چیز کے متعلق جان لیں کہ حق یہ ہے تو اس کی خاطر آگ میں کودنے اور موت سے کھیلنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ ایسے ہی لوگوں کی اس تحریک کے لیے ضرورت تھی۔ وہ ایک ایک دو دو چار چار کرکے آتے رہے اور کشمکش بڑھتی رہی۔ کسی کا روزگار چھوٹا۔ کسی کو گھر والوں نے نکال دیا۔ کسی کے عزیز، دوست، آشنا، سب چھوٹ گئے۔ کسی پر مار پڑی۔ کسی کو قید میں ڈالا گیا۔ کسی کو تپتی ہوئی ریت پر گھسیٹا گیا۔ کسی کی سرِبازار پتھروں اور گالیوں سے تواضع کی گئی۔ کسی کی آنکھ پھوڑ دی گئی۔ کسی کا سر پھاڑ دیا گیا۔ کسی کو عورت، مال، حکومت و ریاست اور ہر ممکن چیز کا لالچ دے کر خریدنے کی کوشش کی گئی۔ یہ سب چیزیں آئیں، اِن کا آنا ضروری تھا، اِن کے بغیر اسلامی تحریک نہ مستحکم ہو سکتی تھی اور نہ بڑھ سکتی تھی۔

اِن کا پہلا فائدہ یہ تھا کہ گھٹیا قسم کے بودی سیرت اور ضعیف ارادہ رکھنے والے لوگ اِس طرف آہی نہ سکتے تھے۔ جو بھی آیا وہ نسلِ آدم کا بہترین جوہر تھا جس کی دراصل ضرورت

تھی۔ کوئی دوسری صورت کام کے آدمیوں کو ناکارہ آدمیوں سے چھانٹ کر الگ نکال لینے کی اس کے سوا نہ تھی کہ جو بھی آتے وہ اس بھٹی میں سے گزر کر آتے۔

پھر جو لوگ آتے ان کو اپنی کسی ذاتی غرض کے لیے یا کسی خاندانی یا قومی مقصد کے لیے نہیں، بلکہ محض حق و صداقت کے لیے، صرف خدا اور اس کی رضا کی خاطر مصائب و آلام کا مقابلہ کرنا پڑتا۔ اسی کے لیے وہ پٹتے، اسی کے لیے بھوکے مرتے، اسی کے لیے دنیا بھر کی جفاکاریوں کا تختۂ مشق بنتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن میں وہ صحیح اسلامی ذہنیت پیدا ہوتی گئی جس کی ضرورت تھی۔ اُن کے اندر خالص اسلامی سیرت پیدا ہوتی۔ اُن کی خدا پرستی میں خلوص آتا اور بڑھتا چلا گیا۔ مصائب کی اس زبردست تربیت گاہ میں کیفیتِ اسلامی کا طاری ہونا ایک طبعی امر تھا۔ جب کوئی شخص کسی مقصد کے لیے اٹھتا ہے اور اس کی راہ میں کشمکش، جدّوجہد، مصیبت، تکلیف، پریشانی، مار، قید، فاقہ، جلاوطنی وغیرہ کے مرحلوں سے گزرتا ہے تو اس ذاتی تجربہ کی بدولت اُس مقصد کی تمام کیفیات اس کے قلب و روح پر چھا جاتی ہیں اور اس کی پوری شخصیت اس مقصد میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس مقصد کی تکمیل میں مدد دینے کے لیے نماز اُن پر فرض کی گئی تاکہ نظر کی پراگندگی کا ہر امکان دور ہو جاتے۔ اپنے نصب العین پر اُن کی نگاہ جمی رہے، جس کو وہ حاکم مان چکے ہیں اس کی حاکمیت کا بار بار اقرار کر کے وہ اپنے عقیدے میں مضبوط ہو جائیں، جس کے حکم کے مطابق انہیں اب دنیا میں کام کرنا ہے اس کا عالم الغیب والشہادۃ ہونا، اس کا مالک یوم الدین ہونا، اس کا قاھر فوق عبادہٖ ہونا پوری طرح اُن کے ذہن نشین ہو جاتے، اور کسی حال میں بھی اُس کی اطاعت کے سوا دوسرے کی اطاعت کا خیال تک اُن کے دل میں نہ آنے پاتے۔

ایک طرف آنے والوں کی تربیت اس طرح ہو رہی تھی اور دوسری طرف اسی کشمکش کی وجہ سے اسلامی تحریک پھیل بھی رہی تھی۔ جب لوگ دیکھتے تھے کہ چند انسان پیٹے جا رہے ہیں تو خواہ مخواہ ان کے اندر یہ معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوتا تھا کہ آخر یہ سارا ہنگامہ ہے کس لیے؟ اور جب انہیں یہ معلوم ہوتا تھا کہ زن، زر، زمین کسی چیز کے لیے بھی نہیں ہے، کوئی

ان کی ذاتی غرض نہیں ہے ، یہ اللہ کے بندے صرف اس لیے پٹ رہے ہیں کہ ایک چیز کی صداقت ان پر منکشف ہوئی ہے ، تو اُن کے دلوں میں آپ سے آپ یہ جذبہ پیدا ہوتا تھا کہ اُس چیز کو معلوم کریں ، آخر ایسی کیا چیز ہے جس کے لیے یہ لوگ ایسے ایسے مصائب برداشت کر رہے ہیں ؟ پھر جب انہیں معلوم ہوتا کہ وہ چیز ہے لاالٰہ الا اللہ ، اور اس سے انسانی زندگی میں اس نوعیت کا انقلاب رونما ہوتا ہے ، اور اس دعوت کو لے کر ایسے لوگ اُٹھے ہیں جو محض صداقت و حقیقت کی خاطر دنیا کے سارے فائدوں کو ٹھکرا رہے ہیں اور جان ، مال ، اولاد ، ہر چیز کو قربان کر رہے ہیں ، تو اُن کی آنکھیں کھل جاتی تھیں ۔ اُن کے دلوں پر جتنے پردے پڑے ہوئے تھے وہ چاک ہونے لگتے تھے ۔ اس پس منظر کے ساتھ یہ سچائی تیر کی طرح نشانے پر جا کر بیٹھتی تھی ۔ یہی وجہ تھی کہ بجز اُن لوگوں کے جن کو ذاتی وجاہت کے تکبر ، یا اجداد پرستی کی جہالت ، یا اغراضِ دنیوی کی محبت نے اندھا بنا رکھا تھا ، اور سب لوگ اس تحریک کی طرف کھنچتے چلے گئے ۔ کوئی جلدی کھنچا اور کوئی زیادہ دیر تک اس کشمکش کی مزاحمت کرتا رہا ، مگر دیر یا سویر ہر صداقت پسند ، بے لوث آدمی کو اس طرف کھنچنا ہی پڑا ۔

اس دوران میں تحریک کے لیڈر نے اپنی شخصی زندگی سے اپنی تحریک کے اصولوں کا اور ہر اُس چیز کا جس کے لیے یہ تحریک اُٹھی تھی ، پورا پورا مظاہرہ کیا ۔ ان کی ہر بات ، ہر فعل اور ہر حرکت سے اسلام کی روح ٹپکتی تھی اور آدمی کی سمجھ میں آتا تھا کہ اسلام کسے کہتے ہیں ۔ یہ ایک بڑی تفصیل طلب بحث ہے جس کی تشریح کا یہاں موقع نہیں ۔ مگر مختصراً چند نمایاں باتوں کا میں یہاں ذکر کروں گا ۔

اُن کی بیوی حضرت خدیجہؓ حجاز کی سب سے زیادہ مالدار عورت تھیں اور وہ ان کے مال سے تجارت کرتے تھے ۔ جب اسلام کی دعوت شروع ہوئی تو آنحضرتؐ کا سارا تجارتی کاروبار بیٹھ گیا کیونکہ ہمہ تن اپنی دعوت میں معروف ہو جانے اور تمام عرب کو اپنا دشمن بنا لینے کے بعد یہ کام نہ چل سکتا تھا ۔ جو کچھ پچھلا اندوختہ تھا اس کو میاں اور بیوی دونوں نے اس تحریک کے پھیلانے پر چند سال میں لگا دیا ۔ آخر کار نوبت یہاں تک آئی کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تبلیغ کے سلسلہ میں طائف تشریف لے گئے تو وہ شخص جو کبھی

حجاز کا مالک الختیار تھا اس کو سواری کے لیے ایک گدھا تک میسر نہ ہوا۔

قریش کے لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حجاز کا تخت پیش کیا۔ کہا کہ ہم آپ کو اپنا بادشاہ بنالیں گے، عرب کی حسین ترین عورت آپ کے نکاح میں دے دیں گے، دولت کے ڈھیر آپ کے قدموں میں لگادیں گے بشرطیکہ آپ اس تحریک سے باز آجائیں۔ مگر وہ شخص جو انسان کی فلاح کے لیے اٹھا تھا، اس نے ان سب پیش کشوں کو ٹھکرادیا اور گالیاں اور پتھر کھانے پر راضی ہوگیا۔

قریش اور عرب کے سرداروں نے کہا کہ محمدؐ! ہم تمہارے پاس کیسے آکر بیٹھیں اور تمہاری باتیں کیسے سُنیں جب کہ تمہاری مجلس میں ہر وقت غلام، مفلس (معاذ اللہ) کمین لوگ بیٹھے رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں جو سب سے زیادہ نیچے طبقے کے لوگ ہیں ان کو تم نے اپنے گرد و پیش جمع کر رکھا ہے، انہیں ہٹاؤ تو ہم تم سے ملیں۔ مگر وہ شخص جو انسانوں کی اونچ نیچ برابر کرنے آیا تھا اس نے رئیسوں کی خاطر غریبوں کو دھتکارنے سے انکار کردیا۔

اپنی تحریک کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ملک، اپنی قوم، اپنے قبیلہ، اپنے خاندان، کسی کے مفاد کی کبھی پروا نہیں کی۔ اسی چیز نے دنیا کو یقین دلایا کہ آپ انسان بحیثیت انسان کی فلاح کے لیے اُٹھے ہیں، اور اسی چیز نے آپ کی دعوت کی طرف ہر قوم کے انسانوں کو کھینچا۔ اگر آپ اپنے خاندان کی فکر کرتے تو غیر ہاشمیوں کو اس فکر سے کیا دلچسپی ہوسکتی تھی؟ اگر آپ اس بات کے لیے کبھی بے چین ہوتے کہ قریش کے اقتدار کو کسی طرح بچاؤں تو غیر قریشی عربوں کو کیا پڑی تھی کہ اس کام میں شریک ہوتے؟ اگر آپ عرب کی برتری کے لیے اُٹھتے تو حبش کے بلالؓ، روم کے صہیبؓ اور فارس کے سلمانؓ کو کیا غرض تھی کہ اس کام میں آپؐ کا ساتھ دیتے؟ دراصل جس چیز نے سب کو کھینچا وہ خالص خدا پرستی تھی، ہر ذاتی، خاندانی، قومی، وطنی غرض سے مکمل بے لوثی تھی۔

مکہ سے جب آپؐ کو ہجرت کرنی پڑی تو وہ تمام امانتیں جو دشمنوں نے آپ کے پاس رکھوائی تھیں، حضرت علیؓ کے سپرد کرکے نکلے کہ میرے بعد ہر ایک کی امانت اس کو پہنچا دینا۔ دُنیا پرست ایسے موقع پر جو کچھ ہاتھ لگتا ہے، لے کر چلتے ہیں۔ مگر خدا پرست نے اپنی جان

کے دشمنوں، اپنے خون کے پیاسوں کا مال بھی اُنہیں واپس پہنچانے کی فکر کی اور اُس وقت کی جب کہ وہ اس کے قتل کا فیصلہ کر چکے تھے۔ یہ وہ اخلاق تھا جس کو دیکھ کر عرب کے لوگ دنگ رہ گئے ہوں گے اور مجھے یقین ہے کہ جب وہ دو سال کے بعد بدر کے میدان میں آنحضرتؐ کے خلاف لڑنے کھڑے ہوئے ہوں گے تو ان کے دل اندر سے کہہ رہے ہوں گے کہ یہ تم کس سے لڑ رہے ہو؟ اُس فرشتہ خصلت انسان سے جو قتل گاہ سے رخصت ہوتے وقت بھی انسانوں کے حقوق اور امانت کی ذمہ داری کو نہیں بھولتا؟ اُس وقت ان کے ہاتھ ضد کی بنا پر لڑتے ہوں گے مگر اُن کے دل اندر سے چیخ رہے ہوں گے۔ عجب نہیں کہ بدر میں کفار کی شکست کے اخلاقی اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہو۔

۱۳ برس کی شدید جدوجہد کے بعد وہ وقت آیا جب مدینہ میں اسلام کا ایک چھوٹا سا اسٹیٹ قائم کرنے کی نوبت آئی۔ اس وقت ڈھائی تین سو کی تعداد میں ایسے آدمی فراہم ہو چکے تھے جن میں سے ایک ایک اسلام کی پوری تربیت پا کر اس قابل ہو چکا تھا کہ جس حیثیت میں بھی اُسے کام کرنے کا موقع ملے، مسلمان کی حیثیت سے اُس کو انجام دے سکے۔ اب یہ لوگ ایک اسلامی اسٹیٹ کو چلانے کے لیے تیار تھے۔ چنانچہ وہ قائم کر دیا گیا۔ دس برس تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اسٹیٹ کی رہنمائی کی اور اس مختصر سی مدت میں ہر شعبۂ حکومت کو اُس اسلامی طرز پر چلانے کی پوری مشق اِن لوگوں کو کرادی۔ یہ دَور اسلامی آئیڈیالوجی کے ایک مجرد تخیل (Abstract Idea) سے ترقی کر کے ایک مکمل نظام تمدن بننے کا دور ہے جس میں اسلام کی انتظامی، تعلیمی، عدالتی، معاشی، معاشرتی، مالی، جنگی، بین الاقوامی پالیسی کا ایک ایک پہلو واضح ہوا، ہر شعبۂ زندگی کے لیے اصول بنے، اُن اصولوں کو عملی حالات پر منطبق کیا گیا، اِس خاص طرز پر کام کرنے والے کارکن تعلیم اور تربیت اور عملی تجربے سے تیار کیے گئے، اور ان لوگوں نے اسلام کی حکمرانی کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ آٹھ سال کی مختصر مدت میں مدینہ جیسے ایک چھوٹے سے قصبہ کا اسٹیٹ پورے عرب کی سلطنت میں تبدیل ہو گیا۔ جوں جوں لوگ اسلام کو اُس کی عملی صورت میں اور اس کے نتائج کو محسوس شکل میں دیکھتے تھے، خود بخود اس بات کے قائل ہو جاتے تھے کہ فی الواقع انسانیت اس کا نام ہے اور انسانی

فلاح اسی چیز میں ہے۔ بدترین دشمنوں کو بھی آخر قائل ہو کر اسی مسلک کو قبول کرنا پڑا جس کے خلاف وہ لڑ رہے تھے۔ خالد بن ولید قائل ہوئے۔ ابو جہل کے بیٹے عکرمہ قائل ہوئے۔ ابو سفیان قائل ہوئے۔ قاتلِ حمزہ وحشی قائل ہوئے۔ ہندہ جگر خوار تک کو آخر اس شخص کی صداقت کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینا پڑا جس سے بڑھ کر اس کی نگاہ میں کوئی مبغوض نہ تھا۔

غلطی سے تاریخ نگاروں نے غزوات کو اتنا نمایاں کر دیا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں عرب کا یہ انقلاب لڑائیوں سے ہوا۔ حالانکہ آٹھ سال کی تمام لڑائیوں میں جن سے عرب جیسی جنگجو قوم مسخر ہوئی، طرفین کے جانی نقصان کی تعداد ہزار بارہ سو سے زیادہ نہیں ہے۔ انقلابات کی تاریخ اگر آپ کے پیش نظر ہے تو آپ کو تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ انقلاب غیر خونی انقلاب (Bloodless Revolution) کہے جانے کا مستحق ہے۔ پھر اس انقلاب میں فقط ملک کا طریقِ انتظام ہی تبدیل نہیں ہوا بلکہ ذہنیتیں بدل گئیں، نگاہ کا زاویہ بدل گیا، سوچنے کا طریقہ بدل گیا، زندگی کا طرز بدل گیا، اخلاق کی دنیا بدل گئی، عادات اور خصائل بدل گئے، غرض ایک پوری قوم کی کایا پلٹ کر رہ گئی۔ جو زانی تھے وہ عورتوں کی عصمت کے محافظ بن گئے۔ جو شرابی تھے وہ منعِ شراب کی تحریک کے علمبردار بن گئے۔ جو چور اور ڈاکو تھے ان کا احساسِ دیانت اتنا نازک ہو گیا کہ دوستوں کے گھر کھانا کھانے میں بھی ان کو اس بنا پر تامل تھا کہ کہیں ناجائز طریقہ پر دوسروں کے مال کھانے کا اطلاق اس فعل پر بھی نہ ہوتا ہو، حتیٰ کہ قرآن میں خود اللہ تعالیٰ کو انہیں اطمینان دلانا پڑا کہ اس طرح کے کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں[1]۔ جو ڈاکو اور لٹیرے تھے وہ اتنے متدین بن گئے کہ ان کے ایک معمولی سپاہی کو پایۂ تخت ایران کی فتح کے موقع پر کروڑوں کی قیمت کا شاہی تاج ہاتھ لگا اور وہ رات کی تاریکی میں اپنے پیوند لگے ہوئے کمبل میں اسے چھپا کر سپہ سالار کے حوالے کرنے کے لیے پہنچا تاکہ اس غیر معمولی واقعہ سے اس کی دیانت کی شہرت نہ ہو جائے اور اس کے خلوص پر ریاکاری کا میل نہ آ جائے۔

---

[1] ملاحظہ ہو سورۂ نور، آیت ۶۱۔

وہ جن کی نگاہ میں انسانی جان کی کوئی قیمت نہ تھی، جو اپنی بیٹیوں کو آپ اپنے ہاتھ سے زندہ دفن کرتے تھے، ان کے اندر جان کا اتنا احترام پیدا ہو گیا کہ کسی مرغ کو بھی بے رحمی سے قتل ہوتے نہ دیکھ سکتے تھے۔ وہ جن کو راست بازی اور انصاف کی ہوا تک نہ لگی تھی ان کے عدل اور راستی کا یہ حال ہو گیا کہ خیبر کی صلح کے بعد جب اُن کا تحصیل دار یہودیوں سے سرکاری معاملہ وصول کرنے گیا تو یہودیوں نے اس کو ایک بیش قرار رقم اس غرض کے لیے پیش کی کہ وہ سرکاری مطالبہ میں کچھ کمی کر دے، مگر اس نے رشوت لینے سے انکار کر دیا اور حکومت اور یہودیوں کے درمیان پیداوار کا آدھا آدھا حصہ اس طرح تقسیم کیا کہ دو برابر کے ڈھیر آمنے سامنے لگا دیتے اور یہودیوں کو اختیار دیا کہ دونوں میں سے جس ڈھیر کو چاہیں اُٹھا لیں۔ اِس نرالی قسم کے تحصیلدار کا یہ طرز عمل دیکھ کر یہودی انگشت بدنداں رہ گئے اور بے اختیار ان کی زبانوں سے نکلا کہ ایسی عدل پر زمین و آسمان قائم ہیں۔ ان کے اندر وہ گورنر پیدا ہوتے جو گورنمنٹ ہاؤسوں میں نہیں بلکہ رعایا کے درمیان انہی جیسے گھروں میں رہتے تھے، بازاروں میں پیدل پھرتے تھے، دروازوں پر دربان نہ رکھتے تھے اور رات دن میں ہر وقت جو چاہتا تھا ان سے انٹرویو کر سکتا تھا۔ ان کے اندر وہ قاضی پیدا ہوتے جن میں سے ایک نے ایک یہودی کے خلاف خود خلیفہ وقت کا دعویٰ اس بنا پر خارج کر دیا کہ خلیفہ اپنے غلام اور اپنے بیٹے کے سوا کوئی گواہ پیش نہ کر سکا[1]۔ ان کے اندر وہ سپہ سالار پیدا ہوتے جن میں سے ایک نے دورانِ جنگ میں ایک شہر خالی کرتے وقت پورا جزیہ یہ کہہ کر اہلِ شہر کو واپس دے دیا کہ ہم اب تمہاری حفاظت سے قاصر ہیں، لہٰذا جو ٹیکس ہم نے حفاظت کے معاوضہ میں وصول کیا تھا اسے رکھنے کا ہمیں کوئی حق نہیں۔ اُن میں وہ سفیر پیدا ہوتے جن میں سے ایک نے سپہ سالار ایران کے بھرے دربار میں اسلام کے اصولِ مساواتِ انسانی کا ایسا مظاہرہ کیا اور ایران کے طبقاتی امتیازات پر ایسی برمحل تنقید کی کہ خدا جانے کتنے ایرانی سپاہیوں کے دلوں میں اِس مذہبِ انسانیت کی عزت و وقعت کا بیج اُسی وقت

---

[1] یہ حضرت علیؓ کے دورِ خلافت کا واقعہ ہے۔

پڑ گیا ہوگا۔ اُن میں وہ شہری پیدا ہوتے جن کے اندر اخلاقی ذمہ داری کا احساس اتنا زبردست تھا کہ جن جرائم کی سزا ہاتھ کاٹنے اور پتھر مار مار کر ہلاک کر دینے کی صورت میں دی جاتی تھی اُن کا اقبال خود آکر کرتے تھے اور تقاضا کرتے تھے کہ سزا دے کر انہیں گناہ سے پاک کر دیا جائے تاکہ وہ چور یا زانی کی حیثیت سے خدا کی عدالت میں نہ پیش ہوں۔ ان میں وہ سپاہی پیدا ہوتے جو تنخواہ لے کر نہیں لڑتے تھے بلکہ اس مسلک کی خاطر جس پر وہ ایمان لائے تھے، اپنے خرچ پر میدانِ جنگ میں جاتے اور پھر جو مالِ غنیمت ہاتھ لگتا وہ سارا کا سارا لا کر سپہ سالار کے سامنے رکھ دیتے۔ کیا اجتماعی اخلاق اور اجتماعی ذہنیت کا اتنا زبردست تغیر محض لڑائیوں کے زور سے ہو سکتا تھا؟ تاریخ آپ کے سامنے موجود ہے۔ کہیں آپ کو کوئی ایسی مثال ملتی ہے کہ تلوار نے انسانوں کو اس طرح مکمل طور پر بدل ڈالا ہو؟

درحقیقت یہ ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ ۱۳ برس کی مدت میں تو کل ڈھائی تین سو مسلمان پیدا ہوتے مگر بعد کے دس سال میں سارا کا سارا ملک مسلمان ہوگیا۔ اس معمے کو لوگ حل نہیں کر سکتے اس لیے عجیب عجیب توجیہیں کرتے ہیں۔ حالانکہ بات بالکل صاف ہے۔ جب تک اس نئی آئیڈیالوجی پر زندگی کا نقشہ نہیں بنا تھا، لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ نرالی قسم کا لیڈر آخر کیا بنانا چاہتا ہے۔ طرح طرح کے شبہات دلوں میں پیدا ہوتے تھے۔ کوئی کہتا یہ نری شاعرانہ باتیں ہیں۔ کوئی اسے محض زبان کی ساحری قرار دیتا۔ کوئی کہتا کہ یہ شخص مجنون ہو گیا ہے۔ اور کوئی اُسے محض ایک خیالی آدمی (Visionary) قرار دے کر گویا اپنے نزدیک رائے زنی کا حق ادا کر دیتا۔ اس وقت صرف غیر معمولی سمجھ اور ذہانت رکھنے والے لوگ ہی ایمان لائے جن کی نگاہ حقیقت بیں اس نئے مسلک میں انسانی فلاح کی صورت صاف دیکھ سکتی تھی۔ مگر جب اس نظام فکر پر ایک مکمل نظام حیات بن گیا اور لوگوں نے اپنی آنکھوں سے اُس کو کام کرتے ہوئے دیکھ لیا اور اُس کے نتائج ان کے سامنے عیاناً آگئے تب ان کی سمجھ میں آیا کہ یہ چیز تھی جس کو بنانے کے لیے وہ اللہ کا نیک بندہ دنیا بھر کے ظلم سہہ رہا تھا۔ اس کے بعد ضد اور ہٹ دھرمی کے لیے پاؤں جمانے کا کوئی موقع باقی نہ رہا جس کی پیشانی پر بھی دو آنکھیں تھیں اور اُن آنکھوں میں نور تھا اس کے لیے آنکھوں دیکھی حقیقت سے انکار

کرنا غیر ممکن ہو گیا۔

یہ ہے اس اجتماعی انقلاب کے لانے کا طریقہ جس کو اسلام برپا کرنا چاہتا ہے۔ یہی اس کا راستہ ہے۔ اسی ڈھنگ پر وہ شروع ہوتا ہے اور اسی تدریج سے وہ آگے بڑھتا ہے۔ لوگ اس کو معجزہ کی قسم کا واقعہ سمجھ کر کہہ دیتے ہیں کہ اب یہ کہاں ہو سکتا ہے، نبی ہی آئے تو یہ کام ہو۔ مگر تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ یہ بالکل ایک طبعی قسم کا واقعہ تھا۔ اس میں علت و معلول کا پورا منطقی اور سائنٹفک ربط ہمیں نظر آتا ہے۔ آج بھی ہم اس ڈھنگ پر کام کریں تو وہی نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ اس کام کے لیے ایمان، شعورِ اسلامی، ذہن کی یکسوئی، مضبوط قوتِ فیصلہ، اور شخصی جذبات اور ذاتی امنگوں کی سخت قربانی درکار ہے۔ اس کے لیے ان جواں ہمت لوگوں کی ضرورت ہے جو حق پر ایمان لانے کے بعد اس پر پوری طرح نظر جما دیں، کسی دوسری چیز کی طرف توجہ نہ کریں۔ دنیا میں خواہ کچھ ہوا کرے، وہ اپنے نصب العین کے راستے سے ایک اپنچ نہ ہٹیں۔ دنیوی زندگی میں اپنی ذاتی ترقی کے سارے امکانات کو قربان کر دیں، اپنی اُمّیدوں کا اور اپنے والدین کی تمناؤں کا خون کرتے ہوئے نہ جھجکیں، عزیزوں اور دوستوں کے چھوٹ جانے کا غم نہ کریں، سوسائٹی، حکومت، قانون، قوم، وطن جو چیز بھی ان کے نصب العین کی راہ میں حائل ہو اس سے لڑ جائیں۔ ایسے ہی لوگوں نے پہلے بھی اللہ کا کلمہ بلند کیا تھا، ایسے ہی لوگ آج بھی کریں گے، اور یہ کام ایسے ہی لوگوں کے کیے سے ہو سکتا ہے۔

(ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۴۰ء)

استدراک[1]

اوپر کے مضمون میں اسلامی انقلاب کے طریق کار کی جو توضیح کی گئی ہے، اگرچہ وہ

[1] یہ حصہ اُس اصل مقالہ میں شامل نہ تھا جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پڑھا گیا تھا۔ بعد میں اشاعت کے موقع پر اس کا اضافہ کیا گیا۔ (جدید)

بجائے خود کافی ہے، لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مسیح علیہ السلام کے چند اقوال ایک خاص ترتیب کے ساتھ نقل کر دیئے جائیں جن سے اِس تحریک کے ابتدائی مرحلہ پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔ چونکہ ہمارے موجودہ زمانے کے حالات اُن حالات سے بہت ملتے جلتے ہیں جن میں سیّدنا مسیح علیہ السلام نے اہلِ فلسطین کو حکومتِ الٰہیہ کی دعوت دی تھی اس لیے اُن کے طریقِ عمل میں ہم کو مفید ہدایات مل سکتی ہیں:۔

"فقیہوں میں سے ایک نے ——— اُس سے پوچھا کہ سب حکموں میں اول کونسا ہے۔ یسوع نے جواب دیا کہ اوّل یہ ہے، اے اسرائیل سُن، خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے[1] اور تو خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور ساری عقل اور اپنی ساری طاقت سے محبت رکھ ——— فقیہ نے اُس سے کہا اے استاد، کیا خوب! تُو نے سچ کہا کہ وہ ایک ہی ہے اور اس کے سِوا اور کوئی نہیں"

(مرقس - ۱۲: ۲۸ - ۳۲)

"تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اُسی کی عبادت کر"

(لوقا - ۴: ۸)

"پس تم اس طرح دُعا مانگا کرو کہ اے ہمارے باپ[2]! تو جو آسمان پر ہے، تیرا نام پاک مانا جائے، تیری بادشاہت آئے، تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو"   (متی ۶: ۹ - ۱۰)

آخری آیت میں حضرت مسیحؑ نے اپنے نصب العین کو واضح کر دیا ہے۔ یہ جو عام غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ خدا کی بادشاہت سے ان کی مراد محض روحانی بادشاہت تھی،

---

[1] "خداوند" اور "الٰہ" دونوں ہم معنی الفاظ ہیں۔ (قدیم)

[2] بنی اسرائیل کے ہاں خدا کے لیے باپ کا لفظ بطور استعارہ استعمال ہوتا تھا۔ اسے ساری خلق کا باپ کہا جاتا تھا اور اس کے معنی یہ نہیں تھے کہ خلق اس کی اولاد ہے۔ (جدید)

یہ آیت اس کی تردید کرتی ہے۔ اُن کا صاف مقصد یہ تھا کہ زمین پر خدا کا قانون اور اُس کا حکمِ شرعی اُسی طرح جاری ہو جس طرح تمام کائنات میں اُس کا قانونِ طبیعی نافذ ہے۔ اسی انقلاب کے لیے وہ لوگوں کو تیار کر رہے تھے۔

• یہ نہ سمجھو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں۔ صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلوانے آیا ہوں۔ مَیں اس لیے آیا ہوں کہ آدمی کو اس کے باپ سے اور بیٹی کو اس کی ماں سے اور بہو کو اس کی ساس سے جدا کر دوں۔ اور آدمی کے دشمن اس کے گھر ہی کے لوگ ہوں گے۔ جو کوئی باپ ماں کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ میرے لائق نہیں۔ اور جو کوئی اپنی صلیب[1] نہ اُٹھائے اور میرے پیچھے نہ چلے وہ میرے لائق نہیں۔ جو کوئی اپنی جان بچاتا ہے اسے کھوئے گا اور جو کوئی میرے سبب اپنی جان کھوتا ہے اسے بچائے گا۔" (متی ۱۰: ۳۴-۳۹)

"جو کوئی میرے پیچھے آنا چاہے وہ اپنی خودی[2] سے انکار کرے اور اپنی صلیب اُٹھائے اور میرے پیچھے ہو لے۔" (متی ۱۶: ۲۴)

• بھائی کو بھائی قتل کے لیے حوالے کرے گا اور بیٹے کو باپ۔ اور بیٹے اپنے ماں باپ کے خلاف کھڑے ہو کر انہیں مروا ڈالیں گے۔ اور میرے نام کے باعث سب لوگ تم سے عداوت کریں گے۔ مگر جو آخر تک برداشت کرے گا وہی نجات پائے گا۔" (متی ۱۰: ۲۱-۲۲)

• دیکھو میں تمہیں بھیجتا ہوں گویا بھیڑوں کے بیچ میں ——— آدمیوں سے خبردار رہو۔ کیونکہ وہ تمہیں عدالتوں کے حوالے کریں گے اور اپنے عبادت خانوں میں تمہارے کوڑے ماریں گے اور تم میرے سبب حاکموں اور بادشاہوں کے

---

[1] اپنی صلیب آپ اُٹھانے سے مراد سزائے موت کے لیے تیار رہنا ہے۔ جس طرح اردو میں محاورہ ہے "سر ہتھیلی پر لے کر نکلنا"۔ (قدیم)

[2] اس سے مراد ہے خود پرستی اور اغراضِ ذاتی سے دست بردار ہو جانا۔ (قدیم)

سامنے حاضر کیے جاؤ گے۔" (۱۰: ۱۶-۱۸)

"اگر کوئی میرے پاس آئے اور اپنے باپ اور ماں اور بیوی اور بچوں
اور بہنوں بلکہ اپنی جان سے بھی دشمنی نہ کرے[1] تو میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔ جو کوئی
اپنی صلیب نہ اٹھائے اور میرے پیچھے نہ آئے وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔
کیونکہ تم میں ایسا کون ہے کہ جب وہ ایک برج بنانا چاہے تو پہلے بیٹھ کر لاگت
کا حساب نہ کرے کہ آیا میرے پاس اس کے تیار کرنے کا سامان ہے یا نہیں۔
ایسا نہ ہو کہ جب نیو ڈال کر تیار نہ کر سکے تو سب دیکھنے والے یہ کہہ کر اس پر
ہنسنا شروع کریں کہ اس شخص نے عمارت شروع تو کی مگر تیار نہ کر سکا ——
تم میں سے جو کوئی اپنا سب کچھ ترک نہ کرے وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔"

(لوقا ۱۴: ۲۶-۳۳)

یہ تمام آیات صاف دلالت کرتی ہیں کہ مسیح علیہ السلام محض ایک دھرم کا پرچار کرنے نہیں اٹھے تھے بلکہ پورے نظام تمدن و سیاست کو بدل دینا اُن کے پیشِ نظر تھا جس میں رومی سلطنت، یہودی ریاست، فقیہوں اور فریسیوں کے اقتدار اور فی الجملہ تمام بندگانِ نفس و ہوائے نفس سے جنگ کا خطرہ تھا۔ اسی لیے وہ لوگوں کو کھلے الفاظ میں بتا دیتے تھے کہ جو کام میں کرنے جا رہا ہوں وہ نہایت خطرناک ہے اور میرے ساتھ اُسی کو آنا چاہیے جو ان تمام خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو۔

"شریر کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا
بھی اس کی طرف پھیر دے۔ اور اگر کوئی تجھ پر نالش کر کے تیرا کرتا لینا چاہے تو چوغہ
بھی اسے لے لینے دے اور جو کوئی تجھ کو ایک کوس بیگار میں لے جائے اس کے
ساتھ دو کوس چلا جا۔" (متی ۵: ۳۹-۴۱)

"جو بدن کو قتل کرتے ہیں اور روح کو قتل نہیں کر سکتے ان سے نہ ڈرو

---

[1] دشمنی کرنے سے مراد اُن کی محبت اور ان کے مفاد کو اسلامی تحریک پر قربان کر دینا ہے۔ (قدیم)

بلکہ اُس سے ڈرو جو روح اور بدن دونوں کو جہنّم میں ہلاک کر سکتا ہے۔"

(متی ۱۰: ۲۸)

"اپنے واسطے زمین پر مال جمع نہ کرو جہاں کیڑا اور زنگ خراب کرتا ہے اور جہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں، بلکہ اپنے لیے آسمان پر مال جمع کرو۔"

(متی ۶: ۱۹-۲۰)

"کوئی آدمی دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا ــــ تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے ــــ اپنی جان کی فکر نہ کرو کہ ہم کیا کھائیں گے۔ یا کیا پیئیں گے، اور نہ بدن کی کہ کیا پہنیں گے ــــ ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے ہیں نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں پھر بھی تمہارا آسمانی باپ اُن کو کھلاتا ہے۔ کیا تم اُن سے زیادہ قدر نہیں رکھتے؟ تم میں ایسا کون ہے جو فکر کر کے اپنی عمر میں ایک گھڑی بھی بڑھا سکے؟ اور پوشاک کے لیے کیوں فکر کرتے ہو؟ جنگلی سوسن کے درختوں کو دیکھو کہ وہ کس طرح بڑھتے ہیں۔ وہ نہ محنت کرتے ہیں، نہ کاتتے ہیں۔ پھر بھی میں تم سے کہتا ہوں کہ سلیمان بھی باوجود اپنی شان و شوکت کے ان میں سے کسی کے مانند پوشاک پہنے ہوئے نہ تھا۔ پس جب خدا میدان کی گھاس کو جو آج ہے اور کل تنور میں جھونکی جاتے گی ایسی پوشاک پہناتا ہے تو اے کم اعتقادو، تم کو کیوں نہ پہنائے گا؟ ــــ تم پہلے اُس کی بادشاہت اور اس کی راستبازی کی تلاش کرو تو یہ سب چیزیں بھی تمہیں مل جائیں گی۔" (متی ۶: ۲۴-۳۳)

"مانگو تو تمہیں دیا جائے گا۔ ڈھونڈو تو تم پاؤ گے۔ دروازہ کھٹکھٹاؤ تو تمہارے واسطے کھولا جائے گا۔" (متی ۷: ۷)

عام غلط فہمی ہے کہ سیدنا مسیحؑ نے رہبانیت اور ترک و تجرید کی تعلیم دی تھی حالانکہ اس انقلابی تحریک کے آغاز میں لوگوں کو صبر، تحملِ شدائد اور توکّل علی اللہ کی تعلیم و تربیت دیئے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔ جہاں ایک نظامِ تمدن و سیاست پوری طاقت کے ساتھ زمین پر چھایا ہوا ہو اور تمام وسائل و ذرائعِ زندگی اس کے قبضہ و اختیار میں ہوں، ایسی جگہ کوئی جماعت

انقلاب کے لیے اٹھ نہیں سکتی جب تک کہ وہ جان و مال کی محبت دل سے نکال نہ دے ، سختیاں اُٹھانے کو تیار نہ ہو جائے ، اپنے بہت سے فوائد کو قربان کرنے اور بہت سے نقصانات گوارا کرنے کے لیے آمادہ نہ ہو۔ حاضر الوقت نظام سے لڑنا دراصل تمام آفات و مصائب کو اپنے اوپر دعوت دینا ہے۔ یہ کام جنہیں کرنا ہو انہیں ایک تھپڑ کھا کر دوسرے تھپڑ کے لیے تیار رہنا چاہیئے ، کُرتا ہاتھ سے جاتا ہو تو چوغہ بھی چھوڑنے کے لیے آمادہ ہونا چاہیئے ، اور روٹی کپڑے کی فکر سے آزاد ہو جانا چاہیئے۔ خزائنِ رزق فی الوقت جن کے ہاتھ میں ہیں ، ظاہر ہے کہ اُن سے لڑ کر رزق پانے کی اُمید نہیں کی جا سکتی۔ لہٰذا جو اسباب سے قطع نظر کر کے صرف خدا کے بھروسہ پر اس راہ میں چھلانگ لگا سکتا ہو وہی اُن سے لڑ سکتا ہے۔

"اے محنت اٹھانے والو ! بوجھ سے دبے ہوئے لوگو اسب میرے پاس آؤ ، میں تمہیں آرام دوں گا کیونکہ میرا جُوا ملائم ہے اور میرا بوجھ ہلکا"

(متی ۱۱ : ۲۸-۳۰)

شاید حکومتِ الٰہیہ کا مینی فسٹو اس سے زیادہ مختصر اور پُر اثر الفاظ میں مرتب نہیں کیا جا سکتا۔ انسان پر انسانی حکومت کا جُوا بڑا ہی سخت اور بڑا ہی بوجھل ہے۔ اس بوجھ تلے دبے ہوئے لوگوں کو الٰہی حکومت کا نقیب جو پیغام دے سکتا ہے وہ یہی ہے کہ جس حکومت کا جوا میں تمہارے اوپر رکھنا چاہتا ہوں وہ نرم بھی ہے اور خفیف بھی۔

"غیر قوموں کے بادشاہ اُن پر حکومت چلاتے ہیں۔ اور جو اُن پر اختیار رکھتے ہیں وہ خداوند نعمت کہلاتے ہیں۔ مگر تم ایسے نہ ہونا بلکہ جو تم میں بڑا ہے وہ چھوٹے کے مانند اور جو سردار ہے وہ خدمت کرنے والے کے مانند ہے۔" (لوقا ۲۲ : ۲۵-۲۶)

مسیح علیہ السلام یہ ہدایت اپنے حواریوں (یعنی صحابیوں) کو فرماتے تھے۔ اس مضمون کے متعدد اقوال انجیلوں میں موجود ہیں۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ کہیں فرعونوں اور نمرودوں کو ہٹا کر تم خود فرعون و نمرود نہ بن جانا۔

"فقیہ اور فریسی[1] موسیٰ کی گدی پر بیٹھے ہیں۔ پس جو کچھ وہ تمہیں بتائیں وہ سب کرو اور مانو لیکن اُن کے سے کام نہ کرو۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں اور کرتے نہیں۔ وہ ایسے بھاری بوجھ جن کا اٹھانا مشکل ہے، باندھ کر لوگوں کے کندھوں پر رکھتے ہیں مگر آپ انہیں اپنی اُنگلی سے بھی ہلانا نہیں چاہتے۔ وہ اپنے سب کام لوگوں کے دکھانے کو کرتے ہیں۔ اپنے تعویذ بڑے بناتے اور اپنی پوشاک کے کنارے چوڑے رکھتے اور ضیافتوں میں صدر نشینی اور عبادت خانوں میں اعلیٰ درجہ کی کرسیاں اور بازاروں میں سلام اور آدمیوں سے رَبی کہلانا پسند کرتے ہیں۔"

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو نہ آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔"

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ ایک مرید کرنے کے لیے تری اور خشکی کا دَورہ کرتے ہو اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے سے دوگنا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو۔"

"اے اندھے راہ بتانے والو! تم مچھر کو تو چھانتے ہو اور اونٹ کو نگل جاتے ہو۔"

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے، تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کے مانند ہو جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مُردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوئے ہو۔" (متی ۲۳: ۲-۲۸)

---

[1] فریسی سے مراد حاملانِ شریعت ہیں۔ (قدیم)

پر اُس وقت کے علماء اور حاملانِ شریعت کا حال تھا۔ وہ علم رکھنے کے باوجود محض بندگیٔ نفس کی وجہ سے آپ بھی گمراہ تھے اور عام لوگوں کو بھی گمراہ کر رہے تھے اور اس انقلاب کے راستہ میں روڑی تیا صرو سے بڑھ کر وہی حائل تھے۔

" اس وقت فریسیوں نے جا کر مشورہ کیا کہ اسے کیونکر باتوں میں پھنسائیں۔ پس انہوں نے اپنے شاگردوں کو ہیرودیوں[1] کے ساتھ اُس کے پاس بھیجا اور انہوں نے (یعنی شاگردوں نے) کہا کہ اے استاد ہم جانتے ہیں کہ تو سچا ہے اور سچائی سے خدا کی راہ کی تعلیم دیتا ہے اور کسی کی پروا نہیں کرتا ——— ہمیں بتا تو کیا سمجھتا ہے قیصر کو جزیہ دینا روا ہے یا نہیں؟ یسوع نے ان کی شرارت جان کر کہا اے ریاکارو! مجھے کیوں آزماتے ہو؟ جزیہ کا سکہ مجھے دکھاؤ۔ وہ دینار اس کے پاس لے آئے۔ اس نے ان سے کہا یہ صورت اور نام کس کا ہے؟ انہوں نے کہا قیصر کا۔ اس پر اس نے کہا جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو اور جو خدا کا ہے خدا کو ادا کرو۔"

(متی ۲۲: ۱۵-۲۱)

اس قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ ایک چال تھی۔ فریسی اس تحریک کو ختم کرنے کے لیے چاہتے تھے کہ حضرت مسیح کا قبل از وقت حکومت سے تصادم کرا دیا جاتے اور تحریک کے جڑ پکڑنے سے پہلے حکومت کے زور سے اُسے کچلوا ڈالا جاتے۔ اسی لیے ہیرودی ریاست کی سی آئی ڈی کے سامنے یہ سوال اُٹھایا گیا کہ قیصر کو ٹیکس دیا جائے یا نہیں۔ جواب میں حضرت مسیح علیہ السلام نے جو ذومعنی بات کہی اس کو دو ہزار برس سے مسیحی اور غیر مسیحی سب اس معنی میں لے رہے ہیں کہ عبادت خدا کی کرو اور اطاعت ہر اُس

---

[1] مسیح علیہ السلام کے زمانے میں فلسطین کے ایک حصہ میں ہندوستان کی دیسی ریاستوں کی طرح ایک یہودی ریاست قائم تھی جو سلطنت روم کی تابع فرمان تھی۔ اس کے بانی ہیرود کے نام پر اس کو عموماً ہیرودی ریاست کہتے تھے۔ ہیرودیوں سے مراد اس ریاست کی پولیس یا سی آئی ڈی کے آدمی ہیں۔ (قدیم)

حکومت کی کرتے رہو جو تمہارے زمانہ میں موجود ہو۔ لیکن دراصل مسیح علیہ السّلام نے نہ تو یہ فرمایا کہ قیصر کو ٹیکس دینا روا ہے، کیونکہ ایسا کہنا اُن کی دعوت کے خلاف تھا، اور نہ یہ فرمایا کہ اُسے ٹیکس نہ دیا جائے، کیونکہ اُس وقت تک اِن کی تحریک اِس مرحلہ تک نہیں پہنچی تھی کہ ٹیکس روکنے کا حکم دیا جاتا، اس لیے انہوں نے یہ لطیف بات کہہ دی کہ قیصر کا نام اور اس کی صورت تو قیصر ہی کو واپس کردو، اور سونا جو خدا نے پیدا کیا ہے وہ خدا کی راہ میں صرف کردو۔

اس سازش میں ناکام ہونے کے بعد فریسیوں نے خود مسیح علیہ السّلام کے حواریوں میں سے ایک کو رشوت دے کر اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ کسی ایسے موقع پر مسیحؑ کو گرفتار کرائے جب کہ عام بلوے کا خطرہ نہ ہو۔ چنانچہ یہ تدبیر کارگر ہوئی اور یہوداہ سکریوتی نے مسیحؑ کو پکڑوا دیا۔

"پھر اُن کی ساری جماعت اُٹھ کر اسے پیلاطس (رومی حاکم) کے پاس لے گئی اور اُنہوں نے الزام لگانا شروع کیا کہ اِسے ہم نے اپنی قوم کو بہکاتے اور قیصر کو خراج دینے سے منع کرتے اور اپنے آپ کو مسیح بادشاہ کہتے پایا ـــــــ پیلاطس نے سردار کاہنوں اور عام لوگوں سے کہا کہ میں اس شخص میں کوئی قصور نہیں پاتا۔ مگر وہ اور بھی زور دے کر کہنے لگے کہ یہ تمام یہودیہ میں بلکہ گلیل سے لے کر یہاں تک لوگوں کو سکھا سکھا کر اُبھارتا ہے ـــــــ وہ چلّا چلّا کر سر ہوتے رہے کہ اسے صلیب دی جائے اور اُن کا چلّانا کارگر ہوا۔"

(لوقا ۲۳ : ۱ - ۲۳)

اس طرح دنیا میں حضرت مسیح علیہ السّلام کا مشن اُن لوگوں کی بدولت ختم ہوا جو اپنے آپ کو حضرت موسیٰ علیہ السّلام کا وارث کہتے تھے۔ تاریخی شواہد کی رُو سے حضرت مسیح علیہ السّلام کی نبوّت کا کُل زمانہ ڈیڑھ سال اور تین سال کے درمیان رہا ہے۔ اِس مختصر مدّت میں اُنہوں نے اُتنا ہی کام کیا جتنا حضرت محمّد صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی مکّی زندگی

کے ابتدائی دو تین سال میں کیا تھا۔ اگر کوئی شخص انجیل کی مذکورۂ بالا آیات کا مقابلہ قرآن مجید کی مکی سورتوں اور زمانۂ قیام مکہ کی احادیث سے کرے گا تو دونوں میں بڑی مماثلت پائے گا۔

ایک صالح جماعت کی ضرورت

دنیا میں اس وقت بڑے زور کے ساتھ توڑ پھوڑ کا عمل جاری ہے[1] ۔ یہ ہم نہیں جانتے کہ اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا۔ (الجن۔ آیت ۱۰) اہلِ زمین کو محض ان کے کرتوتوں کی سزا ہی دینے کا ارادہ کیا گیا ہے یا اس توڑ پھوڑ کے بعد کوئی صالح چیز بھی بننے والی ہے ۔ مگر ظاہر آثار سے اتنا محسوس ہوتا ہے کہ نوعِ انسانی کی امامت اب تک جس تہذیب کے علمبرداروں کو حاصل رہی ہے ، اس کی عمر پوری ہو چکی ہے ، اُن کے امتحان کا زمانہ خاتمہ پر لگا ہے ، اور سنت اللہ کے مطابق اب وقت آگیا ہے کہ اُن کو اور اُن کی اس جاہلی تہذیب کو دنیا کے انتظام سے بے دخل کر دیا جائے ۔ اُن کو زمین پر کام کرنے کا جتنا موقع ملنا تھا ، مل چکا ۔ وہ اپنے تمام اوصاف اور اپنی تمام چھپی ہوئی قابلیتوں کا پورا پورا مظاہرہ کر چکے ہیں ۔ ان کے اندر شاید اب کوئی چیز ایسی باقی نہیں رہی ہے جو باہر نہ آچکی ہو ۔ لہٰذا غالب گمان یہی ہے کہ عنقریب وہ میدان سے ہٹائے جانے والے ہیں ، اور یہ زبردست شکست و ریخت اسی لیے ہو رہی ہے کہ وہ خود اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے مراسم تجہیز و تدفین ادا کر دیں ۔ اس کے بعد یہ بھی ممکن ہے کہ دنیا میں پھر ایک

---

[1] اشارہ ہے دوسری جنگِ عظیم کی طرف جو اُس وقت پوری شدت کے ساتھ چل رہی تھی ۔ (جدید)

ظلمت کا دور شروع ہو جس طرح آخری اسلامی تحریک کے زوال اور موجودہ جاہلی تہذیب کی پیدائش کے درمیان گزر چکا ہے ، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسی ٹوٹ پھوٹ کے دوران میں کسی نئی تعمیر کی صورت نکل آئے ۔

سرمایہ دارانہ جمہوریت ، قومی اجتماعیت (نیشنل سوشلزم) اور اشتراکیت (کمیونزم) کی جو طاقتیں اِس وقت آپس میں متصادم ہیں یہ در اصل الگ الگ تہذیبیں نہیں ہیں کہ ان کے درمیان انتخاب ، اور ان میں سے بہتر کے باقی رہنے کا کوئی سوال ہو۔ حقیقت میں یہ ایک ہی تہذیب کی تین شاخیں ہیں ۔ ایک ہی تصوّرِ کائنات ، ایک ہی تصوّرِ انسان ، ایک ہی نظریۂ حیات اور ایک ہی اساسِ اخلاق ہے جس پر ان تینوں کی تعمیر ہوتی ہے ۔ انسان کو حیوان سمجھنا ، دنیا کو بے خدا فرض کرنا ، علوم طبیعی سے انسانی زندگی کا قانون اخذ کرنا ، اور اخلاق کی بنیاد تجربہ و مصلحت اور خواہشات پر رکھنا ، یہ ان سب کی مشترک بنیاد ہے ۔ ان کے درمیان فرق صرف اس حیثیت سے ہے کہ اس جاہلی تہذیب نے سب سے پہلے فرد کی آزادی اور قوموں کی انفرادیت کا بیج بویا تھا جس سے قومی ریاستوں کے ساتھ سرمایہ دارانہ جمہوریت پیدا ہوتی اور مدّت ہائے دراز تک انسانیت کو تباہ و برباد کرتی رہی ۔ پھر جب اُس کے ظلم و ستم سے انسانی مصائب حد کو پہنچ گئے تو اسی تہذیب نے اشتراکی انقلاب کو بطورِ علاج پیش کیا ۔ مگر بہت جلدی ظاہر ہو گیا کہ یہ علاج اصل مرض سے بھی زیادہ تباہ کُن ہے ۔ آخر کار وہی تہذیب پھر ایک دوسری تجویز سامنے لائی جس کا نام فاشزم یا نیشنل سوشلزم ہے اور چند سال کے تجربہ نے ثابت کر دیا کہ اس ام الخبائث کا یہ آخری بچہ فتنہ انگیزی و شر باری میں پہلے دونوں برخورداروں سے بھی بازی لے گیا ہے ۔

اب دنیا کے لیے اُس تہذیب کو اور زیادہ آزمانے کا کوئی موقع باقی نہیں رہا ہے جو آدمی کو جانور سمجھ کر اور اُس جانور کو بے لگام فرض کر کے اپنا کام شروع کرتی ہے اور اس کے اندر جوع البقر سے لے کر بدترین قسم کی درندگی تک ہر وہ بیماری پیدا کر دیتی ہے جو آدمیت کے حق میں نہایت مہلک ہے ۔ در حقیقت یہ پوری تہذیب اپنی تمام

شاخوں سمیت عمرِ طبیعی کو پہنچ چکی ہے، امتحان کی مدت ختم کر چکی ہے، اس کے پاس اب کوئی اور "لٹریچر" ایسا باقی نہیں رہا ہے جس کو یہ انسانی مسائل کے حل کی حیثیت سے پیش کر سکے۔ اور بالفرض اگر یہ اپنی زندگی کی مہلت بڑھانے کے لیے کسی اور "ازم" کی تخلیق کا بہانہ کرے بھی تو خدا کی مشیت اب یہ نہیں معلوم ہوتی کہ وہ اِسے اپنی زمین کو فساد سے بھرنے کا کوئی اور موقع دے گا۔ بہت ممکن ہے کہ موجودہ [illegible] کے بعد اس کی شاخوں میں سے کوئی شاخ باقی رہ جائے، مگر یقیناً اس کا بقاء عارضی ہوگا، جلدی ہی وہ شاخ خود چیخ کر اپنے اندر سے آگ جھاڑے گی اور آپ اپنی ہی آگ سے جل کر خاکستر ہو جائے گی۔

اب رہا یہ سوال کہ آیا اس تہذیب کی تباہی کے بعد دنیا میں پھر کوئی ظلمت کا دور آنا ہے یا کوئی نئی تعمیر شروع ہوتی ہے، تو اس کا فیصلہ دو چیزوں پر منحصر ہے۔

ایک یہ کہ جاہلیتِ خالصہ کی ناکامی کے بعد کوئی اور ایسا نظریہ انسان کو ملتا ہے یا نہیں جو پچھلے فاسد نظریوں سے بہتر ہو، جس سے انسانی عقل صلاح کی توقعات وابستہ کر سکے اور جس پر ایک جاندار اور طاقت ور تہذیب قائم ہو سکے۔

دوسرے یہ کہ نوعِ انسانی میں سے کوئی ایسا گروہ اٹھتا ہے یا نہیں جس کے اندر جہاد اور اجتہاد کی وہ صلاحیتیں اور قوتیں ہوں جو ایک نئے نظریے پر ایک نئی تہذیب کا قصر تعمیر کرنے کے لیے ضروری ہیں، اور جس کے اخلاق و اوصاف ان لوگوں سے مختلف ہوں جن کی خباثت و شرارت کا ابھی قریب ہی میں انسان کو تجربہ ہو چکا ہے۔

اگر ایسا کوئی نظریہ بروقت سامنے آجائے اور اس کو لے کر ایسی ایک صالح جماعت اُٹھ کھڑی ہو تو یقیناً نوعِ انسانی ایک دوسرے دَورِ ظلمت (Dark Age) سے بچ سکتی ہے، ورنہ کوئی قوت اس کو اِس تاریک گڑھے میں گرنے سے نہیں بچا سکتی۔ یہ صدمۂ عظیم جس سے انسانیت اس وقت دوچار ہے، یہ بھیڑیوں سے بدتر سلوک جو اس وقت آدمی آدمی کے ساتھ کر رہا ہے، یہ بے دردی و سنگدلی جو کبھی دَورِ وحشت میں بھی آدمی سے ظاہر نہیں ہوتی تھی، یہ بے رحمی و قساوت جس کی نظیر درندہ جانور بھی پیش کرنے سے عاجز ہیں، یہ علم و حکمت کے نتائج جو آج جہاں سوز طیاروں اور انسان پاش ٹینکوں

کی شکل میں دیکھے جا رہے ہیں، یہ تنظیمی قابلیتوں کے ثمرات جنہوں نے آج غارت گر
فوجوں کی صورت اختیار کی ہے، یہ صنعتی ترقی کے پھل جو آج آلاتِ جنگ کی بھیانک
شکل میں نمودار ہو رہے ہیں، یہ وسائل نشر و اشاعت کا کمال جس سے آج دنیا میں جھوٹ
پھیلانے اور قوموں میں منافرت کے بیج بونے کا کام لیا جا رہا ہے، یہ سب کچھ انسان کا دل توڑ
دینے اور اس کو اپنے آپ سے اور اپنی ساری قابلیتوں اور صلاحیتوں سے مایوس کر دینے
کے لیے بالکل کافی ہے، اور اس کا فطری نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ نوعِ انسانی دل شکستہ اور مایوس
ہو کر صدیوں کے لیے نیند اور بے ہوشی کی حالت میں مبتلا ہو جاتے۔

جیسا کہ اوپر بیان کر چکا ہوں انسانیت کو اس دردناک انجام سے اگر کوئی چیز بچا
سکتی ہے تو وہ صرف ایک صالح نظریہ اور ایک صالح جماعت کا برسرِ کار آنا ہے۔

مگر وہ کونسا نظریہ ہو سکتا ہے جس کے لیے آج کامیابی کا کوئی موقع ہو؟

مشرکانہ جاہلیت جس پر دنیا کی بہت سی قدیم تہذیبیں قائم ہوئی تھیں، اب اس
کے احیاء کا کوئی امکان نہیں۔ شرک کی جڑ بنیاد کٹ چکی ہے۔ جاہل عوام پر چاہے اس کا
تسلط ابھی باقی ہو، مگر علم و عقل رکھنے والے لوگ اب اس وہم میں مبتلا نہیں ہو سکتے کہ کائنات
کے نظام کو بہت سے خدا چلا رہے ہیں اور انسانی فلاح و سعادت کا سررشتہ دیوتاؤں
یا روحوں سے وابستہ ہے۔ علاوہ بریں یہ حقیقت ہے کہ مشرکانہ نظریہ سے انسانی زندگی
کے پیچیدہ مسائل حل نہیں ہوتے بلکہ یہ پیچیدگیاں کچھ اور بڑھ جاتی ہیں۔ سب سے بڑی
مشکل جس نے اس وقت دنیا کو پریشان کر رکھا ہے نوعِ انسانی میں وحدت کا فقدان
ہے۔ مگر شرک اس مشکل کو حل نہیں کرتا، بلکہ وحدت پیدا کرنے کے بجائے مزید تفریق و تقسیم
کے اسباب فراہم کرتا ہے۔ لہٰذا کسی مشرکانہ نظریہ کے لیے آج دنیا میں برسرِ اقتدار آنے
کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

راہبانہ جاہلیت دنیا میں کبھی کوئی طاقت نہ تھی نہ بن سکتی ہے۔ گرما اور تناسخ اور
اہنسا اور ہمہ اوست کے نظریات، جو روح کو سرد اور ہمتوں کو پست اور قوائے فکر کو
افیونِ تخیل کی پینک میں مست کر دینے والے ہیں، اپنے اندر اتنی جان ہی نہیں رکھتے کہ ان

کے بل پر کوئی ایسی تہذیب پیدا ہو سکے جو زمین کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہو اور دنیا
کی امامت و پیشوائی کے منصبِ جلیل پر فائز ہو سکتی ہو۔ کوئی ساحر ہی اِس تنِ مردہ میں رُوح
پھونکنے کی جتنی چاہے کوشش کر دیکھے، یہ نظریات کبھی گیان، تیاگ اور تپسیا کے مقام
سے آگے بڑھ کر ایک صالح تمدن کی تخلیق اور ایک عادل مملکت کی تاسیس اور ایک درخشاں
تہذیب کی تعمیر تک نہیں پہنچ سکتے۔ لہٰذا مردہ اور رو بزوال قومیں تو ان نظریات کے چکر
میں پڑی رہ سکتی ہیں مگر کسی زندہ اور اُبھرنے والی قوم کے تخیل کو یہ کبھی اپنی طرف نہیں کھینچ
سکیں گے۔

رہی جاہلیتِ خالصہ تو اس کا اور اس کی پیداوار کا اب دنیا کو اتنا کافی تجربہ ہو چکا
ہے کہ عنقریب وہ اس سے مایوس ہونے والی ہے۔ انسان کا اپنے آپ کو جانور فرض
کرنا، جانوروں کی زندگی سے تنازع للبقاء اور انتخابِ طبعی اور بقائے اصلح کا قانون اپنے
لیے اخذ کرنا، مادّی فوائد اور لذتوں کو مقصودِ حیات ٹھیرانا، تجربات اور مصالح کو اخلاق کا ماخذ
قرار دینا، اور کسی فوق الانسانی اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم نہ کرنا، جو کچھ نتائج پیدا کر سکتا تھا وہ سب اپنی
تمام تلخیوں کے ساتھ سامنے آ چکے ہیں۔ ان نظریات کی بدولت انسان کو جو کچھ ملا ہے وہ قومی
اور نسلی تعصبات ہیں، رنگ و نسل کی برتری کے دعوے ہیں، قومی ریاستوں کی معاشی و
سیاسی رقابتیں ہیں، قیصریت اور استعمار اور معاشی لوٹ کے فتنے ہیں، افراد سے لے کر
بڑی بڑی قوموں اور سلطنتوں تک کا اپنے معاملات میں ہر اخلاقی قید سے آزاد ہو جانا ہے،
اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انسان کا واقعی جانور بن کر کام کرنا اور دوسرے انسانوں کے ساتھ
جانوروں کا سا بلکہ بے روح مشینوں کا سا سلوک کرنا ہے۔ یہ نظریات اگر جمہوریت پیدا
کرتے ہیں تو ایسی جس میں افراد کو ظلم اور کسبِ حرام اور فحش اور بے حیائی کی آزادی ملتی ہے۔
اور اگر اشتراکیت یا اجتماعیت پیدا کرتے ہیں تو ایسی جس میں افراد کو بھیڑ بکریوں کے گلّے
کی طرح ایک ڈکٹیٹر یا ایک چھوٹی سی پارٹی کے حوالے کر دیا جاتا ہے تاکہ وہ انہیں جس طرح
چاہے ہانکے اور اُن کا جو جی چاہے بنائے۔ یہ پھل جو ان نظریات سے پیدا ہوتے ہیں،
کسی اتفاقی غلطی کا نتیجہ نہیں ہیں، بلکہ اس شجرِ خبیث کی عین فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ اس

سے یہ پھل پیدا ہوں۔ لہٰذا جس طرح اب تک انسان اس سے کسی قسم کی فلاح نہیں پا سکا ہے اسی طرح آئندہ بھی یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ انسانیت کے اِس حیوانی تصور اور کائنات کے اِس مادہ پرستانہ نظریے اور اخلاق کی اس تجربی اور مصلحت پرستانہ بنیاد پر کوئی ایسا اجتماعی مسلک پیدا ہو سکے گا جو انسان کے لیے موجبِ فلاح ہو۔

ان سب نظریات کی ناکامی کے بعد دنیا اگر کسی نظریہ سے فلاح کی امیدیں وابستہ کر سکتی ہے تو وہ صرف ایک ایسا نظریہ ہی ہو سکتا ہے:

جو انسان کو انسان قرار دے نہ کہ جانور، جو اپنی ذات کے متعلق انسان کی رائے کو بہتر بنائے، جس کا تصورِ انسانیت مغربی سائنس کے "تصورِ حیوانی" اور مسیحیت کے "پیدائشی گنہگار" اور ہندو مت کے "مجبورِ تناسخ" سے بلند تر ہو،

جو انسان کو مختارِ مطلق اور شترِ بے مہار نہ بنائے بلکہ اسے سُلطانِ کائنات کے اقتدارِ اعلیٰ کا تابع قرار دے اور اس کے آگے ذمّہ دار و جوابدہ ٹھیرائے،

جو اخلاق کے ایک ایسے قابلِ عمل ضابطے کا انسان کو پابند بنائے جس میں اپنی خواہشات کے مطابق ردّ و بدل کرنے کا حق اُس کو نہ ہو،

جو مادّی بنیادوں پر انسانیت کو تقسیم کرنے کے بجائے ایک ایسی اخلاقی و روحانی بنیاد فراہم کرے جس پر انسانیت متحد ہو سکتی ہو،

جو اجتماعی زندگی کے لیے ایسے اصول انسان کو دے جن پر افراد اور جماعتوں اور قوموں کے درمیان صحیح اور متوازن عدل قائم ہو سکے،

جو زندگی کے نفس پرستانہ مقاصد سے بلند تر مقاصد اور قدر و قیمت کے مادہ پرستانہ معیاروں سے بہتر معیار انسان کو دے،

اور ان سب خصوصیات کے ساتھ جو علمی و عقلی اور تمدنی ارتقاء میں انسان کی صرف مدد ہی نہ کرے بلکہ صحیح رہنمائی بھی کرے اور مادّی و اخلاقی، ہر دو حیثیتوں سے اسے ترقی کی طرف لے جائے۔

ایسا ایک نظریہ اسلام کے سوا دنیا میں اور کونسا ہے؟ لہٰذا یہ کہنا بالکل حق بجانب ہے

کہ اب انسانیت کا مستقبل اسلام پر منحصر ہے۔ انسان کے اپنے بنائے ہوئے تمام نظریات ناکام ہو چکے ہیں۔ ان میں سے کسی کے لیے کامیابی کا اب کوئی موقع نہیں۔ اور انسان میں اب اتنی ہمت بھی نہیں ہے کہ پھر کسی نظریہ کی تصنیف اور اس کی آزمائش پہ اپنی قسمت کی بازی لگا سکے۔ اس حالت میں صرف اسلام ایک ایسا نظریہ و مسلک ہے جس سے انسان فلاح کی توقعات وابستہ کر سکتا ہے، جس کے نوعِ انسانی کا دین بن جانے کا امکان ہے، اور جس کی پیروی اختیار کر کے انسان کی تباہی ٹل سکتی ہے۔

لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ دنیا بس مفتوح ہونے کے لیے تیار بیٹھی ہے، اسلام کی خوبیوں پر ایک وعظ اور اس پر ایمان لانے کے لیے ایک دعوت نامہ شائع ہونے کی دیر ہے، پھر ایشیا، یورپ، افریقہ، امریکہ سب مسخر ہوتے چلے جائیں گے۔ ایک تہذیب کا سقوط اس طرح اچانک نہیں ہوا کرتا کہ کل تھی اور آج ناپید ہو گئی۔ اور دوسری تہذیب کا قیام بھی اس طرح واقع نہیں ہوتا کہ آج چٹیل میدان ہے اور کل کسی منتر کے زور سے ایک عالیشان قصر بن کھڑا ہو۔ گرنے والی تہذیب کے افکار، اصول، طریقے، مدتہائے دراز تک دلوں اور دماغوں پر، علوم و آداب پر، اور تمدن و معاشرت پر اپنا اثر جمائے رہتے ہیں۔ اس اثر کا استیصال خود بخود نہیں ہو جاتا، کرنے سے ہوتا ہے۔ اسی طرح گرنے والی تہذیب کے علمبردار بھی زوال پذیر ہونے کے باوجود سالہا سال تک زمین پر قبضہ جمائے رہتے ہیں۔ وہ خود جگہ چھوڑ کر نہیں ہٹ جاتے، ہٹانے سے ہٹتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس نئی تہذیب پر نئی عمارت بنانا بھی کوئی کھیل نہیں ہے کہ آپ سہولت سے بیٹھے رہیں اور وہ خود بن جائے۔ اس کام کے لیے ایک زبردست تنقیدی، تخریبی اور تعمیری تحریک کی ضرورت ہے جو ایک طرف علم و فکر کی طاقت سے پرانی تہذیب کی جڑیں اکھاڑ دے اور دوسری طرف علوم و فنون و آداب کو اپنی مخصوص فکری بنیادوں پر از سرِ نو مدوّن کرے، حتّٰی کہ ذہنی دنیا پر اس طرح چھا جائے کہ لوگ اسی کے طرز پر سوچنا اور محسوس کرنا شروع کر دیں۔ ایک طرف ان پرانے سانچوں کو ڈھائے جن میں انسانیت ڈھلا کرتی تھی اور دوسری طرف نئے سانچے تیار کرے جن میں نئے اخلاق اور نئی سیرتوں کے آدمی ڈھلنے لگیں۔ ایک طرف پرانے نظامِ تمدن و

سیاست کو بزور مٹاتے اور دوسری طرف ایک پورا نظامِ تمدن و سیاست اپنے اصولوں پر عملاً قائم کر دیتے۔

پس دنیا کو آئندہ دَورِ ظلمت کے خطرے سے بچانے اور اسلام کی نعمت سے بہرہ ور کرنے کے لیے صرف اتنی بات کافی نہیں ہے کہ یہاں صحیح نظریہ موجود ہے۔ صحیح نظریے کے ساتھ ایک صالح جماعت کی بھی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ایسے لوگ درکار ہیں جو اس نظریہ پر سچا ایمان رکھتے ہوں۔ اُن کو سب سے پہلے اپنے ایمان کا ثبوت دینا ہوگا اور وہ صرف اسی طرح دیا جا سکتا ہے کہ وہ جس اقتدار کو تسلیم کرتے ہیں اُس کے خود مطیع بنیں جس ضابطے پر ایمان لاتے ہیں اس کے خود پابند ہوں، جس اخلاق کو صحیح کہتے ہیں اُس کا خود نمونہ بنیں، جس چیز کو فرض کہتے ہیں اس کا خود التزام کریں، اور جس چیز کو حرام کہتے ہیں اُسے خود چھوڑیں۔ اس کے بغیر تو اُن کی صداقت آپ ہی مشتبہ ہو گی کجا کہ کوئی ان کے آگے سر تسلیم خم کرے۔ پھر اُن کو اِس فاسد نظامِ تہذیب و تمدن و سیاست کے خلاف عملاً بغاوت کرنی ہوگی، اُس سے اور اس کے پیروؤں سے تعلق توڑنا ہوگا، اُن تمام فائدوں، لذتوں، آسائشوں اور اُمیدوں کو چھوڑنا ہوگا جو اس نظام سے وابستہ ہوں، اور رفتہ رفتہ اُن تمام نقصانات، تکلیفوں اور مصیبتوں کو برداشت کرنا ہوگا جو نظامِ غالب کے خلاف بغاوت کرنے کا لازمی نتیجہ ہیں۔ پھر انہیں وہ سب کچھ کرنا ہوگا جو ایک فاسد نظام کے تسلط کو مٹانے اور ایک صحیح نظام قائم کرنے کے لیے ضروری ہے۔ اس انقلاب کی جدوجہد میں اپنا مال بھی قربان کرنا ہوگا، اپنے اوقاتِ عزیز بھی صرف کرنے پڑیں گے، اپنے دل و دماغ اور جسم کی ساری قوتوں سے بھی کام لینا پڑے گا، اور قید اور جلاوطنی اور ضبطِ اموال اور تباہیِ اہل و عیال کے خطرات بھی سہنے ہوں گے، اور وقت پڑے تو جانیں بھی دینی پڑیں گی۔ ان راہوں سے گزرے بغیر دنیا میں نہ کبھی کوئی انقلاب ہوا ہے نہ اب ہو سکتا ہے۔ ایک صحیح نظریہ کی پشت پر ایسے صادق الایمان لوگوں کی جماعت جب تک نہ ہو، محض نظریہ، خواہ وہ کتنا ہی بلند پایہ ہو، کتابوں کے صفحات سے منتقل ہو کر ٹھوس زمین میں کبھی جڑ نہیں پکڑ سکتا۔ نظریہ کی کامیابی کے لیے خود اس کے اصولوں کی

طاقت جس قدر ضروری ہے، اُسی قدر اُن انسانوں کی سیرت، اُن کے عمل اور اُن کی قربانی و سرفروشی کی طاقت بھی ضروری ہے جو اس پر ایمان رکھتے ہوں۔ زراعت کے طریقہ کی درستی، بیج کی صلاحیت، موسم کی موافقت، سب اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں، مگر زمین اِتنی حقیقت پسند ہے کہ جب تک کسان اپنے صبر سے، اپنی محنت سے، اپنے بہتے ہوئے پسینہ سے، اور اپنی جفاکشی سے اُس پر اپنا حق ثابت نہیں کر دیتا، وہ لہلہاتی ہوئی کھیتی اُگلنے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔

اگرچہ خلوصِ ایمان اور قربانی و جانفشانی ہر دین کے قیام کے لیے ناگزیر ہے، خواہ وہ دینِ حق ہو یا دینِ باطل، مگر دینِ حق اُس سے بہت زیادہ اخلاص اور قربانی مانگتا ہے جو دینِ باطل کے قیام کے لیے درکار ہے۔ حق ایک ایسا باریک بین صراف ہے جو ذرا سی کھوٹ کو بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ وہ خالص سونا چاہتا ہے۔ آزمائشوں کی بھٹی میں سے گزر کر جب تک ساری کھوٹ جل نہ جائے اور پورے عیار (Standard) کا کُندن نکل نہ آئے وہ اپنے نام سے اُس کو بازار میں لانے کی ذمہ داری لینا پسند نہیں کرتا، کیونکہ وہ حق ہے، باطل نہیں ہے کہ کھوٹے سکّے اور مُلمّع کیے ہوئے زیور بیچتا پھرے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن بار بار کہتا ہے:

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۔ (آل عمران-آیت ۱۷۹)

"اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ ایمان لانے والوں کو اسی حالت پر چھوڑ دے جس پر تم لوگ اس وقت ہو (کہ مومن اور منافق سب خلط ملط ہیں) وہ نہ مانے گا جب تک کھوٹے کو کھرے سے الگ نہ کر دے۔"

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ۔ (عنکبوت-۲-۳)

"کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہہ دینے پر کہ ہم ایمان لائے،

چھوڑ دیئے جائیں گے اور انہیں آزمائش کی بھٹی میں تپایا نہ جائے گا؟ حالانکہ ان سے پہلے جو گزر چکے ہیں (یعنی جنہوں نے بھی ایمان لانے کا دعویٰ کیا ہے) ان سب کو ہم نے تپایا ہے، پس ضرور ہے کہ اللہ دیکھے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون؟"

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ۔ (بقرہ: ۲۱۴)

"کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ جنت کا داخلہ تمہیں مل جائے گا حالانکہ ابھی تم پر وہ کیفیت تو گزری ہی نہیں جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکی ہے؟ ان پر سختیاں اور مصیبتیں آئیں اور وہ ہلا مارے گئے حتیٰ کہ رسول اور اس کے ساتھی اہلِ ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟"

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً۔ (توبہ: ۱۶)

"کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم یونہی چھوڑ دیئے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون ایسے ہیں جنہوں نے سعی و جہد کا حق ادا کیا اور اللہ اور رسول اور اہلِ ایمان کے سوا کسی سے قلبی تعلق نہ رکھا۔"

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ، وَلَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ، اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ، وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ

(العنکبوت - ۱۰-۱۱)

"اور لوگوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے مگر جب

اللہ کی راہ میں انہیں ستایا گیا تو انسانوں کی ایذا سے ایسے ڈرے جیسے اللہ کے عذاب سے ڈرنا چاہیئے۔ اور اگر تیرے رب کی طرف سے فتح نصیب ہو جاتے تو یہی لوگ آکر کہیں گے کہ ہم تو تمہارے ہی ساتھ تھے۔ کیا اللہ اہلِ دنیا کے دلوں سے خوب واقف نہیں ہے؟ مگر ضرور ہے کہ اللہ یہ دیکھے کہ تم میں سے ایماندار کون ہیں اور منافق کون۔"

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ۔ (بقرہ۔ ۱۵۵۔ ۱۵۷)

"ہم ضرور تم کو خطرات اور فاقوں سے اور جان و مال اور کمائیوں کے نقصانات سے آزمائیں گے اور کامیابی کی بشارت دیدو اُن مستقل مزاج لوگوں کو جنہوں نے ہر مصیبت کی آمد پر کہا کہ ہم اللہ ہی کے ہیں اور آخر اسی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے۔ ایسے لوگوں پر ان کے رب کی طرف سے مہربانیاں ہیں اور رحمت ہے، اور یہی لوگ راہِ راست پانے والے ہیں۔"

قرآن یہ سب کچھ کہنے کے ساتھ اس حقیقت پر بھی متنبہ کر دیتا ہے کہ

وَلَوْ يَشَاءُ اللَّهُ لَانتَصَرَ مِنْهُمْ وَلَٰكِن لِّيَبْلُوَ بَعْضَكُم بِبَعْضٍ۔ (محمد۔ ۴)

"اللہ چاہتا تو خود ہی ان سے نمٹ لیتا، مگر وہ تم میں سے کچھ لوگوں کو کچھ لوگوں کے ذریعہ سے آزماتا ہے۔"

یعنی یہ نہ سمجھنا کہ اللہ اپنے باغیوں کی سرکوبی خود نہیں کر سکتا اس لیے تم سے مدد مانگتا ہے۔ نہیں، وہ اتنی زبردست طاقت رکھتا ہے کہ چاہے تو ایک اشارے میں اُن کو تباہ کر کے رکھ دے اور اپنے دین کو خود قائم کر دے، مگر اس نے یہ جہاد اور محنت و قربانی کا بار تم پر اس لیے

ڈالا ہے کہ وہ تم انسانوں کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں آزمانا چاہتا ہے۔ جب تک باطل پرستوں سے تمہارا تصادم نہ ہو، اور اس تصادم میں مصائب و شدائد اور خطرات، و مہالک پیش نہ آئیں، سچے اہلِ ایمان جھوٹے مدعیوں سے تمیز نہیں ہو سکتے، اور جب تک ناکارہ لوگوں میں سے کارآمد آدمی چھٹ کر الگ نہ ہو جائیں وہ جتھا نہیں بن سکتا جو خلافتِ الٰہیہ کی ذمہ داری سنبھالنے کا اہل ہو۔

لہٰذا آج دنیا کا مستقبل درحقیقت اس امر پر منحصر نہیں ہے کہ کوئی نظریۂ حق انسان کو ملتا ہے یا نہیں، کیونکہ نظریۂ حق تو موجود ہے، البتہ وہ اگر منحصر ہے تو اس امر پہ ہے کہ انسانوں میں سے کوئی ایسا گروہ اٹھتا ہے یا نہیں جو سچے ایمان دار، دُھن کے پکے اور اپنی ہر عزیز و محبوب چیز کو خدا کی راہ میں قربان کرنے والے لوگوں پر مشتمل ہو۔

ہم سے کہا جاتا ہے کہ ایسے لوگ بھلا اب کہاں مل سکتے ہیں؟ وہ تو بس ایک مبارک دَور میں پیدا ہوئے تھے اور پھر خالق نے اُس ماڈل کو ہمیشہ کے لیے منسوخ کر دیا۔ لیکن یہ محض ایک وہم ہے اور ایسا وہم اُنہی لوگوں کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے جنہیں خود اپنے آپ سے مایوسی ہے۔ دنیا میں ہر قابلیت اور صلاحیت کے آدمی ہر زمانہ میں پائے گئے ہیں اور پائے جاتے ہیں۔ جہاں منافقانہ خصوصیات رکھنے والے اور ضعیف الارادہ لوگ اور سہولت پسند اشخاص ہمیشہ پائے گئے ہیں اور آج بھی پائے جاتے ہیں، وہاں ایسے لوگ بھی ہر زمانہ میں موجود رہے ہیں اور آج بھی موجود ہیں جو کسی چیز پر ایمان لانے کے بعد اس کو سربلند کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا سکتے ہیں۔ آج آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ایک دو نہیں ہزاروں انسان ایسے ہیں جو ہٹلر اور جرمنی پر ایمان لاتے ہیں اور وہ اپنے اس ایمان کی خاطر ہوائی جہاز سے عین دشمن کے ملک میں جست لگاتے ہیں جہاں ان کو معلوم ہے کہ بے شمار شکاری اُن کی گھات میں لگے ہوئے ہیں۔ روس کا انقلاب جو ابھی چوبیس پچیس سال پہلے ہی کی بات ہے، اُس کی تاریخ آپ دیکھیے تو معلوم ہو گا کہ ہزارہا آدمی جو انقلابی نظریات پر ایمان رکھتے تھے، مسلسل نصف صدی تک ہر قسم کی قربانیاں دیتے رہے، سائبیریا کے جہنم میں بھیجے گئے، پھانسی پر چڑھائے گئے، جلاوطنی کی حالت میں برسوں مُلک

ملک کی خاک چھانتے پھرے، اپنی ذاتی خوش حالی کی تمام خواہشوں اور تمنّاؤں کا خون کیا، خانماں بربادی کو خود اپنے ہاتھوں مول لیا، اور یہ سب کچھ اُس وقت کیا جب کہ زار کی سلطنت کے مٹنے کا تصور بھی مشکل ہی کیا جا سکتا تھا۔ دُور نہ جائیے خود ہندوستان ہی کو دیکھ لیجیے۔ یہاں جو نوجوان اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتے کہ کشت و خون کے ذریعہ سے وہ اپنے ملک کو آزاد کرا سکیں گے انھوں نے اپنے مقصد کے پیچھے اپنی زندگیوں کو برباد کرنے اور خطرات کا مقابلہ کرنے میں کیا کسر اٹھا رکھی؟ کون سی ممکن التصور مصیبت ایسی تھی جسے انھوں نے برداشت نہ کیا ہو؟ قید خانوں میں شدید ترین اذیتیں اُٹھائیں، حبسِ دوام میں عمریں گزار دیں، پھانسی کے تختہ پر جانیں تک دے دیں۔ اس سے بحث نہیں کہ ان کے طریقے صحیح تھے یا غلط، مگر اس سے یہ تو ضرور ثابت ہوتا ہے کہ کسی مقصد پر ایمان لانے کے بعد اس کے لیے جان و مال اور شخصی امنگوں کی قربانی گوارا کرنے اور مصیبتیں سہنے کی صفت آج بھی انسانوں میں ناپید نہیں ہے۔ گاندھی جی کی سول نافرمانی ابھی حال ہی کی بات ہے۔ کیا اسی ہندوستان کے باشندوں میں ایسے لوگ موجود نہ تھے جنھوں نے لاٹھیاں کھائیں جیل گئے اور مالی نقصانات برداشت کیے؟ کیا باردولی کے کسانوں نے اپنی زمینوں، اپنے جانوروں اور اپنے گھروں کے برتنوں تک کی قُرقی اور نیلامی کو صبر کے ساتھ برداشت نہیں کیا؟ پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ آج ایثار و قربانی کی وہ صفات انسانوں میں مفقود ہیں جو پہلے لوگوں میں پائی جاتی تھیں؟ اگر ہٹلر اور مارکس اور گاندھی پر ایمان لا کر انسان یہ سب کچھ کر سکتا ہے، تو کیا خدا پر ایمان لا کر کچھ نہیں کر سکتا؟ اگر خاکِ وطن میں اتنی کشش ہے کہ اس کے لیے آدمی جان و مال کی قربانی گوارا کر سکتا ہے تو کیا خدا کی رضا اور اس کے تقرب میں اتنی کشش بھی نہیں ہے؟ پس جو لوگ خود پست ہمت اور ضعیف الارادہ ہیں انھیں یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ اس کارِ عظیم کے لیے جن اولوالعزم انسانوں کی ضرورت ہے وہ کہیں مل ہی نہیں سکتے۔ البتہ اپنی ذات کی حد تک وہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ "جاؤ تم اور تمہارا رب دونوں لڑیں اور ہم یہاں بیٹھے ہیں" (المائدہ-۲۴)

(ترجمان القرآن- اپریل ۱۹۴۱ء[1])

---

[1] واضح رہے کہ اس مضمون کی اشاعت کے ۴ مہینے بعد ۲۶ اگست ۱۹۴۱ء کو جماعت اسلامی کا قیام عمل میں آیا۔ (جدید)

اضافی

مطالبۂ پاکستان کو

یہود کے مطالبہ "قومی وطن" سے تشبیہ دینا غلط ہے

سوال: "ہمارا عقیدہ ہے کہ مسلمان آدم علیہ السلام کی خلافت ارضی کا وارث ہے۔ مسلمان کی زندگی کا مقصد صرف اللہ پاک کی رضا اور اس کے مقدس قانون پر چلنا اور دوسروں کو چلنے کی ترغیب دینا ہے۔ اس لیے اس کا فطری نصب العین یہ قرار پاتا ہے کہ سارے عالم کو قانونِ الٰہیہ کے آگے مفتوح کر دے۔ لیکن مسٹر جناح اور ہمارے دوسرے مسلم لیگی بھائی پاکستان چاہتے ہیں، ہندوستان کی زمین کا ایک گوشہ! تاکہ ان کے خیال کے مطابق مسلمان چین کی زندگی گزار سکیں۔ کیا خالص دینی نقطۂ نظر سے یہ قابلِ اعتراض نہیں؟ یہودی قوم مقہور و مغضوب قوم ہے۔ اللہ پاک نے اس پر زمین تنگ کر دی ہے اور ہر چند کہ اس قوم میں دنیا کے بڑے سے بڑے سرمایہ دار اور مختلف علوم کے ماہرین موجود ہیں لیکن اُن کے قبضہ میں ایک اِنچ زمین بھی نہیں ہے۔ آج وہ اپنا قومی وطن بنانے کے لیے کبھی انگریزوں سے بھیک مانگتے ہیں اور کبھی امریکہ والوں سے۔ میرے خیال میں مسلمان، یا بالفاظِ دیگر مسلم لیگ بھی یہی کر رہی ہے۔ وہ یہودیوں کی طرح پاکستان کی بھیک کبھی ہندوؤں سے اور کبھی انگریزوں سے مانگتی پھر رہی ہے۔ تو پھر کیا یہ ایک مقہور اور مغضوب قوم کی پیروی نہیں ہے؟ اور کیا ایک مقہور و مغضوب قوم کی پیروی مسلمانوں کو بھی اسی صف میں لا کھڑا نہ کر دے گی؟"

جواب: پاکستان کے متعلق آپ میرے مفصل خیالات "مسلمان اور موجودہ سیاسی
کشمکش" حصہ سوم میں ملاحظہ فرمائیے۔ میرے نزدیک پاکستان کے مطالبہ پر یہودیوں کے قومی
وطن کی تشبیہ چسپاں نہیں ہوتی۔ فلسطین فی الواقع یہودیوں کا قومی وطن نہیں ہے۔ اُن کو وہاں
سے نکلے ہوئے دو ہزار برس گزر چکے ہیں، اُسے اگر اُن کا قومی وطن کہا جاسکتا ہے تو اُسی معنی میں
جس معنی میں جرمنی کی آریہ نسل کے لوگ وسط ایشیا کو اپنا قومی وطن کہہ سکتے ہیں۔ یہودیوں کی
اصل پوزیشن یہ نہیں ہے کہ ایک ملک واقعی اُن کا قومی وطن ہے اور وہ اسے تسلیم کرانا چاہتے
ہیں۔ بلکہ ان کی اصلی پوزیشن یہ ہے کہ ایک ملک اُن کا قومی وطن نہیں ہے اور اُن کا مطالبہ یہ
ہے کہ ہم کو دنیا کے مختلف گوشوں سے سمیٹ کر وہاں بسایا جائے اور اُسے بزور ہمارا قومی
وطن بنادیا جائے۔ بخلاف اس کے مطالبۂ پاکستان کی بنیاد یہ ہے کہ جس علاقہ میں مسلمانوں
کی اکثریت آباد ہے وہ بالفعل مسلمانوں کا قومی وطن ہے، اور مسلمانوں کا مطالبہ صرف یہ ہے
کہ موجودہ جمہوری نظام میں ہندوستان کے دوسرے حصوں کے ساتھ لگے رہنے سے اُن کے
قومی وطن کی سیاسی حیثیت کو جو نقصان پہنچتا ہے اُس سے اس کو محفوظ رکھا جائے اور متحدہ
ہندوستان کی ایک آزاد حکومت کے بجائے ہندو ہندوستان اور مسلم ہندوستان کی دو آزاد
حکومتیں قائم ہوں۔ یعنی بالفاظ دیگر وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ ان کا قومی وطن جو بالفعل موجود ہے
اُس کو اپنی آزاد حکومت الگ قائم کرنے کا حق حاصل ہو جائے۔

یہ چیز بعینہٖ وہی ہے جو آج دنیا کی ہر قوم چاہتی ہے اور اگر مسلمانوں کے "مسلمان" ہونے
کی حیثیت کو نظر انداز کر کے انہیں صرف ایک قوم کی حیثیت سے دیکھا جائے تو اُن کے اس
مطالبہ کے حق بجانب ہونے میں کوئی کلام نہیں کیا جاسکتا۔ ہم اصولاً اس بات کے مخالف ہیں کہ
دنیا کی کوئی قوم کسی دوسری قوم پر سیاسی و معاشی حیثیت سے مسلط ہو۔ ہمارے نزدیک اصولاً
یہ ہر قوم کا حق ہے کہ اس کی سیاسی و معاشی باگیں اس کے اپنے ہاتھوں میں ہوں۔ اس لیے
ایک قوم ہونے کی حیثیت سے اگر مسلمان یہ مطالبہ کرتے ہیں تو جس طرح دوسری قوموں کے معاملے میں
یہ مطالبہ صحیح ہے اسی طرح ان کے معاملہ میں بھی صحیح ہے۔ البتہ ہمیں اس چیز کو نصب العین بنانے
پر جو اعتراض ہے وہ صرف یہ ہے کہ مسلمانوں نے ایک اصولی جماعت اور ایک نظام کی داعی

اور علم بردار جماعت ہونے کی حیثیت کو نظر انداز کر کے صرف ایک "قوم" ہونے کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اگر وہ اپنی اصلی حیثیت کو قائم رکھتے تو ان کے لیے قومی وطن اور اس کی آزادی کا سوال ایک نہایت حقیر سوال ہوتا، بلکہ حقیقتاً سرے سے وہ ان کے لیے پیدا ہی نہ ہوتا۔ اب وہ کروڑوں ہو کر ایک ذرا سے خطے میں اپنی حکومت حاصل کر لینے کو ایک انتہائی نصب العین سمجھ رہے ہیں، لیکن اگر وہ نظامِ اسلامی کے داعی ہونے کی حیثیت اختیار کریں تو تنہا ایک مسلمان ساری دنیا پر اپنی، یعنی درحقیقت اپنے اُس نظام کی جس کا وہ داعی ہے، حکومت کا مدعی ہو سکتا ہے اور صحیح طور پر سعی کرے تو اسے حاصل بھی کر سکتا ہے۔

(ترجمان القرآن، جولائی، اگست، ستمبر، اکتوبر ۱۹۴۲ء)

مسلم لیگ سے اختلاف کی نوعیت

مسلم لیگ کی مجلس عمل کی جانب سے حسب ذیل سوال نامہ ہمارے پاس بھیجا گیا ہے :-

"کن اصول خطوط اور بنیادوں پر ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی و معاشی اصلاح، اُن حالات کے اندر رہتے ہوئے جن میں وہ گھرے ہوئے ہیں۔ اصول، روایات اور نقطۂ نظر کے مطابق ممکن ہے؟ براہِ کرم حسب ذیل خطوط پر اپنی تفصیلی رائے تحریر کیجیے:-

(الف) ایک ایسا قابلِ عمل دستور تجویز کیجیے جس کے ذریعہ قومی احیاء کے مشترکہ مقصد کے لیے مسلمانوں کے مختلف فرقوں اور مدارسِ فکر کو متحد اور مربوط کیا جا سکے۔

(ب) ایک ایسا اقتصادی نقشہ و نظام مرتب کیجیے جو اصول اسلام کے ساتھ مطابقت رکھتا ہو۔

(ج) ہندوستانی مسلمان جن مخصوص حالات میں گھرے ہوئے ہیں انہیں ذہن میں رکھ کر بتائیے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ اگر، اور جب، وہ ایسی آزاد ریاستیں حاصل کرلیں جن میں ان کی اکثریت ہو تو ایک ایسا نظام حکومت قائم کر سکیں جس میں مذہب اور ریاست کے درمیان ایک خوش آئند ہم آہنگی پیدا ہو جائے۔

(د) اسلامی اصول، روایات، تصورات اور نظریات کے مطابق ایک ایسی اسکیم مرتب کیجیے جو مسلمانوں کے معاشرتی، تہذیبی اور تعلیمی پہلوؤں پر حاوی ہو۔

(ر) مجموعی قومی بہبودی کی خاطر مذہبی ادارات یعنی اوقاف اور دوسرے ذرائع آمدنی کو ایک مرکز کے ماتحت منظم کرنے کے لیے طریق کار اور نظام اس طرح مرتب کیجیے کہ ان اداروں پر قبضہ رکھنے والے اشخاص کے احساسات، میلانات، اغراض اور مختلف نظریات کا لحاظ رہے۔"

اس سوالنامے کا جو جواب ہماری طرف سے بھیجا گیا وہ درج ذیل ہے:

آپ نے جو تفصیلی سوالات دریافت کیے ہیں وہ دراصل ایک ہی بڑے سوال کے اجزا ہیں۔ پھر کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ان مسائل کو الگ الگ لینے اور ان پر الگ الگ رائے ظاہر کرنے کے بجائے اسی بڑے سوال کو بیک وقت سامنے لے آیا جائے جس کے یہ سب اجزاء ہیں؟ وہ وہ بڑا سوال یہ ہے کہ مسلمان کس طرح وہ اصلی مسلمان بنیں جنہیں بنانا قرآن کا اصل منشا تھا؟ یہ ہے اصل سوال اور اس کے حل ہونے سے باقی سب سوالات خود بخود حل ہو جائیں گے۔

میرے پاس اس سوال کا سیدھا اور صاف جواب یہ ہے کہ پہلے اسلام کو، جو کچھ کہ وہ ہے اور جو کچھ کہ انسان سے اُس کے مطالبات ہیں، واضح طور پر مسلمانوں کے سامنے رکھ دیا جائے اور اُن سے شعوری طور پر اُسے قبول کرنے کا مطالبہ کیا جائے۔ پھر جو لوگ اسے جاننے اور سمجھنے کے بعد قبول کریں اور اپنے طرزِ عمل سے ثابت کریں کہ واقعی انہوں نے اسے قبول کیا ہے، ان کو ایک پارٹی کی صورت میں منظم کرنا شروع کیا جائے اور باقی مسلمانوں میں مسلسل تبلیغ و تلقین کا سلسلہ اس ارادہ کے ساتھ جاری رکھا جائے کہ بالآخر ہمیں اس پارٹی میں پوری قوم کو جذب کر لینا ہے۔

اس پارٹی کے سامنے صرف ایک ہی نصب العین ہو، یعنی اسلام کو بحیثیت ایک نظامِ زندگی کے عملاً زمین پر قائم کرنا۔ اور اس کا ایک ہی اصول ہو، یعنی اسلام کے خالص طریقہ پر چلنا (خواہ یہ طریقہ دنیا کو مرغوب ہو یا نہ ہو) اور غیر اسلام کے ساتھ سر مدارات و مصالحت (Compromise)

اور ہر آمیزش و اختلاط کو قطعی چھوڑ دینا۔ اس نصب العین اور اس اصول پر جو پارٹی کام کرے گی اس کے لیے وہ سوالات جو آپ کے سامنے آ رہے ہیں اوّل تو سرے سے پیدا ہی نہ ہونگے اور اگر ان میں سے بعض سوالات پیدا ہوتے بھی تو وہ اُس شکل میں نہیں ہوں گے جس شکل میں آپ کے سامنے اب یہ سوالات آ رہے ہیں۔ انہیں کوئی نئی اسکیم وضع نہیں کرنی ہوگی، بلکہ صرف وہ قوت فراہم کرنی ہوگی جس سے وہ اس اسکیم کو نافذ کرسکیں جو پہلے ہی بنی ہوئی موجود ہے۔ وہ اس کی پروا نہیں کریں گے کہ موجودہ حالات ہماری اسکیم کے نفاذ کے لیے سازگار ہیں یا نہیں۔ وہ ناسازگار حالات کو بزور بدلیں گے تاکہ وہ اس اسکیم کے لیے سازگاری کرنے پر مجبور ہوں۔ غرض یہ کہ ان کا نقطۂ نظر اس معاملہ میں اُس نقطۂ نظر سے بالکل مختلف ہوگا جو آپ حضرات نے اختیار کیا ہے۔

میرا خیال ہے کہ آپ حضرات ایک ایسی پیچیدگی میں پڑ گئے ہیں جس کا کوئی حل شاید آپ نہ پاسکیں، اور وہ پیچیدگی یہ ہے کہ ایک طرف تو آپ اس پوری مسلمان قوم کو "مسلمان" کی حیثیت سے لے رہے ہیں جس کے نناوے فی صدی افراد اسلام سے جاہل، اور پچانوے فی صدی منحرف، اور نوے فی صدی انحراف پر مصر ہیں، یعنی وہ خود اسلام کے طریقہ پر چلنا نہیں چاہتے اور نہ اُس منشا کو پورا کرنا چاہتے ہیں جس کے لیے ان کو مسلمان بنایا گیا ہے۔ دوسری طرف آپ حالات کے اُس پورے مجموعہ کو جو اس وقت عملاً قائم ہے، تھوڑی سی ترمیم کے بعد قبول کر لیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ حالات تو یہی رہیں اور پھر ان کے اندر کسی اسلامی اسکیم کے نفاذ کی گنجائش نکل آئے۔ یہی چیز آپ کے لیے ایک بڑی پیچیدگی پیدا کرتی ہے۔ اور اسی وجہ سے میرا خیال یہ ہے کہ جن مسائل سے آپ حضرات تعرض کر رہے ہیں ان کا کوئی حل آپ کبھی نہ پاسکیں گے۔

(ترجمان القرآن، جولائی، اگست، ستمبر، اکتوبر ۱۹۴۲ء)

وقت کے سیاسی مسائل میں
جماعتِ اسلامی کا مسلک

سوال: "اِس وقت مسلمانانِ ہند دو فتنوں میں مبتلا ہیں۔ اوّل کانگریس کی وطنی تحریک کا فتنہ جو واحد قومیت کے مفروضے اور مغربی ڈیموکریسی کے اصول پر ہندوستان کی اجتماعی زندگی کی تشکیل کرنا چاہتی ہے۔ دوم مسلم نیشنلزم کی تحریک جسے مسلم لیگ چلا رہی ہے اور جس پر بظاہر میں تو اسلام کا لیبل لگا ہوا ہے مگر باطن میں روحِ اسلامی سراسر مفقود ہے۔ "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے مطالعے سے یہ بات ہم پر واضح ہو چکی ہے کہ یہ دونوں تحریکیں اسلام کے خلاف ہیں۔ لیکن حدیث میں آیا ہے کہ انسان جب دو بلاؤں میں مبتلا ہو تو چھوٹی بلا کو قبول کرلے۔ اب کانگریس کی تحریک تو سراسر کفر ہے، اس کا ساتھ دینا مسلمانوں کی موت کے مترادف ہے۔ اس کے مقابلہ میں لیگ کی تحریک اگرچہ غیر اسلامی ہے، لیکن اس سے یہ خطرہ تو نہیں ہے کہ دس کروڑ مسلمانانِ ہند کی قومی ہستی ختم ہو جائے۔ لہٰذا کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم لیگ سے باہر رہتے ہوئے اس کے ساتھ ہمدردی کریں؟ اِس وقت ہندوستان میں انتخابات کی مہم درپیش ہے اور یہ انتخابات فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک طرف تمام غیر لیگی عناصر مل کر مسلم لیگ کو پچھاڑنے کی کوشش کر رہے ہیں جن میں اگر وہ کامیاب ہو جائیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ کانگریس کی وطنی تحریک مسلمانوں پر

زبردستی مسلط ہو کے رہ جائے گی۔ دوسری طرف مسلم لیگ یہ ثابت کرنا چاہتی ہے کہ مسلمان ایک مستقل قوم ہیں اور وہ اپنی قومی حکومت قائم کرنے کے خواہشمند ہیں۔ ان دونوں کا فیصلہ رائے دہندوں کے ووٹوں پر منحصر ہے۔ ایسی صورت میں ہم کو کیا رویّہ اختیار کرنا چاہیئے؟ کیا ہم لیگ کے حق میں ووٹ دیں اور دلوائیں؟ یا خاموش بیٹھے رہیں؟ یا خود اپنے نمائندے کھڑے کریں"؟

جواب:- آپ کے ذہن پر ملک کے موجودہ سیاسی حالات کا غلبہ ہے، اس لیے آپ کو صرف دو ہی فتنے نظر آتے جن میں ہندوستان کے مسلمان مبتلا ہیں۔ حالانکہ اگر آپ ذرا وسیع نگاہ سے دیکھتے تو ان دو فتنوں کے علاوہ آپ کو اور بہت سے اخلاقی، فکری، تمدنی، مذہبی اور سیاسی و معاشی فتنے نظر آتے جو اس وقت مسلمانوں پر ہجوم کیے ہوئے ہیں، اور یہ ایک فطری سزا ہے جو اللہ کی طرف سے ہر اُس قوم کو ملا کرتی ہے جو کتابُ اللہ کی حامل ہونے کے باوجود اُس کے اتباع سے منہ موڑے اور اس کے منشا کے مطابق کام کرنے سے جی چرائے۔ اس سزا سے اگر مسلمان بچ سکتے ہیں تو وہ صرف اِس طرح کہ اپنے اُس اصلی و بنیادی جرم سے باز آجائیں جس کی پاداش میں ان پر یہ فتنے مسلط ہوتے ہیں، اور اُس کام کے لیے کھڑے ہو جائیں جس کی خاطر انہیں کتابُ اللہ دی گئی تھی۔ لیکن اگر وہ اس سے مُنہ موڑتے ہیں تو پھر جو تدبیریں چاہیں کر کے دیکھ لیں، یقین جانیے کہ کسی ایک فتنہ کا بھی سدِّباب نہ ہوگا، بلکہ ہر تدبیر چند اور فتنے برپا کر دے گی۔

آپ نے جو سوال جماعت اِسلامی کی توجہ اور فیصلے کے لیے پیش کیا ہے اس کے متعلق مَیں دو باتیں واضح طور پر عرض کیے دیتا ہوں تاکہ آپ کو اور آپ کی طرح سوچنے والے اصحاب کو آئندہ اس سلسلہ میں کوئی الجھن نہ پیش آئے۔

اوّل یہ کہ پہلے آپ اِس جماعت کے مقصدِ قیام کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ یہ جماعت کسی ملک یا قوم کے وقتی مسائل کو سامنے رکھ کر وقتی تدابیر سے اُن کو حل کرنے کے لیے نہیں بنی ہے، اور نہ اس کی بنائے قیام یہ قاعدہ ہے کہ پیش آمدہ مسائل کو حل کرنے کے لیے جس وقت جو اصول چلتے نظر آئیں ان کو اختیار کر لیا جائے۔ اس جماعت کے سامنے تو صرف ایک ہی عالمگیر

اور ازلی و ابدی مسئلہ ہے جس کی لپیٹ میں ہر ملک اور ہر قوم کے سارے وقتی مسائل آ جاتے ہیں اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ انسان کی دُنیوی فلاح اور اُخروی نجات کس چیز میں ہے؟ پھر اس مسئلے کا ایک ہی حل اس جماعت کے پاس ہے، اور وہ یہ ہے کہ تمام بندگانِ خدا (جن میں ہندوستان کے مسلمان بھی شامل ہیں) صحیح معنوں میں خدا کی بندگی اختیار کریں اور اپنی پوری انفرادی و اجتماعی زندگی کو اس کے سارے پہلوؤں سمیت اُن اصولوں کی پیروی میں سپرد کر دیں جو خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت میں پائے جاتے ہیں۔ ہمیں اِس مسئلے اور اس کے اِس واحد حل کے سوا دنیا کی کسی دوسری چیز سے قطعًا کوئی دلچسپی نہیں ہے، اور جو شخص بھی ہمارے ساتھ چلنا چاہتا ہو اسے لازم ہے کہ ہر طرف سے نظر ہٹا کر پوری جمعیتِ خاطر کے ساتھ اس شاہراہ پر قدم جمائے چلتا رہے۔ اور جو شخص اتنی ذہنی و عملی یکسوئی بہم نہ پہنچا سکے، جس کے ذہن کو اپنے ملک یا اپنی قوم کے وقتی مسائل بار بار اپنی طرف کھینچتے ہوں اور جس کے قدم بار بار ڈگمگا کر اُن طریقوں کی طرف پھسلتے ہوں جو دنیا میں آج رائج ہیں، اس کے لیے زیادہ مناسب یہ ہے کہ پہلے اُن ہنگامی تحریکوں میں جا کر اپنا دل بھر لے۔

دوم یہ کہ ووٹ اور الیکشن کے معاملہ میں بھی آپ ہماری پوزیشن کو صاف صاف ذہن نشین کر لیں۔ پیش آمدہ انتخاب یا آئندہ آنے والے انتخابات کی اہمیت جو کچھ بھی ہو اور ان کا جیسا کچھ بھی اثر ہماری قوم یا ہمارے ملک پر پڑتا ہو، بہرحال ایک بااصول جماعت ہونے کی حیثیت سے ہمارے لیے یہ ناممکن ہے کہ کسی وقتی مصلحت کی بنا پر ہم اُن اصولوں کی قربانی گوارا کر لیں جن پر ہم ایمان لائے ہیں۔ موجودہ نظام کے خلاف ہماری لڑائی ہی اس بنیاد پر ہے کہ یہ نظام حاکمیتِ جمہور (Sovereignty of the People) کے اصول پر قائم ہوا ہے، اور جمہور جس پارلیمنٹ یا اسمبلی کو منتخب کریں یہ اُس کو قانون بنانے کا غیر مشروط حق دیتا ہے جس کے لیے کوئی بالاتر سند اس کو تسلیم نہیں ہے۔ بخلاف اس کے ہمارے عقیدۂ توحید کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ حاکمیت (Sovereignty) جمہور کی نہیں بلکہ خدا کی ہو، اور آخری سند (Final Authority) خدا کی کتاب کو مانا جائے اور قانون سازی جو کچھ بھی ہو کتابِ الٰہی کے تحت ہو نہ کہ اس سے بے نیاز۔ یہ ایک اصولی معاملہ ہے جس کا تعلق عین

ہمارے ایمان اور ہمارے اساسی عقیدے سے ہٹے[1]۔ اگر ہندوستان کے علماء اور عامۂ مسلمین اس حقیقت سے ذہول برت رہے ہیں اور وقتی مصلحتیں ان کے لیے مقتضیاتِ ایمانی سے اہم ترین گئی ہیں تو اس کی جوابدہی وہ خود اپنے خدا کے سامنے کریں گے۔ لیکن ہم کسی فائدے کے لالچ اور کسی نقصان کے اندیشے سے اِس اصولی مسئلے میں موجودہ نظام کے ساتھ کسی قسم کی مصالحت نہیں کر سکتے۔ آپ خود ہی سوچ لیجیے کہ توحید کا یہ عقیدہ رکھتے ہوئے آخر ہم کس طرح انتخابات میں حصّہ لے سکتے ہیں؟ کیا ہمارے لیے یہ جائز ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو ہم کتاب اللہ کی سند سے آزاد ہو کر قانون سازی کرنے کو شرک قرار دیں، اور دوسری طرف خود اپنے ووٹوں سے اُن لوگوں کو منتخب کرنے کی کوشش کریں جو خدا کے آئینی اختیارات غصب کرنے کے لیے اسمبلی میں جانا چاہتے ہیں؟ اگر ہم اپنے عقیدے میں صادق ہیں تو ہمارے لیے اس معاملہ میں صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم اپنا سارا زور اس اصول کے منوانے پر صرف کر دیں کہ حاکمیت صرف خدا کی ہے اور قانون سازی کتابِ الٰہی کی سند پر مبنی ہونی چاہیے۔ جب تک یہ اصول نہ مان لیا جائے ہم کسی انتخاب اور کسی رائے دہی کو حلال نہیں سمجھتے۔

(ترجمان القرآن، ستمبر و اکتوبر ۴۵ء)

---

[1] یہی وجہ ہے کہ جماعتِ اسلامی نے تقسیم کے بعد انتخابات میں حصہ لینے اور اسمبلیوں کی رکنیت حاصل کرنے کو اس وقت تک جائز تسلیم نہیں کیا جب تک پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے قرارداد مقاصد (Objectives Resolution) پاس کر کے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت تسلیم نہ کر لی۔

(جدید)

نظامِ کفر کی قانون ساز مجلس میں مسلمانوں کی شرکت کا مسئلہ

سوال :۔ "آپ کی کتاب "اسلام کا نظریۂ سیاسی" پڑھنے کے بعد یہ حقیقت تو ذہن نشین ہو گئی ہے کہ قانون سازی کا حق صرف خدا ہی کے لیے مختص ہے اور اس حقیقت کے مخالف اصولوں پر مبنی ہوئی قانون ساز اسمبلیوں کا ممبر بننا عین شریعت کے خلاف ہے۔ مگر ایک شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ اگر تمام مسلمان اسمبلیوں کی شرکت کو حرام تسلیم کر لیں تو پھر سیاسی حیثیت سے مسلمان تباہ ہو جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ سیاسی قوت ہی سے قوموں کی فلاح و بہبود کا کام کیا جا سکتا ہے اور ہم نے اگر سیاسی قوت کو بالکلیہ غیروں کے حوالے ہو جانے دیا تو اس کا نتیجہ یہی ہو گا کہ اغیار مسلم دشمنی کی وجہ سے ایسے قوانین نافذ کریں گے اور ایسا نظام مرتب کریں گے جس کے نیچے مسلمان دب کر رہ جائیں گے، پھر آپ اس سیاسی تباہی سے بچنے کی کیا صورت مسلمانوں کے لیے تجویز کرتے ہیں؟"

جواب :۔ آپ نے اپنے سوال میں سوچنے کا انداز غلط اختیار کیا ہے۔ یہ بات تو آپ کی سمجھ میں آ گئی ہے کہ وہ نظام جس میں انسان خود اپنا قانون ساز بنتا ہے یا دوسرے انسانوں کو قانون سازی کا حق دیتا ہے، سرے سے غلط ہے۔ نیز یہ بات بھی آپ سمجھ چکے ہیں کہ امرِ حق یہی ہے کہ حکم صرف اللہ کے لیے ہے اور انسان کا کام اس کے حکم کا اتباع کرنا ہے نہ کہ خود

واضح حکم بن جانا۔ اب آپ کو یہ سوچنا چاہیے کہ مسلمان جن کے مفاد کی آپ فکر کر رہے ہیں وہ کس غرض کے لیے "مسلم" نامی ایک جماعت بنائے گئے تھے؟ آیا اِس غرض کے لیے کہ وہ اُس امرِ حق کو جو قرآن سے ثابت ہے، دنیا کے سامنے پیش کریں، اُس کو تسلیم کرائیں، خود اپنی زندگی کو اُس پر قائم کریں اور دنیا میں اُس کو جاری کرنے کے لیے اپنی پوری قوت صرف کر دیں؟ یا اِس غرض کے لیے کہ اُس کے بالکل برخلاف جو باطل بھی دنیا میں قائم ہو جائے (اور خود ان کی اپنی غفلتوں کی بدولت قائم ہو) اس کی موافقت کریں اور اُس کو اپنا لیں اور اُس کو مٹانے کی سعی سے اس لیے گریز کرتے رہیں کہ کہیں اُن کے مفاد کو نقصان نہ پہنچ جائے؟ اگر پہلی بات ہے تو مسلمان آج جو کچھ کر رہے ہیں، غلط کر رہے ہیں، اور ان کا مفاد اگر اِسی غلطی سے وابستہ ہے تو وہ ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ اُس کی پروا کی جائے، اور ایسی صورتِ حال میں ایک سچے مسلمان کو اپنی قوم کے ساتھ لگ کر جہنم کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے امرِ حق کو قائم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، خواہ اس کی قوم اس کا ساتھ دے یا نہ دے۔ اور اگر آپ دُوسری بات کے قائل ہیں تو پھر مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے، حق کو حق جاننے کے باوجود خلافِ حق طریقہ پر اگر محض قومی مفاد کی خاطر آپ جانا چاہیں تو جا سکتے ہیں۔

یہ اندیشہ اکثر پیش کیا جاتا ہے کہ اگر ہم اسمبلیوں سے پرہیز کریں تو ان پر غیر مسلم قابض ہو کر نظامِ حکومت کے تنہا مالک و متصرف بن جائیں گے اور اگر نظامِ باطل کے کل پرزے ہم نہ بنیں تو دوسرے بن جائیں گے اور اس طرح زندگی کے سارے کاروبار پر قابض ہو کر وہ ہماری ہستی ہی کو ختم کر دیں گے، حتٰی کہ اِسلام کا نام لینے والے باقی ہی نہ رہیں گے کہ تم ان سے خطاب کر سکو۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ اندیشے جتنے ہولناک ہیں اس سے زیادہ خام خیالی کے نمونے ہیں۔ اگر ہم نے یہ کہا ہوتا کہ صرف ایک منفی پالیسی اختیار کر کے مسلمان زندگی کا سارا کاروبار چھوڑ دیں اور گوشوں میں جا بیٹھیں تو یہ اندیشے ضرور کسی حقیقت پر مبنی ہوتے۔ لیکن ہم اِس نفی کے ساتھ ساتھ ایک اِثبات بھی تو پیش کرتے ہیں، اور وہ یہ ہے کہ مسلمان اِس نظام کے ساتھ سازگاری کرنے کے بجائے دنیا میں نظامِ حق قائم کرنے کے لیے منظم سعی شروع کریں اور دوسری قوموں کے ساتھ اپنے دُنیوی مفاد کے لیے کشمکش اور مزاحمت کرنے کے بجائے ان کے سامنے

وہ دینِ حق پیش کریں جس کی پیروی میں تمام انسانوں کی فلاح ہے، اور قرآن کے ذریعہ سے، سیرتِ رسولؐ کے ذریعہ سے اور اخلاقِ اسلامی کے ذریعے سے دنیا میں فکری، اخلاقی، معاشی، اور تمدنی اور سیاسی انقلاب برپا کرنے کی کوشش کریں۔

ہماری اس دعوت کے جواب میں دو صورتیں پیش آسکتی ہیں:

ایک یہ کہ تمام ہندوستان کے مسلمان، جن کی تعداد دس کروڑ ہے اور جن کے پاس مادّی وسائل اور ذہنی اور دماغی قوتوں اور ہاتھ پاؤں کی طاقتوں کی کمی نہیں ہے، بیک وقت ہماری اِس دعوت کو قبول کرلیں اور ذہنی، اخلاقی اور عملی تمام حیثیتوں سے اسلام کے سچے داعی بن جائیں۔ اگر ایسا ہوجائے تو آپ تو یہ اندیشہ کر رہے ہیں کہ سب کچھ آپ کے ہاتھ سے نکل جائے گا اور میں یہ یقین رکھتا ہوں کہ ہندوستان ہی نہیں دنیا کا ایک بڑا حصّہ آپ کے ہاتھ آجائے گا، ہندوستان میں اقلیت اور اکثریت کا جھگڑا دیکھتے دیکھتے ختم ہوجائے گا، ہندوستان میں خالص اسلامی حکومت کو قائم ہونے سے کوئی طاقت نہ روک سکے گی، بہت قلیل مدت کے اندر مسلمان ممالک کی بھی کایا پلٹ جائے گی اور خود وہ قومیں تک جو آج ساری دنیا پر چھائی ہوئی ہیں، مسخّر ہونے سے محفوظ نہ رہ سکیں گی۔

دوسری صورت یہ پیش آسکتی ہے، اور یہی اِس وقت متوقع بھی ہے، کہ مسلمانوں میں سے بتدریج تھوڑی تعداد میں پاک نفس اور اعلیٰ درجہ کے ذہن رکھنے والے لوگ ہماری اِس دعوت کو قبول کرتے جائیں گے اور جب تک صالحین کا یہ گروہ منظم ہوکر ایک طاقت بنے، عام مسلمان اپنے لیڈروں کی پیروی میں وہی کچھ کرتے رہیں گے جو ایک مدت سے کرتے آرہے ہیں اور آج کر رہے ہیں۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ وہ خطرہ پیش نہیں آسکتا جس کا آپ اندیشہ ظاہر کر رہے ہیں، کیونکہ غلط کار مسلمانوں کی عظیم الشان اکثریت وہ سارے کام کرنے کے لیے موجود رہے گی جن کے نہ کرنے سے آپ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کا قومی مفاد خاک میں مل جائے گا۔ البتہ اگر یہ سارے کام ہوتے رہیں اور صرف وہی ایک کام نہ ہو جس کی طرف ہم بُلا رہے ہیں اور اگر ہم بھی امرِ حق اور اُس کے تقاضوں سے آنکھیں بند کرکے محض قوم اور اُس کے مفاد کی فکر میں اُن باطل کاریوں کی طرف دوڑ جائیں جو آج اسلام اور مسلم مفاد کے نام سے ہو

رہی ہیں، تو یقین رکھیے کہ اسلام کا جھنڈا تو خیر کیا بلند ہوگا، مسلمان قوم اُس ذلّت و خواری اور اس پستی کے گڑھے سے بھی نہ نکل سکے گی جس میں وہ یہودیوں کی طرح صرف اس لیے مبتلا ہوئی ہے کہ خدا کی کتاب رکھتے ہوئے اس نے اس کتاب کا منشا پورا کرنے سے مُنہ موڑا۔

(ترجمان القرآن۔ محرم ۱۳۶۵ھ۔ دسمبر ۱۹۴۵ء)

مجالس قانون سازی کی رکنیت شرعی نقطۂ نظر سے

سوال: "کیا مسلمان کو بحیثیت مسلمان ہونے کے اسمبلی کی ممبری جائز ہے یا نہیں؟
اگر نہیں تو کیوں؟ یہاں مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں کے نمائندے اسمبلی کی رکنیت
کے لیے کھڑے ہوئے ہیں اور ان کی طرف سے ووٹ حاصل کرنے کے لیے
مجھ پر دباؤ پڑ رہا ہے، حتیٰ کہ علماء تک کا مطالبہ یہی ہے۔ اگرچہ مجملاً جانتا
ہوں کہ انسانی حاکمیت کے نظریے پر قائم ہونے والی اسمبلی اور اس کی
رکنیت دونوں شریعت کی نگاہ میں ناجائز ہیں، مگر تاوقتیکہ معقول وجوہ پیش
نہ کر سکوں، ووٹ کے مطالبہ سے چھٹکارا پانا دشوار ہے۔"

جواب: اسمبلی کے متعلق یہ سمجھ لیجیے کہ موجودہ زمانہ میں جتنے جمہوری نظام بنے
ہیں (جن کی ایک شاخ ہندوستان کی موجودہ اسمبلیاں بھی ہیں) وہ اس مفروضے پر مبنی
ہیں کہ باشندگانِ ملک اپنے معاملات کے متعلق خود تمدن، سیاست، معیشت، اخلاق
اور معاشرت کے اصول وضع کرنے اور ان کے مطابق تفصیلی قوانین و ضوابط بنانے کا حق
رکھتے ہیں اور اس قانون سازی کے لیے رائے عام سے بالاتر کسی سند کی ضرورت نہیں
ہے۔ یہ نظریہ اسلام کے نظریہ سے بالکل برعکس ہے۔ اسلام میں توحید کے عقیدے کا لازمی
جزو یہ ہے کہ لوگوں کا اور تمام دنیا کا مالک اور فرماں روا اللہ تعالیٰ ہے، ہدایت اور حکم

دنیا اُس کا کام ہے اور لوگوں کا کام یہ ہے کہ اس کی ہدایت اور اس کے حکم سے اپنے لیے قانونِ زندگی اخذ کریں، نیز اگر اپنی آزادی رائے استعمال کریں بھی تو اُن حدود کے اندر کریں جن حدود میں خود اللہ تعالیٰ نے ان کو آزادی دی ہے۔ اس نظریئے کی رُو سے قانون کا ماخذ اور تمام معاملاتِ زندگی میں مرجع اللہ کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت قرار پاتی ہے، اور اس نظریہ سے ہٹ کر اوّل الذکر جمہوری نظریئے کو قبول کرنا گویا عقیدۂ توحید سے منحرف ہو جانا ہے۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ جو اسمبلیاں یا پارلیمینٹیں موجودہ زمانہ کے جمہوری اصول پر بنی ہیں ان کی رکنیت حرام ہے، کیونکہ ووٹ دینے کے معنی ہی یہ ہیں کہ ہم اپنی رائے سے کسی ایسے شخص کو منتخب کرتے ہیں جس کا کام موجودہ دستور کے تحت وہ قانون سازی کرنا ہے جو عقیدۂ توحید کے سراسر منافی ہے۔ اگر علمائے کرام میں سے کوئی صاحب اس چیز کو حلال اور جائز سمجھتے ہیں تو ان سے اس کی دلیل دریافت کیجیے[1]۔

اس قسم کے معاملات میں یہ کوئی دلیل نہیں ہے کہ چونکہ یہ نظام مسلط ہو چکا ہے اور زندگی کے سارے معاملات اس سے متعلق ہیں، اس لیے اگر ہم انتخابات میں حصہ نہ لیں اور نظامِ حکومت میں شریک ہونے کی کوشش نہ کریں تو ہمیں فلاں اور فلاں نقصانات پہنچ جائیں گے۔ ایسے دلائل سے کسی ایسی چیز کو، جو اصولاً حرام ہو، حلال ثابت نہیں کیا جا سکتا، ورنہ شریعت کی کوئی حرام چیز ایسی نہ رہ جائے گی جس کو مصلحتوں اور ضرورتوں کی بنا پر حلال نہ ٹھیرا لیا جائے۔ اضطرار کی بنا پر حرام چیزیں استعمال کرنے کی اجازت شریعت میں پائی تو جاتی ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آپ خود اپنی غفلتوں سے اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کر کے اضطرار کی حالتیں پیدا کریں، پھر اس اضطرار کو دلیل بنا کر تمام محرمات کو اپنے لیے حلال کرتے جائیں اور اس اضطرار کی حالت کو ختم کرنے کے لیے کوئی کوشش نہ کریں۔ جو نظام اس

---

[1] اس مسئلہ کو جو لوگ تفصیل کے ساتھ سمجھنا چاہیں وہ میری کتاب "اسلامی ریاست" ملاحظہ فرمائیں۔ (جدید)

وقت مسلمانوں پر مسلط ہوتا ہے، جس کے تسلط کو وہ اپنے لیے دلیلِ اضطرار بنائے ہوئے ہیں، وہ آخر ان کی اپنی ہی غفلتوں کا تو نتیجہ ہے۔ پھر اب بجائے اس کے کہ اپنا سرمایۂ قوت و عمل اس نظام کے بدلنے اور خالص اسلامی نظام قائم کرنے کی سعی میں صرف کریں، وہ اس اضطرار کو حجت بنا کر اسی نظام کے اندر حصہ دار بننے اور پھلنے پھولنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

(ترجمان القرآن۔ محرم ۶۵ھ۔ دسمبر ۱۹۴۵ء)

پُرامن اِنقلاب کا راستہ

سوال: "ذیل میں دو شبہات پیش کرتا ہوں۔ براہِ کرم صحیح نظریات کی توضیح فرما کر انہیں صاف کر دیجیے۔

(۱) ترجمان القرآن کے گزشتہ سے پیوستہ پرچے میں ایک سائل کا سوال شائع ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی منظم اسٹیٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا، مگر حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے ایک منظم اسٹیٹ تھا اور انہوں نے جب ریاست کو اقتدارِ کُلی منتقل کرنے پر آمادہ پایا تو اسے بڑھ کر قبول کر لیا اور یہ طریقِ کار اختیار نہیں کیا کہ پہلے مومنین صالحین کی ایک جماعت تیار کریں۔ کیا آج بھی جب کہ اسٹیٹ اس دَور سے کئی گنا زیادہ ہمہ گیر ہو چلا ہے، اس قسم کا طریقِ کار اختیار کیا جا سکتا ہے؟" اس سوال کے جواب میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس سے مجھے پورا پورا اطمینان نہیں ہوا مجھے یہ دریافت کرنا ہے کہ ہم کو حضرت یوسف علیہ السلام کا اتباع کرنا ہی کیوں چاہیے؟ ہمارے لیے تو صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ واجب الاتباع ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ مکہ کی بادشاہت کی پیش کش کو رد کر کے اپنے ہی خطوط پر جداگانہ ریاست کی تعمیر و تشکیل کا کام جاری رکھنے کا فیصلہ کیا تھا، اور ہمارے لیے بھی طریقِ کار اب یہی ہے! واضح فرمایئے کہ میری رائے

کس حد تک صحیح یا غلط ہے ؟

(۲) آپ نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ کسی مرحلہ پر اگر ایسے آثار پیدا ہو جائیں کہ موجود الوقت دستوری طریقوں سے نظام باطل کو اپنے اصول پر ڈھالا جا سکے تو ہمیں اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں تامل نہ ہوگا۔ اس جملہ سے لوگوں میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ جماعت اسلامی بھی ایک حد تک اسمبلیوں میں آنے کے لیے تیار ہے اور الیکشن کو جائز سمجھتی ہے۔ اس معاملہ میں جماعتی مسلک کی توضیح فرمائیے۔"

جواب :- ہمارے لیے سارے انبیاء علیہم السلام واجب الاتباع ہیں۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہی ہدایت تھی کہ اسی طریق پر چلیں جو تمام انبیاء کا طریق تھا۔ جب قرآن کے ذریعہ سے ہمیں معلوم ہو جائے کہ کسی معاملہ میں کسی نبی نے کوئی خاص طرزِ عمل اختیار کیا تھا اور قرآن نے اس کو منسوخ بھی نہ قرار دیا ہو تو وہ ویسا ہی دینی طریق کار ہے جیسا وہ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مسنون ہو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو بادشاہی پیش کی گئی تھی وہ اس شرط کے ساتھ مشروط تھی کہ آپ اس دین کو اور اس کی تبلیغ کو چھوڑ دیں تو ہم سب مل کر آپ کو اپنا بادشاہ بنا لیں گے۔ یہ بات اگر یوسف علیہ السلام کے سامنے بھی پیش کی جاتی تو وہ بھی اسی طرح اس پر لعنت بھیجتے جس طرح نبی کریمؐ نے اس پر لعنت بھیجی، اور ہم بھی اس پر لعنت بھیجتے ہیں۔ لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کو جو اختیارات پیش کیے گئے تھے وہ غیر مشروط اور غیر محدود تھے اور ان کے قبول کر لینے سے حضرت یوسفؑ کو یہ اقتدار حاصل ہو رہا تھا کہ ملک کے نظام کو اس ڈھنگ پر چلائیں جو دین حق کے مطابق ہو۔ یہ چیز اگر نبی کریمؐ کے سامنے پیش کی جاتی تو آپ بھی اسے قبول کر لیتے اور خواہ مخواہ لڑ کر ہی وہ چیز حاصل کرنے پر اصرار نہ فرماتے جو بغیر لڑے پیش کی جا رہی ہو۔ اسی طرح اگر کبھی ہم کو یہ توقع ہو کہ ہم رائے عام کی تائید سے نظام حکومت پر اس طرح قابض ہو سکیں گے کہ اس کو خالص اسلامی دستور پر چلا سکیں تو ہمیں بھی اس کے قبول کر لینے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔

الیکشن لڑنا اور اسمبلی میں جانا اگر اس غرض کے لیے ہو کہ ایک غیر اسلامی دستور کے تحت

ایک لادینی (Secular) جمہوری (Democratic) ریاست کے نظام کو چلایا جائے تو یہ ہمارے عقیدۂ توحید اور ہمارے دین کے خلاف ہے۔ لیکن اگر کسی وقت ہم ملک کی رائے عام کو اس حد تک اپنے عقیدہ و مسلک سے متفق پائیں کہ ہمیں یہ توقع ہو کہ عظیم الشان اکثریت کی تائید سے ہم ملک کا دستورِ حکومت تبدیل کر سکیں گے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس طریقہ سے کام نہ لیں۔ جو چیز ڈنڈے بغیر سیدھے طریقہ سے حاصل ہو سکتی ہو اس کو خواہ مخواہ ٹیڑھی انگلیوں ہی سے نکال لینے کا ہم کو شریعت نے حکم نہیں دیا ہے۔ مگر یہ اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ ہم یہ طریق کار صرف اُس صورت میں اختیار کریں گے جب کہ:

اولاً، ملک میں ایسے حالات پیدا ہو چکے ہوں کہ محض رائے عام کا کسی نظام کے لیے ہموار ہو جانا ہی عملاً اُس نظام کے قائم ہونے کے لیے کافی ہو سکتا ہو۔

ثانیاً، ہم اپنی دعوت و تبلیغ سے باشندگانِ ملک کی بہت بڑی اکثریت کو اپنا ہم خیال بنا چکے ہوں اور غیر اسلامی نظام کے بجائے اسلامی نظام قائم کرنے کے لیے ملک میں عام تقاضا پیدا ہو چکا ہو۔

ثالثاً، انتخابات غیر اسلامی دستور کے تحت اُس کو چلانے کے لیے نہ ہوں بلکہ بنائے انتخاب ہی یہ مسئلہ ہو کہ ملک کا آئندہ نظام کس دستور پر قائم کیا جائے۔

(ترجمان القرآن۔ محرم ۶۵ھ۔ دسمبر ۴۵ء)

۱۹۴۶ء کے انتخابات اور جماعت اسلامی

(۱۹۴۶ء کے انتخابات کے موقع پر مسلم لیگ کے ایک پُرجوش حامی نے جماعت اسلامی کے مسلک پر تنقید کرتے ہوئے ایک مضمون لکھا تھا۔ ذیل میں ہم وہ مضمون اور اس کا جواب جوں کا توں نقل کر رہے ہیں)

کچھ دنوں سے اخبارات میں مولانا مودودی صاحب کے اُس مضمون کا تذکرہ ہو رہا ہے جو ایک سوال کے جواب میں سہ روزہ "کوثر" مورخہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۵ء کے صفحہ ۳ پر شائع ہوا ہے۔ مولانا نے انتخابات کی شرکت اور رائے دہی کو حرام قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ:

° ووٹ اور الیکشن کے معاملہ میں ہماری پوزیشن کو صاف صاف ذہن نشین کر لیجیے۔ پیش آمدہ انتخابات یا آئندہ آنے والے انتخابات کی اہمیت جو کچھ بھی ہو اور ان کا جیسا کچھ بھی اثر ہماری قوم یا ملک پر پڑتا ہو، بہرحال ایک بااصول جماعت ہونے کی حیثیت سے ہمارے لیے یہ ناممکن ہے کہ کسی وقتی مصلحت کی بنا پر ہم اُن اصولوں کی قربانی گوارا کرلیں جن پر ہم ایمان لائے ہیں۔ موجودہ نظام کے خلاف ہماری لڑائی ہی اس بنیاد پر ہے کہ یہ نظام حاکمیتِ جمہور پر قائم ہوا ہے اور جمہور جس پارلیمنٹ یا اسمبلی کو منتخب کریں یہ اُس کو قانون بنانے کا غیر مشروط حق دیتا ہے جس کے لیے کوئی بالاتر سند اس کو تسلیم نہیں ہے۔ بخلاف اس کے ہمارے عقیدہ

توحید کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ حاکمیت، جمہور کی نہیں بلکہ خدا کی ہو اور آخری سند خدا کی کتاب کو مانا جائے اور قانون سازی جو کچھ بھی ہو کتابِ الٰہی کے ماتحت ہو نہ کہ اُس سے بے نیاز۔"

دَورِ حاضر کے علماء حضرات، کانگریسی ہوں یا احراری، بریلوی ہوں یا دیوبندی، مختلف سیاسی نظریات رکھنے کے باوجود اسمبلیوں کے اشتراک و انسلاک پر متفق العمل ہیں۔ صاف انکار اور بائیکاٹ کی آواز پٹھانکوٹ کے سوا کہیں سے نہیں اٹھی اور وہ بھی اب تک محض ایک انکار ہے۔ ایک مسئلہ کی حیثیت سے یہ معاملہ تشنۂ بحث ہے۔ سطور ذیل میں اجمالی طور پر اپنے تاثرات پیش کرتا ہوں، ممکن ہے اہلِ علم اصحاب کی توجہ سے اس کے جزئیات دلیل و برہان کے ساتھ مزید روشنی میں آجائیں۔

اگر ممبرانِ اسمبلی کو قانون سازی کا غیر مشروط حق حاصل ہے تو اس حق کا غیر مشروط ہونا ہی اس امر کی کافی ضمانت ہے کہ یہ لوگ صحیح قانون مرتب کرنے میں آزاد ہیں۔ یعنی ان کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ ایسا قانون مرتب کریں جس میں "آخری سند خدا کی کتاب کو مانا جائے اور قانون سازی جو کچھ بھی ہو کتابِ الٰہی کے ماتحت ہو نہ کہ اس سے بے نیاز" کیونکہ آخر زمین کے مُنہ پر خدا کے بندوں ہی کو خدائی قانون کی ذمہ داریوں کو انجام دینا ہے۔ اگر حکم و اختیار نیک بندوں کے ہاتھ میں آئیگا تو یقیناً خدا کی زمین پر نیکی کی اشاعت ہوگی اور بُرائی مٹتی جائے گی۔ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ۔

لہٰذا اس مقصدِ اعلیٰ کے حاصل کرنے کے لیے ایجابی پہلو تو یہ ہوا کہ ایسے لوگوں کے منتخب ہونے کی کوشش کی جائے جن پر رضائے الٰہی کے ماتحت کام کرنے کا گمان غالب ہو، اور سلبی پہلو یہ رہا کہ ایسے لوگوں کے اختیار و اقتدار میں شدید مزاحمت کی جائے جن کی نسبت اس کے برعکس چلنے کا خیال ہو۔ علیحدگی، بائیکاٹ اور تعطّل کا جواز کسی صورت میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ اگر نیک لوگوں کے برسرِ اقتدار آنے میں تعاون نہ کیا جائے تو تعاون علی البر کے خلاف ہے اور اگر خالی چھوڑ کر بُروں کو موقع دے دیا جائے تو سکوت عن الحق کا جرم ثابت۔

ہاں اگر موجودہ جماعتوں میں کوئی جماعت تعاون کی مستحق اور اہل نہیں تو جماعت اسلامی کو میدان میں آنا چاہیئے تاکہ یہ لوگ "اپنا سارا زور اِس اصول کے منوانے میں صرف کر دیں کہ حاکمیت صرف خدا کی ہو اور قانون سازی کتاب الٰہی کی سند پر مبنی ہو" تاہم اس سارے زور کے لیے بائیکاٹ اور تجنّب کا میدان تلاش کرنا یقیناً وضاحت طلب ہے۔

اگر ہر معاملہ کو وقتی قرار دے کر مسلمانوں کو اس سے علیحدہ رہنے کی تلقین کر دی جائے تو ایک ایسی دنیا مسلمانوں کے آباد ہونے کے لیے تلاش کرنی پڑے گی جو اس لیل و نہار اور وقت و زمان کی قیود سے ماوراء ہو۔ نیز یہ بھی خیال کرنا پڑے گا کہ کیا اسلامی نظام کی ہمہ گیری اس سے قاصر ہے کہ وقتی مسائل کو اپنے ابدی و ازلی قوانین کے ماتحت حل کر سکے۔ علیحدگی کسی صورت میں بھی اس مسئلہ کا حل نہیں کہلا سکتی۔ یا اس نظام کے ساتھ منع و مزاحمت کا معاملہ ہو، یا قبول و اذعان کا تعلق۔ اگر پوری مزاحمت ناممکن بھی ہو تو بھی مسلمان حتی الامکان کام کرنے کے لیے مجبور ہے۔

اس سلسلہ میں اکثر اضطرار و اختیار کی بحث پیش آتی ہے۔ سو اس کی نسبت عرض ہے کہ محترم مولانا مودودی صاحب نے اپنی اکثر تحریروں میں اظہارِ افسوس کرتے ہوئے بالوضاحت لکھا ہے کہ بدقسمتی سے اِس وقت ہندوستان میں ایسی کوئی جگہ نہیں جہاں اسلامی قانون بغیر کسی منع و مزاحمت کے نافذ ہو۔ واقعی موجودہ حکومت کے ماتحت رہتے ہوئے اور اس قانون و تمدن میں زندگی بسر کرتے ہوئے یہ بھی ناممکن کہ ہم اپنی تمام قوتوں اور مال و املاک کو نظامِ باطل کا آلۂ کار بننے سے محفوظ رکھ سکیں۔ اور ہندوستان کے وسیع و عریض برِّاعظم میں زمین کا ایک انچ بھر ٹکڑا ایسا تلاش کر سکیں جو اِس نظام کے اثر سے ماؤف نہ ہو۔ تاہم گورداسپور کے ضلع میں قصبہ پٹھانکوٹ کے قریب زمین کے ایک ٹکڑے کو دارالاسلام بنایا جاتا ہے۔ اور اس شیطانی نظام کی تمام خرابیوں کے باوجود اس کے اندر وہ دارالاسلام ہے۔ اور یہ اسی مجبوری کا نتیجہ ہے کہ جو چیز مکمل حاصل نہ کی جا سکے اس میں سے جس قدر حاصل ہو سکے کر لی جائے۔

پھر مولانا نے دارالاسلام کے نظام کی توضیح فرماتے ہوئے اس سے رہبانیت اور قدامت پرستی کے شائبہ کو بھی رفع فرمایا ہے۔ لکھا ہے کہ دارالاسلام کے قیام کا مقصد اکثر غلط فہم پیداروں کی طرح یہ نہیں کہ تمدن و حضارت کی جو حالت صحابہ کرام کے زمانہ میں تھی بالکل وہی پیدا کی جائے

اور ایک مُتحجّر صورت میں قائم رکھی جائے بلکہ آپ آیۃ اَعِدُّوا لَھُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّنْ قُوَّۃٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ تُرْھِبُوْنَ بِہٖ عَدُوَّ اللّٰہِ وَعَدُوَّکُمْ سے استدلال کرکے قوانین طبیعی کی ہر نئی قوت و ایجاد کو شرعی قانون کے ماتحت استعمال کرنا ہی عین اسلام قرار دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر فرمایا ہے کہ:

"ریڈیو بجائے خود ناپاک نہیں، ناپاک وہ تہذیب ہے جو ریڈیو کے ڈائرکٹر کو داروغۂ اربابِ نشاط یا ناشر کذب و افترا بناتی ہے۔"

(رسالہ "دارالاسلام" صفحہ ۲۰)

اور فرمایا:

"یہ طاقتیں تو تلوار کی طرح ہیں کہ جو اُس سے کام لے گا وہی کامیاب ہوگا خواہ وہ ناپاک مقصد کے لیے کام لے یا پاک مقصد کے لیے۔ پاک مقصد والا اگر اپنے مقصد کی پاکی کو لیے بیٹھا رہے اور تلوار استعمال نہ کرے تو یہ اس کا قصور ہے اور اس قصور کی سزا اسے بھگتنی پڑے گی۔ کیونکہ اس عالم اسباب میں خدا کی جو سُنّت ہے اسے کسی کی خاطر نہیں بدلا جاسکتا۔"

(رسالہ مذکورہ صفحہ ۲۰)

اب گزارش ہے کہ اسمبلی کی غیر مشروط قانون ساز قوت یا حکومت کے اختیار کی تلوار کا قبضہ اگر آپ جیسے صحیح الخیال اصحاب کے ہاتھ میں آنے کا موقع مل سکتا ہے تو اسے مسترد کردینے اور اس سے امکانی فوائد حاصل کرنے سے باز رہنے کے لیے وجہ جواز کیا ہے؟ مزاحمتِ باطل اور اعلائے حق کے مصائب سے عمداً کنارہ کش ہوکر گوشۂ عافیت اختیار کرنے کی یہ ایک دانشمندانہ کوشش تو نہیں۔

اگر پاک جماعت اپنے پاک مقاصد کو لیے بیٹھی رہے اور ناپاک مقاصد رکھنے والے لوگوں کے لیے عمداً جگہ چھوڑ دے اور نظام باطل کی گاڑی کے سامنے مزاحمت پیدا کرنے کے بجائے اس کے پہیئے سے اپنے آپ کو بے حس و حرکت باندھ دینا ہی دین داری اور خدمتِ اسلام یقین کرلے تو کیا اس عالم اسباب میں خدا کی سُنّت کے مطابق اس قصور کی سزا بُھگتنی نہیں

پڑے گی؟

یا تو نظامِ باطل سے کامل بے تعلقی عملاً حاصل ہو جائے اور مسلمان ایک خالص اسلامی ماحول پیدا کر لے، لیکن اگر یہ صورت ناممکن ہو جیسا کہ ظاہر ہے تو پھر یہ کون سا مسلک ہے کہ وہ تعاون تو اضطرار "جائز" رکھا جائے جس سے یہ نظام کما حقہ متمتع ہو کر دن بدن مضبوط سے مضبوط تر ہو رہا ہے، اور ان صورتوں سے اختیاراً دست کشی کر لی جائے جہاں کسی قدر اسلامی مفاد بھی حاصل کرنا مقصود ہو۔ اگر اسم اور مسمّٰی میں کسی وجہِ تسمیہ کا ہونا لازم ہے تو ایسی روش کو مسلک (چلنے کی راہ) کے بجائے بقولِ "کوثر" موقف (ٹھہرنے کی جگہ) کہنا زیادہ موزوں ہو گا۔

"کوثر" کے اسی نمبر کے افتتاحیہ میں مولانا نصر اللہ خان عزیز نے بھی اسی مسئلہ پر بحث فرمائی ہے جس کے مطالعہ سے اس سلسلہ میں اور بھی الجھن پیدا ہو جاتی ہے اور جمود و تعطّل کا شائبہ یقین کی حد کو پہنچ جاتا ہے۔ آپ جہاد کے لیے دو شرطیں مقرر فرماتے ہیں۔ لکھا ہے:

> "اس کے لیے دو شرطیں ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ وہ بااختیار امیر کی قیادت میں ہو، کسی دوسرے نظامِ قاہر و مستلط کے اندر رہتے ہوئے جہاں کسی بااختیار امیر کا وجود ناممکن ہے قتال کرنا بدامنی اور فساد ہے جو جائز نہیں۔"

یہ حکم مزید توضیح کا محتاج نہیں۔ بااختیار امیر کی قیادت کے بغیر جہاد فساد ہے اور امیر کا وجود کسی دوسرے قاہر و مستلط نظام کی موجودگی میں ناممکن ہے[1]۔

اس شرط کی صحت تسلیم کر لینے کے بعد نظامِ حقہ قائم ہونے کی صرف یہی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ قاہر و مستلط نظام کے ارکان خود بخود مہربانی کر کے مسلمانوں پر سے اپنا قہر و تسلط اٹھا لیں اور انہیں کامل آزاد ماحول میں چھوڑ کر ٹھنڈے ٹھنڈے کہیں سدھار جائیں تاکہ مسلمان

---

[1] یہ محض ایک مغالطۂ مبحث ہے۔ مدیر کوثر نے اس موقع پر جس جہاد سے بحث کی ہے وہ جہاد بالسیف ہے نہ کہ وہ جہاد جو جدّ و جہد کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ اس دوسری قسم کے جہاد کے لیے بااختیار امیر کی شرط کا کوئی بھی قائل نہیں۔ (قدیم)

کو ایک با اختیار قیادت قائم کرنے کا شرعی حق حاصل ہو جاتے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ پھر جہاد کی ضرورت رہے یا نہ رہے۔ بہر حال جہاد حلال ہونے کی شرط یہی ہے۔

اگر یہ شرعی فتویٰ کسی غیر متقی کو مشتبہ نظر آتے تو پھر سوا اس کے چارۂ کار نظر نہیں آتا کہ جس طرح نظام باطل کے منع و مزاحمت کے باوجود ایک غیر اسلامی ماحول میں دارالاسلام قائم کرنے کی کوشش مناسب و موزوں بلکہ ضروری نظر آتی ہے اور اس نظام کے پیدا کردہ تمام آلات و قوٰی سے کام لینا عین اسلام اور کام نہ لینا ہلاکت قرار دیا جاتا ہے، وہاں اسمبلیوں سے اپنا حصّہ حاصل کرنا اور اس کو صحیح طور پر استعمال کرنا ہی تقاضائے عقل و انصاف ہے۔

مسلم لیگ کی پیدا کردہ موجودہ فضا اس مقام پر پہنچ چکی ہے کہ اگر دیہات کے ناخواندہ زمینداروں کے سامنے، جو آج تک ذات پات کی عصبیت میں اعراب عرب سے کسی حالت میں کم نہیں تھے، ایک طرف کوئی غیر متشرع نواب ہوتا اور دوسری طرف ایک عالم دین تو یقیناً وہ عالم دین کو کامیاب کر کے چھوڑتے۔ اس نادر موقع سے فائدہ اُٹھانے اور عوام کو مذہبی قیادت سے محروم رکھنے کی ذمہ داری صرف ان لوگوں پر ہے جو محض اپنے آرام کی خاطر علماء کو بائیکاٹ کا مشورہ دے رہے ہیں۔

یوسف صدیق علیہ السّلام نے اِجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ کا مطالبہ کر کے غیر اسلامی حکومت کے ایک شعبہ کو ہاتھ میں لیا اور بہترین انتظام کر کے دنیا کو ہلاکت سے بچایا۔

موسیٰ علیہ السّلام نے فرعون سے اَنْ اَدُّوْٓا اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰهِ اور اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ کے مسلسل مطالبات کر کے ایک غیر مہذب اور غیر صالح بھیڑ کو اسی ملک کے ایک حصّہ میں رکھ کر اصلاح و تہذیب کی کوشش کی۔

مریض کی صحت اُنہی اخلاط کی تبدیلی پر منحصر ہے جو مریض کے وجود کے اندر موجود ہیں۔ ہمسائے کے گھر میں خواہ کسی قدر بہترین اور قیمتی ادویات کا انبار عمدہ سے عمدہ قرینہ اور ترتیب ہی سے کیوں نہ لگا دیا جائے دوسرے گھر والا مریض صحت یاب نہیں ہو سکتا۔

جواب

یہ مضمون دراصل متعدد مغالطوں یا غلط فہمیوں کا مجموعہ ہے۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں کو نظر انداز کر کے یہاں ہم صرف تین بڑی اور بنیادی غلط فہمیوں کو دُور کرنے کی کوشش کریں گے۔

(۱) صاحب مضمون کی پہلی غلط فہمی یہ ہے کہ "اگر ممبرانِ اسمبلی کو قانون سازی کا غیر مشروط حق حاصل ہے تو اس حق کا غیر مشروط ہونا ہی اس امر کی کافی ضمانت ہے کہ یہ لوگ صحیح قانون مرتب کرنے میں آزاد ہیں، یعنی ان کو اختیار حاصل ہوگا کہ ایسا قانون مرتب کریں جس میں آخری سند خدا کی کتاب کو مانا جاتے۔" بظاہر یہ بات بڑی معقول معلوم ہوتی ہے لیکن اس کی تھوڑی سی تحلیل کرنے سے ہی یہ حقیقت بآسانی کُھل جاتی ہے کہ یہ مغالطہ یا غلط فہمی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ آزادی کا ایک مفہوم یہ ہے کہ انسان کو یا انسانوں کے کسی گروہ کو کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا اختیار حاصل ہو۔ اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ کوئی انسان یا انسانوں کا کوئی گروہ اپنا یہ اصول قرار دے اور اس نظریے پر کاربند ہو کہ وہ اپنے عمل میں خود مختار ہے اور خود اپنی خواہش اور صوابدید کے سوا کسی آسمانی ہدایت سے امر و نہی کے احکام لینے اور اپنے معاملات میں رہنمائی حاصل کرنے کا پابند نہیں ہے۔ ان دونوں مفہومات میں سے پہلے مفہوم کی آزادی تو انسان کی فطری مسئولیت و ذمہ داری کی اساس ہے جس کی بنیاد ہی پر وہ شرائعِ الٰہیہ کا مخاطب بنایا گیا ہے۔ یہ آزادی مومن ہونے کے لیے بھی اسی طرح ناگزیر ہے جس طرح کافر ہونے کے لیے۔ اسے ایمان و اسلام کی راہ میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے اور کفر و معصیت کی راہ میں بھی۔ اس کو بجائے خود نہ کُفر کہا جا سکتا ہے نہ ایمان، بلکہ یہ ایک شرطِ مقدّم ہے جس کے حصول کے بغیر کوئی فرد یا گروہ نہ ایمان کی راہ پر چل سکتا ہے نہ کفر کی راہ پر۔ بخلاف اس کے دوسری قسم کی آزادی قطعی طور پر ایک کافرانہ آزادی ہے اور کسی فرد یا قوم کا اُسے بطور ایک نظریہ و مسلک کے اختیار کرنا صریحاً یہ معنی رکھتا ہے کہ اس نے ایمان کے بجائے کُفر کی راہ اپنے لیے انتخاب کی ہے، کیونکہ کُفر اِس کے سوا کسی اور چیز کا نام ہی نہیں ہے کہ انسان اپنے آپ کو ہدایتِ الٰہی سے بے نیاز قرار دے کر اپنے نظریات و

اعمال میں خود مختاری کا طریقہ اختیار کرے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہندوستان میں جس دستور پر حکومت خود اختیاری کا نظام اِس وقت قائم کیا گیا ہے اور جن خطوط پر آئندہ اس دستور کا نشوونما ہو رہا ہے، اس کی بنیاد آیا محض پہلی ہی قسم کی آزادی ہے یا دوسری قسم کی آزادی بھی اس میں شامل ہے؟ جو شخص ہندوستان کے موجودہ نظامِ حکومت سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ پورا نظام دنیوی، لادینی ریاست (Secular State) کے نظریہ پر مبنی ہے، اور اب جو اس کا مزید دستوری ارتقا ہو رہا ہے اس میں بھی یہ بات اصل واساس کے طور پر تسلیم کر لی گئی ہے کہ وہ اسی دُنیوی لادینی ریاست کے قاعدہ پر مبنی ہوگا، یعنی اس میں باشندگانِ ملک کو صرف یہی آزادی حاصل نہیں ہوگی کہ اپنے لیے جو دستور چاہیں اختیار کریں، بلکہ اس کی بنیاد لازماً اس نظریہ پر قائم ہوگی (اور آج بھی ہے)، کہ حاکمیت (Sovereignty) جمہور کی ہے اور قانون سازی میں رائے عام سے بالاتر کسی کتابِ الٰہی اور ہدایتِ خداوندی سے رجوع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس بنا پر یہ پورا نظام دراصل ایک کافرانہ نظام ہے، اِس کی بنیاد اسلام کی بنیاد سے متصادم ہے اور اس کے اصول کو تسلیم کرتے ہوئے اِس میں داخل ہونا قطعاً ایمان کے خلاف ہے۔ یہ آواز اگر صرف "پٹھان کوٹ" سے اُٹھی ہے تو اس میں بے چارے "پٹھان کوٹ" کا کوئی قصور نہیں، قصور اُن دوسری جگہوں کا ہے جہاں سے یہ اُٹھنی چاہیئے تھی مگر نہ اُٹھی۔

یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ہم اس نظام کے اندر داخل ہو کر[1] اس کو اسلام کی طرف پھیر لیں گے۔ اس کے اندر داخل ہونا بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ پہلے اس کے بنیادی نظریئے کو تسلیم کیا جائے، اور اس کے بُنیادی نظریئے کو تسلیم کرنا اسلام کے بنیادی نظریئے سے انکار کا ہم معنی ہے۔ لہٰذا مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے کہ باہر رہتے[2] ہوئے اس کے خلاف لڑیں اور اپنی تمام تر کوشش پہلے یہ اصول

---

[1] یعنی اس کی کارفرمائی و کارکنی میں شریک و حصہ دار بن کر۔

[2] باہر رہنے سے ہماری مراد حکومت کی مشینری سے باہر رہنا ہے، نہ کہ اس تمدن سے باہر نکل جانا جو اس حکومت کے تحت چل رہا ہے۔

منوانے میں صرف کریں کہ قانون سازی کتابِ الٰہی کی سند پر مبنی ہونی چاہیئے نہ کہ اس سے آزاد، اور باشندگانِ ملک کی حکومت خود اختیاری دوسری قوموں اور ملکوں کے مقابلہ میں خود اختیاری ہونی چاہیئے، نہ کہ خدا کے مقابلہ میں۔ اصولی حیثیت سے قطع نظر عملی حیثیت سے بھی یہ تدبیر قطعاً ایک غلط تدبیر ہے کہ اِس کافرانہ نظامِ حکومت کی مجالسِ قانون سازی میں داخل ہو کر ہم مذکورۂ بالا اصول منوانے کی کوشش کریں۔ یہ پارلیمنٹری طریقِ کار صرف اُن جماعتوں کے لیے مفید ہو سکتا ہے جو اصول میں رائج الوقت نظام سے متفق ہوں اور صرف فروعی اصلاحات کے معاملہ میں اپنا الگ مسلک رکھتی ہوں۔ لیکن جو جماعت سرے سے اس نظام ہی کو اصولی طور پر بدل ڈالنا چاہتی ہو اس کے لیے پارلیمنٹری طریقِ کار کسی طرح مفید نہیں ہو سکتا۔ اس کو تو لازماً انقلابی طریقِ کار اختیار کرنا پڑتا ہے، یعنی یہ کہ وہ رائج الوقت نظام کے خلاف عام بے چینی پیدا کرے۔ اور اس کو بدلنے کا ایک زبردست داعیہ باشندگانِ ملک میں اُبھار دے، پھر وقت کے حالات کے لحاظ سے ایسی تدبیر اختیار کرے جس سے نظامِ حکومت عملاً تبدیل ہو سکے۔

(۲) دوسری غلط فہمی جس میں صاحبِ مضمون مبتلا ہیں، یہ ہے کہ ان کے نزدیک اس نظام کی اصلاح اِس طرح اور صرف اِسی طرح ہو سکتی ہے کہ اچھے لوگوں کو منتخب کر کے اُن اسمبلیوں میں بھیجنے کی کوشش کی جائے جو اِس کافرانہ دستور پر بنائی گئی ہیں، اور چونکہ جماعت اسلامی نے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا ہے اس لیے وہ سمجھتے ہیں کہ اس جماعت نے محض علیحدگی و اجتناب کا سلبی پہلو اختیار کر رکھا ہے جس سے اصلاح تو کسی طرح نہ ہو گی البتہ اقتدار کی تلوار بُرے لوگوں کے ہاتھ میں جا کر باطل کو اور زیادہ مضبوطی کے ساتھ جمانے میں استعمال ہو گی۔ اس غلط فہمی میں نہ صرف صاحبِ مضمون مبتلا ہیں، بلکہ بکثرت لوگ اِسی طرز پر سوچ رہے ہیں اور اس کی اصل وجہ سطح بینی اور قلتِ فکر و تدبر کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ دراصل یہ حضرات اس بات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ کروڑوں مسلمانوں کے موجود ہوتے ہوئے موجودہ کافرانہ نظام اِس ملک میں آخر قائم کیسے ہو گیا؟ اور کیا وجہ ہے کہ ملک کا سارا دستوری ارتقا اِنہی کافرانہ اصولوں پر ہوتے چلا جا رہا ہے؟ اس سوال پر اگر انہوں نے کچھ غور کیا ہوتا تو ان پر

خود یہ حقیقت منکشف ہو جاتی کہ اس خرابی کی اصل وجہ صرف یہ ہے کہ مسلمانوں میں عموماً شعورِ اسلامی مردہ یا نیم مردہ ہو گیا ہے، ان کے اندر اسلامی دستورِ حیات پر چلنے اور اس کے لیے جینے اور مرنے کا ارادہ مفقود یا فقدان کی حد تک ضعیف ہے۔ اور انہوں نے ہندستان کے غیر مسلم باشندوں کو بھی صحیح نظامِ زندگی سمجھانے اور اس کی طرف دعوت دینے کی کوئی کوشش نہیں کی ہے۔ اسی وجہ سے مسلمانوں کی اپنی زندگی بھی فکری، اخلاقی اور تمدنی حیثیت سے بیشتر غیر اسلامی ہو گئی ہے اور ہندوستان کا پورا نظامِ تمدن و سیاست بھی کافرانہ اصولوں پر قائم ہو گیا ہے۔ اب اس خرابی کا اور اس کے بُرے نتائج کا مداوا کرنے کے لیے اس قسم کی تدابیر سے کچھ کام نہیں چل سکتا کہ اس کافرانہ نظام کی مشینری میں ہم چند نیک مومنوں کو بھجوانے کی کوشش کریں۔ تھوڑی دیر کے لیے اگر اس اصولی سوال کو نظرانداز کر بھی دیا جائے کہ ایک نیک مومن اس مشینری کی کافرانہ بنیادوں کو تسلیم کر کے اس میں داخل ہونے پر آمادہ ہی کیسے ہو سکتا ہے، اور اگر تقیہ کے شیعی طریقہ کو اختیار کر کے چند مومن اس نظام میں داخل ہونے پر آمادہ ہو بھی جائیں، تو دیکھنا یہ ہے کہ اس تدبیر سے حاصل کیا ہو سکتا ہے۔

جمہوری نظام میں کوئی گروہ اپنے اصول کے مطابق نظامِ حکومت کو اس وقت تک ہرگز نہیں چلا سکتا جب تک کہ وہ حکومت کی مشینری پر قابض نہ ہو۔

حکومت کی مشینری پر قابض ہونے کے لیے ضروری ہے کہ مجالسِ قانون ساز میں اس گروہ کو غالب اکثریت حاصل ہو۔

اس غالب اکثریت کا حصول بحالاتِ موجودہ ہندوستان کے ایک بڑے حصّہ میں اہلِ ایمان کے لیے ممکن نہیں ہے، کیونکہ اس وقت اسلام اس ملک میں ایک ایسی اصولی تحریک کی حیثیت نہیں رکھتا جس کے علمبردار باشندگانِ ملک سے محض اپنے اصول کی بنا پر عام اپیل کر سکتے ہوں اور یہ امید کی جا سکے کہ وہ اپنی دعوت کو مقبولِ عام بنا کر اکثریت کی تائید حاصل کر لیں گے۔ فی الحال تو اسلام ہندوستان کی ایک ایسی قوم کا مذہب ہے جس کی دوسری قوموں سے کشمکش ہو رہی ہے۔ لہٰذا اگر کوئی گروہ اس وقت خالص اسلامی اصول لے کر انتخابی مقابلہ میں اُترے گا تو مسلمان قومیت کے پرستاروں کی طرح اس کو بھی صرف موجودہ مسلمان قوم ہی کے ووٹوں پر انحصار کرنا پڑیگا،

اور معلوم ہے کہ یہ قوم ملک کے بڑے حصّے میں بجائے خود اقلیت میں ہے۔

رہے وہ علاقے جہاں مسلمانوں کو اکثریت حاصل ہے، تو اگر بالفرض وہ پاکستان کی صورت میں خود مختار ہو جائیں اور ایک مستقل صاحبِ حاکمیت اسٹیٹ کی حیثیت بھی ان کو حاصل ہو جائے تب بھی خالص اسلامی اصولوں پر جو گروہ کام کرنا چاہتا ہو اس کے غالب اکثریت حاصل کرنے کا بحالت موجودہ وہاں بھی کوئی امکان نہیں ہے، کیونکہ ان علاقوں میں اس کے اکثریت حاصل کرنے کا تمام تر انحصار مسلمانوں کی رائے عام پر ہے اور مسلمانوں کی رائے عام اس وقت بالکل ناتربیت یافتہ ہے، اسلامی فہم و شعور سے بہت بڑی حد تک عاری ہے اور اسلامی مقاصد کی بہ نسبت اپنی دنیوی خواہشات و اغراض کے عشق میں بُری طرح مبتلا ہے۔ اس رائے عام کی تائید سے کسی ایسے گروہ کا اکثریت کے ساتھ منتخب ہونا تقریباً ناممکن ہے جو بے لاگ طریقہ سے خالص اسلامی اصولوں پر کام کرنا چاہتا ہو۔

پھر اگر بالفرض ایسا ایک گروہ اکثریت میں منتخب ہو بھی جائے تو جو حالات اس وقت پائے جاتے ہیں ان میں یہ ممکن نہیں ہے کہ آزاد پاکستان کے نظام کو اسلامی دستور میں تبدیل کیا جا سکے۔ کیونکہ جنت الحمقا میں رہنے والے لوگ اپنے خوابوں میں خواہ کتنے ہی سبز باغ دیکھ رہے ہوں، لیکن آزاد پاکستان (اگر فی الواقع وہ بنا بھی تو) لازماً جمہوری لادینی اسٹیٹ کے نظریہ پر بنے گا جس میں غیر مسلم اسی طرح برابر کے شریکِ حکومت ہوں گے جس طرح مسلمان، اور پاکستان میں اُن کی تعداد اتنی کم اور اُن کی نمائندگی کی طاقت اتنی کمزور نہ ہوگی کہ شریعتِ اسلامی کو حکومت کا قانون اور قرآن کو اُس جمہوری نظام کا دستور بنایا جا سکے[1]

---

[1] واضح رہے کہ یہ مضمون فروری ۱۹۴۶ء میں لکھا گیا تھا جب پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا تخیل تک پیدا نہ ہوا تھا، اور مسلم لیگ کے تجویز کردہ مسلم علاقے میں آسام بھی پورا کا پورا شامل تھا۔ اُس وقت مجوزہ پاکستان کے مغربی حصے میں غیر مسلموں کی تعداد ۲۷،۹۳ فی صدی اور مشرقی حصے میں ۴۸،۳۱ فی صدی تھی۔ مزید برآں دونوں حصوں میں غیر مسلموں کو معاشی، سیاسی، تعلیمی اور انتظامی حیثیت سے اتنی قوت حاصل تھی کہ ان کی اس تعداد اور اس طاقت کی موجودگی میں پاکستان کے اندر اسلامی ریاست کا خیال محض (باقی صفحہ ۲۵۲ پر)

ہم ان حقائق کو سمجھتے ہیں اور اس بنا پر ہمارے نزدیک وہ تدابیر بالکل لاحاصل ہیں جن سے ہمارے محترم مضمون نگار اور ان کے طرز پر سوچنے والے بہت سے مسلمان اسلامی نظام کے قیام کی اُمیدیں وابستہ کیے بیٹھے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس مقصد تک پہنچنے کا کوئی راستہ اس کے سوا نہیں ہے کہ موجودہ حالات میں ہندوستان کا سیاسی نظام جس ڈھنگ پر چل رہا ہے اور جس راہ پر وہ آگے بڑھتا نظر آرہا ہے اس سے فی الحال ہم قطع نظر کرلیں اور اپنی ساری قوت اُس بنیادی کام پر صرف کریں جس کے ذریعہ سے نظامِ زندگی میں اسلامی طرز کا انقلاب رونما ہو سکتا ہے۔ مسلمانوں کی جو جماعتیں حقیقی صورتِ معاملہ کو اچھی طرح نہیں سمجھ رہی ہیں وہ اپنے طرزِ عمل میں آزاد ہیں، جس طرح وہ کام کرنا چاہیں کریں، ہم ان کے خلاف خواہ مخواہ کوئی معرکہ آرائی نہیں کرنا چاہتے۔ لیکن ہم یہ جانتے ہیں کہ پچھلے زمانہ کی غلطیوں کی بدولت اس وقت فوری طور پر ایسی کوئی قوت فراہم نہیں کی جاسکتی جس سے واقعات کی موجودہ رفتار پر وہ کم سے کم اثر بھی ڈالا جاسکے جو اسلام کے مقصد کے لیے مطلوب ہے۔ اس لیے ہم اس وقت کی سیاسی کارروائیوں میں دخل دینا تضیعِ وقت بھی سمجھتے ہیں اور اس وجہ سے بھی اس سے احتراز کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اس وقت ہم اپنے اصول سے ہٹے بغیر سیاسی جدوجہد میں حصہ نہیں لے سکتے۔ نیز ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اس وقت سیاسی معاملات کا فیصلہ خواہ کچھ ہو جائے اور اس کے نتائج آگے چل کر خواہ کتنے ہی خوفناک نکلتے نظر آئیں، لیکن اگر ہم اُس پروگرام پر ٹھیک ٹھیک عملدرآمد کرنے میں کامیاب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵۱ سے) کرنا اُتنا ہی مشکل تھا جتنا وہ ہندوستانی اکثریت کے علاقوں میں تھا۔ درحقیقت حالات نے پلٹا اُس وقت کھایا جب بنگال، آسام اور پنجاب تینوں صوبے ۱۹۴۷ء کے وسط میں تقسیم کر دیئے گئے، اور مزید تغیر اس وقت ہوا جب عین تقسیم ہند کے موقع پر آبادیوں کا جبری تبادلہ رونما ہوا جو کسی اسکیم میں شامل نہ تھا۔ اس طرح مشرق میں مسلم آبادی کا تناسب ۸۰ فی صدی اور مغرب میں ۹۸ فی صدی ہو گیا۔ اس کے باوجود پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے میں جیسی جیسی دشواریاں پیش آئی ہیں ان سے اب کوئی بھی ناواقف نہیں ہے۔ (جدید)

ہوگئے جو ہمارے پیش نظر ہے تو واقعات کی رفتار بالآخر پلٹ کر رہے گی اور ان سارے نقصانات کی تلافی ہو جائے گی جو اِس وقت کے اجتناب سے ہمیں پہنچیں گے ۔ ہمارا پروگرام مختصر یہ ہے :

(الف) مسلمانوں کے اِس مخلوط انبوہ میں سے صالح اہلِ ایمان کے عنصر کو چھانٹ کر اعلیٰ درجہ کی اخلاقی تربیت کے ساتھ منظم کیا جائے اور ان کو اس کام کے لیے تیار کیا جائے کہ وہ مسلم قومیت کے بجائے خود اسلام کو ایک اصولی تحریک کی حیثیت سے لے کر اُٹھ سکیں ۔

(ب) اس گروہ کے ذریعہ سے عامۂ مسلمین میں اِسلامی شعور و فہم اور اسلام اور غیر اسلام کی تمیز پیدا کی جائے ، ان کی اخلاقی قدروں (Moral Values) کو تبدیل کر کے خالص اسلامی قدریں ان کے ذہن نشین کی جائیں ، اُن میں اِسلامی نظامِ زندگی کے قیام کا مضبوط ارادہ (موہوم اور مبہم ارادہ نہیں بلکہ واضح اور شعوری ارادہ) پیدا کیا جائے اور ان کی رائے عام کو اس حد تک تیار کر دیا جائے کہ اگر جمہوری طریقوں پر ملک میں انقلاب کرنا ممکن ہو تو خالص اِسلامی طرز پر کام کرنے والی جماعت کے سوا کوئی دوسرا گروہ انہیں بیوقوف بنا کر یا ان کے سامنے غیر اسلامی مقاصد پیش کر کے ان سے ووٹ نہ حاصل کر سکے ، اور اگر جمہوری طریقے قابلِ عمل نہ ہوں تو وہ اِسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے پر آمادہ ہو جائیں ۔

(ج) مسلمانوں اور غیر مسلموں کی موجودہ سیاسی کشمکش سے جو تعصّبات ہندوستان کے غیر مسلموں میں پیدا ہو گئے ہیں اُن سے بالاتر ہو کر غیر مسلموں کے سامنے اِسلامی نظامِ زندگی کو اور اُن اخلاقی بنیادوں کو جن پر یہ نظامِ زندگی قائم ہوتا ہے ، پیش کیا جائے اور پوری حکمت ، جانفشانی اور خالص لِلّٰہیت کے ساتھ ایسے حالات پیدا کیے جائیں جن میں یہ ممکن ہو کہ غیر مسلموں کا بھی ایک صالح عنصر اسلامی نظامِ زندگی کا معتقد اور اس کے قیام کا طالب ہو جائے اور اِسلامی نظام کا قیام صرف موجودہ مسلمان قوم کی رائے عام پر منحصر نہ رہے بلکہ اُن قوموں کی رائے عام بھی اس کی مؤیّد ہو جائے جو آج غیر مسلم ہیں اور جن کو مسلمانوں کی موجودہ قومیت پرستانہ جنگ نے اسلام کے خلاف سخت تعصّبات میں مبتلا کر رکھا ہے ۔

اِس پروگرام میں جب ہم ایک قابلِ لحاظ حد تک کامیاب ہو جائیں گے (اور ہمیں یقین ہے کہ جس طرز پر ہم کام کر رہے ہیں اس سے آخر کار انشاء اللہ ہم کو کامیابی ضرور ہوگی) تب ہم ملک

کے حالات پر نظر ڈال کر دیکھیں گے کہ آیا اِس وقت یہاں جمہوریت اتنی ترقی کر چکی ہے کہ دستورِ حکومت میں کوئی اصولی تغیّر صرف اِس بنیاد پر ہو سکتا ہے کہ رائے عام اُس تغیّر کی خواہش مند ہے؟ اگر یہ صورت ہم نے موجود پائی تو ہم وقت کے دستورِ حکومت کو تبدیل کرنے اور اسلامی اصول پر نیا دستور بنانے کا مطالبہ ملک کی رائے عام کے سامنے پیش کریں گے، اس تغیّر کے لیے اِسے تیار کریں گے، اور وقت کے سیاسی نظام پر دباؤ ڈالیں گے کہ وہ ایک نئی دستور ساز اسمبلی (Constituent Assembly) منعقد کرے جو اس امر کا فیصلہ کرے کہ ملک کا آئندہ دستور کیا ہو۔ اس اسمبلی کے الیکشن میں ہم پوری کوشش کریں گے کہ رائے عام کی تائید سے ہم کو اکثریت حاصل ہو اور ہم ملک کا دستور اسلامی اصولوں پر قائم کریں۔

بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اس پروگرام کو ایک بڑا لمبا پروگرام سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ شاید اس کے پورا ہونے میں دو تین صدیاں لگ جائیں گی، اس لیے اُن کے نزدیک یہ کوئی عملی پروگرام نہیں ہے بلکہ وہ اسے خیالی پلاؤ سمجھتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس پروگرام میں سارا دیر طلب کام صرف اُس ابتدائی صالح گروہ کی تنظیم و تربیت کا ہے جو اسلامی انقلاب کی ایک وسیع تحریک کا موزوں محرک بن سکے۔ ایسے ایک گروہ کی تنظیم کے بعد یہ تحریک اس طرح پھیلے گی جیسے خشک گھاس میں آگ پھیلتی ہے۔ وقت کے تعین کی پیشین گوئی تو میں نہیں کر سکتا، لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس ابتدائی مرحلے کے گزرنے کے بعد ہماری منزلِ مقصود اتنی دُور نہیں رہے گی جتنی بہت سے لوگ کام کیے بغیر صرف اپنے خیال میں دُور سمجھ رہے ہیں۔ تاہم اگر وہ دُور بھی ہو تو چونکہ منزلِ حق وہی ہے اس لیے ہم اس کی طرف دوڑتے ہوئے مر جانا زیادہ بہتر سمجھتے ہیں بہ نسبت اس کے کہ جانتے بوجھتے غلط گر آسان راہوں میں اپنی قوت صرف کریں یا نادانی کے ساتھ جنت الحمقاء کے حصول میں اپنی قوت ضائع کریں۔

(۳) تیسری غلط فہمی جس میں صاحبِ مضمون کے ساتھ بہت سے سادہ لوح مسلمان مبتلا ہیں، یہ ہے کہ مسلم لیگ کی پیدا کردہ موجودہ فضا اِس مقام پر پہنچ چکی ہے کہ عام مسلمانوں کے ووٹوں سے صالح مومنین کا ایسا گروہ منتخب ہو کر آ سکتا ہے جو وقت کی سیاسی رفتار کو

اسلامی نصب العین کی طرف پھیرنے کے قابل ہو۔ اسی بنا پر یہ حضرات کہتے ہیں کیسا نادر موقع مل رہا ہے اور تم اسے کھوئے دیتے ہو۔ اندھے ایمان کی بات تو دوسری ہے کہ اس میں تحقیق کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اور جب کوئی تحریک شور و غل اور ہنگامہ کے ساتھ طوفانی رفتار سے چل رہی ہو تو عام طبائع میں اندھے ایمان کا رجحان پیدا ہو ہی جایا کرتا ہے لیکن جب ہم تحقیق کی نگاہ ڈال کر اس فضا کا جائزہ لیتے ہیں جو مسلم لیگ نے پیدا کی ہے تو ہمیں کسی نادر تو درکنار غیر نادر موقع کا بھی نشان نہیں ملتا۔

مسلم لیگ کی تحریک کے متعلق پہلی بات تو یہ سمجھ لیجیے کہ اُس کے بنیادی تصورات، اُس کا نظام ترکیبی، اُس کا مزاج اور اُس کی اسپرٹ، اُس کا طریق کار اور اُس کے مقاصد سب کچھ وہی ہیں جو قومی اور قوم پرستانہ تحریکوں کے ہوا کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ یہ مسلمانوں کی قومی تحریک ہے اور مسلمان کی ہر چیز "اسلامی" بن جایا کرتی ہے اس لیے خواہ مخواہ اسے بھی اسلامی تحریک سمجھ لیا گیا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسلامی تحریک اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل ایک دوسری ہی چیز ہوتی ہے جس کا کوئی شائبہ بھی مسلم لیگ کی قومی تحریک میں نہیں پایا جاتا، اور یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ اسلام اپنے مخصوص طریق کار سے جس منزل تک پہنچنا چاہتا ہے اس تک آپ ایک قوم پرستانہ تحریک کے ڈھنگ اختیار کرکے پہنچ جائیں۔ ہر منزل اپنی فطرت کے لحاظ سے اپنی ہی ایک مخصوص راہ رکھتی ہے۔ آپ اسلام کی منزلِ مقصود کو پہنچنا چاہیں تو آپ کو اسلامی تحریک ہی کی مخصوص راہ کو سمجھنا اور اُسے اختیار کرنا پڑے گا۔ قوم پرستی کے طریقے اختیار کرکے آپ قومیت کی منزلِ مقصود تک پہنچ سکتے ہیں مگر یہ توقع کرنا انتہائی پراگندہ خیالی ہے کہ ان ڈھنگوں سے آپ اسلامی منزلِ مقصود پر جا پہنچیں گے۔ اس نکتہ کی توضیح کا یہاں موقع نہیں ہے۔ مَیں اس سے پہلے تفصیل سے بتا چکا ہوں کہ ایک اصولی تحریک اور ایک قوم پرستانہ تحریک میں کیا فرق ہوتا ہے۔ ضرورت ہو تو پھر اس کی تشریح کر سکتا ہوں۔ یہاں میں اشارۃً صرف اتنی بات واضح کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ ایک اصولی تحریک کے کارکنوں کو یہ خبر دینا کہ تمہارے لیے ایک قوم پرستانہ تحریک نے بڑے اچھے مواقع پیدا کر دیتے ہیں کسی بصیرت اور معاملہ فہمی کا ثبوت نہیں ہے۔

اس کی مثال تو بالکل ایسی ہے جیسے کسی عازم کلکتہ کو یہ خبر دی جائے کہ کراچی میل تیار کھڑا ہے۔
ان کی یہ خوشخبری کسی حد تک اگر صحیح ہو بھی سکتی تھی تو شاید اُس صورت میں ہوتی جب کہ مسلمانوں کی اس قوم پرستانہ تحریک میں کم از کم ثانوی حیثیت ہی سے مذہبیت کا پُر زور اثر موجود ہوتا۔ لیکن افسوس ہے کہ یہاں اس کا بھی فقدان ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ مسلم لیگ فی الواقع مسلمانوں کو اسلام اور اس کی تہذیب اور اس کے احکام کی اطاعت سے روز بروز دُور تر لیے جا رہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عام مسلمانوں کے جذبات کو بھڑکانے کے لیے اس میں اسلام کا نام بہت لیا جاتا ہے، اور ایسی نمائشی باتیں بھی کچھ کر دی جاتی ہیں جن سے اکابر لیگ کے گہرے جذبۂ دینی کا ثبوت بہم پہنچ جاتے، لیکن یہ چیزیں صرف سطح بین لوگوں کو دھوکے میں ڈال سکتی ہیں۔ حقیقت جو کچھ ہے وہ ہر صاحبِ نظر کے سامنے بالکل بے نقاب ہے۔ لیگ کی قیادت، اس کی پالیسی کی تشکیل، اس کے پورے نظام کی کارفرمائی، اور اس کی ساری قوتِ محرّکہ اس وقت مسلمان قوم کے ایک ایسے طبقہ کے ہاتھ میں ہے جو زندگی کے جملہ مسائل میں دینی کے بجائے دُنیوی (Secular) نقطۂ نظر سے سوچنے اور کام کرنے والا ہے، اسلام کے بجائے مغربی اصولِ حیات کا معتقد اور مقلد ہے، دینی تعلق کے بجائے قومیت کے تعلق کی بنا پر مسلمانوں کی حمایت و وکالت اُسی طرح کر رہا ہے جس طرح ہر قوم پرست کیا کرتا ہے، اور صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ یہ گروہ خود علانیہ اسلام کے اصول و احکام کی خلاف ورزی کرنے میں بیباک ہے بلکہ اس کی رہنمائی و سربراہ کاری کی وجہ سے مسلمانوں میں بالعموم اسلام کے احکام کی خلاف ورزی اور اس خلاف ورزی میں بیباکی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے، اُن کی دینی حس مُردہ ہو رہی ہے اور ان پر وہ ذہنیت بڑی تیزی کے ساتھ چھا رہی ہے جو اپنی اصل کے لحاظ سے قطعاً ایک دُنیا پرستانہ ذہنیت ہے مگر "مسلم قوم کے مفاد" اور "ملت کی زندگی کے بقا" کا نام لے لے کر اس پر "اسلامیت" کا جھوٹا ملمع چڑھایا جا رہا ہے۔
کوئی شک نہیں کہ اس صورتِ حال کے پیدا کرنے کی ذمہ داری میں اُن مذہبی رہنماؤں کی نادانی بھی برابر کی شریک ہے جن کے ہاتھ میں تحریکِ خلافت کے زمانہ سے مسلمانوں کی قیادت کی باگیں تھیں اور جنہوں نے مسلمانوں کے عام احساسات کے علی الرغم ہندوستانی قوم پرستی کے

سراسر غلط مسلک پر اصرار کر کے مسلمانوں کو زبردستی لامذہب رہنماؤں کی گود میں دھکیل دیا لیکن اسباب خواہ کچھ ہوں، یہ امر بجائے خود واقعہ ہے کہ مسلم لیگ کی پیدا کی ہوئی موجودہ فضا اسلام کے لیے کوئی موافق فضا نہیں ہے بلکہ انتہائی ناموافق اور ناسازگار فضا ہے جس میں خالص دینی نقطۂ نظر سے کام کرنے کے مواقع کم اور کم تر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ میں مانتا ہوں کہ لیگ کے حلقے میں ایسے لوگوں کا بھی ایک بہت بڑا گروہ شامل ہے جو اخلاص کے ساتھ مسلمان ہیں اور سچے دل سے اسلام کی برتری چاہتے ہیں۔ مگر مجھے ان کی سادہ لوحی پر بڑا ترس آتا ہے۔ یہ بیچارے اُسی نادانی کا ارتکاب کر رہے ہیں جس کا ارتکاب ٹرکی کے بہت سے نیک نیت مسلمانوں نے پہلی جنگِ عظیم کے بعد کیا تھا اور اس کا بُرا انجام دیکھ لیا۔ انہوں نے بھی اِسی طرح قومی تحفظ کی خاطر (اور "مسلمان قوم" کا تحفظ تو ایک مقدس مذہبی کام بن ہی جاتا ہے) مصطفےٰ کمال اور اس کی قوم پرست پارٹی کو زمامِ کار سونپی تھی۔ وہ بھی اِسی طرح مذہبی تاویلیں کر کے لادینی کی طرف اس کی ہر پیش قدمی کو گوارا کرتے رہے، اور یونہی وہ بھی اپنا دل یہ سوچ سوچ کر بہلایا کرتے تھے کہ اس وقت تو قوم کا تحفظ مقدم ہے اور اس کے لیے اللہ اپنے دین کی تائید اِس رجُلِ فاجر کے ذریعہ کر رہا ہے، جب یہ وقت گزر جائے گا تو انشاء اللہ ہمارا کاروان جادۂ اسلام کی طرف پھر مڑ جائے گا۔ مگر جو کاروان اپنے آپ کو بے دینی قیادت کے قابو میں خود دے چکا تھا اسے پھر اسلام کی راہ پر جادہ پیمائی کی توفیق نصیب نہ ہوئی۔

اب ذرا دینی پہلو سے قطع نظر کر کے محض قومیت کے نقطۂ نظر سے اس فضا کا جائزہ لیجیے جو مسلم لیگ نے اس وقت پیدا کی ہے۔ اس کا یہ پہلو خواہ کتنا ہی شاندار ہو کہ مسلمانوں میں ایک عام قومی حرکت پیدا ہو گئی ہے اور وہ ایک مرکزی طاقت سے بظاہر وابستہ ہو گئے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ لیگ کی یہ تحریک محض ایک اضطراری ہیجان ہے جو ہندو قوم پرستی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے خوف سے مسلمانوں میں بھڑک اٹھا ہے۔ اس ہیجان کے پیچھے کوئی سوچا سمجھا نقشہ نہیں ہے، کوئی واضح مقصد[1] نہیں ہے، کوئی تعمیری سعی نہیں ہے

---

[1] کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان ایک واضح مقصد ہے، لیکن کسی مقصد کے لیے محض ایک نام (باقی صفحہ ۲۵۸ پر)

جو حصولِ مقصد کے لیے طاقت فراہم کر سکے، کوئی ایسی کارکن جماعت نہیں ہے جو قابلِ اعتماد سیرت اور ایک منظم فکر رکھتی ہو اور کوئی ایسی قیادت نہیں ہے جو ایک عمومی تحریک کو چلانے کی اہل ہو۔ فی الواقع مسلمانوں میں جو حرکت پیدا ہوئی ہے وہ لیگ اور اس کی قیادت نے سوچ سمجھ کر کسی نقشے کے مطابق پیدا نہیں کی بلکہ ہندوؤں کی قومی سامراجیت اور ان کے لیڈروں کی تنگ دلانہ سیاست سے مسلمانوں میں خود بخود ایک احساسِ خطر اور ہیجانِ اضطراب بھڑک اٹھا اور اس حالت میں جب مسلمانوں نے دیکھا کہ وہ مذہبی اور سیاسی لیڈر جن کی طرف وہ تحریک خلافت کے زمانہ سے رجوع کرتے رہے تھے، ان کے کسی کام نہیں آرہے تو جس نے بھی آگے بڑھ کر ان کی طرف مدد کا ہاتھ بڑھایا اس کا دامن انہوں نے تھام لیا۔ اب یہ بدقسمتی کی بات ہے کہ اس ہیجان کی حالت میں جو رہنمائی ان کو میسر آئی وہ بجز کانفرنسوں اور اسمبلیوں کی لڑائی لڑنے کے اور کسی طرزِ جنگ اور طریقِ تیاری سے واقف نہیں ہے۔ اور یہ کھیل چونکہ کسی تیاری اور کسی نقشہ کے بغیر کھیلا گیا تھا اس لیے اس کا کوئی فائدہ اس کے سوا نہ ہوا کہ مسلمانوں کے قومی کیرکٹر کی کمزوری اور زیادہ بے نقاب ہو گئی اور ان کی ہوا پہلے سے زیادہ اکھڑ گئی۔ سب سے زیادہ افسوس ناک معاملہ جس نے لیگ کی موجودہ رہنمائی کا انتہائی نااہل ہونا واضح کر دیا ہے، اشتراکیوں کا معاملہ ہے۔ اس گروہ کے متعلق ثابت ہو چکا ہے کہ اس کی وفاداریاں اور ہمدردیاں روس کے ساتھ وابستہ ہیں اور اس کی رہنمائی کی باگیں تک روس کے ہاتھ میں ہیں۔ کوئی قوم جو اپنے گھر میں آزاد ہونا یا رہنا چاہتی ہو، اپنے درمیان ایسے ایک گروہ کو پھلنے پھولنے کا موقع نہیں دے سکتی جو کسی بیرونی طاقت کے اشاروں پر کام کرتا ہو۔ اسی وجہ سے کانگریس نے اس گروہ کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵۷ سے) جہاں ہو جانا یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ مقصد ایک واضح مقصد ہے۔ جس چیز کو پاکستان کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے وہ قطعی مبہم ہے اور اس کی اصل تعبیر غالباً ایک جمہوری لادینی اسٹیٹ کے سوا کچھ نہ ہو گی۔ مگر اس کو محض اس لیے صاف صاف بیان نہیں کیا جاتا کہ سادہ لوح مسلمان جو اسلامی نظام کے قیام کی اُمیدیں لگائے بیٹھے ہیں اس سے مایوس نہ ہو جائیں۔

(قدیم)

اپنے اندر سے نکال باہر کیا اور ہندوؤں میں اس کے اثرات پھیلنے کا دروازہ تقریباً بند کر دیا۔
لیکن لیگ جس نے اپنے قابلِ اعتماد کارکن بنانے کی کوئی کوشش نہیں کی اور جو اس وقت اندھوں
کی طرح ہر اس شخص یا گروہ کا سہارا لے رہی ہے جو بس اس کا الیکشن پروپیگنڈا کرنے کے لیے
اپنے آپ کو پیش کر دے، اِن اشتراکیوں کو بے تکلف اپنے اندر لے آئی [1] اور اس کو کچھ نہیں
سُوجھا کہ اپنے پاکستان میں وہ ایک ایسی طاقت کے ایجنٹوں کو قدم جمانے کا موقع دے
رہی ہے جو ایران پر اپنا تسلط قریب قریب مضبوط کر چکی ہے اور اب اس کے اور پاکستان
کے درمیان صرف افغانستان کی بودی سی دیوار حائل ہے۔ حد یہ ہے کہ اس کم نظر قیادت کو یہ کھلے
ہوئے آثارِ غداری بھی نظر نہیں آتے کہ یہ کمیونسٹ جو ہندوستان میں بڑے مسلمان قوم پرست بنے
ہوئے ہیں، ایران اور ٹرکی پر روس کی دست درازیوں کے خلاف ایک حرف نہیں کہتے بلکہ الٹا روس
کو حق بجانب اور ایران و ٹرکی کو قابلِ الزام ٹھیرا رہے ہیں۔ کیا اس سے بھی یہ پتہ نہیں چلتا کہ کل اگر
یہی روس پاکستان میں دخل اندازی شروع کرے گا تو ان کا رویہ کیا ہوگا؟

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں اسلام اور اس کے مقاصد سے تھوڑی دیر کے لیے قطع نظر کر لیجیے کہ
اس کے لحاظ سے تو لیگ کی تحریک مسلمانوں کو کوسوں دور لیے جا رہی ہے، لیکن محض قومی مفاد کو بھی
اگر سامنے رکھا جائے تو مجھے وہ فضا کہیں نظر نہیں آتی جس کے متعلق خبر دی جا رہی ہے کہ وہ بڑی ہی
کوئی سازگار فضا ہے۔ یہ مختلف عناصر آج کانگریس کے مقابلہ میں متحد و متفق ہو سکتے ہیں، لیکن یہ
قطعی ناممکن ہے کہ کل یہ سب مل کر کوئی ایک تعمیری اسکیم بنا سکیں اور اسے ٹھیک ٹھیک چلا لے
جائیں۔

(ترجمان القرآن۔ فروری ۱۹۴۶ء)

---

[1] اس سلسلہ میں یہ لطیفہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ لیگ کا دستورِ اساسی کمیونسٹوں کے داخلہ میں کسی طرح مانع
نہیں ہے۔ چونکہ یہ مسلم لیگ بلا اسلام بنائی گئی ہے اس لیے اس میں داخل ہونے کے لیے اسلام پر
اعتقاد اور اس کی پیروی شرط نہیں ہے بلکہ ہر وہ شخص جس کا نام مسلمانوں کا سا ہو اس میں داخل ہو سکتا ہے خواہ وہ
خدا اور آخرت اور رسالت کا منکر ہی کیوں نہ ہو۔ (قدیم)

تقسیم سے قبل
ہندوستان کے مسلمانوں کو آخری مشورہ

(یہ وہ تقریر ہے جو ۲۶ر اپریل ۱۹۴۷ء کو جماعت اسلامی کے اجلاس منعقدہ مدراس میں کی گئی تھی۔)

رفیقو اور دوستو! اس وقت ہم ہندوستان کی تاریخ کے ایک بہت نازک اور فیصلہ کن مرحلے سے گزر رہے ہیں (اور یہ مرحلہ جس طرح ہندوستان کے باشندوں کی قسمت کے لیے فیصلہ کن ہے اُسی طرح ہماری اِس تحریک کے لیے بھی فیصلہ کن ہے۔ اِس لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ اِس موقع پر ہم پوری ہوشمندی کے ساتھ اپنے اُس مقصد کو جس کے لیے ہم کام کرنا چاہتے ہیں، اور اُن حالات کو جن میں ہمیں کام کرنا ہے، اور اُس رُخ کو جس کی طرف یہ حالات جا رہے ہیں اور جن میں سے ہمیں اپنا راستہ نکالنا ہوگا، اچھی طرح سمجھ لیں، اور ہمارا ہر کارکن پوری بصیرت کے ساتھ یہ جان لے کہ موجودہ اور آئندہ حالات میں اُسے کس حکمتِ عملی پر کاربند ہونا ہے۔

ہماری اس تحریک کا مقصد، جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں، صاف اور واضح الفاظ میں یہ ہے کہ ہم اُس صحیح طریقِ زندگی کو جس کا نام اسلام ہے، انفرادی اور اجتماعی طور پر عملاً قائم کریں، اپنے قول و عمل سے اس کا ٹھیک ٹھیک مظاہرہ کریں، دنیا کو اِس بات پر مطمئن کرنے کی کوشش کریں کہ اُسی طریقِ زندگی میں اس کے لیے فلاح اور سعادت ہے، اور موجودہ باطل نظاموں کی جگہ وہ نظامِ حق برپا کرنے کی جدوجہد کریں جو سراسر اُس طریقِ زندگی پر مبنی ہو۔ اس

مقصد کے لیے اگرچہ ہمیں کام تو ساری دنیا اور تمام نوعِ انسانی میں کرنا ہے، لیکن فطرۃً ہمارے کام کی جگہ وہی سرزمین ہے جہاں ہم پیدا ہوتے ہیں، جہاں کی زبان ہماری زبان ہے، جہاں کے رسم و رواج سے ہم واقف ہیں، جہاں کے نفسیات سے ہم آشنا ہیں اور جہاں کی معاشرت سے ہمارا پیدائشی رشتہ ہے۔ خود پیغمبروں کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے ان کے اپنے وطن ہی کو جائے عمل اور مقامِ دعوت قرار دیا تھا، حالانکہ اُن کا پیغام ساری دنیا کے لیے تھا، کسی پیغمبر کے لیے جائز نہ تھا کہ اپنے اس فطری حلقۂ کار کو چھوڑ کر کہیں اور چلا جائے جب تک کہ اس کے اہلِ وطن اسے نکال نہ دیں یا وہ خود دعوت و تبلیغ میں انتہائی کوشش صرف کرنے کے بعد ان سے مایوس نہ ہو جائے۔ لہٰذا ہماری اِس جماعت کا فطری دائرۂ عمل بھی یہی سرزمین ہے جسے خدا نے ہماری سکونت کے لیے منتخب فرمایا ہے ـــــــ پوری جماعت کا دائرۂ عمل پورا ملک، ہر علاقے کے ارکان کا دائرہ ان کا اپنا علاقہ، اور ہر شہر، قصبے، یا گاؤں کے ارکان کا دائرہ ان کا اپنا وطن ـــــــ ہم میں سے ہر شخص کا فرض ہے کہ پورے استقلال کے ساتھ اپنی جگہ جم کر دعوتِ اصلاح اور سعیِ انقلاب میں منہمک رہے اور اپنے مقام سے ہرگز نہ ہٹے جب تک کہ اس کا وہاں رہنا قطعی غیر ممکن نہ ہو جائے، یا پھر وہاں دعوتِ حق کے بار آور ہونے کی کوئی امید باقی نہ رہے۔ آنے والے حالات میں آپ بہت کچھ ہجرت و مہاجرت کی آوازیں سُنیں گے اور بعید نہیں کہ عام رَو کو دیکھ کر، یا خیالی اندیشوں سے سہم کر آپ میں سے بہتوں کے پاؤں اُکھڑنے لگیں۔ لیکن آپ جس مشن کے حامل ہیں اس کا مطالبہ یہ ہے کہ آپ میں سے جو شخص جہاں ہے وہیں ڈٹ جائے اور اپنی دعوت کو اپنے ہی علاقے کی زندگی پر غالب کرنے کی کوشش کرے۔ آپ کا حال جہاز کے اُس بہادر کپتان کا سا ہونا چاہیے جو آخر وقت تک اپنے جہاز کو بچانے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور ڈوبتے ہوئے جہاز کو چھوڑنے والوں میں سب سے آخری شخص وہی ہوتا ہے۔ آپ جس مقصد پر ایمان لائے ہیں اس کا تقاضا ہے کہ جس علاقے میں آپ رہتے ہیں وہیں کے نظامِ زندگی کو بدلنے اور راہِ راست پر لانے کی کوشش کریں۔ اس علاقے پر آپ کا اور آپ پر اس علاقے کا حق ہے اور وہ حق اسی طرح ادا ہو سکتا ہے کہ اس کی اجتماعی زندگی میں جو خرابیاں پائی جاتی ہیں انہیں دُور کرنے میں آپ اپنا پُورا زور صرف کریں اور جس ہدایت سے آپ سرفراز کیے گئے ہیں اس کا فائدہ سب سے پہلے

اُ سے پہنچا ئیں۔

ہندوستان میں اس وقت جو حالات رونما ہیں وہ بظاہر ہماری دعوت کے لحاظ سے نہایت مایوس کن ہیں اور میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ سب لوگوں پر ان کا دل شکن اثر پڑ رہا ہے۔ ملک کی مختلف قومیں قومی خود غرضی میں بُری طرح مبتلا ہیں اور قوم پرستی کا جنون بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ ان سے وہ حرکات سرزد ہو رہی ہیں جنہیں اگر جانوروں سے بھی منسوب کیا جائے تو وہ اپنی توہین سمجھیں۔ قومی کشمکش نے جنگ کی اور جنگ نے وحشت و درندگی کی شکل اختیار کر لی ہے۔ پہلے تو بات یہیں تک تھی کہ ہر قوم ایک دوسرے سے بڑھ کر اپنے دعوے اور جواب دعوے پیش کر رہی تھی اور اس پر تلخ کلامی کا سلسلہ چل رہا تھا، مگر اب نوبت یہ آگئی ہے کہ یہ مختلف قومیں ایک دوسرے کا نام و نشان تک مٹا دینے کے درپے ہیں۔ انہوں نے اپنی رہنمائی کا کام ایسے ایسے لیڈروں اور اخبار نویسوں کے سپرد کر دیا ہے جو انہیں ہر روز خود غرضانہ قوم پرستی کی شراب، نفرت و عداوت کا زہر ملا کر پلاتے ہیں اور ان کی حد سے بڑھی ہوئی قومی خواہشات کی وکالت میں انصاف اور اخلاق کی ساری حدوں کو پھاندتے چلے جاتے ہیں۔ اخلاقی تصورات کے لیے ان کے دلوں میں اب فی الواقع کوئی گنجائش نہیں رہی ہے۔ تمام اخلاقی معیارات قومیت کے تابع ہو گئے ہیں۔ جو کچھ قومی مفاد اور قومی خواہشات کیمطابق ہے وہی سب سے بڑا اخلاق ہے، خواہ وہ جھوٹ ہو، خیانت ہو، ظلم ہو، سنگدلی اور بے رحمی ہو، یا اور کوئی ایسی چیز جو دنیا کے معروف اخلاقیات میں ہمیشہ سے بدی سمجھی جاتی رہی ہے۔ بخلاف اس کے سچائی، انصاف، دیانت، رحم، شرافت، انسانیت سب گناہ قرار پا چکے ہیں اگر وہ قومی مفاد کے خلاف پڑتے ہوں یا قومی خواہشات کے حصول میں مانع ہوں۔

ان حالات میں کسی ایسی دعوت کے لیے کام کرنا سخت مشکل ہے جو قومیتوں کو نظر انداز کر کے انسانیت کو خطاب کرتی ہو، جو قومی خواہشات کو چھوڑ کر خالص اصولِ حق کی طرف بلاتی ہو، اور قومی خود غرضیوں کو توڑ کر عالمگیر انصاف قائم کرنا چاہتی ہو۔ جنونِ قومیت کے اس دور میں ایسی دعوت کی آواز سُننے کے لیے نہ ہندو تیار ہیں نہ مسلمان۔ مسلمان کہنے

ہیں کہ تم ہماری قوم کے افراد ہو، تمہارا فرض تھا کہ قوم کے جھنڈے تلے کھڑے ہو کر قومی لڑائی لڑتے، یہ تم نے الگ جتھا بنا کر دین و اخلاق اور اصولِ حق کی رٹ کیا لگانی شروع کر دی؟ تمہاری اس صدائے بے ہنگام سے قوم کی طاقت منتشر ہوتی ہے اور قومی مفاد کو نقصان پہنچتا ہے۔ لہٰذا ہم تمہیں قوم کا دشمن سمجھتے ہیں خواہ تمہاری دعوت اُسی اسلام کی طرف ہو جس کا نام لے کر ہم یہ قومی لڑائی لڑ رہے ہیں۔ دوسری طرف ہندوؤں کے پاس جاتے ہیں تو وہ خیال کرتے ہیں کہ ان لوگوں کی بات دل کو تو ضرور لگتی ہے مگر اس چھاچھ کو ذرا پھونک کر پینا چاہیے، کیونکہ یہ ہیں تو اُسی قوم کے افراد جس سے ہماری لڑائی ہے، کیا خبر کہ یہ اصولی دعوت بھی مسلمان قومیت ہی کو فروغ دینے کے لیے ایک دوسری تدبیر ہو۔

لیکن یہ حالات خواہ کتنے ہی حوصلہ شکن اور صبر آزما ہوں، بہر حال مستقل نہیں ہیں بلکہ عنقریب بدل جانے والے ہیں۔ اس وقت آپ کے لیے صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ صبر اور حسنِ اخلاق سے اپنا کام کیے جائیں۔ اُلجھنے والوں کے ساتھ نہ اُلجھیں، نادان لوگوں کی مخالفتوں پر برافروختہ نہ ہوں، جن لوگوں میں دوست اور دشمن تک کی تمیز باقی نہیں رہی ہے اور جو لوگ جوشِ جنوں میں اب خود اپنے بھلے اور بُرے تک کا ہوش نہیں رکھتے وہ اگر جہالت اور جاہلیت پر اُتر آئیں تو آپ شریف آدمیوں کی طرح ان کے مقابلے سے ہٹ جائیں اور ان کی زیادتیوں کو خاموشی سے سہہ لیں۔ اس کے ساتھ آپ کو چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ معقول طریقے سے اپنی دعوت مسلم اور غیر مسلم سوسائٹی کے اُن سب لوگوں تک پہنچائیں جو معقول بات کو سُننے اور اس پر کھلے دل سے غور کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اس طریقہ پر اگر آپ نے عمل کیا تو ایک طرف آپ کی اخلاقی برتری کا سِکّہ بیٹھ جائے گا اور دوسری طرف وہ ذہنی فضا ایک حد تک تیار ہو جائے گی جو آنے والے حالات میں مؤثر کام کے لیے ضروری ہے۔

جس تغیّر کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ عنقریب ملک تقسیم ہو جائے گا۔ ہندوؤں کو ان کی اکثریت کے علاقے اور مسلمانوں کو ان کی اکثریت کے علاقے الگ الگ مل جائیں گے۔ دونوں اپنے اپنے علاقوں میں پوری طرح خود مختار ہوں گے اور اپنی مرضی کے مطابق اپنے اسٹیٹ کا نظام چلائیں گے۔ یہ بڑا تغیّر اُس نقشے کو بالکل بدل دے گا جس پر اس وقت تک

حالات چلتے رہے ہیں۔ اس کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں اور دوسری قوموں کے مسائل اور اُن کی نوعیتیں بالکل بدل جائیں گی۔ اُن کو بالکل ایک دوسری ہی صورتِ حال سے سابقہ پیش آئے گا۔ جس ڈھنگ پر اس وقت تک انہوں نے اپنے قومی رویہ اور اپنی تحریکات اور جماعتی نظاموں کو قائم کر رکھا ہے وہ بڑی حد تک بے معنی اور ناکارہ ہو جائے گا۔ بدلے ہوئے حالات میں ان سب کو سوچنا پڑے گا کہ جو کچھ اب تک وہ کرتے رہے ہیں اس نے انہیں کہاں لا کھڑا کیا ہے اور اب اس نئے دورِ زندگی میں ان کے لیے راہِ عمل کیا ہے۔ آج کے بنے اور جمے ہوئے عقیدے اس وقت مہمل ہو جائیں گے۔ آج کے خیالات اور تصورات کے لیے اُس وقت کوئی جگہ نہ ہوگی۔ آج کے نعرے اس وقت کھوٹے سکے ہوں گے جنہیں کوئی مفت کو بھی نہ پوچھے گا۔ جن بنیادوں پر آج کی قومی تحریکیں اور جماعتیں قائم ہیں وہ خود بخود ڈھ جائیں گی۔ اس لیے صرف یہی نہیں کہ آج کی لیڈریاں اپنی طبعی موت مر جائیں گی بلکہ بعید نہیں کہ جو لوگ آج انہیں اپنا نجات دہندہ سمجھ رہے ہیں کل وہی ان کو اپنے مصائب و آلام کا اصلی سبب سمجھنے لگیں۔

آنے والے اس دور میں ہندو ہندوستان اور مسلم ہندوستان کے حالات بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے، اور چونکہ ہمیں دونوں علاقوں میں کام کرنا ہوگا اس لیے ہمیں بھی اپنی تحریک کو دو مختلف طریقوں پر چلانا پڑے گا۔ بلکہ بعید نہیں کہ نظامِ جماعت کو بھی دو حصوں میں بانٹ دینا پڑے تاکہ ہر حصہ اپنے اپنے علاقے کے حالات کے مطابق مناسب پالیسی پر خود چل سکے اور اس کے لیے ضروری انتظامات خود کر سکے۔ جہاں تک مسلم علاقے کا تعلق ہے اس پر تو میں یہاں کوئی بحث نہ کروں گا، کیونکہ اس کے لیے موزوں مقام شمالی مغربی حلقہ کا اجتماع ہے جو عنقریب ہونے والا ہے۔ آپ کے سامنے مجھے صرف ہندو ہندوستان کے مستقبل پر گفتگو کرنی ہے کہ یہاں مسلمانوں اور ہندوؤں کو آئندہ کن حالات سے سابقہ پیش آنے والا ہے اور ان حالات میں آپ کو کس طرح کام کرنا ہوگا۔

سب سے پہلے مسلمانوں کے معاملہ کو لیجیے۔ ہندو اکثریت کے علاقے میں مسلمان عنقریب یہ محسوس کریں گے کہ جس مسلم قوم پرستی پر انہوں نے اپنے اجتماعی رویہ کی بنیاد رکھی تھی وہ

انہیں بیابانِ مرگ میں لاکر چھوڑ گئی ہے اور ان کی قومی جنگ، جسے وہ بڑے جوش و خروش سے بغیر سوچے سمجھے لڑ رہے تھے، ایک ایسے نتیجہ پر ختم ہوئی ہے جو اُن کے لیے تباہی کے سوا اپنے اندر کچھ نہیں رکھتا۔ جن جمہوری اصولوں پر ایک مدت سے ہندوستان کا سیاسی ارتقا ہو رہا تھا اور جنہیں خود مسلمانوں نے بھی قومی حیثیت سے تسلیم کرکے اپنے مطالبات کی فہرست مرتب کی تھی، انہیں دیکھ کر بیک نظر معلوم کیا جاسکتا تھا کہ ان اصولوں پر بننے ہوئے نظام حکومت میں جو کچھ ملتا ہے اکثریت کو ملتا ہے، اقلیت کو اگر ملتا بھی ہے تو خیرات کے طور پر دست نگر ہونے کی حیثیت سے، نہ کہ حق کے طور پر حریف اور مدِ مقابل اور شریک کی حیثیت سے۔ یہ ایک ظاہر و باہر حقیقت تھی، مگر مسلمانوں نے اس کی طرف سے جانتے بوجھتے آنکھیں بند کرلیں اور اِس دوہری حماقت کا ارتکاب کیا کہ ایک طرف تو نظام حکومت کے لیے مغرب کے انہی جمہوری اصولوں پر راضی ہوگئے اور دوسری طرف خود اپنی طرف سے تقسیم ملک کا یہ اصول پیش کیا کہ جہاں ہم اکثریت میں ہیں وہاں ہم حاکم اور تم محکوم ہو، اور جہاں تم اکثریت میں ہو وہاں تم حاکم اور ہم محکوم ہوں۔ کئی سال کی تلخ اور خونریز کشمکش کے بعد اب یہ مرکب حماقت "کامیابی" کے مرحلے میں پہنچ گئی ہے، اور جس چیز کے لیے اقلیت کے صوبوں سے تعلق رکھنے والے مسلمان خود لڑ رہے تھے وہ حاصل ہوا چاہتی ہے، یعنی اکثریت کی آزاد و خود مختار حکومت جس میں وہ بحیثیت ایک قوم کے محکوم ہوں گے اور محکوم بھی اُس اکثریت کے جس سے وہ ابھی کل تک قومی جنگ لڑتے رہے تھے۔

جو اسٹیٹ اب مسلم اقلیت کے علاقوں میں بن رہا ہے وہ ہندوؤں کا قومی اسٹیٹ ہوگا۔ قومیت و جمہوریت کے جن نظریات کو مسلمان اور ہندو یکساں تسلیم کرکے اپنی قومی تحریکوں کی اساس بنا چکے ہیں ان کی بنیاد پر کوئی قومی اسٹیٹ اپنے اندر کسی دوسری ایسی قوم کے وجود کو گوارا نہیں کرتا جو حکمران قومیت سے الگ اپنی مستقل قومیت کی مدعی ہو اور پھر اِس قومیت کے دعوے کے ساتھ اپنے مخصوص قومی مطالبات بھی رکھتی ہو۔ یہ چیز صرف اُسی وقت تک چل سکتی تھی جب تک ملک میں عملاً اقتدار ایک بیرونی قوم کا تھا اور ہندو اور مسلمان دونوں اس کے محکوم تھے۔ صرف اُسی وقت یہ ممکن تھا کہ اقلیت بھی اکثریت کی طرح

اپنی الگ قومیت کا دعویٰ کرے اور کم و بیش اپنے کچھ مستقل حقوق منوا لے۔ مگر جب جمہوری اصول پر اہل ملک کی آزاد حکومت بن جائے گی تو ہندوستان اکثریت کا قومی اسٹیٹ بن کر رہے گا اور اس میں کسی اقلیت کی جداگانہ قومیت اور مخصوص قومی مطالبات کے لیے گنجائش نہ ہوگی۔ قومی اسٹیٹ ایسی کسی قومیت کو تسلیم کر کے اس کے مطالبے کبھی پورے نہیں کیا کرتا، بلکہ وہ پہلے تو یہ کوشش کرتا ہے کہ اسے تحلیل کر کے اپنے اندر ہضم کر لے، پھر اگر وہ اتنی سخت جان نکلتی ہے کہ ہضم نہ ہو سکے تو اسے دبا دینا چاہتا ہے تاکہ جداگانہ قومی وجود اور اس کی بنا پر مستقل قومی مطالبوں کی آواز بلند ہونے ہی نہ پائے، اور بالآخر اگر وہ دباؤ کے نیچے بھی پیچھے ہی چلی جائے تو پھر قومی اسٹیٹ اسے باقاعدہ فنا کرنے کی کوشش شروع کر دیتا ہے۔ یہی کچھ ہندوؤں کے قومی اسٹیٹ میں مسلم اقلیت کو پیش آنے والا ہے۔ اس کے سامنے بھی عملاً یہی تین راستے پیش کیے جائیں گے:

یا تو اپنی جداگانہ قومیت کے دعوے اور اس کی بنا پر مستقل حقوق کے مطالبے سے دستبردار ہو کر اسٹیٹ کی قومیت میں جذب ہو جائے۔

یا اگر وہ اس کے لیے تیار نہ ہو تو اسے ہر قسم کے حقوق سے محروم کر کے شودروں اور اچھوتوں کی سی حالت میں رکھا جائے۔

یا اس پر استیصال کا پیہم عمل جاری کر دیا جائے یہاں تک کہ قومی اسٹیٹ کے حدود میں اس کا نام و نشان باقی نہ رہے۔

یہ لازمی نتیجہ ہے مغربی طرز کے ایک جمہوری نظام میں قومیت کی اساس پر اپنی سیاسی پالیسی کی عمارت اٹھانے کا۔ بصیرت کی آنکھیں اس نتیجہ کو اسی وقت دیکھ سکتی تھیں جب یہ پالیسی اختیار کی جا رہی تھی اور یہ نتیجہ ابھی بہت دور تھا۔ مگر اس وقت دیکھنے سے انکار کیا گیا اور دکھانے کی کوشش کرنے والوں کو دشمن سمجھا گیا۔ اب یہ نتیجہ بالکل سامنے آ گیا ہے اور افسوس کہ اسے دیکھنا ہی نہیں بھگتنا بھی پڑے گا۔

مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی کے لیے جو گروہ اس وقت پیش پیش ہیں ان میں سے ایک "نیشنلسٹ" مسلمانوں کا گروہ ہے جو آنے والے دور میں وہی پارٹ ادا کرے گا جو انگریزی دور میں خان بہادر

طبقہ ادا کر چکا ہے۔ یہ گروہ مسلمانوں کو دعوت دیگا کہ پہلی صورت کو برضا و رغبت قبول کر لیں، یعنی اپنی قومی انفرادیت کے دعوے اور مخصوص حقوق کے مطالبے سے دست بردار ہو کر سیدھی طرح اسٹیٹ کی قومیت میں مُدغم ہو جائیں۔ اس گروہ کی بات اب تک تو نہیں چلی ہے مگر مجھے اندیشہ ہے کہ آگے بہت کچھ چلنے لگے گی، کیونکہ آئندہ یہی لوگ سرکار رس ہوں گے، انہی کی مدد سے نوکریاں اور ٹھیکے اور تعلیم گاہوں کے گرانٹ وغیرہ ملا کریں گے اور یہی حکمران قوم اور محکوم قوم کے درمیان واسطہ و وسیلہ بنیں گے۔ ان کی کوششیں مسلمانوں کی ایک معتد بہ تعداد کو اس حد تک گرا دینے میں کامیاب ہو جائیں گی کہ وہ خود مہاشے اور ان کی بیویاں اور بیٹیاں شریمتیاں بنیں اور لباس، زبان، معاشرت، خیالات، ہر چیز میں حکمران قوم سے اس درجہ ہم رنگ ہو جائیں "تا کس نگوید بعد ازاں من دیگرم تو دیگری"۔ جس قوم کی ایک بڑی تعداد اس سے پہلے مسٹر اور مس بن چکی ہے آخر اس کے لیے اب یہ نیا تغیر ناممکن کیوں ہونے لگا؟ خصوصاً جب کہ آئندہ روٹی اور خوش حالی اور ترقی کا انحصار اسی پر ہوگا۔ لیکن مجھے امید نہیں کہ مسلمان من حیث القوم اس طرح سپر ڈال دینے پر راضی ہو جائیں گے۔ قومی حیثیت سے ان کی کوشش یہی ہوگی کہ اس جذب و انجذاب کی مزاحمت کریں۔

مزاحمت کے لیے وہ ابتداءً اسی گروہ کی طرف رجوع کریں گے جو اس وقت سیاسی میدان میں ان کی رہنمائی کر رہا ہے۔ مگر تجربہ بہت جلدی مسلمانوں کو بتا دے گا کہ اب اس گروہ کی سیاست پر چل کر وہ سیدھے تباہی کے گڑھے کی طرف جائیں گے۔ اکثریت کے قومی جمہوری اسٹیٹ میں رہ کر اگر اقلیت قومی جنگ لڑے گی تو ہر طرف سے پیسی اور کچلی جائے گی، زندگی کے ہر شعبے سے نکالی جائے گی، ہر قسم کے حقوق سے محروم کی جائے گی، اچھوتوں سے بھی بد تر حالت میں گرا دی جائے گی اور پھر بھی اگر اس کی آواز اٹھتی رہی تو اسے اس طرح مٹا یا جائے گا کہ اس پر نہ زمین روئے گی نہ آسمان۔

کہا جاتا ہے کہ اقلیت کے مسلمانوں کو اس انجام سے بچانے کے تین ذریعے ہیں:

ایک یہ کہ پاکستان کی ریاست ہندوستان کی ریاست سے سودا کرے گی، یعنی وہ کہے گی کہ پاکستان کی ہندو اقلیت سے ہم وہی سلوک کریں گے جو تم ہندوستان کی

مسلمان اقلیت سے کرو گے اور اس طرح مسلمانوں کو وہی آئینی تحفظات مل جائیں گے جو ہندو پاکستان میں ہندوؤں کے لیے چاہیں گے۔ لیکن آغازِ کار میں یہ تجویز خواہ کیسی ہی خوش آئند نظر آئے، مجھے یقین ہے اور تجربہ بتا دے گا کہ آگے چل کر یہ قطعاً ناکام ہوگی[1]۔ ہم صاف دیکھ رہے ہیں کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں مغربی طرزِ سیاست کی راہ پر چلے جا رہے ہیں۔ اس طرزِ سیاست کے جو نتائج مغرب میں نکل چکے ہیں وہی یہاں نکل کر رہیں گے۔ اقلیت کی جداگانہ قومیت اور قومی حقوق اور مطالبوں کو نہ مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ زیادہ مدّت تک برداشت کر سکے گا اور نہ ہندوؤں کا قومی اسٹیٹ۔ خصوصاً جب یہ دونوں اقلیتیں اپنی اپنی ہم قوم بیرونی ریاست کی طرف استمداد کا ہاتھ پھیلائیں گی اور اپنے ملک کی حکومت کے بجائے بیرونی حکومت سے وفاداری، دلچسپی اور محبّت کی پینگیں بڑھائیں گی تو ان کا وجود ہندوستان اور پاکستان دونوں کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جائے گا۔ ابتدا میں خواہ کیسے ہی اطمینان بخش آئینی تحفظات دونوں نے ایک دوسرے کی اقلیتوں کو دیئے ہوں، رفتہ رفتہ عملاً ان کو ختم کر دیا جائے گا، روزمرّہ کے برتاؤ میں اقلیتوں کا استیصال کرنے والی پالیسی چل پڑے گی، دونوں حکومتیں اپنی اپنی قومی اقلیتوں کی خاطر ایک دوسرے پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کریں گی اور بالآخر یا تو جنگ تک نوبت پہنچے گی ـــــــ جس کے نتیجہ کے متعلق پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی، ـــــــ یا دونوں کو اس پر راضی ہونا پڑے گا کہ ایک حکومت ہندوؤں کے ساتھ اور دوسری حکومت مسلمانوں کے ساتھ جو برتاؤ چاہے کرے۔

دوسرا ذریعۂ تحفظ یہ بتایا جاتا ہے کہ اقوامِ متحدہ کے نظام (United Nations Organisation) سے اس معاملہ میں مدد لی جا سکے گی۔ لیکن جو لوگ اس نظام کے مزاج کو کچھ بھی جانتے ہیں وہ بآسانی اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس ذریعۂ تحفظ کے بل پر کوئی دبی ہوئی

---

[1] اپریل ۱۹۵۰ء میں پاکستان نے اس کی کوشش کی تھی جس کے نتیجہ میں لیاقت نہرو پیکٹ وجود میں آیا۔ لیکن اس سے ہندوستان کی مسلم اقلیت کا جیسا کچھ تحفظ ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔ (جدید)

قوم کتنے دن جی سکتی ہے۔ اول تو اقوام متحدہ کے نظام سے مُرافعہ کسی ایسے ہی معاملے میں کیا جا سکتا ہے جس میں کوئی بہت بڑی اور نمایاں ظالمانہ کارروائی کی گئی ہو۔ روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے معاملات خواہ مجموعی طور پر مل کر کتنا ہی بڑا ظلم بن جائیں، بہرحال اس نظام میں قابل مرافعہ قرار نہیں پا سکتے۔ نہ اُن بظاہر معصوم پالیسیوں کو وہاں زیر بحث لایا جا سکتا ہے جو مغربی معیار کے لحاظ سے بالکل برحق ہوتی ہیں مگر ہمارے نقطۂ نظر سے مسلمانوں کی حیات دینی و ملی کو بالکل ختم کر دینے والی ہیں۔ پھر اس نظام نے اب تک تو یہ ثابت نہیں کیا ہے کہ وہ بالکل بے لاگ انصاف کرنے کے لیے تیار ہے۔ اس کے ارکان صرف یہی نہیں دیکھتے کہ معاملہ بجائے خود کیسا ہے اور اُس میں انصاف کا تقاضا کیا ہے، بلکہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ شکایت جس حکومت کے خلاف کی گئی ہے اس سے ہماری اپنی حکومتوں کے تعلقات کیسے ہیں اور آیا اسے ملعون کرنا ہماری حکومتوں کی مصلحت کے مطابق ہے یا خلاف۔ اس لحاظ سے کون کہہ سکتا ہے کہ آئندہ زمانہ میں نظامِ اقوام متحدہ کے اندر ہندوستان اور پاکستان کی اضافی (Relative) پوزیشن کیا ہوگی اور کس کی بات وہاں زیادہ وزن دار ہوگی۔

"تیسرا ذریعہ ہجرت اور تبادلۂ آبادی کا بیان کیا جاتا ہے۔ ہجرت کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان خود ہندوستان چھوڑ چھوڑ کر پاکستان میں جا بسنے شروع ہوں۔ اور تبادلۂ آبادی کا مطلب یہ ہے کہ دونوں حکومتیں باہمی قرارداد سے ایک نظم کے ساتھ اپنی اپنی ہم قوم آبادی کو اپنے علاقے میں منتقل کر لیں۔ ان میں سے پہلی صورت قابلِ عمل ہے مگر وہ ہندوستان کے مسلمانوں کا مسئلہ حل نہ کر سکے گی۔ کیونکہ اس صورت میں وقتاً فوقتاً صرف کھلتے پیتے لوگ یا بہت برداشتہ خاطر افراد و خاندان یا کچھ من چلے قسمت آزما لوگ ہی عمل کر سکیں گے، مسلمانوں کی عام آبادی جہاں اب بس رہی ہے وہیں بستی رہے گی اور اس کا کسی بڑے پیمانے پر خود مہاجرت کرنا ممکن نہ ہوگا، اِلّا یہ کہ کسی وقت خدانخواستہ وہ حالات پیش آ جائیں جو بہار وغیرہ میں پیش آتے ہیں۔ رہی دوسری صورت، تو مجھے امید نہیں کہ آئندہ پچاس سال تک ہندوستان اور پاکستان کی حکومتیں ساڑھے چار کروڑ مسلمانوں اور ڈھائی تین کروڑ غیر مسلموں کو ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر منتقل کرنے کا انتظام کر سکیں گی، خواہ وہ دل سے ایسا کرنا

چاہیں۔ تاہم اگر کوئی اِس اُمید پر جینا چاہتا ہو تو ضرور جیے۔

یہ ہے اُن ذرائع کی حقیقت جن کی بنا پر اُمید کی جا رہی ہے کہ قوم پرستانہ سیاست جس طرح انگریزی اقتدار کے دَور میں چلتی رہی ہے، اسی طرح ہندوستان کی قومی حکومت بن جانے کے بعد بھی چل سکے گی۔ آج مسلمان اپنی جہالت اور کم نگاہی کی وجہ سے ان حقائق کو نہیں سمجھ رہے ہیں، مگر وہ وقت قریب ہے جب یہ حقائق خود اپنے آپ کو ان کی سمجھ میں اُتار دیں گے اور اس وقت لامحالہ ان کو تین راستوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑے گا۔

ایک یہ کہ "نیشنلسٹ" مسلمانوں کی پالیسی قبول کر کے ہندی قومیت میں جذب ہونے پر تیار ہو جائیں۔

دوسرے یہ کہ "مسلم قوم پرستی" کی موجودہ روش پر بدستور چلتے رہیں یہاں تک کہ مٹ جائیں۔

تیسرے یہ کہ قوم پرستی اور اس کے طور طریقوں اور اس کے دعوؤں اور مطالبوں سے توبہ کر کے اسلام کی رہنمائی قبول کر لیں جس کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان اپنی قومی اغراض کے لیے سعی و جہد کرنے کے بجائے اپنی تمام کوششوں کو صرف اسلام کی اصولی دعوت پر مرکوز کر دیں اور من حیث القوم اپنے اخلاق، اعمال اور اجتماعی زندگی میں اُس کی شہادت دیں جس سے دنیا یقین کر سکے کہ فی الواقع یہ وہ قوم ہے جو اپنی ذات کے لیے نہیں بلکہ محض دنیا کی اصلاح کے لیے جینے والی ہے اور در حقیقت جن اصولوں کو یہ پیش کر رہی ہے وہ انسانی زندگی کو انفرادی اور اجتماعی طور پر نہایت اعلیٰ و ارفع اور اصلح بنا دینے والے ہیں۔

یہی آخری راہ مسلمانوں کے لیے پہلے بھی راہِ نجات تھی اور اب بھی اِسی میں ان کے لیے نجات ہے۔ مَیں کئی سال سے اُن کو اسی کی طرف بلا رہا ہوں۔ اگر یہ قوم پرستانہ سیاست کی راہ اختیار کرنے کے بجائے اِس راہ کو اختیار کرتے، اور جس طرح پچھلے دس سال میں انہوں نے اپنی پُوری قومی طاقت کو اُس راہ پر لگایا ہے اُسی طرح کہیں اِس راہ پر لگایا ہوتا تو آج ہندوستان کی سیاست کا نقشہ بالکل بدلا ہوا ہوتا اور دو چھوٹے چھوٹے پاکستانوں کی جگہ

سارے ہندوستان کے پاکستان بن جانے کے امکانات ان کی آنکھوں کے سامنے ہوتے لیکن اُس وقت میری دعوت انہیں دشمن کی دعوت یا ایک دیوانے دوست کی دعوت محسوس ہوئی۔ اب واقعات انہیں گھیر کر "ناچار مسلمان شو" کے مقام پر خود کھینچ لاتے ہیں۔ اب ان کے لیے زندگی کی راہ صرف ایک ہی رہ گئی ہے اور وہ اسلام کی ـــــــ اصلی اور حقیقی اور مخلصانہ اسلام کی ـــــــ راہ ہے۔ دوسری راہیں زندگی کی نہیں بلکہ خودکشی یا سزائے موت یا طبعی وفات کی راہیں ہیں۔

یہ وقت جس کے آنے کی مَیں خبر دے رہا ہوں اب بالکل قریب آگیا ہے۔ جونہی کہ ہندوستان کی سیاست کا موجودہ دور ختم ہو کر نیا دور شروع ہوا، اقلیت کے علاقوں میں مسلمانوں کو اپنی واقعی یاس انگیز پوزیشن کا عام احساس شروع ہو جائے گا۔ یہ ایک بڑی تحریک کے انہدام کا وقت ہوگا جو تحریکِ خلافت کے انہدام سے کئی گنا زیادہ خطرناک ہوگا۔ تحریکِ خلافت کی ناکامی نے مسلمانوں پر جو جمود و انتشار طاری کیا تھا وہ اگرچہ نہایت نقصان دہ تھا مگر مہلک نہ تھا۔ اب اگر وہ کیفیت کہیں پھر طاری ہوئی تو قطعاً مہلک ثابت ہوگی۔ اپنے اِس وقت تک کے رہنماؤں سے مایوس ہو کر کوئی صحیح رہنمائی اور کوئی شعاعِ امید اگر مسلمانوں نے نہ پائی تو ان پر گھبراہٹ اور طوائف الملوکی مسلّط ہو جائے گی۔ کوئی نیشنلسٹ مسلمانوں کی طرف دوڑیگا، کوئی کمیونسٹ گروہ کی طرف لپکے گا، کوئی ہجرت کی تیاری کرے گا، کوئی مایوسی کی حالت میں ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائے گا، اور کوئی دل برداشتگی کے عالم میں، یا محض احمقانہ جھنجھلاہٹ کی بنا پر ہاری ہوئی قومی جنگ کو پھر تازہ کر کے نہ صرف اپنے اوپر بلکہ اپنے ہزاروں لاکھوں بے گناہ بھائیوں پر بھی تباہی کا طوفان اُٹھا لائے گا۔ اس نازک وقت کے لیے ابھی سے ایک ایسا منظم گروہ تیار رہنا چاہیے جو ہوش میں آنے والے مسلمانوں کے سامنے بروقت صحیح راہِ عمل پیش کر سکے، ان کی مائل بانتشار قوتوں کو غلط کاریوں اور خام کاریوں سے بچا کر ایک روشن نصب العین کے گرد سمیٹ سکے، اور ان کو یاس کے بعد حقیقی کامیابیوں کی بشارت دے سکے۔ میری دُعا ہے کہ آپ ہی کا یہ گروہ اُس خدمت کے انجام دینے کی توفیق پائے اور اُس وقت کے آنے سے پہلے اِس حد تک طاقت ور اور منظم اور مستعد ہو جائے کہ یہ خدمت

انجام دے سکے۔

اب میں چاہتا ہوں کہ آپ ذرا ہندو ہندوستان کی اکثریت کے مستقبل کا بھی جائزہ لیں۔ میں آپ لوگوں سے اکثر کہتا رہا ہوں کہ اسلامی انقلاب برپا کرنے کا جتنا امکان مسلم اکثریت کے علاقوں میں ہے قریب قریب اتنا ہی امکان غیر مسلم اکثریت کے علاقوں میں بھی ہے۔ میری اس بات کو بہت سے لوگ ایک غرقِ تخیل آدمی کا خواب سمجھتے ہیں، اور بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ غالباً یہ تصوّف کا کوئی نکتہ ہے جو ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ اس لیے کہ اُن کو صریح طور پر یہ نظر آ رہا ہے کہ غیر مسلم اکثریت مسلمانوں کے مقابلہ میں ایک مضبوط متحد اور منظم بلاک بنی ہوئی ہے۔ اُس کے اندر کہیں کوئی خلل یا شگاف نہیں ہے جہاں سے اس کے ٹوٹنے کا امکان ہو۔ اُس پر قوم پرستی کا نشہ پُوری طرح مسلّط ہے۔ ہندوانڈیا کا پُورا نظامِ حکومت نہایت مستحکم طریقہ سے اس کے ہاتھ میں آچکا ہے اور جو تھوڑی سی کسر باقی ہے وہ عنقریب پوری ہوتی جاتی ہے۔ اس حالت کو دیکھتے ہوئے ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر یہاں اسلامی انقلاب کا راستہ کدھر سے نکل آئے گا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ یہ مضبوط بلاک جو آپ کے سامنے نظر آ رہا ہے، اور بظاہر ٹھوس بھی محسوس ہوتا ہے، اس کی ساخت کو ذرا سمجھنے کی کوشش کیجیے کہ یہ کن اجزاء سے مرکّب ہے اور ان کی پیوستگی کی نوعیت کیا ہے۔

ہندوستان کے ان کروڑوں غیر مسلموں کو جس چیز نے متحد اور منظم کیا ہے وہ کوئی مستقل نظریۂ حیات، کوئی مضبوط فلسفۂ زندگی اور کوئی شعوری نصب العین نہیں ہے کہ اس کا متزلزل ہونا اور بدل جانا مشکل ہو، بلکہ وہ محض ایک قوم پرستی کا جذبہ ہے جو ایک طرف اجنبی اقتدار کے خلاف اور دوسری طرف مسلم قوم پرستی کے مقابلہ میں بھڑکایا گیا تھا۔ قوم پرستی کا فطری خاصہ یہ ہوتا ہے کہ وہ صرف کسی مخالف و مزاحم اور مبارز طاقت ہی کے مقابلہ میں پیدا ہوا کرتی ہے، اس کی شدت مزاحمت ہی سے بھڑکتی ہے، اور جب تک وہ طاقت مقابلہ میں موجود ہو اسی وقت تک باقی رہتی ہے۔ جونہی کہ مزاحمت ختم ہوئی اور قوم پرستی کا مقصد حاصل ہوا یہ جذبہ آپ سے آپ دب جاتا ہے، اندرونی زندگی کے دوسرے اہم تر مسائل لوگوں کی توجہات کو اپنی

طرف کھینچ لیتے ہیں اور وہ عناصر جو محض قوم پرستی کے جذبہ سے باہم پیوستہ ہوتے تھے، بکھرنے لگتے ہیں۔ ہندو قوم پرستی کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ یہ جن دو پاؤں پر کھڑی ہوئی تھی ان میں سے ایک ـــــ یعنی انگریزی اقتدار سے نجات پانے کا جذبہ ـــــ عنقریب گرا چاہتا ہے۔ اس کے بعد صرف دوسرا پاؤں باقی رہ جاتا ہے، یعنی مسلم قوم پرستی کے مقابلہ کا جذبہ۔ سو پاکستان کے بن جانے کے بعد اس کا قائم رہنا بھی مشکل ہے۔ بشرطیکہ ہندو علاقے کی مسلمان اقلیت اپنے مسئلے کو حل کرنے کی کوئی ایسی راہ نکال لے جس سے نہ تو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کشیدگی و نزاع کے اسباب پیدا ہوں اور نہ ہندوستان کے اندر مسلم قوم پرستی کے دعووں اور مطالبوں کو دبانے کے لیے ہندو قوم پرستی کے مشتعل ہونے کا کوئی موقع باقی رہے۔ یہ حکمت اگر خدا نے مسلمانوں کو عطا کر دی تو آپ دیکھیں گے کہ نیشنلسٹ لیڈر اور قومی و مذہبی عصبیتوں کے مبلغین مصنوعی خطرے اور جعلی ہوّے پیش کر کرکے موجودہ قوم پرستی کو زندہ اور مشتعل رکھنے کی خواہ کتنی ہی کوشش کریں، وہ بہر حال مر کے رہے گی اور وہ مختلف و متضاد عناصر، جن کی ترکیب سے یہ قوم پرست بلاک بنا ہے، بکھر کر رہیں گے۔ اس لیے کہ اس بلاک کے اندر خود اس کے اپنے عناصر ترکیبی کے درمیان جو تمدنی، معاشرتی بے انصافیاں، جو معاشی جفا کاریاں، جو اغراض و مقاصد کی کشاکشیں، اور جو طبقاتی منافرتیں موجود ہیں، وہ بیرونی خطرات کے ہٹتے ہی اپنے آپ کو بزور محسوس کرائیں گی اور ملک کے آئندہ نظام، اختیارات کی تقسیم، حقوق کے تعین اور سماجی نظام کی تشکیل کے مسائل لامحالہ ان کو آپس میں پھاڑ دیں گے۔ اس تفرقہ کے لیے ایسے طاقت ور اور فطری اسباب موجود ہیں کہ اسے رونما ہونے سے کوئی چیز روک نہیں سکتی۔

ہندوستان کا موجودہ سماجی نظام کچھ اس طرز پہ بنا ہے کہ وہ بے شمار طبقات پر مشتمل ہے جن میں سے بعض بعض پر چڑھے ہوئے اور بعض ان سے دبے ہوئے ہیں۔ ان طبقوں کے درمیان پیدائشی برتری و پستی، اور اٹل امتیازات کا تصور گہری جڑوں کے ساتھ جما ہوا ہے اور اس کو تناسخ کے فلسفے سے اور زیادہ مضبوط کر دیا گیا ہے۔ پست طبقوں کے حق میں یہ یقین پیدا کیا گیا ہے کہ وہ پستی ہی کے لیے پیدا ہوتے ہیں اور یہ ان کے پچھلے کرموں کا لازمی

نتیجہ ہے جسے انہیں بہرحال بھگتنا ہی پڑے گا، جسے بدلنے کی ہر کوشش بے سُود ہے۔ اور اُونچے طبقوں کے حق میں یہ اِذعان پیدا کیا گیا ہے کہ وہ پیدا ہی برتری کے لیے ہوتے ہیں۔ برتری اُن کا حق اور ان کے پچھلے کرموں کا نتیجہ ہے اور اس کو بدلنے کی کوشش قانونِ قدرت کے خلاف ہے۔ اس سماجی نظام میں ہر اُوپر کا طبقہ نیچے والے طبقہ کے سر پہ پاؤں رکھے کھڑا ہے اور اسے رَوند رہا ہے۔ معاشرت کے ہر پہلو میں اُونچ اور نیچ کا امتیاز ہے۔ قدم قدم پر بے شمار بے انصافیاں ہیں۔ تمدّن کے ہر گوشہ میں امتیاز کا برتاؤ ہے، خواہ کھانے پینے کا معاملہ ہو یا رہن سہن کا یا شادی بیاہ کا، اور اس امتیاز میں صرف تفریق ہی کا نہیں بلکہ تحقیر اور تذلیل کا عنصر بھی شامل ہے۔ حد یہ ہے کہ اُونچے طبقے اِس بات کو بھی گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ نیچے طبقوں کے مرد اور عورتیں ان کے سے لباس اور زیور پہن لیں۔ حال ہی کی بات ہے کہ راجپوتانہ کے گوجروں اور جاٹوں نے اس بات پر ہنگامہ برپا کر دیا تھا کہ چار وغیرہ نیچے طبقوں نے ــــــ جو جنگ کی وجہ سے خوشحال ہو گئے ہیں اور کچھ باہر کی ہوا بھی کھا آتے ہیں ــــــ اپنی عورتوں کو ان کی عورتوں کے سے لباس اور زیور پہنانے شروع کر دیئے ہیں۔ باوجودیکہ یہ جاٹ اور گوجر خود بھی اپنے ساتھ راجپوتوں کے ایسے ہی سلوک کی تلخی محسوس کرتے ہیں، مگر پھر بھی انہوں نے اس بات کو اپنی توہین قرار دیا کہ چار اُٹھ کر معاشرت میں اُن کے ہم سر بنیں۔ چنانچہ مجموعی طور پر ان کی برادری نے زور لگانا شروع کیا کہ ان غریبوں کو زبردستی اُسی پستی میں پھینک دیں جس سے وہ اُٹھنا چاہتے ہیں۔

معاشی نظام بڑی حد تک اسی سماجی نظام کی ترتیب پر قائم ہے اور اس کے قدیم ظالمانہ پہلوؤں پر جدید سرمایہ داری کی خصوصیات کا اور اضافہ ہو گیا ہے۔ جو طبقے قدیم اجتماعی نظریات اور مابعد الطبیعی فلسفوں (Metaphysical Philosophies) کی مدد سے اوپر کی سیڑھیوں پر متمکن ہو چکے ہیں، انہوں نے صرف اِتنے ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے کہ ملک کی تمدنی زندگی میں برتری کو اپنے لیے مخصوص کر لیا، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہی ملک کی دولت اور اس کے وسائل و ذرائع پر بھی قابض ہو گئے ہیں اور نیچے کی سیڑھیوں پر رہنے والی عام آبادی کے لیے انہوں نے زندگی بسر کرنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں چھوڑی ہے کہ وہ ذلت کے ساتھ ان کی خدمت اور مزدوری

کریں۔ اس معاشی نظام میں محروم اور محنت پیشہ طبقوں کے ساتھ جو بے انصافیاں اور زیادتیاں پائی جاتی ہیں ان کا شمار کرنا مشکل ہے۔ پھر اونچے طبقوں نے خود اپنے دائرے میں بھی ظلم و ناانصافی کی بہت سی شکلیں اختیار کر رکھی ہیں جن کی بنا پر کم لوگ خوشحال اور زیادہ لوگ بدحال ہیں۔ ان کی سُود خواری، ان کا مشترک خاندانی جائیداد کا طریقہ (Joint Family System)، ان کا توریثِ اولادِ اکبر کا قانون (Rule of Primogeniture) اور اسی طرح کے اور بہت سے طریقے ایسے ہیں جو دولت اور اس کے ذرائع کو سمیٹ کر چند لوگوں کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں اور بہت سوں کو محروم اور دست تنگ بنا دیتے ہیں۔ انہی طریقوں سے جن ہاتھوں میں دولت سمٹی ہے وہ اب جدید سرمایہ داری کے ڈھنگ اختیار کر کے ملک کی صنعت، تجارت اور مالیات پر مسلط ہو رہے ہیں اور ہوتے جا رہے ہیں۔

اب جو سیاسی نظام بنایا جا رہا ہے اس کی تصنیف میں کاغذ پر تو بلاشبہ جمہوریت، اجتماعی انصاف (Social Justice) مساوات اور مواقع کی یکسانی (Equality of Opportunities) کے بڑے بڑے نفیس تصورات بہت ستھری اور دلکش زبان میں رقم کیے جا رہے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ ان الفاظ کی اصل قیمت ان کے تلفظ میں نہیں، ان پر واقعی عمل درآمد میں ہے۔ عملاً جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں وہ یہ ہے کہ اس سیاسی نظام کی تشکیل، تعمیر اور تنفیذ کے سارے کام پر وہی طبقے حاوی ہیں جو سماجی اور معاشی نظام کی اوپر والی سیڑھیوں پر تشریف فرما ہیں ـــــ نہیں، بلکہ پیدا ہوتے ہیں ـــــ اور تجربہ نے ہمیں بتا دیا ہے کہ ان طبقوں کو خدا نے سب کچھ دیا ہے مگر بڑا دل، وسیع ظرف اور فراخ حوصلہ نہیں دیا۔ ان کی تنگ دلی اب تک بھی ہندوستان کو بہت کچھ نقصان پہنچا چکی ہے اور آئندہ بھی اسے دیکھتے ہوئے مشکل سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ یہ لوگ اپنی سیاسی طاقت کو واقعی انصاف قائم کرنے میں استعمال کریں گے۔

یہ حالات اپنے اندر اتنی تلخیاں رکھتے ہیں جنہیں ملک کی عام آبادی شدت کے ساتھ محسوس کر رہی ہے۔ اب تک قوم پرستی کے نشے نے اس احساس کو بڑی حد تک دبائے رکھا تھا، اور لوگ اس امید پر جی رہے تھے کہ ملک کا انتظام جب ہمارے ہاتھ میں آ جائیگا

تو یہ بے انصافیاں ختم ہو جائیں گی۔ اب انتظام کے اختیارات جب فی الواقع اہلِ ملک کی طرف منتقل ہو جائیں گے تو یہ سوال زیادہ دیر تک نہ ٹل سکے گا کہ اِن اختیارات کو آئندہ کس طرح استعمال کیا جائے جس سے ملک میں حقیقی انصاف قائم ہو۔ ہندوستان کے مستقبل کی باگیں اس وقت جن لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں وہ ہندو کلچر کی سابق روایات کے ساتھ مغربی یورپ اور امریکہ کے طریقِ زندگی اور کچھ سوشلزم کا جوڑ لگاتے نظر آتے ہیں۔ یہ میرا اندازہ اگر صحیح ہے تو اس طرح سے وہ ایک نمائشی جمہوریت، ایک ظاہری مساوات اور ایک نظر فریب عدل قائم کرنے میں تو ضرور کامیاب ہو جائیں گے، مگر اس کی تہہ میں بدستور وہی بے انصافیاں، وہی ناہمواریاں اور وہی تفریقیں برقرار رہیں گی جو اِس وقت پائی جاتی ہیں، کیونکہ تفریق و امتیاز ہندو کلچر کی رگ رگ میں پیوست ہے جس کے ہوتے کسی حقیقی جمہوریت کا قیام غیر ممکن ہے، اور اس کے ساتھ مغربی نظریات کا جوڑ لگنے سے اِس کے سوا کچھ حاصل ہونے کی امید نہیں کی جا سکتی کہ اونچے طبقوں کی برتری و سرمایہ داری کو الیکشنوں اور ووٹوں کے ذریعہ سے سند جواز مل جائے۔ اسی لیے یہ امر قریب یقینی نظر آتا ہے کہ یہ لوگ بہت جلدی ہندوستان کی عام آبادی کو مایوس کر دیں گے۔ ان کے ہاتھوں انصاف قائم نہ ہو سکے گا اور کچھ زیادہ دیر نہ گزرنے پائے گی کہ ہندوستانی عوام، کسان، مزدور، اور خود اونچے طبقے کے محروم لوگ کسی دوسرے منصفانہ نظام کی طلب میں بے چین ہونے لگیں گے۔

اشتراکی گروہ اسی صورتِ حال سے فائدہ اٹھانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ جونہی کہ موجودہ قوم پرستی اپنے مدعا کو پہنچنے کے بعد مضمحل ہوئی، وہ اِسی طبقاتی خلل اور اِسی تصادمِ اغراض کے شگافوں میں سے اپنا راستہ نکالنے کی کوشش کرے گا اور عام باشندوں کو انصاف کی اُمیدیں دلا کر سیاسی اقتدار حاصل کرنا چاہے گا۔ مگر اِس گروہ کے پاس اِن بے انصافیوں کو ختم کرنے کے لیے کوئی ایسا پروگرام نہیں ہے جو خود ظلم سے، بے انصافی سے، کشت و خون اور فساد سے اور بالآخر جباری و قہاری سے پاک ہو۔ وہ ہندوستان کو موجودہ فرقہ وارانہ منافرت اور نزاع کی جگہ طبقہ وارانہ منافرت اور نزاع کا تحفہ دے گا۔ اب تک جہاں ہندو اور مسلمان کے جھگڑے کی بنا پر لوگ ایک دوسرے کے سر پھاڑتے اور گھر جلاتے رہے ہیں وہاں اب

روٹی کے جھگڑے کی بنا پر وہی لوگ کشت و خون کرنے لگیں گے۔ ایک طبقہ دوسرے طبقے کے خلاف اسی طرح نفرت اور غصے سے بھڑک اُٹھے گا جس طرح آج ایک فرقہ دوسرے فرقے کیخلاف بھڑکا ہوا ہے۔ فرقہ پرستی اور قوم پرستی کی جگہ طبقاتی مفاد کی پرستاری لے لے گی اور انصاف کے حقیقی جذبہ سے دل جس طرح آج قومی جنگ کے زمانے میں خالی ہیں اسی طرح اُس وقت طبقاتی جنگ کے زمانہ میں بھی خالی ہوں گے۔ برسرِ اقتدار طبقے محروم طبقوں کو محروم رکھنے کے لیے لڑیں گے، اور محروم طبقے ان کی جگہ لے کر اُلٹا انہیں محروم کر دینے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائیں گے۔ اس طرح ہندوستان ایک مدت تک امن کی صورت کو ترستا رہے گا، اور آخر کار اگر خدانخواستہ اشتراکی انقلاب کامیاب ہو گیا تو مزید ایک طویل مدت تک یہاں روس کی طرح اُونچے طبقوں کو ان کی زمینوں، جائدادوں اور کارخانوں سے بے دخل کرنے کے لیے سخت کشت و خون اور ظلم و جور کا بازار گرم رہے گا۔ پھر اشتراکی نظام قائم ہو جانے کے بعد ویسی ہی ڈکٹیٹرشپ یہاں بھی قائم ہو گی جیسی روس میں ہے۔ اسی طرح ملک کی پوری آبادی کو ایک جابرانہ اور ہمہ گیر (Totalitarian) اقتدار کے شکنجے میں کس دیا جائے گا، اُسی طرح لوگ زبان اور قلم اور خیال کی آزادی سے محروم ہو جائیں گے، اُسی طرح تمام لوگوں کا رزق چند لوگوں کے ہاتھوں میں آ جائے گا، اور اسی طرح بندگانِ خدا کو اتنی آزادی بھی حاصل نہ رہے گی کہ اس نظام کی سختیوں سے دل برداشتہ ہوں تو کچھ چیخ پکار کر لیں، یا اس حالت کو بدلنے کے لیے کوئی سیاسی تنظیم اور اجتماعی کوشش کر سکیں ——— اور ان سب سے بڑھ کر اس اشتراکی انقلاب سے جو نقصان ہندوستان کو پہنچے گا وہ یہ ہے کہ پچھلی صدیوں کے انحطاط کے باوجود جو تھوڑی بہت روحانی اور اخلاقی قدریں ہندوستان کی تہذیب میں باقی ہیں وہ بھی ختم ہو جائیں گی اور یہ ملک سراسر ایک مادہ پرست ملک بن کر رہ جائیگا۔

اس انجام سے اگر کوئی چیز ہندوستان کو بچا سکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ کوئی گروہ ایک ایسے نظامِ فکر و عمل کو لے کر اُٹھے جس میں اعلیٰ درجہ کی اور حقیقی روحانی و اخلاقی قدریں بھی ہوں، سچائی اور بے لاگ اجتماعی انصاف بھی ہو، اصلی جمہوریت ——— محض سیاسی ہی نہیں بلکہ تمدنی و معاشرتی جمہوریت (Social Democracy) ——— بھی ہو، اور تمام

باشندگانِ ملک کے لیے بلا امتیاز طبقہ و نسل انفرادی و اجتماعی حیثیت سے ترقی کے یکساں مواقع بھی ہوں۔ جو ایک یا چند طبقوں کے مفاد کو نہیں بلکہ سب انسانوں کے مفاد کو یکساں ہمدردی اور انصاف کی نظر سے دیکھے، کسی کا حمایتی اور کسی کا دشمن نہ ہو، طبقوں اور گروہوں کو ایک دوسرے کے خلاف اکسانے اور لڑانے کے بجائے ایک مبنی بر انصاف نظامِ زندگی پر انہیں متحد کرے، محروم طبقوں کو وہی کچھ دلائے جو ان کا فطری حق ہے اور اونچے طبقوں سے صرف وہی کچھ لے جو ان کے پاس ان کے فطری حقوق سے زائد ہے۔ ایسے ایک نظام کو اگر ملک کے لوگوں کے سامنے پیش کیا جاتے اور اس کو پیش کرنے والے وہ لوگ ہوں جن کی سیرت اور اخلاق پر اعتماد کیا جاسکے، جو خود کسی قسم کی قومی یا طبقاتی یا ذاتی خود غرضی میں مبتلا نہ ہوں، جن کی اپنی زندگیاں اس بات پر گواہ ہوں کہ درحقیقت انہی سے انصاف کی اُمید وابستہ کی جاسکتی ہے، اور جن میں دیانت اور انتظامِ دنیا کی صلاحیت دونوں جمع ہوں، تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہندوستان کے باشندے اس نظام کے مقابلہ میں اشتراکی انقلاب کے راستے کو ترجیح دیں۔ اشتراکی انقلاب تو ایک آپریشن ہے جو مرض کے ساتھ تندرستی کے بھی ایک بڑے حصّے کا استیصال کر دیتا ہے، اور انسان اسے صرف ایسی مجبوری کی حالت ہی میں گوارا کیا کرتا ہے جب دوا سے مرض کی اصلاح ہونے کی کوئی اُمید باقی نہ رہے۔ دنیا میں جہاں بھی کسی ملک کے لوگوں نے اس آپریشن کے طریقے کو اختیار کیا ہے اسی وجہ سے کیا ہے کہ ان کے سامنے ظالمانہ سرمایہ داری اور اشتراکیت کے درمیان کوئی ایسا تیسرا راستہ تھا ہی نہیں جس میں وہ ان دونوں کی خرابیوں سے بچ کر انصاف پالینے کی اُمید کرسکتے۔ اگر اس قسم کا تیسرا راستہ پیش کر دیا جاتے ——— جیسا کہ پیش کرنے کا حق ہے ——— تو نہ ہندوستان کے لوگ ایسے پاگل ہیں اور نہ دُنیا کے دوسرے ملکوں کی آبادی ہی کو اس قدر دیوانہ فرض کرنے کی کوئی وجہ ہے کہ وہ ایک کارگر دوا کو آزمانے کے بجائے خواہ مخواہ آپریشن ہی پر اصرار کریں۔

سوال یہ ہے کہ آیا مسلمان یہ تیسرا راستہ پیش کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر پیش کر سکتے ہیں اور اس تیسرے راستے کا نام اسلام ہی ہے تو میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ مستقبل کے ہندوستان میں اشتراکیت کے بالمقابل اسلام کے لیے کامیابی کے کم از کم ۹۰ فی صدی امکانات

ہیں یہ مسلمانوں کی انتہائی بدقسمتی اور سخت نالائقی ہوگی کہ ان کے پاس اسلام جیسا ایک کامل اور صحیح نظام موجود ہو اور پھر وہ اسے لے کر اٹھنے کے بجائے پورا میدان اشتراکیت کے لیے خالی چھوڑ دیں۔

اب میں آپ کو مختصر طور پر یہ بتاؤں گا کہ ہندوستان میں اسلامی انقلاب کا راستہ ہموار کرنے کے لیے ہمیں کیا کرنا ہے۔

(۱) سب سے مقدم کام یہ ہے کہ اُس قومی کشمکش کا خاتمہ کیا جائے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اب تک برپا رہی ہے۔ میرے نزدیک یہ بات پہلے بھی غلط تھی کہ مسلمان اسلام کے لیے کام کرنے کے بجائے اپنی قومی اغراض اور مطالبوں کے لیے لڑتے رہے۔ مگر اب تو اس لڑائی کو جاری رکھنا محض غلطی نہیں بلکہ مہلک غلطی اور احمقانہ خودکشی ہے۔ اب یہ نہایت ضروری ہے کہ مسلمان اپنے طرزِ عمل کو بالکل بدل دیں۔ یہ اسمبلیوں میں نمائندگی کے تناسب کا سوال، یہ انتخابات کی دوڑ دھوپ، یہ ملازمتوں کے لیے کشمکش، اور یہ دوسرے قومی حقوق اور مطالبوں کے لیے چیخ پکار آئندہ دور میں لاحاصل ہوگی اور نقصان دہ بھی۔ لاحاصل اس لیے کہ اب جن لوگوں کے ہاتھ میں ہندوستان کی حکومت آرہی ہے وہ مخلوط انتخابات اور ملازمتوں میں صرف "قابلیت" کے لحاظ کا اصول مقرر کرکے مسلمانوں کی جداگانہ سیاسی ہستی کو ختم کردینے کا فیصلہ کرچکے ہیں اور ان کے فیصلے کو نافذ ہونے سے کسی طرح نہیں روکا جاسکتا۔ نقصان دہ اس لیے کہ ان "حقوق" کے استقرار کی جتنی کوشش بھی مسلمان کریں گے وہ ہندوؤں کے قومی تعصب کو اور زیادہ مشتعل کرے گی، اور اگر وہ اپنی شکایات کو رفع کرانے کے لیے پاکستان کی مدد حاصل کرنا چاہیں گے تو یہ بین الاقوامی پیچیدگی اور کشمکش کا سبب بن جائے گا جس سے ہندو قوم پرستی کو زندگی کی مزید طاقت مل جائے گی۔ لہٰذا اب ہمیں وسیع پیمانے پر مسلمانوں میں ایسی رائے عام تیار کرنی چاہیے کہ وہ بحیثیت ایک قوم کے حکومت اور اس کے نظام سے بے رُخی اختیار کریں اور ہندو قوم پرستی کو اپنے طرزِ عمل سے یہ اطمینان دلا دیں کہ میدان میں کوئی دوسری سیاسی قومیت اس کے ساتھ کشمکش کرنے کے لیے موجود نہیں ہے۔ یہی ایک طریقہ ہے اُس غیر معمولی تعصب کو ختم کردینے کا جو اِس وقت غیر مسلم اکثریت کے اندر اسلام کے خلاف

پیدا ہو گیا ہے، اور اسی طریقہ سے غیر مسلموں کے اِس اندیشے کو بھی دُور کیا جا سکتا ہے کہ اگر اسلام کو مزید اشاعت کا موقع دیا گیا تو کہیں پھر کسی علاقے کے مسلمان ایک اور پاکستان مانگنے کے لیے کھڑے نہ ہو جائیں۔

(۲) دوسرا اہم کام ہمارے لیے یہ ہے کہ ہم مسلمانوں میں وسیع پیمانے پر اسلام کا علم پھیلائیں، ان میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کا عام جذبہ پیدا کر دیں، اور ان کی اخلاقی و تمدنی اور معاشرتی زندگی کی اس حد تک اصلاح کر لیں کہ ان کے ہمسایہ غیر مسلموں کو خود اپنی سوسائٹی کی بہ نسبت ان کی سوسائٹی صریحاً بہتر محسوس ہونے لگے اور ان میں سے جو لوگ بھی اس سوسائٹی میں شامل ہونے کے لیے آمادہ ہوں، خواہ وہ کسی طبقے کے ہوں، ان کو بالکل مساویانہ حیثیت سے اپنے اندر لیا جا سکے۔ یہ کام برسوں کی انتھک اور لگاتار محنت چاہتا ہے، مگر جب تک ہم مسلم سوسائٹی کے ایک بڑے حصّہ کو علمی و عملی اور تمدنی و معاشرتی حیثیت سے اسلام کا صحیح نمائندہ نہ بنا لیں ہمارا یہ اُمید کرنا محض ایک بوالفضولی ہے کہ ہندوستان کی عام غیر مسلم آبادی کی رائے کو اسلام کے حق میں ہموار کیا جا سکے گا۔ غیر مسلموں کے سامنے آپ کاغذ پر یا تقریر میں اسلام کو کیسے ہی دلپذیر انداز سے پیش کریں، بہر حال وہ ان کو اپیل نہیں کر سکتا کیونکہ اسلام کے نمائندوں کا جو تجربہ انہیں رات دن کی زندگی میں ہو رہا ہے وہ آپ کے بیان کی تصدیق نہیں کرتا۔ پھر اگر ان میں کوئی ایسا حق پسند نکل بھی آئے کہ مسلمانوں کے بجائے اسلام کو دیکھ کر اسے قبول کر لے، تو موجودہ مسلم سوسائٹی میں اس کا کھپنا مشکل ہوتا ہے، اس لیے کہ یہاں ابھی تک قدیم ہندوانہ جاہلیت کے موروثی تعصبات، اُونچ نیچ کے امتیازات، ذات برادری کے تفرقے، اِسلام میں آجانے کے باوجود جوں کے توں محفوظ ہیں اور اس بنا پر ایک نو مسلم کو پھر اُنہی معاشرتی خرابیوں سے سابقہ پیش آتا ہے جنہیں چھوڑ کر وہ ہندو سوسائٹی سے نکلا تھا۔ لہٰذا مسلمانوں کی ــــــ اگر سب کی نہیں تو کم از کم ان کے ایک معتدبہ حصّہ کی ــــــ اخلاقی، تمدنی، اور معاشرتی زندگی کی اصلاح کے بغیر دعوت اِسلامی کا قدم آگے نہیں بڑھ سکتا اور یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم محض نو مسلموں کی ایک الگ سوسائٹی بنا سکیں۔ اس اصلاح میں اگر ہم کسی حد تک بھی کامیاب ہو جائیں اور

اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں اسلام سے عام واقفیت بھی پیدا کر دیں اور ان کے اندر یہ جذبہ بھی ابھار دیں کہ رات دن کی زندگی میں ان کو ہر جگہ غیر مسلموں سے جو سابقہ پیش آتا ہے اس میں وہ حسب موقع ان کے سامنے اسلام کو پیش کرتے رہیں، تو دعوت کی رفتار اتنی تیز ہو سکتی ہے کہ ہندوستان میں کوئی دوسری تحریک اسلام کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہاں مسلمانوں کی تعداد چار پانچ کروڑ کے قریب ہے۔ اس تعداد کا بیسواں حصہ بھی اگر اسلام کو جانتا ہو اور اس کی تبلیغ شروع کر دے، تو اسلام کے مبلغوں کی تعداد ۲۰، ۲۵ لاکھ کے لگ بھگ ہو گی۔ کیا کوئی دوسری تحریک ایسی موجود ہے جس کے پاس اتنے مبلغ ہوں؟

پھر مسلمان ہندوستان کی آبادی میں کھچڑی کی طرح غیر مسلموں کے ساتھ ملے جلے ہیں اور زندگی کے ہر شعبے میں ہر جگہ ہر وقت انہیں دوسروں تک اپنے خیالات پہنچانے اور اپنے برتاؤ کا اثر ڈالنے کا موقع ملتا ہے۔ کیا کسی دوسری تحریک کو یہ مواقع حاصل ہیں؟

پھر دوسری کسی تحریک کی اپنی کوئی مستقل سوسائٹی اور اپنا کوئی تمدنی نظام نہیں ہے۔ ان کے دامن میں پناہ لے کر ہندوستان کے بسنے والے اور دبے ہوئے طبقے کچھ اپنے پیٹ کے مطالبے تو پورے کر سکتے ہیں مگر اپنی معاشرتی زندگی کی مشکلات اور خرابیاں رفع نہیں کر سکتے۔ بخلاف اس کے مسلمان اپنی ایک مستقل سوسائٹی رکھتے ہیں جو اگر ہمارے نصب العین کے مطابق کچھ بھی اصلاح یافتہ ہو جائے تو تمام اُن لوگوں کے لیے پوری پناہ گاہ بن سکتی ہے جنہیں معاشرتی زندگی میں پست بنا کر رکھ دیا گیا ہے، یا جن کو جاہلی نظام تمدن و معاشرت کی دوسری خرابیوں نے پریشان کر دیا ہے۔

(۳) تیسرا ضروری کام یہ ہے کہ ہم اس ملک کے مسلمانوں کی ذہنی طاقت کا زیادہ سے زیادہ حصّہ اپنی اِس دعوت کے لیے فراہم کر دیں اور اس سے باقاعدگی کے ساتھ کام لیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ اپنے اُن مقاصد میں ناکام ہو چکا ہے جن پر اس نے اب تک نظر جما رکھی تھی۔ اس ناکامی کا شعور حاصل ہوتے ہی اس پر یاس طاری ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ اس موقع پر اگر ان کے سامنے ایک روشن نصب العین امیدوں اور بشارتوں کے ساتھ آئے تو وہ ان کے ایک بڑے حصّے کی توجہات اپنی طرف کھینچ لے گا۔ اس طرح جیسے جیسے ہماری

دعوت کو یہ طاقت حاصل ہوتی جائے ہم چاہتے ہیں کہ اُسے اُن نتیجہ خیز کاموں پر لگایا جاتا ہے جو اسلامی انقلاب کو قریب تر لا سکیں۔ مثلاً ہم مسلمانوں کی اخبار نویسی کے موجودہ رُجحانات کو بالکل بدل دینا چاہتے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ بہتر قسم کے اہلِ قلم اب انگریزی، اُردو اور دوسری زبانوں میں اخبارات جاری کریں اور ان میں حقوق کی چیخ پکار، ملازمتوں کے فی صدی تناسب پر شور و غل اور محکموں میں ہندو گردی پر واویلا کرنے کے بجائے رائج الوقت نظام پر اصولی تنقید کریں، اس کی خامیوں کا ایک ایک پہلو نمایاں کرکے پبلک کو دکھائیں اور اس سے بہتر ایک نظامِ زندگی پیش کرکے رائے عام کو اس کے حق میں ہموار کریں۔ اسی طرح ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے نوجوان ادیب ارباب نشاط کا پیشہ چھوڑ کر اپنی ادبی قابلیتوں کو ایک اعلیٰ درجہ کا تعمیری ادب پیدا کرنے میں صرف کریں جو انسانیت کے شعور کو بیدار کرے، اور ذہنوں میں ایک صالح نظام کے لیے تڑپ پیدا کر دے۔ پھر جن لوگوں کو خدا نے زیادہ بلند درجہ کی دماغی صلاحیتیں دی ہیں ان کو ہم دنیا کی ذہنی امامت کا راستہ دکھانا چاہتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ یہ حضرات قرآن کی مشعل ہاتھ میں لے کر علم کے ہر گوشے اور مسائلِ حیات کے ہر پہلو کا جائزہ لیں اور تحقیق و کاوش کے ساتھ اسلامی نظامِ زندگی کی پوری تصویر دنیا کے سامنے پیش کر دیں جس سے دیکھ کر لوگ بآسانی یہ معلوم کر سکیں کہ اگر دنیا کا انتظام اس نظام کے مطابق ہو تو اس کی تفصیلی صورت کیا ہوگی۔ ان سب کے علاوہ اسی اہلِ دماغ طبقہ میں سے وہ لوگ بھی نکل سکتے ہیں جو لیڈرشپ کی صلاحیتیں رکھتے ہیں۔ اسلامی دعوت کو ایک عمومی تحریک بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ان لوگوں کو اس کی رہنمائی کا منصب سنبھالنے کے لیے تیار کیا جائے۔

(۴) چوتھا ضروری کام یہ ہے کہ ہمارے سب کارکن اور وہ تمام لوگ جو آئندہ ہماری تحریک سے متاثر ہوں، ہندوستان کی اُن مقامی زبانوں کو سیکھیں اور ان میں تحریر و تقریر کی قابلیت بہم پہنچائیں جو آئندہ تعلیم اور لٹریچر کی زبانیں بننے والی ہیں۔ نیز اس امر کی انتہائی کوشش کریں کہ ان زبانوں میں جلدی سے جلدی اسلام کا ضروری لٹریچر منتقل کر دیا جائے۔ جنوبی ہند میں تامل، تلنگی، کنڑی، ملایالم اور مرہٹی، مغربی ہند میں گجراتی، مشرقی ہند میں بنگلہ اور باقی ہندوستان

میں ہندی اب تعلیم کی زبانیں ہوں گی۔ یہی اپنے اپنے علاقوں میں دفتری اور سرکاری زبانیں بھی ہوں گی اور انہی میں ملک کا لٹریچر شائع ہوگا۔ اگر مسلمان اپنی قومی عصبیت کی بنا پر صرف اردو تک اپنی تحریر و تقریر کو محدود رکھیں گے تو ملک کی عام آبادی سے بے گانہ ہو کر رہ جائیں گے اور ان کے پاس اپنے کروڑوں ہمسایوں کو اپنا ہم خیال بنانے کا کوئی ذریعہ نہ رہے گا۔

بلاشبہ ہم یہ ضرور چاہتے ہیں کہ اردو زبان نہ صرف باقی رہے بلکہ فروغ پائے کیونکہ ہمارا اب تک کا سارا سرمایۂ علم و تہذیب اسی زبان میں ہے۔ لیکن ہم اسلام کے مستقبل کو اُردو زبان کے دامن سے باندھ دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اگر اردو زبان ملک کی عام زبان نہیں بن سکتی، اور آثار یہی بتا رہے ہیں کہ اس کو یہ حیثیت حاصل نہ ہوگی، تو پھر جن جن زبانوں کو ملک میں رواج حاصل ہوگا ہم ان سب میں اسلام کا لٹریچر مہیا کریں گے اور ان سب کو اسلام کی دعوت و تبلیغ کے لیے استعمال کریں گے۔ ایسا کرنا محض غیر مسلموں ہی کی خاطر نہیں بلکہ خود مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کو بھی مسلمان رکھنے کی خاطر ضروری ہے، کیونکہ آگے چل کر مسلمان بچے درسگاہوں میں تعلیمی زبان اور درس گاہوں سے باہر سرکاری اور ملکی زبان سے اس قدر متاثر ہوں گے کہ اُردو سے ان کا تعلق برائے نام رہ جائے گا، اور اگر ان زبانوں میں کافی اسلامی لٹریچر نہ ملا تو وہ بالکل اکثریت کے رنگ میں رنگتے چلے جائیں گے۔

یہ چار کام ایسے ہیں جن پر ہندوستان میں اسلام کا اور خود آپ کا مستقبل منحصر ہے اس لیے آپ کو اپنے تمام ذرائع اور اپنی پوری قوتِ کار اور اپنی ساری فکر ان پر مرکوز کر دینی چاہیے، کیونکہ اس ابتدائی پروگرام کو بڑی حد تک عمل میں لائے بغیر آگے کا کوئی پروگرام آپ نہیں بنا سکتے۔ اب وہ وقت ہے کہ ایک لمحہ بھی اگر آپ تساہل میں ضائع کریں گے تو جرم کریں گے۔

جس طوفان کی میں دس سال سے خبر دیتا رہا ہوں وہ اُمنڈ آیا ہے۔ اب اگر آپ نے اس کے تدارک کی فکر نہ کی تو یہ سب مسلمانوں کے ساتھ آپ کو بھی لے ڈوبے گا۔ جو حالات اب اس ملک میں پیش آنے والے ہیں وہ آپ کے صبر کا، آپ کے عزم کا، آپ کے استقلال کا، آپ کی حکمت و دانائی کا، اور آپ کی عملی طاقت کا سخت امتحان لیں گے۔ آپ کے ایک طرف دجّال کی جنت ہوگی جس میں داخل ہونے اور مدارج عالیہ پر چڑھنے کے لیے شرط لازم یہ ہوگی کہ تیز سے تیز قوت شامہ رکھنے

والے کو بھی آدمی کے اندر اسلامیت اور اسلامی غیرت کی ذرا سی بُو تک محسوس نہ ہو سکے، اور آپ دیکھیں گے کہ آپ کے گرد و پیش بہت سے مسلمان اپنی دنیوی نجات کی خاطر اس شرط کو پورا کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ آپ کے دوسری جانب، ہتھوڑے اور ڈانتی کا جھنڈا بلند ہو گا اور اس کے سایہ میں ایک دوسری جنت شدّاد کا خیالی نقشہ پیش کیا جاتے گا جس کے عاشقوں کو قسم دی جاتے گی کہ خدا پرستی اور دیانت و اخلاق سے اپنے دلوں کو خالی کر لیں۔ آپ کی آنکھیں یہ بھی دیکھیں گی کہ دنیا کے ہر گوشے کے مسلمانوں اور غیر مسلموں کا ایک جمّ غفیر اس کی طرف دوڑ رہا ہو گا۔ ان دو جھوٹی جنتوں کے درمیان آپ اپنے آپ کو ایسے مقام پر کھڑا پائیں گے جہاں اسلام پر چلنے والوں اور اس کے لیے کام کرنے والوں کو ترقی و خوشحالی تو در کنار زندہ رہنے کا سامان بھی مشکل ہی سے میسر آئے گا۔ ان کو ہر قدم پر ہمت شکن حالات سے سابقہ پیش آئے گا۔ ان کی غیرت اسلامی اور عزّتِ نفس کو ہر وقت چرکے لگیں گے۔ شعائرِ اسلامی کو وہ نہ صرف مٹتے دیکھیں گے بلکہ ان کی علانیہ اہانت ہو گی اور بعید نہیں کہ مسلمانوں کے اپنے ہاتھوں ہو۔ ان حالات میں صرف وہی لوگ اسلامی انقلاب کے لیے کام کر سکیں گے جو غیر معمولی صبر و ثبات، انتہائی سرگرمی، اور غایت درجہ کی حکمت و دانشمندی سے بہرہ ور ہوں۔ یہ تین خصوصیات اگر آپ اپنے اندر پیدا کر لیں گے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ انشاء اللہ اس طوفان کا رُخ پھیر دینے میں بہت زیادہ دیر نہ لگے گی۔

(ترجمان القرآن۔ جون ۱۹۴۷ء)

صوبہ سرحد کے ریفرنڈم میں جماعتِ اسلامی کا مسلک

سوال: "جیسا کہ آپ کو معلوم ہے صوبہ سرحد میں اس سوال پر ریفرنڈم ہو رہا ہے کہ اس صوبہ کے لوگ تقسیم ہند کے بعد اپنے صوبے کو ہندوستان کے ساتھ شامل کرانا چاہتے ہیں یا پاکستان کے ساتھ؟ وہ لوگ جو جماعتِ اسلامی پر اعتماد رکھتے ہیں ہم سے دریافت کرتے ہیں کہ ان کو اس استصواب میں رائے دینی چاہیئے؟ اور کس طرف سے رائے دینی چاہیئے؟ کچھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اس استصواب میں بھی ہماری پالیسی اُسی طرح غیر جانبدارانہ ہونی چاہیئے جیسی مجالس قانون ساز کے سابق انتخابات میں رہی ہے، ورنہ ہم پاکستان کے حق میں اگر ووٹ دیں گے تو یہ ووٹ آپ سے آپ اُس نظامِ حکومت کے حق میں بھی شمار ہوگا جس پر پاکستان قائم ہو رہا ہے"

جواب: استصوابِ رائے کا معاملہ مجالسِ قانون ساز کے انتخابات کے معاملے سے اصولاً مختلف ہے۔ استصوابِ رائے صرف اِس امر سے متعلق ہے کہ تم کس ملک سے وابستہ رہنا چاہتے ہو، ہندوستان سے یا پاکستان سے؟ اس معاملے میں رائے دینا بالکل جائز ہے اور اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں۔ لہٰذا جن جن علاقوں میں استصوابِ رائے کیا جا رہا ہے وہاں کے ارکان جماعتِ اسلامی کو اجازت ہے کہ اس میں رائے دیں۔

رہا یہ سوال کہ کس چیز کے حق میں رائے دیں تو اس معاملے میں جماعت کی طرف سے کوئی

پابندی عائد نہیں کی جا سکتی، کیونکہ جماعت اپنے ارکان کو صرف اُن امور میں پابند کرتی ہے جو تحریک اسلامی کے اصول اور مقصد سے تعلق رکھتے ہیں، اور یہ معاملہ نہ اصولی ہے نہ مقصدی۔ اس لیے ارکانِ جماعت کو اختیار ہے کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق جو رائے چاہیں دیدیں۔ البتہ شخصی حیثیت سے میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر میں خود صوبہ سرحد کا رہنے والا ہوتا تو استصواب رائے میں میرا ووٹ پاکستان کے حق میں پڑتا۔ اس لیے کہ جب ہندوستان کی تقسیم ہندو اور مسلم قومیت کی بنیاد پر ہو رہی ہے تو لامحالہ ہر اُس علاقے کو جہاں مسلمان قوم کی اکثریت ہو اِس تقسیم میں مسلم قومیت ہی کے علاقے کے ساتھ شامل ہونا چاہیئے۔

پاکستان کے حق میں ووٹ دینا لازماً اُس نظامِ حکومت کے حق میں ووٹ دینے کا ہم معنی نہیں ہے جو آئندہ یہاں قائم ہونے والا ہے۔ وہ نظام اگر فی الواقع اِسلامی ہوا جیسا کہ وعدہ کیا جاتا رہا ہے تو ہم دل و جان سے اس کے حامی ہوں گے۔ اور اگر وہ غیر اسلامی نظام ہوا تو ہم اُسے تبدیل کر کے اِسلامی اصولوں پر ڈھلنے کی جدوجہد اُسی طرح کرتے رہیں گے جس طرح موجودہ نظام میں کر رہے ہیں[1]۔

(سہ روزہ کوثر مورخہ ۵ر جولائی ۱۹۴۷ء)

---

[1] واضح رہے کہ سلہٹ کے ریفرنڈم کے بارے میں کوئی سوال ہمارے پاس اس لیے نہیں آیا کہ اس وقت تک مشرقی بنگال اور آسام میں جماعت اِسلامی کا کام شروع ہی نہیں ہوا تھا۔ (جدید)

تقسیم ہند کے حالات پر تبصرہ

پچھلے سال ہماری آنکھوں نے جو ہولناک انقلاب دیکھا ہے اس نے تمام اُن انقلابات کو مات کر دیا ہے جو اس سے پہلے نہ صرف ہمارے اِس ملک[1] میں بلکہ دنیا کے کسی ملک میں پیش آئے ہیں۔ ممکن ہے کہ انسانی جانوں کا اِتلاف اِس سے پہلے کہیں اس سے بھی زیادہ وسیع رقبوں میں ہوا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اِس سے پہلے کبھی اِس سے زیادہ بڑی آبادیوں کو اُن کے آبائی وطنوں سے اُکھاڑ پھینکا گیا ہو۔ مگر شاید اِس سے پہلے کبھی اور کہیں انسان نے انسان کے ساتھ اِتنے بڑے پیمانہ پر ایسی سنگ دلانہ درندگی اور ایسی بے شرمانہ بہیمیت کا برتاؤ نہیں کیا ہے۔ قوموں میں دشمنیاں بھی ہوتی ہیں، ملکوں میں خانہ جنگیاں بھی ہو چکی ہیں، لیکن غالباً کبھی دنیا کی دو قوموں کے درمیان عداوت نے یہ شدّت، یہ تلخی اور یہ تُندی اختیار نہیں کی ہے۔ انسان انسان سے بارہا لڑا ہے، مگر لڑائی میں کمینہ پن اور بدمعاشی کا جو مظاہرہ یہاں ہوا ہے، یہ اپنی نظیر بس آپ ہی ہے۔ یہاں انسان صورت جانوروں نے وہ وہ کام کیے ہیں کہ اگر کُتوں اور بھیڑیوں پر ان کا الزام تھوپ دیا جائے تو وہ بھی اسے اپنی توہین محسوس کریں۔ اور یہ کرتوت چند گنے چُنے بدمعاشوں کے نہیں تھے بلکہ پوری پوری قوموں نے اپنے آپ کو بدمعاش ثابت کیا۔

---

[1] اس جگہ ملک سے مراد وہ ہندوستان ہے جو تقسیم کے وقت تک ایک ملک تھا۔ (جدید)

باقاعدہ حکومتیں بدمعاش بن گئیں، بڑے بڑے لیڈروں اور رئیسوں اور وزیروں نے بدمعاشی کی اسکیم سوچی اور حکومتوں کے پورے نظم ونسق نے اپنے مجسٹریٹوں اور اپنی پولیس اور اپنی فوج کے ذریعہ سے اِس اسکیم کو عملی جامہ پہنایا۔ دو سال پہلے تک ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ جس ملک میں ہم رہتے ہیں اس کی آبادی کا اخلاقی زوال اِس انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ نفیس لباسوں، اعلیٰ ڈگریوں اور بڑے ناموں کے پردے میں جو شخصیتیں چھپی ہوئی تھیں ان کو، ہم شرفا میں شمار کرتے تھے۔ عام آبادی کے پُرامن رویے کو دیکھ کر ہم سمجھتے تھے کہ یہ بھلے انسانوں کی بستیاں ہیں۔ مگر افسوس کہ واقعات نے اس سارے حُسن ظن کا پردہ چاک کر دیا۔ معلوم ہوا کہ پہلے جو کچھ ہم دیکھ رہے تھے وہ محض انگریز کی سنگین کا کرشمہ تھا۔ اس سنگین کے ہٹتے ہی یہ حقیقت کھل گئی کہ یہ ملک لاکھوں، کروڑوں ڈاکوؤں، لٹیروں، قاتلوں، زانیوں اور سخت کمینہ صفت ظالموں سے بھرا ہوا تھا۔

کیا یہ سب کچھ جو واقع ہوا محض ایک اتفاقی حادثہ تھا؟ جو لوگ پچھلے تیس سال سے اِس ملک کی رہنمائی کرتے رہے ہیں، اور جن کی قیادت میں یہ انقلاب رونما ہوا ہے، وہ ایسا ہی کچھ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ اس فسادِ عظیم کے اسباب کی بحث کو باتوں میں ٹالنا چاہتے ہیں۔ وہ اس کی ایک شاعرانہ توجیہ ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں کہ کشت و خون اور ظلم و ستم کا یہ مظاہرہ کوئی غیر معمولی چیز نہیں ہے جس پر کچھ فکر مند ہونے کی ضرورت ہو، یہ تو ایک آزاد قوم کی ولادت کے درد ہیں جو ایسے موقع پر ہوا ہی کرتے ہیں[1]۔ حالانکہ اگر یہ ولادت کے درد ہی تھے تو یہ دنیا کو ایک درندے کی پیدائش کی خوشخبری دے رہے تھے نہ کہ کسی انسان کے تولد کی۔ انہوں نے دنیا کو جو اطلاع دی وہ اس بات کی نہ تھی کہ کچھ انسان ہیں جن کا بندِ اسیری ٹوٹا ہے، بلکہ دراصل یہ اس بات کی اطلاع تھی کہ کچھ بھیڑیئے قید تھے جن کا پنجرہ کھل گیا ہے۔ اس کے بعد لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہندوستان کے باشندے اپنی فطرت

---

[1] یہ پنڈت جواہر لال نہرو تھے جنہوں نے اس کے لیے (Birth Pangs) کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ (جدید)

اور اپنے مزاج ہی کے لحاظ سے کمینے، بدمعاش اور سفاک ہیں، یا ان کو ایسا بنا دیا گیا ہے؟ پہلا الزام ثابت کرنے کے لیے اُس سے زیادہ قوی ثبوت کی ضرورت ہے جو پچھلے دو سال کے واقعات نے فراہم کیا ہے۔ آخر ہندوستانیوں کی پچھلی سینکڑوں برس کی تاریخ موجود ہے۔ اپنے ماضی میں انہوں نے کب ایسی ذلیل صفات کا مظاہرہ کیا تھا؟ پھر اگر یہ الزام ثابت نہیں ہے تو یقیناً دوسرا الزام آپ سے آپ ثابت ہے، یعنی یہ کہ ہمارے ملک کی آبادی کو اس اخلاقی پستی کے گڑھے میں گرایا گیا ہے۔ یہی وہ نتیجہ ہے جس سے بچنے کے لیے پچھلے دردناک واقعات کے اسباب کی بحث کو باتوں میں اڑانے کی کوشش کی جاتی ہے، کیونکہ یہ بحث اُن سب لوگوں کا منہ کالا کر دینے والی ہے جنہوں نے پچھلی ربع صدی میں ہمارے ملک کی سیاسی تحریکوں کی قیادت فرمائی ہے۔

ہندوستان میں سیاسی بیداری کی ابتدا مغربی تعلیم و تہذیب کے زیر اثر ہوئی۔ اس تعلیم اور تہذیب نے دو تحفے ہمارے ملک کے کار فرماؤں اور کارکن ہاتھوں کو دیے ہیں۔ ایک، قومیت کا احساس اور قوم پرستی کا جذبہ۔ دوسرے مادہ پرستانہ اخلاق۔

پہلی چیز کو لے کر یہاں کے سیاسی لیڈروں نے "ہندوستانی قومیت" کا ایک مصنوعی تخیل پیدا کرنے کی کوشش کی، مگر چونکہ اس کے لیے کوئی حقیقی بنیاد موجود نہ تھی اس لیے قومیت کی حس بیدار کرنے کی جتنی کوششیں کی گئیں ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں اُن مختلف گروہوں میں اپنی جداگانہ قومیتوں کا شعور جاگ اٹھا جو فی الحقیقت اپنے اندر قومیت کے فطری عناصر رکھتے تھے۔ اس طرح چالیس پچاس سال کی تبلیغ قومیت نے اس ملک میں ایک کے بجائے بہت سی چھوٹی بڑی قومیتیں پیدا کر دیں، جن میں سے تین ـــــ یعنی ہندو قومیت، مسلم قومیت اور سکھ قومیت ـــــ تو پوری طرح برسرِ کار آ کر اپنا کھیل کھیل چکی ہیں، اور باقی بہت سی صوبائی اور لسانی قومیتیں ابھی دورانِ تخلیق میں ہیں۔ پھر سیاسی اختیارات حاصل کرنے کے لیے برطانوی اقتدار کے خلاف جو جدوجہد ہو رہی تھی، اس کا قدم جتنا جتنا آگے بڑھتا گیا، ان مختلف قومیتوں کے درمیان آپس کی کشمکش اتنی ہی تیز تر اور تلخ تر ہوتی چلی گئی۔ اس کشمکش نے ان میں سے ہر ایک کے اندر قوم پرستی کا شعور بھڑکا دیا، اور ایک کی طرف سے

دوسرے کے قومی حوصلوں کی مزاحمت جتنی بڑھی اتنی ہی قومی عداوت ان کے درمیان بڑھتی چلی گئی۔

دوسری طرف مادّہ پرستانہ اخلاق کا جو درس مغربی تعلیم و تہذیب سے لیا گیا تھا وہ بادلے گتّے کے زہر کی طرح سارے ملک کی رگ رگ میں پھیل گیا۔ اس نے دلوں کو خدا ترسی اور حق شناسی سے خالی کر دیا، شرافت اور انسانیت کی جڑیں ہلا دیں، اور ان تمام اخلاقی قدروں کو ختم کر دیا جو اس ملک کے لوگوں نے اپنے قدیم مذہبوں سے پائی تھیں۔ یہ اس نئے اخلاق ہی کا کرشمہ تھا کہ پچھلے پچیس سال میں ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کی قومی کشمکش روز بروز زیادہ سے زیادہ رذالت کے راستوں پر بڑھتی چلی گئی۔ بڑے بڑے لیڈروں نے بے حیائی کیساتھ ایمان نگل کر قومی خود غرضیوں کے تقاضے پورے کیے، بڑی بڑی ذمّہ دار سیاسی جماعتوں نے حق اور انصاف سے بے نیاز ہو کر ایک دوسرے کے خلاف جوڑ توڑ کیے، ملک بھر کے اخبارات نے انتہائی بے شرمی کے ساتھ جھوٹے پروپگنڈے کیے، گالم گلوچ کا طوفان بپا کیا، اور نفرت و عداوت کی شراب پلا پلا کر اپنی اپنی قوموں کو بدمست کر دیا۔ پھر دونوں مخالف گروہوں کے لوگوں نے سرکاری محکموں میں، منڈیوں اور بازاروں میں اور زندگی کے ہر کاروبار میں ایک دوسرے کے خلاف کھلی کھلی بے انصافیاں اور حق تلفیاں کیں اور ہر اُس بے ایمانی کو اپنے لیے نیکی اور کارِ ثواب بنا لیا جو حریف قوم کے کسی فرد کے ساتھ کی جائے۔ واقعات کی یہ رفتار صاف بتا رہی تھی کہ اس ملک کا اخلاقی زوال کس پستی کی طرف بہا چلا جا رہا ہے۔

یہی وہ اسباب ہیں جنہوں نے مل جل کر وہ ہولناک نتائج پیدا کیے جو ہماری آنکھیں ابھی ابھی دیکھ چکی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کی ذمّہ داری سے وہ لوگ بری نہیں ہو سکتے جو اس دَور میں یہاں کی مختلف قوموں کے رہنما اور سربراہ کار رہے ہیں۔ یہی تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے ایک طرف اپنی اپنی قوم کے لوگوں میں قومی خواہشات برانگیختہ کیں اور دوسری طرف قومی اخلاق کو سنبھالنے کے لیے کچھ نہ کیا۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ اسے گرایا اور گرنے میں خود اس کی حوصلہ افزائی کی۔ اگر یہ اس کھیل کے نتائج سے بے خبر تھے تو سخت اناڑی تھے، ایسے اناڑی

اس قابل نہیں ہیں کہ کروڑوں انسانوں کی قسمتوں کے ساتھ بازی گری کرنے کے لیے انہیں چھوڑ دیا جائے ۔ اور اگر انہوں نے جان بوجھ کر یہ سارا کھیل کھیلا تو درحقیقت یہ انسانیت کے اور خود اپنی قوم کے دشمن ہیں، ان کا صحیح مقام پیشوائی کی مسند نہیں بلکہ عدالت کا کٹہرا ہے جہاں ان کے اعمال کا محاسبہ ہونا چاہیئے۔

یہ خیال کرنا سخت حماقت ہے کہ جو کچھ ہو گذرا وہ اس قومی کشمکش کا آخری باب تھا اور یہ کہ اب تقسیم ملک کے بعد تاریخ ایک صحیح راستے پر چل پڑے گی۔ ہرگز نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۵ اگست، ۴۷ء کی تقسیم سے یہاں جو دو مملکتیں بنی ہیں، انہوں نے قومی خود غرضی اور اخلاق پستی کا وہ سارا زہر میراث میں پایا ہے جو قبل تقسیم کے ہندوستان کی رگ رگ میں سرایت کر چکا تھا اور ان دونوں مملکتوں کی پیدائش کا آغاز جن سخت المناک حالات میں ہوا ہے وہ ان کی آئندہ تاریخ پر اثر ڈالے بغیر نہیں رہ سکتے۔ نئی سیاسی سرحدوں کے دونوں جانب، جو دو قومیں آباد ہیں ان کے دل ایک دوسرے کے خلاف انتقام اور عداوت کے تلخ ترین جذبات سے لبریز ہیں —— خصوصاً سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان تو وہ دشمنی پیدا ہو چکی ہے جو شاید اس وقت کہیں بھی دنیا کی دو قوموں کے درمیان نہیں پائی جاتی —— مسلمان، ہندو اور سکھ ایک دوسرے کو وہ چرکے لگا چکے ہیں جن کے زخم مدتوں رستے رہیں گے اور اب وہ کسی غیر قوم کے ماتحت بے بس نہیں ہیں بلکہ اپنی اپنی آزاد مملکتیں رکھتے ہیں۔ اگر اب بھی ان دونوں مملکتوں کے باشندوں کو ہوش نہ آیا، اگر اب بھی ان کی لیڈر شپ تبدیل نہ ہوئی اور اگر اس نئے دور میں بھی ان کے معاملات اسی اندھی اور گندی قوم پرستی پر اور اسی مادہ پرستانہ اخلاق پر چلتے رہے جس پر اب تک وہ چلے ہیں، تو آئندہ ان بااختیار قوموں کی کشمکش بہت زیادہ بڑے پیمانے پر بدرجہا زیادہ تلخ نتائج پیدا کرے گی۔ پہلے جو گالم گلوچ اخباروں کے کالموں میں ہوتی تھی وہ اب بین الاقوامی پیمانے پر ہوگی۔ پہلے جو چھوٹے چھوٹے معرکے دفتروں اور منڈیوں میں برپا ہوا کرتے تھے اب وہ دو سلطنتوں کے درمیان سیاسی رسہ کشی اور معاشی رقابت کی شکل میں برپا ہوں گے۔ اور پھر اگر خدانخواستہ ان دونوں قوموں کے درمیان کبھی جنگ ہو گئی تو یقیناً وہ ایسی سخت انتقامی جنگ ہوگی جو اپنی وحشت و بربریت میں تاریخ انسانی کی بدترین لڑائیوں کو بھی مات کر دے گی۔

لہٰذا اب پاکستان اور ہندوستان، دونوں کے مستقبل کی بہتری کا انحصار اس بات پر ہے کہ اگر ان کی آبادیوں میں شریف، معقول اور خداترس انسانوں کا کوئی عنصر موجود ہے تو وہ منظم ہو کر اُٹھے، اپنی اپنی قوم کی ذہنیت بدلنے کی کوشش کرے، اور موجودہ قیادتوں کو بدل کر ایسے طریقے پر دونوں ملکوں کے معاملات چلائے جس سے ان کے تعلقات شریفانہ ہمسایگی اور منصفانہ تعاون پر قائم ہو سکیں۔

اب ذرا ایک نظر تقسیم کے اُس ڈرامے پر بھی ڈال لیجیے جو پچھلے سال یہاں کھیلا گیا ہے، تاکہ آپ کو ان لیڈروں کی سیاسی دانائی کا حال معلوم ہو جائے جن کی مہارت فن کا شہرہ ایک مدت سے ہم سُن رہے تھے۔

اس ڈرامے کے اصل اداکار تین تھے، انگریز، کانگریس، اور مسلم لیگ۔ ان تینوں کے کام کا جائزہ لے کر ہمیں دیکھنا چاہیے کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنے آپ کو کیا ثابت کیا ہے۔

انگریزوں کے لیے دوسری جنگِ عظیم کے پیدا کردہ مسائل اور ہندوستان کی سیاسی بیداری نے جو سوال پیدا کر دیا تھا وہ یہ تھا کہ آیا اس ملک پر آخر وقت تک قاہرانہ تسلّط جاری رکھا جائے یہاں تک کہ زبردستی نکالے جانے کی نوبت آ جائے؟ یا وہ وقت آنے سے پہلے ہی باہمی رضامندی سے یہ ملک چھوڑ دیا جائے؟ پہلی صورت میں وہ مزید چند سال تک اس ملک پر قبضہ رکھ سکتے تھے، مگر اس عارضی فائدے کا مستقل نقصان یہ تھا کہ زبردستی نکالے جانے کے بعد انہیں اُن تمام فائدوں سے ہمیشہ کے لیے ہاتھ دھو لینا پڑتا جو ہندوستان سے اُٹھائے جا سکتے تھے۔ دوسری صورت میں برٹش ایمپائر کا بظاہر خاتمہ تھا، مگر آزاد ہندوستان سے فائدہ اٹھانے کے امکانات باقی رہتے تھے۔ ان دونوں صورتوں کے فوائد اور نقصانات کا موازنہ کر کے انگریزی قوم نے ٹھنڈے دل سے دوسری صورت کا انتخاب کیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ تاریخ اور نفسیات کے اس سبق سے بھی غافل نہ تھی کہ جو قوم کسی دوسری قوم کی غلامی سے آزاد ہوتی ہے اس کے اندر مدتوں تک اُس قوم کے خلاف شدید تعصب بلکہ انتقام کا جذبہ بھڑکتا رہتا ہے جو اس پر جبروقہر سے حکومت کرتی رہی ہو۔ اس لیے وہ اپنے مفاد کی خاطر یہ ضروری سمجھتی تھی کہ ہندوستان

کا معاملہ ایسے طریقے سے طے کیا جائے جس سے تعصب و انتقام کے وہ سارے جذبات جو اس کے خلاف بھڑک سکتے تھے خود ہندوستانیوں کے درمیان آپس میں ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو جائیں اور انگریز دونوں کا یار غار بن کر رہے۔ اس غرض کے لیے برطانوی حکومت نے پہلے لارڈ ویول کو استعمال کرنا چاہا، مگر معلوم نہیں کہ وہ چالاک کم تھا یا شریف زیادہ، بہرحال وہ تاریخ انسانی کی عظیم ترین سیاسی بدمعاشی کا وہ کام انجام نہ دے سکا جو اس کی قومی حکومت اس سے لینا چاہتی تھی۔ آخر کار نگاہِ انتخاب لارڈ ماؤنٹ بیٹن پر جا کر ٹھہری[1] اور اس شخص نے آکر تقسیم ہند کا پورا نقشہ ایسے طرز پر بنایا جو لازمی اور قطعی طور پر وہی نتائج پیدا کر سکتا تھا جو اس نے فی الواقع پیدا کیے[2]۔ کلکتہ، نواکھالی، بہار، گڑھ مکتیشور، راولپنڈی اور امرتسر کے واقعات کے بعد تقسیم ملک

---

[1] یہ شخص کس کیرکٹر کا آدمی تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے:

"لندن، ۱۸ نومبر۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن، جو ہندوستان کے آخری برطانوی وائسرائے تھے اور جو ملکۂ برطانیہ کے شوہر پرنس فلپ کے چچا ہیں، آج عدالت نے اس جرم پر اُن کو ۷ پونڈ جرمانہ کی سزا دی ہے کہ انہوں نے اپنے فارم واقع کینٹ (جنوبی مشرقی انگلستان) سے دودھ میں پانی ملا کر فروخت کیا۔" (پاکستان ٹائمز۔ مورخہ ۱۹ نومبر ۷۱ء) (حاشیہ جدید)

[2] یہاں حقیقت معاملہ کو سمجھنے کے لیے تھوڑی سی تاریخی وضاحت ضروری ہے۔ ۲۰ فروری ۴۷ء کو برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر ایٹلی نے دارالعوام میں جو بیان دیا تھا اس میں برطانیہ سے اہل ہند کی طرف اقتدار منتقل کرنے کے لیے آخری تاریخ یکم جون ۴۸ء مقرر کی گئی تھی، اور کنزرویٹو پارٹی کو اس پر یہ اعتراض تھا کہ اتنے بڑے تغیر کو روبعمل لانے کے انتظامات کرنے کے لیے ۱۵ مہینے کی مہلت ناکافی ہے۔ لیکن ۲۴ مارچ ۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان کا وائسرائے مقرر ہو کر آیا۔ اس نے مئی کے وسط تک تقسیم ہند کا خاکہ (جس میں پنجاب و بنگال اور آسام کی تقسیم کا تصور بھی موجود تھا) مکمل کیا اور برطانوی حکومت سے منظوری لے کر ۳ جون ۴۷ء کو اعلان کر دیا کہ ملک کی تقسیم اور برعظیم ہند میں دو آزاد مملکتوں کی تشکیل ۱۵ اگست ۴۷ء تک کر دی جائے گی۔ گویا جس کام کے لیے ۱۵ مہینے ناکافی سمجھے جا رہے تھے اس کے لیے یکایک کسی پیشگی تیاری کے بغیر یہ فیصلہ کر دیا گیا کہ وہ ۷۲ دن میں مکمل کر دیا جائے گا۔ یہ صریحاً ایک ارادی شرارت تھی تاکہ تقسیم سخت (باقی صفحہ ۲۹۶ پر)

اور انتقالِ اختیارات کا جو ڈھنگ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اختیار کیا اس کو دیکھ کر ایک معمولی عقل و بصیرت رکھنے والا آدمی بھی یہ اندازہ کر سکتا تھا کہ اس سے ملک کے ایک بڑے حصے میں سخت خونریزی ہو کر رہے گی۔ اب اگر یہ ماؤنٹ بیٹن کا اناڑی پن تھا اور کوئی دانستہ چالاکی نہ تھی جسے اس کی قوم کی رضامندی حاصل ہوتی، تو جو ہولناک نتائج اس سے برآمد ہوئے انہیں دیکھ لینے کے بعد، بجائے اس کے کہ اس شخص پر تحسین و آفرین کے پھول برسائے جاتے، اس پر لعنت ملامت کی بوچھاڑ ہونی چاہیے تھی اور لاکھوں انسانوں کے قتل اور ایک کروڑ سے زیادہ انسانوں کی خانہ بربادی کے بدلے میں اس پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جانا چاہیے تھا۔ لیکن اس کی سیاست دانی کی جو داد انگلستان میں دی گئی وہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ یہ سب کچھ دانستہ کیا گیا تھا اور اسے پوری انگریزی قوم کی رضامندی حاصل تھی۔ آج یہ اُسی چالاکی کا کرشمہ ہے کہ ہندو اور مسلمان اور سکھ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں، اور وہ انگریز جو کل تک تینوں پر یکساں ظلم کر رہا تھا تینوں کا مشترک دوست ہے۔ مسلمان کے لیے ہندستان کی، اور ہندو اور سکھ کے لیے پاکستان کی زمین تنگ ہے، مگر انگریز کے لیے ہر جگہ فراخی ہی فراخی ہے۔ انسانیت کے نقطۂ نظر سے آپ چاہے اس کو کتنا ہی بڑا جرم قرار دے لیں، انگریز کی قومی خود غرضی کے لحاظ سے یہ بالیقین ایک کامیاب ترین سیاسی چال تھی۔ مگر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اس پر زیادہ داد کا مستحق کون ہے، لارڈ ماؤنٹ بیٹن، یا ہندوستان کے وہ اندھے سیاسی لیڈر جو تقسیم کے اس نقشے کی ساخت اور تکمیل میں ہر مرحلے پر اس کے شریک کار رہے؟

اس ڈرامے کی دوسری اداکار کانگریس تھی اور اس نے جو پارٹ ادا کیا وہ احمقوں کے سوا کسی سے داد نہیں پا سکتا۔ تقسیم ہند سے دو تین برس پہلے ہی یہ بات بالکل واضح ہو چکی تھی کہ اب تقسیم کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ اس کے بعد دو راستے کھلے ہوئے تھے۔ ایک راستہ یہ تھا کہ تلخی اور بدمزگی کے بڑھنے سے پہلے ہی اُس چیز کو سیدھی طرح قبول کر لیا جاتا جو ناگزیر ہو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹۵ سے) افراتفری کے عالم میں ہو اور کشت و خون سے یہ سرزمین لالہ زار بن جاتے۔ (جدید)

چکی تھی، اور بھلے آدمیوں کی طرح بیٹھ کر سارے معاملات ایسے طریقے سے طے کر لیے جاتے کہ پھر مل جانے یا کم از کم شریف ہمسایوں کی طرح رہنے کے مواقع باقی رہتے۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ "لے کر رہیں گے" اور "ہر گز نہ دیں گے" کے اس جھگڑے کو انتہائی تلخی کی حد تک بڑھنے دیا جاتا اور اس ناگزیر تقسیم کو ایسے مرحلے پر پہنچ کر قبول کیا جاتا جہاں الگ ہونے والی قوموں کے درمیان دوستانہ تو درکنار شریفانہ انسانی تعلقات برقرار رہنے کے امکانات بھی ختم ہو جاتے۔ کانگریسی لیڈروں نے ان دونوں راستوں میں سے دوسرے راستے کو انتخاب کیا۔ اس کی وجہ اگر نادانی تھی تو بد قسمت ہے وہ قوم جو اپنی باگیں ایسے نادان لوگوں کے ہاتھ میں دے۔ اور اگر اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ اپنی قوم میں اپنی ہر دلعزیزی کو کھونے کے لیے تیار نہ تھے تو یہ اور بھی زیادہ افسوسناک ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان لوگوں نے اپنی پوزیشن کی خاطر ملک کو اُس راستے پر جان بوجھ کر چلایا جس میں ان کے کروڑوں ہم وطنوں کی بربادی تھی۔

اس سارے کھیل میں کانگریس نے اپنے طرزِ عمل سے اپنے دشمنوں اور مخالفوں کی ایک ایک بات کو سچا اور اپنی ایک ایک بات کو جھوٹا کر دکھایا۔

ہندوستان کی آزادی کے خلاف چرچل اور دوسرے انگریز مدبرین کی سب سے زیادہ پُر زور دلیل یہ تھی کہ ہمارے ہٹتے ہی ملک میں فسادِ عظیم رونما ہو جائے گا۔ کانگریسی لیڈر اس کے جواب میں کہتے تھے کہ یہ ایک بات ہے جو تم اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے بناتے ہو، ذرا ذمہ داری کا بوجھ اہلِ مُلک پہ ڈال تو دو، پھر دیکھو کہ کیسا امن اور انصاف قائم ہوتا ہے۔ اب واقعات نے کسے سچا اور کسے جھوٹا ثابت کیا؟ یہ آج سارا زمانہ دیکھ رہا ہے۔

مسٹر جناح کا سب سے بڑا الزام کانگریس پر یہ تھا کہ وہ دراصل ایک متعصب ہندو قوم پرست جماعت ہے اور اس نے محض منافقت کے ساتھ ہندوستانی قوم پرستی کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ کانگریسی اس الزام کو بالکل غلط کہتے تھے لیکن وزارتی مشن (Cabinet Mission) کی آمد کے بعد سے آج تک کانگریس اور اس کے لیڈروں نے

جو کچھ کیا ہے وہ مسٹر جناح کے الزام کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔ انہوں نے خود ہی اپنے اوپر سے اُس لبادے کو اُتار پھینکا ہے جسے مسٹر جناح منافقت کا لبادہ کہتے تھے۔

کانگرس کے مخالفین کہتے تھے کہ جو سوراج کانگرس قائم کرنا چاہتی ہے وہ دراصل ہندو راج ہوگا جس میں مسلمانوں کے لیے کوئی آزادی نہ ہوگی۔ اسی اندیشے پر تقسیم ملک کی تجویز مبنی تھی اور اسی خطرے کی بنا پر مسلمانوں کی عظیم اکثریت اُس تحریک آزادی کو مشتبہ نظروں سے دیکھتی تھی جس کی علمبرداری کا "شرف" کانگرس کو حاصل تھا۔ کانگرسی لیڈر ہمیشہ مسلمانوں کے ان اندیشوں اور خطرات کو بے بُنیاد قرار دیتے رہے۔ مگر ۱۵ اگست کے بعد جو کچھ ہندوستان میں ہوا اور اب تک ہو رہا ہے اس نے ان سارے اندیشوں کو بالکل صحیح ثابت کر دیا جن کی بنا پر مسلمان کانگرس کی تحریک آزادی کو اپنے لیے تحریک بربادی سمجھتے تھے۔ بلکہ درحقیقت سوراج قائم ہوتے ہی جو سلوک مسلمانوں کے ساتھ شروع ہوا وہ تو اُن بدتر سے بدتر اندازوں سے بھی بدرجہا زیادہ بدتر نکلا جو کانگرس کے شدید ترین مخالف لگا سکتے تھے۔

کانگرس کا دعویٰ تھا کہ وہ ہندوستان کی وحدت کا عقیدہ رکھتی ہے اور تقسیم کو محض مسلم لیگ اور انگریزی حکومت کی زبردستی سے بادلِ نخواستہ قبول کر رہی ہے۔ لیکن تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے وقت اور تقسیم کے بعد جو کچھ اس نے کیا وہ سب اِس تقسیم کو دائمی اور ابدی بنا دینے والا ہے۔ اگر آدمیت سے تقسیم کا معاملہ طے کیا جاتا، شرافت سے اس پر عملدرآمد کیا جاتا اور اس کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں سے منصفانہ سلوک کیا جاتا تو بعید نہ تھا کہ کچھ مدت بعد پاکستان خود ہندوستان کے ساتھ اتحاد کا خواہشمند ہوتا۔ مگر اب پاکستان اور ہندوستان کے درمیان وہ دیواریں کھڑی ہو چکی ہیں جو صدیوں تک انہیں ایک دوسرے سے جُدا رکھیں گی۔

اب تیسرے اداکار کو لیجیے جس کا پارٹ اس ڈرامے میں سب سے زیادہ ناکام رہا ہے۔

دس سال سے مسلمانوں کی قیادتِ عظمیٰ جس لائحۂ عمل پر چل رہی تھی وہ سلطان عبدالحمید خان

کی سیاست سے ملتا جلتا تھا۔ جس طرح وہ ۳۲ سال تک محض وُدلِ یورپ کی باہمی رقابتوں سے فائدہ اُٹھاکر جیتے رہے اور اس دوران میں خود اپنے ملک کی کوئی طاقت انہوں نے نہ بنائی جس کے بل بوتے پر وہ جی سکتا، اسی طرح اِس قیادت کا بھی سارا سیاسی کھیل بس انگریز اور کانگرس کی کشمکش سے فائدہ اُٹھانے تک محدود تھا۔ پورے دس سال میں اس نے خود اپنی قوم کی اخلاقی، مادی اور تنظیمی طاقت بنانے اور اس کے اندر قابلِ اعتماد سیرت پیدا کرنے کی کوئی کوشش نہ کی جس کی بنا پر وہ اپنے کسی مطالبہ کو خود اپنی طاقت سے منوا سکتی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جوں ہی انگریز اور کانگرس کی باہمی کشمکش ختم ہوئی، اِس قیادتِ عظمٰی نے اپنے آپ کو ایسی حالت میں پایا جیسے اس کے پاؤں تلے زمین نہ ہو۔ اب وہ مجبور ہوگئی کہ جو کچھ جن شرائط پر بھی ملے اُسے غنیمت سمجھ کر قبول کرلے۔ بنگال و پنجاب کی تقسیم اسے بے چون وچرا ماننی پڑی۔ سرحدوں کی تعیین جیسے نازک مسئلے کو اسے صرف ایک شخص کے فیصلے پر چھوڑ دینا پڑا۔ انتقالِ اختیارات کے لیے جو وقت اور جو طریقہ تجویز کردیا گیا اسے بھی بلا تامل اس نے مان لیا۔ حالانکہ یہ تینوں امور صریح طور پر مسلمانوں کے حق میں مہلک تھے۔ انہی کی وجہ سے ایک کروڑ مسلمانوں پر تباہی نازل ہوئی، اور انہی کی وجہ سے پاکستان کی عمارت اول روز ہی سے سخت متزلزل بنیادوں پر اُٹھی۔

اس قیادت کی غلطیاں اس سے بہت زیادہ ہیں کہ چند سطروں میں انہیں شمار کیا جا سکے۔ مگر اس کی چند غلطیاں تو اتنی نمایاں ہیں کہ آج ہر ذی ہوش آدمی ان کو بری طرح محسوس کر رہا ہے۔ مثال کے طور پر۔

۱۔ اس نے حصولِ پاکستان کی جنگ میں اُن علاقوں کے مسلمانوں کو شریک کیا جنہیں لامحالہ ہندوستان ہی میں رہنا تھا۔ آج یہ اُسی کا خمیازہ ہے کہ ہندوستان کی سرزمین اُن غریبوں کے لیے جہنم بن گئی ہے۔ حالانکہ اگر تقسیم کے بعد ہندوستانی اور پاکستانی مسلمانوں کا مستقبل ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوجانے والا تھا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ تقسیم سے پہلے دونوں کی پالیسی ایک ہوتی۔

۲۔ اس نے ہندوستانی مسلمانوں کو ایک ہفتہ پہلے بھی خبردار نہ کیا کہ تقسیم کے وقت ان پر کیا طوفان ٹوٹنے والا ہے۔ اگر فی الواقع اسے ان حالات کا اندازہ ہی نہ تھا تو اس کی غفلت و بیخبری

قابلِ ماتم ہے۔ اور اگر اس نے جان بوجھ کر مسلمانوں کو بے خبر رکھا تو اس غداری کے لیے اسے کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔

۳۔ جن لیڈروں پر ہندوستان کے مسلمان آخر وقت تک اندھا اعتماد کیے ہوئے تھے وہ عین وقت پر انہیں چھوڑ کر پاکستان اُٹھ آئے اور انہیں کچھ بھی نہ بتایا کہ اُن کے پیچھے وہ کیا کریں۔

۴۔ جو عجیب و غریب ہدایت ہندوستان کے مسلمانوں کو دی گئی وہ یہ تھی کہ ایک رات میں وہ اُن سارے اصولوں کو نگل جائیں جن پر وہ دس برس سے کانگرس کے خلاف لڑ رہے تھے۔ ۱۴ار اگست کا سورج دو قومی نظریئے کا کلمہ پڑھتے ہوئے غروب ہو اور ۱۵ار اگست کا سورج طلوع ہوتے ہی ہر ہندی مسلمان ہندوستانی قومیت کا معتقد بن کر اُٹھے۔

۵۔ پچھلے دس سال کی قومی تحریک میں اِسلام کا نام جس قدر لیا گیا اس کا پچاسواں حصہ بھی مسلمانوں کے اندر اسلامی اخلاق پیدا کرنے کے لیے کام نہیں کیا گیا۔ بلکہ ان کے قومی اخلاق کو پہلے سے کچھ زیادہ ہی پست کر دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ قومی جنگ میں مسلمان اُن تمام اخلاقی جرائم کے مرتکب ہوتے جن کا ارتکاب ان کے حریفوں نے کیا۔ مظالم کی مقدار میں چاہے کتنا ہی فرق رہا ہو مگر مظالم کی نوعیت میں دونوں کے کارنامے ایک دوسرے سے کچھ بھی مختلف نہ رہے۔ اگر ہماری قومی قیادت نے ہمارے عوام کی اخلاقی تربیت کے لیے کوئی کوشش کی ہوتی اور اکثریت کے علاقوں کے مسلمان وہ حرکات نہ کرتے جو انہوں نے کیں، تو اقلیت کے مسلمان اِس بُری طرح نہ پیسے جاتے، اور آج پاکستان کی اخلاقی پوزیشن ہندوستان سے اتنی زیادہ اونچی ہوتی کہ ہندوستان اس سے آنکھ ملا کر بات نہ کر سکتا۔

(ترجمان القرآن۔ جون ۱۹۴۸ء)

تقسیم کے وقت مسلمانوں کی حالت کا جائزہ

گزشتہ صفحات میں ہندوستان کے تازہ سیاسی انقلاب کا جو جائزہ لیا گیا تھا وہ اس کے صرف ایک پہلو سے تعلق رکھتا تھا۔ اس میں ہم نے بحیثیت مجموعی پورے ملک[1] کی حالیہ سرگزشت خونیں پر ایک نگاہ ڈال کر یہ بتایا تھا کہ اس ملک کے سابق حکمرانوں اور سیاسی لیڈروں نے مل جل کر اپنی خود غرضی، تنگ دلی اور احمقانہ بے تدبیری سے اس کو کس خوفناک تباہی کے راستے پر ڈال دیا ہے، اور اس سے بچنے کی واحد صورت اب کیا ہے۔ آج ہم اس کے دوسرے پہلو پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں، اور وہ یہ ہے کہ اس انقلاب میں سب سے زیادہ تباہی جس قوم پر آئی ہے ——— یعنی مسلم قوم ——— وہ آج کس حال میں ہے، کن اسباب نے اسے اس حالت کو پہنچا دیا ہے، اور اب کیا چیز اسے بچا سکتی ہے۔

دس گیارہ برس پہلے کی بات ہے جب ہندوستان کے سات صوبوں میں یکایک کانگرس کو برسر اقتدار دیکھ کر اور پنڈت نہرو سے مسلم عوام کے ساتھ براہ راست ربط قائم کرنے (Muslim Mass Contact) کا پروگرام سن کر مسلمانوں کو پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا کہ اس ملک میں ہندو قوم پرستی کا غلبہ ان کے لیے ایک حقیقی خطرہ ہے اور یہ خطرہ سر پر آ چکا ہے۔

---

[1] یہاں بھی ملک سے مراد وہ ہندوستان ہے جو تقسیم کے وقت تک ایک ملک تھا۔ (جدید)

اُس وقت مسلمانوں میں دو گروہ موجود تھے۔ ایک گروہ کہتا تھا کہ خطرہ وطرہ کچھ نہیں ہے، سب تمہارا وہم اور انگریز کا دلایا ہوا ڈراوا ہے، جو سیلاب اُمڈ رہا ہے ٹھیک اُمڈ رہا ہے، اطمینان کے ساتھ اس میں کُود پڑو، اور جدھر یہ بہا کر لے جانا چاہتا ہے پُورے انشراحِ صدر کے ساتھ اُدھر بہہ جاؤ۔ دوسرا گروہ کہتا تھا کہ خطرہ واقعی اور حقیقی ہے، یہ سیلاب محض آزادی وطن کا سیلاب نہیں بلکہ ہندو سامراجیت کا سیلاب ہے، اپنے آپ کو اس کے حوالہ کر دینے کے معنی قومی خودکشی کے ہیں، اور اس سے بچنے کی تدبیر ضرور کرنی چاہیئے۔ پہلا گروہ اگرچہ بڑی بڑی مذہبی شخصیتوں اور آزمودہ کار سیاسی لیڈروں پر مشتمل تھا، لیکن چونکہ وہ ایسی بات کہہ رہا تھا جو مسلمانوں کے عام احساسات کے خلاف تھی، اور پوری قوم کو ہندوستان کے ہر گوشے اور زندگی کے ہر میدان میں ہندو قوم پرستی کے ہاتھوں اس کے بالکل برعکس تجربات پیش آرہے تھے، اس لیے مسلمانوں نے مجموعی طور پر اُس کو رد کر دیا اور جوق در جوق دوسرے گروہ کی آواز پر وہ لبیک کہتے چلے گئے۔

پھر دوسرے گروہ میں بھی جلدی ہی اس مسئلے پر اختلافِ رائے ہو گیا کہ ہندو سامراج کی اِس بڑھتی ہوئی رَو کے مقابلہ میں مسلمانوں کے لیے راہِ عمل کیا ہے۔

ایک رائے یہ تھی کہ مغربی جمہوریت اور قوم پرستی کے اصولوں پر ہندو اقتدار کی تحریک کا مقابلہ کرنا اصولاً بھی غلط ہے اور عملاً بھی مفید نہیں۔ اصولاً اس لیے غلط ہے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے یہ اصول اُن اسلامی اصولوں سے ٹکراتے ہیں جن پر ہم ایمان لانے کے مدعی ہیں۔ اور عملاً یہ راہ اس بناء پر غیر مفید ہی نہیں، قطعی مہلک بھی ہے کہ ہندوستان کے ایک چھوٹے سے حصّے کو چھوڑ کر باقی سارے ملک میں مسلمان قلیل التعداد ہیں، اور ایک جمہوری نظام میں قومی جنگ لڑ کر اقلیت بجز تباہی کے اور کچھ مول نہیں لے سکتی۔ اس رائے کے پیش کرنیوالوں نے مسلمانوں سے کہا کہ اگر تم محض ایک قوم ہوتے تو بلاشبہ تمہارے لیے یہاں اِس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ ہوتا کہ قومی جنگ لڑ کر اپنے جتنے حصّے کو بچا سکتے بچا لیتے اور باقی حصّوں کی طرف سے پیشگی فاتحہ پڑھ لیتے۔ لیکن تم محض عام معنی میں ایک قوم نہیں ہو بلکہ ایک اصولی جماعت ہو جس کے پاس اصولِ اسلام کا ہتھیار وہ زبردست ہتھیار ہے جو پہلے بھی دنیا کو

مسخر کر چکا ہے اور آج بھی کر سکتا ہے۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ تم یہ مایوسانہ نقشۂ جنگ بناؤ۔ تمہارے لیے صحیح راہِ عمل یہ ہے کہ سیاسی اور معاشی اغراض کے لیے لڑنے والی ایک قلیل التعداد قوم کی پوزیشن چھوڑ دو جو غلطی سے تم نے اختیار کر رکھی ہے، اور اس کے بجائے اپنا اصل منصب سنبھالو جو مسائلِ زندگی کا ایک بہترین حل اور تمام موجود الوقت نظاموں سے زیادہ جامع اور منصفانہ نظام پیش کرنے والی جماعت کا منصب ہے۔ اس چیز کو لے کر اگر تم اٹھ کھڑے ہوئے اور تم نے علمی و فکری حیثیت سے اصولِ اسلام کا تفوق تمام دوسرے اصولوں پر ثابت کر دیا اور اس کے ساتھ اپنے آپ کو اخلاقی حیثیت سے بھی اپنے ہمسایوں پر فائق کر کے دکھا دیا تو یقین جانو کہ تھوڑی ہی مدت کے اندر ہندوستان میں توازنِ قوت بدل جائے گا، ہندوستان کی سیادت تمہارے سوا پھر کسی اور کا حصہ نہ ہوگی، اور بجائے اس کے کہ تم اپنے بچاؤ کے لیے پریشان ہو، تمہارے حریفوں کو یہ فکر لاحق ہو جائے گی کہ وہ تمہارے بڑھتے ہوئے سیلاب سے اپنے آپ کو کس طرح بچائیں۔

یہ وہی بات تھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں قریش کے لوگوں سے فرمایا کرتے تھے کہ میں وہ کلمہ لے کر آیا ہوں کہ اگر تم اسے لے لو تو عرب اور عجم سب تمہارے زیرِ نگین ہو جائیں گے۔ لیکن مسلمانوں نے اس مشورے میں وہی خطرہ محسوس کیا جو قریش نے محسوس کیا تھا کہ اِنۡ نَّتَّبِعِ الۡهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفۡ مِنۡ اَرۡضِنَا، یعنی اگر ہم اس راہِ عمل کو اختیار کر لیں تو اس سرزمین میں ہمارا کوئی ٹھکانا نہ رہے گا۔ پوری قوم میں بہت کم لوگ اس راہ کے امکانات کو سمجھ سکے، اور بہت ہی کم لوگ اس پر چلنے کے لیے آمادہ ہوئے۔ اس طرح یہ رائے قومی طرزِ عمل نہ بن سکی۔

دوسری رائے یہ تھی کہ تمام ہندوستان کے مسلمان ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں اور مل کر آواز اٹھائیں کہ ہم ایک الگ قوم ہیں، ہمارا مذہب الگ ہے، ہماری تہذیب الگ ہے، ہمیں اور ہندوؤں کو ملا کر سارے ملک میں ایک قومی جمہوری ریاست بنا دینا صحیح نہیں ہے، ملک کو تقسیم کیا جائے، جہاں ہماری اکثریت ہے وہاں ہماری آزاد قومی حکومت بنے اور جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے وہاں اُن کی آزاد قومی حکومت بن جائے۔

یہ راستہ آسان تھا۔ اس میں نہ کسی ذہنی کاوش کی کوئی حاجت تھی اور نہ کسی اخلاقی اصلاح و انضباط کا کوئی سوال۔ بظاہر بات بھی بالکل صاف تھی، اور مسلمانوں کے ذہین طبقہ کو ایک مدت سے جس قسم کی تعلیم و تربیت مل رہی تھی، اس کے لحاظ سے یہی بات ان کی دماغی سطح سے قریب تر بھی تھی۔ اس لیے مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت نے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ تھوڑے سے لوگوں کو چھوڑ کر ساری قوم نے اس راستے کو اپنا لیا۔ اس مرکزی تخیل پر جمع ہونے کے بعد سے پچھلے چند سالوں میں مسلمانوں نے من حیث القوم جو کچھ کیا ہے اُسی تحریک اور اُسی قیادت کے زیر اثر کیا ہے جو اس تخیل کو پیش کرنے کی ذمہ دار تھی۔ لہٰذا ہماری ماضی قریب کی سرگزشت کا اور ہمارے آج کے حال کا حسن و قبح لازماً اس تحریک ہی کی طرف راجع ہو گا۔

یہ تحریک ایک قومی تحریک تھی۔ اس میں وہ سب لوگ شریک ہوئے جو نام و نسب کے لحاظ سے مسلم قوم کے افراد تھے۔ یہ سوال اس میں سرے سے بے محل تھا کہ جو اس میں شامل ہوتا ہے وہ خدا، رسول، آخرت، وحی و کتاب اور دین و شریعت کو مانتا ہے یا نہیں، حرام و حلال کی تمیز کا قائل ہے یا نہیں اور فجور و تقویٰ، دین داری و بے دینی کی مختلف صفات میں سے کس صفت کے ساتھ متصف ہے۔ اصل مسئلہ قوم کو بچانے کا تھا اور اس کے لیے تمام قومی عناصر کا متحدہ محاذ بننا ضروری تھا۔ پھر جو کام پیش نظر تھا وہ بھی نہ تو سے اور امامت کا نہ تھا کہ دین و اعتقاد کے تجسس کی ضرورت پیش آتی۔ مقصود صرف قومی مدافعت تھی اور اس کے لیے تحریک کی شرکت تو درکنار اس کی قیادت و رہنمائی کے معاملہ میں بھی یہ دیکھنے کی حاجت نہ تھی کہ جن لوگوں کو ہم آگے لا رہے ہیں ان کا اسلام سے کتنا اور کیسا تعلق ہے۔

یہ تحریک سیاسی تھی، اس میں اخلاق کا بھی کوئی سوال نہ تھا۔ جس نے سیاسی جوڑ توڑ میں جتنی زیادہ مہارت دکھائی وہ اتنے ہی زیادہ ذمہ داری کے منصب کا اہل قرار پایا۔ اس قابلیت کا ثبوت مل جانے کے بعد یہ دیکھنا بالکل غیر ضروری تھا کہ اس کی دیانت، امانت، صداقت کا کیا حال ہے اور اس کی سیرت کہاں تک اعتماد کے لائق ہے۔

اس تحریک میں اگرچہ مذہب کا کوئی دخل نہ تھا۔ بعینہٖ اسی قسم کی تحریک ایسے ہی کارکنوں اور لیڈروں اور پیروؤں کے ساتھ دنیا کی ہر قوم اُٹھا سکتی تھی۔ لیکن اتفاق کی بات

تھی کہ جو قوم اپنی مدافعت کے لیے یہ تحریک لے کر اُٹھی تھی اس کا مذہب اسلام تھا۔ اس لیے اسلام کی خدمات بھی اس کے لیے حاصل کی گئیں۔ اصول یہ قرار پایا کہ ہدایت و رہنمائی تو اسلام کے بس کا روگ نہیں ہے، اور نہ یہ کہنے کا اُسے حق ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے اور کیا نہ کرنا چاہیئے، البتہ یہ اُس کا فرض اور اولین فرض ہے کہ جو کچھ ہم کریں وہ اس کی تصدیق و توثیق کرے، اس پر اجر کی اُمید دلائے، اس پر چسپاں کرنے کے لیے اپنی کوئی نہ کوئی اصطلاح مستعار دے، اور اس میں ہمارا ساتھ نہ دینے والوں کو جہنّم کا راستہ دکھائے، اس لیے کہ ہم جو کچھ کریں گے اسی پر مسلم قوم کا بچنا موقوف ہے، اور مسلم قوم ہی نہ رہی تو یہ اسلام صاحب آخر رہیں گے کہاں؟ یوں اس تحریک میں اسلام سے وہ خدمت لی گئی جو بگڑے ہوئے نواب زادے اپنے خاندان کے کسی پرانے جانثار ملازم سے لیا کرتے ہیں۔ مشورہ اور نصیحت اُس کا کام نہیں ہوتا۔ میاں لوگ اپنی مرضی سے جو چاہیں کریں۔ مگر آڑے وقت میں بوڑھے خادم کو پکارا جاتا ہے کہ آ اور حقِ نمک ادا کر۔ پھر اگر وہ غریب اُن حرکات پر صبر نہیں کر سکتا جن کی وجہ سے بُرے وقت آتے ہیں اور بے چین ہو کر کبھی کہہ بیٹھتا ہے کہ صاحبزادے اپنے اطوار ٹھیک کرو، تو اُسے ڈانٹ دیا جاتا ہے کہ ایاز قدرِ خود بشناس، تو اپنے کام سے کام رکھ، تیری یہ حیثیت کب سے ہو گئی کہ ہمارے معاملات میں دخل دے۔

یہ تھیں وہ بنیادیں جن پر ہماری یہ قومی تحریک اول روز سے اٹھی اور آخر تک بڑھتی چلی گئی۔ اس کے اجزائے ترکیبی میں مومن اور منافق اور کھُلے کھُلے ملحد سب شامل تھے۔ بلکہ دین میں جو جتنا ہلکا تھا وہ اتنا ہی اوپر آیا۔ اس میں اخلاق کی سرے سے کوئی پوچھ نہ تھی۔ عام کارکنوں سے لے کر بڑے سے بڑے ذمّہ دار لیڈروں تک میں انتہائی ناقابلِ اعتماد سیرت کے لوگ موجود تھے، بلکہ تحریک کا قدم جتنا آگے بڑھا اس قسم کے عناصر کا تناسب بڑھتا ہی چلا گیا۔ اس میں اسلام کو اتباع کے لیے نہیں بلکہ صرف عوام میں مذہبی جوش پیدا کرنے کے لیے فریقِ جنگ بنایا گیا تھا۔ کبھی ایک دن کے لیے بھی اس کو یہ حیثیت نہیں دی گئی کہ وہ حکم دے اور یہ اسے مانیں، اور کوئی قدم اٹھاتے وقت یہ اُس سے استصواب کریں۔

پھر چونکہ مقابلہ ہندو سے تھا اس لیے یہ بھی ضروری تھا کہ اس کے ہر حربے کا جواب ویسے ہی حربے سے، ہر چوٹ کا جواب ویسی ہی چوٹ سے، اور ہر چال کا جواب ویسی ہی چال سے دیا جاتے۔ جن جن پستیوں میں وہ گرا مسلمان بھی اس کی ضد میں گرے، اور جو جو کچھ وہ اپنی قومی خود غرضیوں کی خاطر کرتا گیا مسلمانوں نے اس دلیل پر اس کا ارتکاب کیا کہ ہندو ایسا کر رہا ہے۔ اس مقابلہ و مسابقت نے مسلمانوں کی عام اخلاقی سطح اتنی گرادی کہ شاید اس سے پہلے وہ کبھی اخلاقی حیثیت سے اتنے نہ گرے تھے۔

یہ تو تھا ہماری اس عظیم الشان قومی تحریک کا اخلاقی و دینی پس منظر۔ اب ذرا اس کے اصل کام کا جائزہ لیجیے جو وہ قوم کو بچانے کے لیے کر رہی تھی۔

مسلمانوں کا قومی مطالبہ جو اس نے مرتب کیا وہ یہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی عددی اکثریت کے لحاظ سے ملک تقسیم کر دیا جائے۔ اس مطالبہ کے اندر آپ سے آپ تین باتیں شامل تھیں۔ ایک یہ کہ تقریباً آدھے مسلمان ہندوؤں کے قومی غلام بن کر رہ جائیں۔ دوسرے یہ کہ مسلمانوں کی قومی ریاست دو ایسے چھوٹے چھوٹے خطوں میں بٹے جن کی حیثیت ہندو ریاست کی سرحدوں پر قریب قریب وہی ہو جو پولینڈ اور چیکوسلوواکیہ جیسی ریاستوں کی حیثیت روس کی سرحدوں پر ہے۔ تیسرے یہ کہ ان دونوں خطوں کے درمیان بھی ایک ہزار میل کا ہندو علاقہ حائل ہو اور ان کے درمیان نہ حالتِ امن میں پوری طرح تعاون ہو سکے نہ حالتِ جنگ میں یہ ایک دوسرے کی مدد کر سکیں[1]۔

---

[1] یہ بات ابتدا ہی سے واضح تھی کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کا ایک ملک بن کر رہنا اُسی وقت تک ممکن ہے جب تک ہندو تقسیم کے بین الاقوامی راضی نامے کا احترام کریں۔ لیکن جس وقت بھی وہ اس کا احترام بالائے طاق رکھ دیں اور مسلمانوں کے کسی گروہ سے سازش کر کے مشرقی پاکستان میں پہلے کوئی بغاوت برپا کرائیں اور پھر اس کی مدد کو خود پہنچ جائیں، یہ وحدت باقی نہ رہ سکے گی، کیونکہ اس صورت میں مغربی پاکستان کسی طرح بھی مشرقی پاکستان کو نہیں بچا سکتا۔ یہ ایسی حقیقت تھی جس کو ہندو پاکستان کے نقشے پر ایک نگاہ ڈال کر ہر شخص پہلی نظر ہی میں دیکھ سکتا تھا۔ (جدید)

اوّل روز ہی سے معلوم تھا کہ ہندو اس مطالبہ کی سخت مزاحمت کرے گا، چنانچہ وہ اُس نے
کی اور ایک طرف سے مطالبے اور دوسری طرف سے مزاحمت نے چند سال کے اندر قومی جنگ کو
اتنی شدید تلخی کی حد تک پہنچا دیا کہ شاید آج جرمنی اور روس، امریکہ اور جاپان، عرب اور یہود
کے درمیان بھی اس سے زیادہ تلخی نہ ہوگی۔ اس قومی جنگ میں لامحالہ مسلمان ہی سب سے زیادہ
نقصان اٹھانے والے تھے۔ کیونکہ ان کا پورا نصف حصّہ ہمارے اپنے مطالبہ کی رُو سے ان کے مالکانہ
تصرف میں جانے والا تھا۔ پھر چونکہ اقلیت کے مسلمانوں کو بھی اس جنگ میں شریک کیا گیا تھا،
بلکہ پیش پیش وہی تھے، اس لیے یہ یقینی بات تھی کہ جنگ کے آخری مرحلوں میں، اور تقسیم کے بعد
اُن کو بدترین مظالم کا تختۂ مشق بننا پڑے گا۔ یوپی، بہار، اور دوسرے ہندوستانی علاقوں میں
کسی مکان پر "پاکستان زندہ باد" لکھا ہونا یہ معنی رکھتا تھا کہ ایک وقت میں یہی فقرے بدمست
دشمنوں کو آتش زنی، قتل وغارت اور عصمت دری کی دعوت دیں۔

اس کے ساتھ مزید غضب یہ کہ قومی جنگ کے لیے ہم نے جو طاقت فراہم کی تھی وہ نعرے،
جھنڈے، جلسے، جلوس، ریزولیوشن، اخباری بیانات اور سیاسی گفت وشنید سے زیادہ
کچھ نہ تھی۔ یہ سب ہتھیار صرف اُسی حالت کے لیے موزوں ہو سکتے تھے جب کہ قسمتوں کی
میزان ایک تیسری طاقت کے ہاتھ میں ہو، اور وہ خود اپنی مصلحتوں کی خاطر توازن قائم کرنے کے
لیے ایک فریق کے مقابلہ میں دوسرے فریق کے شوروغل کو وزن دیتا ہے۔ ہمارے لیڈر
مدتوں تک اس حالت میں رہتے رہتے اس کے اتنے خوگر ہو چکے تھے کہ وہ سب کچھ اس کے
اندر ہی سوچ سکتے تھے۔ اس حالت کے گزر جانے کے بعد دوسری حالت میں کیا کچھ درکار ہے
اس کا شاید انہیں کوئی اندازہ ہی نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب دوسرے حالات یکایک پیش آگئے تو
ان کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ بالکل بے سروسامان تھے۔

پچھلے سال (۱۹۴۷ء) کے آغاز تک کسی کو بھی محسوس نہ ہوا کہ ہم اپنے اندر کیا کمزوریاں لیے
ہوتے ہیں، ہماری سیاست کیا نتائج اپنے اندر چھپائے ہوتے ہے، اور قومی جنگ کس رُخ
پر جا رہی ہے۔ شوروشغب اور ہنگامہ وجوش نے ایک ایسا فریب قوت پیدا کر دیا تھا کہ ہم
اپنی تنظیم کو ایک مکمل تنظیم اور اپنی سیاست کو ایک ماہرانہ سیاست سمجھے بیٹھے تھے، اور اس وقت ہر

وہ شخص ہمیں اپنا دشمن نظر آ رہا تھا جو سطح کے نیچے چھپے ہوئے کمزور پہلوؤں کی طرف، یا سر پر آئے ہوئے طوفانِ بلا کی طرف ذرا سا اشارہ بھی کر دے۔ مگر جونہی کہ تقسیم کا فیصلہ ہوا، یکایک وہ ساری ہی کمزوریاں رنگ لے آئیں جو ہمارے قومی اخلاق میں، ہماری قومی تنظیم میں اور ہمارے سیاسی نقشے میں موجود تھیں۔

پانچ کروڑ مسلمانوں نے انتہائی بے بسی کی حالت میں ایک مفتوح اور شکست خوردہ قوم کی حیثیت سے اپنے آپ کو اچانک اُن ہندوؤں اور سکھوں کے جنگل میں پایا جن کے ساتھ وہ چند روز پہلے دو بدو لڑ رہے تھے۔ اس طرح جو تحریک پوری قوم کو بچانے کے لیے اُٹھی تھی اس کی تدبیرِ مدافعت کا خلاصہ یہ نکلا کہ ایک نصف کو بچانے کے لیے دوسرے نصف کو ایسی سخت تباہی کے گڑھے میں پھینک دیا گیا جس کا تصور بھی پہلے نہ کیا جا سکتا تھا۔

مشرقی پنجاب، دہلی اور اس کے آس پاس کے دوسرے علاقوں میں جب مسلمانوں پر ظلم و ستم کا پہاڑ یکایک ٹوٹ پڑا تو وہ قومی تنظیم جس پر کئی سال سے مسلمان اعتماد کیے ہوئے تھے ان کے لیے بالکل بیکار ثابت ہوئی۔ ہر جگہ کے مقامی لیڈروں اور قومی کارکنوں میں سے ۹۵ فی صدی سخت ناقابلِ اعتماد نکلے۔ انہوں نے عین وقت پر اپنی قوم کا ساتھ چھوڑ دیا اور صرف اپنے بچاؤ کی فکر کی۔ ان محافظینِ قوم نے وہ اسلحہ تک، جو مسلمانوں کی مدافعت کے لیے فراہم کیے گئے تھے ازیادہ داموں پر ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں فروخت کرنے میں تامل نہ کیا۔ انہوں نے خطرے کے علاقوں سے مسلمانوں کو بچا کر نکالنے کے بجائے اپنے جانوروں اور اپنے عیش کے سامانوں کو نکال لانا زیادہ ضروری سمجھا۔ انہوں نے پاکستان کے سرکاری ٹرکوں پر پناہ گزینوں کو بٹھلانے کے لیے بھی رشوتیں وصول کیں۔ انہوں نے کیمپوں میں ایک ایک دانے کے لیے ترسنے والے پناہ گزینوں کے ہاتھ بھی وہ روٹیاں مہنگے داموں بیچیں جو سرکاری خرچ پر بھیجی گئی تھیں۔

پھر مسلمانوں کے قومی اخلاق کی تعمیر سے جو غفلت برتی گئی تھی اس نے اپنے بدترین نتائج پاکستان کی سرحد کے دونوں طرف دکھائے۔ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں نے بڑے بڑے علاقے محض دھمکیوں میں خالی کر دیئے، انہوں نے انتہائی بے غیرتی کے منظر جیتے جی اپنی آنکھوں سے دیکھے، ایک ایک سکھ کے آگے پچاس پچاس مسلمان زمین بوس ہوتے، اور اس کے ساتھ عین اُس

قیامت صغریٰ کی حالت میں بھی مسلمان نے مسلمان کو لوٹنے میں، اور ذرا ذرا سی ضرورت کی چیزیں اپنے مصیبت کے ساتھیوں کے ہاتھ بلیک مارکیٹ کے داموں بیچنے میں کوئی شرم محسوس نہ کی۔ دوسری طرف مغربی پنجاب، سرحد اور سندھ کے مسلمانوں نے، ان کے لیڈروں اور قومی کارکنوں نے، ان کے منتخب کیے ہوئے ایم ایل اے صاحبان نے اور ان سرکاری ملازموں نے جو کبھی قومی درد سے بہت تڑپا کرتے تھے، ہندوؤں اور سکھوں کے مال لوٹ لوٹ کر جس طرح اپنے گھر بھرے، اپنے پناہ گزین بھائیوں کے بسنے میں جو مشکلات پیدا کیں، مصیبت کے مارے ہوئے مسلمانوں کے ساتھ جس بیدردی کا سلوک کیا، اور پاکستان بنتے ہی بے نظمی، نافرض شناسی، رشوت، خیانت، اقرباپروری اور ظلم و بے انصافی کی جو گرم بازاری کی اسے دیکھ کر یہ بالکل عیاں ہو گیا کہ سیرت و اخلاق کے بغیر نرے جھنڈوں، نعروں اور جلوسوں کے بل پر کسی قوم کو اٹھانے کے کیا نتائج ہوا کرتے ہیں۔

اس سارے نامۂ اعمال میں اگر کسی چیز کو نفع کے خانہ میں رکھا جا سکتا ہے تو وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ انہوں نے کم از کم آدھے مسلمانوں کو تو بچا لیا اور ان کی ایک قومی ریاست بنا دی۔ لیکن افسوس کہ اس "روشن" کارنامے کو بھی ہم بدترین غلطیوں سے داغدار پاتے ہیں اور بری طرح ان کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ تقسیم ہند کا معاملہ جس طریقے سے طے کیا گیا وہ غلطیوں بلکہ حماقتوں کا ایک مجموعہ تھا۔ سرحدات کا تعین گفت و شنید سے طے کرنے کے بجائے دو کمیشنوں پر چھوڑ دیا گیا۔ کمیشن کی ترکیب ایسی قبول کی گئی جس سے فیصلہ کا اختیار کلیتہً صدر کے ہاتھ میں رہ جاتا تھا۔ صدر بھی کسی غیر جانبدار قوم کا آدمی نہیں بنایا گیا بلکہ انگریز قوم سے لیا گیا جو ہندوستان میں نہ غیر جانبدار تھی نہ بے غرض۔ پھر اس فیصلہ کا اعلان کرنے کے اختیارات بھی اس شخص (لارڈ ماؤنٹ بیٹن) کے ہاتھ میں چھوڑ دیئے گئے جو صرف ہندوستان کا گورنر جنرل رہ جانے والا تھا، اور ہماری قیادت عظمیٰ نے پیشگی یہ قول دیدیا کہ اس فیصلے کی رو سے جو بھی سرحدیں مقرر کر دی جائیں گی انہیں وہ بے چون و چرا مان لے گی۔ اس شدید غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنگال اور پنجاب دونوں میں مسلمان اکثریت کے متعدد علاقے ہندوستان کے ساتھ ملحق کر دیئے گئے، مشرقی پنجاب کی پوری تحصیلیں جن میں مسلمانوں کی واضح اکثریت تھی، ہندوؤں اور سکھوں کے قبضہ میں چلی گئیں، اور سب سے زیادہ یہ کہ گورداسپور

کا ضلع ہندوستان میں شامل ہو گیا جس کی وجہ سے کشمیر کے ہندو رئیس کو ہندوستان کے ساتھ تعلق جوڑنے کا راستہ مل گیا۔

انتقالِ اختیارات کی جو صورت لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے تجویز کی تھی وہ صریح طور پر پاکستان کے حق میں سخت مضر تھی، مگر ہماری قیادت عظمیٰ نے اسے بھی جوں کا توں قبول کر لیا۔ پاکستان کے حصّہ کی فوجیں جگہ جگہ منتشر تھیں، اس کے حصّے کا سامان اور فوجی ذخائر بھی ہندوستان کے قبضے میں تھے، اس کے حصّے کا سرمایہ بھی ہندوستان ہی کے ہاتھ میں تھا، اس کے دفاتر اور اس کا عملہ تک ابھی پوری طرح منتقل نہ ہوا تھا، اور اس حالت میں پاکستان کی مستقل مملکت نظم و نسق اور دفاع کی پوری ذمّہ داری کے ساتھ قائم کر دی گئی۔ آج یہ اسی حماقت کا نتیجہ ہے کہ اپنی قوم کے جس آدھے حصّے کو انہوں نے ہندو اقتدار کے چنگل سے نکالا ہے وہ بھی اُس کے دباؤ سے پوری طرح آزاد نہیں ہو سکا۔ جونا گڑھ پر انہوں نے زبردستی قبضہ کیا اور ہم اپنی بے بسی کی وجہ سے اُنگلی تک نہ ہلا سکے۔ کشمیر کے مسلمانوں کو وہ ہمارے سامنے پامال کر رہے ہیں اور ہم ان کے مقابلہ میں کھُل کر لڑنے کی جرأت نہیں رکھتے۔ ہماری گردن اُن سے دبی ہوئی ہے اور ہم ہر موقع پر ان سے دبتے چلے جا رہے ہیں۔

آج ایک سال کے بعد کہا جا رہا ہے کہ یہ سب کچھ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی زبردستی سے کیا تھا اور ہم اس پر راضی نہ تھے۔ مگر سوال یہ ہے کہ جب یہ زیادتی کی جا رہی تھی اور آپ دیکھ رہے تھے کہ ماؤنٹ بیٹن ہماری بربادی کے سامان کر رہا ہے، اس وقت آپ کی زبان کہاں چلی گئی تھی؟ کیوں نہیں آپ نے اپنی قوم اور ساری دنیا کو اس شرارت کی اطلاع دی؟ کیوں آپ خاموشی کے ساتھ وہ سب کچھ قبول کرتے چلے گئے جو مسلمانوں کے لیے سخت تباہ کن تھا؟ کیوں آپ نے اسی وقت یہ اعلان نہ کیا کہ یہ سب کچھ ماؤنٹ بیٹن اپنی ذمّہ داری پر کر رہا ہے اور ہم برضا و رغبت اس کی ذمّہ داری میں شریک نہیں ہیں؟ صرف یہی نہیں کہ اس وقت آپ خاموش رہے۔ بعد میں جب اس غلط طرزِ تقسیم کے سخت ہولناک نتائج رونما ہو گئے اور لاکھوں مسلمانوں کو اس کا بدترین خمیازہ بھگتنا پڑا، اس وقت بھی آپ نے اپنی پوزیشن صاف کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہ کی۔

جیسا کہ ہم ابتدا میں کہہ چکے ہیں، دس سال پہلے مسلمانوں کے سامنے یہ سوال آیا تھا کہ وہ ہندو سامراج کے تسلّط سے اپنے آپ کو کیسے بچائیں۔ اس سوال کا ایک حل پیش کیا گیا تھا کہ اسلام

کے اصولوں اور اسلامی سیرت کی طاقت سے اس خطرے کا مقابلہ کیا جائے۔ مگر اس حل نے مسلمانوں کو اپیل نہ کیا اور وہ اسے آزمانے پر آمادہ نہ ہوئے۔ اب یہ بحث بیکار ہے کہ اسے آزمایا جاتا تو کیا ہوتا۔ دوسرا حل جو پیش کیا گیا وہ یہ تھا کہ قومیت کی بنیاد پر سیاسی جنگ لڑی جائے۔ اسی حل کو مسلمانوں نے قبول کیا اور اپنی ساری قومی طاقت، اپنے تمام ذرائع اور اپنے جملہ معاملات اُس قیادت کے حوالے کر دیئے جو اُن کے قومی مسئلے کو اس طرح حاصل کرنا چاہتی تھی۔ دس برس کے بعد آج اس کا پورا کارنامہ ہمارے سامنے ہے اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس نے کس طرح کس صورت میں ہمارے مسئلے کو حل کیا۔ جو کچھ ہو چکا ہے وہ تو اٹ ہے، اب اسے بدلا نہیں جا سکتا۔ اُس پر اس حیثیت سے تو بحث بیکار ہے کہ یہ نہ کیا جاتا تو کیا ہوتا۔ البتہ اس حیثیت سے اس پر بحث کرنا ضروری ہے کہ جو مسائل اب ہمیں درپیش ہیں، کیا ان کے حل کے لیے بھی وہی قیادت موزوں ہے جو اس سے پہلے ہمارے قومی مسئلے کو اس طرح حل کر چکی ہے؟ کیا اس کا اب تک کا کارنامہ یہی سفارش کرتا ہے کہ اب جو بڑے بڑے اور نازک مسائل ہمارے سر پر آپڑے ہیں، جن کا بیشتر حصہ خود اسی قیادت کی کارفرمائیوں کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے، انہیں حل کرنے کے لیے ہم اس پر اعتماد کریں؟

(ترجمان القرآن۔ جولائی ۱۹۴۸ء)

تقسیم کے بعد سامنے آنے والے مسائل

مسلمان اس وقت بحیثیت ایک قوم کے جن بڑے بڑے مسائل سے دوچار ہیں ان کا ابھی تک پوری طرح جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ ہمارے سوچنے سمجھنے والے طبقے ان مسائل کا کچھ نہ کچھ ادراک ضرور رکھتے ہیں اور ان پر غور و فکر کرتے بھی رہتے ہیں، لیکن عام طور پر جو بحثیں پڑھنے اور سننے میں آتی ہیں ان سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ نہ تو ان مسائل کا پورا احاطہ کیا گیا ہے اور نہ ان کا تجزیہ کر کے دیکھا گیا ہے کہ ان میں سے ہر ایک مسئلہ کیا نوعیت رکھتا ہے، کیا اس کے اسباب ہیں، کیا اس کی اہمیت ہے، اور کس طرح وہ حل ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قوم بحیثیت مجموعی اب تک اپنے اصل مسائل سے غافل ہے۔ پھر ہمارے اندر ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جن کی خواہش اور کوشش یہی ہے کہ قوم کو ان مسائل سے غافل کیا اور رکھا جائے۔ وہ اس کی توجہ ان سے ہٹا کر ہنگامی معاملات کی طرف پھیرتے رہتے ہیں۔ وہ اسے اب تک وہی نشہ پلائے جا رہے ہیں جو آزادی سے پہلے پلا رہے تھے۔ وہ اسے تھپکیاں دے دے کر مطمئن کر رہے ہیں کہ یہ مسائل یا تو موجود ہی نہیں ہیں یا ہیں بھی تو ان کے لیے کچھ زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ باتیں خواہ نادانی کے ساتھ کی جا رہی ہوں یا ہوشیاری کے ساتھ، اور خواہ کسی پارٹی کی اغراض کے لیے یہ کتنی ہی مفید ہوں، بہرحال قوم کی خیرخواہی کا ان میں شائبہ تک نہیں ہے۔ قوم کی بھلائی اسی میں ہے کہ اس کے سامنے واضح طور پر وہ سارے

مسائل رکھ دیے جائیں جن سے اس کو عہدہ برآ ہونا ہے۔ پھر اسے یہ سوچنے کی دعوت دی جائے کہ آیا وہ اپنی موجودہ حالت میں ان مسائل سے عہدہ برا ہونے کے قابل ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو الحمدللہ، اور نہیں ہے تو اسے لامحالہ اپنے اندر تبدیلی کرنی ہوگی اور غور کرنا پڑے گا کہ وہ تبدیلی کس نوعیت کی ہو۔

ہمارے لیے اس وقت سب سے زیادہ نازک اور سب سے بڑھ کر دلخراش مسئلہ ان مسلمانوں کا ہے جو تقسیم ملک کے بعد ہندوستان میں رہ گئے ہیں۔ تقسیم کے وقت ان کی تعداد پانچ کروڑ کے لگ بھگ تھی، یعنی ہماری قوم کا پورا نصف حصّہ۔ تقسیم کے بعد ان میں سے کئی لاکھ فنا کے گھاٹ اُتار دیئے گئے، ایک بڑی تعداد جبراً غیر مسلم بنالی گئی، ساٹھ ستر لاکھ پاکستان میں دھکیل دیئے گئے اور دس پندرہ لاکھ کو حیدرآباد میں پناہ لینی پڑی[1]۔ اب اندازہ کیا جاتا ہے کہ چار کروڑ مسلمان ہندوستان میں باقی ہیں۔ یہ باقی ماندہ مسلمان آج انڈین یونین میں وہی حیثیت رکھتے ہیں جو روس کے ماتحت مفتوح جرمنوں کی اور امریکہ کے ماتحت شکست خوردہ جاپانیوں کی ہے۔ دس سال کی تلخ و تیز قومی جنگ کے بعد اب وہ بالکل بے بسی کے ساتھ اپنے سابق حریفوں کے قبضے میں ہیں۔ انہیں "پاکستان زندہ باد" کی وہ قیمت دینی پڑ رہی ہے جو ان کے شہری حقوق ہی کو نہیں، انسانی حقوق تک کو لاگتی ہے۔ وہ سب "غدار" اور سب "جاسوس" ہیں۔ ہر ایک کی وفاداری مشتبہ ہے۔ ہر ایک کے لیے خانہ تلاشی اور گرفتاری مقدر ہے الّا یہ کہ کسی کی باری آنے میں ابھی کچھ دیر ہو۔ پوری قوم اصل میں یرغمال بن چکی ہے۔ اس کے لیے عزت کی زندگی کا دروازہ بند ہے اور صرف تین راستے کھُلے ہوئے ہیں: یا تو برضا و رغبت مرتد ہو جائے، یا اچھوتوں سے بدتر حالت میں رہے، یا پھر خاموشی کے ساتھ ان سب تدبیروں کو برداشت کرتی چلی جائے جو اس کی امتیازی ہستی کو مٹانے اور اسے ہندو قومیت میں جذب کرنے کے لیے عمل میں لائی جارہی ہیں۔ یہ حالت اگر یوں ہی جاری رہی تو مستقبل قریب میں مسلمان

---

[1] اُس وقت تک حیدرآباد کا سقوط نہیں ہوا تھا اور آس پاس کے علاقوں سے کئی لاکھ مسلمان اس ڈوبتی ہوئی کشتی میں پناہ لینے پر مجبور ہوتے تھے۔ (جدید)

ہندوستان سے اسی طرح غائب ہو جائیں گے جس طرح وہ اندلس (اسپین) اور صقلیہ (سسلی) سے غائب ہو چکے ہیں۔ لاقدر اللہ۔

چار کروڑ مسلمانوں کی یہ عظیم الشان قوم اس وقت بالکل بے سہارا ہے۔ جس سیاست پر اب تک اس کا مدارِ کار تھا اس کی بساط انقلاب کے ایک ہی پلٹے نے اُلٹ دی۔ جس قومی تنظیم پر اس کا سارا اعتماد تھا وہ طوفان کا ایک تھپیڑا بھی نہ سہ سکی۔ جن لیڈروں کے ہاتھ میں وہ اپنے معاملات سونپ کر مطمئن ہو بیٹھی تھی وہ اس کے لیے بالکل بے کار ثابت ہوئے۔ ان کے کچھ اکابر تو خاموشی کیساتھ اُٹھ کر پاکستان چلے آئے، اور باقی اکابر و اصاغر سب دشمنوں کے آگے توبہ و استغفار کرنے میں مشغول ہو گئے۔ سیرت و اخلاق کے بغیر جو لوگ محض نعروں کے بل پر لیڈر رہے تھے وہ زمانے کا رُخ بدل جانے کے بعد ایک دن بھی اپنے قبلے کی سمت اُستوار نہ رکھ سکے۔ انقلاب کی پہلی ہی رات وہ اپنے اُن نظریات اور اصولوں کو طلاقِ مُغلّظہ دے بیٹھے جن پر دس سال سے وہ اپنی قوم کو لڑا رہے تھے۔ دو قومی نظریہ یک لخت ان کے نزدیک باطل ہو گیا۔ ایک قومی نظریے کی صداقت اچانک ان پر منکشف ہو گئی۔ ترنگے جھنڈے کی عقیدت یکایک ان کے دل میں گھر کر گئی۔ چند روز کے اندر ان مجاہدینِ ملت کو وطن پرستی میں ایسا شرح صدر نصیب ہوا کہ اُن کے حلقے سے مخلوط ہندو مسلم شادیوں تک کی تجویزیں آنے لگیں تاکہ مسلم و ہندو کے اندر سے یہ کم بخت "من دیگرم تو دیگری" کا احساس تو کسی طرح دُور ہو! اِس پورے گروہ میں سے ایک کو کن بھی نہ نکلا جو بازی کھونے کے بعد سر دے سکتا۔ ساری جماعت بازی گروں سے پٹی پڑی تھی جنہوں نے عجیب عجیب قلابازیاں کھا کر دنیا کو اپنی بودی سیرت اور کھوکھلے اخلاق کا تماشا دکھایا اور اُس قوم کی رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا دی جس کے وہ نمائندے بنے ہوئے تھے۔

اِس سے مایوس ہو کر اس ڈوبتی ہوئی قوم نے اُن تنکوں کا سہارا لینا چاہا جو پہلے سے کانگرسی دریا کی سطح پر تیر رہے تھے، مگر اب وہ بھی اس کے لیے بے کار ثابت ہو رہے ہیں۔ ان میں سے ایک گروہ اب بھی یہی رائے رکھتا ہے کہ مسلمان اپنے امتیازی وجود کو خود بھول جائیں اور ہندی قومیت میں اپنے آپ کو گم کر دیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تحفظِ ذات کا نہیں بلکہ "انسان مجبری" کا نسخہ ہے جو مسلمان کے مزاج کو نہ پہلے راس آیا تھا اور نہ اب راس آسکتا ہے۔

دوسرا گروہ کچھ مسلمان کے "مستقل وجود" اور کچھ اس کے "حقوق" کا بھی تصور رکھتا ہے، مگر یہ نام زبان پر آتے ہی پرانے سے پرانا کانگرسی مسلمان بھی ہندو قوم پرستوں کی نگاہ میں بس ایک نقاب پوش مسلم لیگی بن کر رہ جاتا ہے۔

ہندوستان کے ان مسلمانوں کا مسئلہ اس وقت درحقیقت ہمارا سب سے بڑا قومی مسئلہ ہے۔ تقسیم نے ہمیں کاٹ ضرور دیا ہے، مگر وہ ہیں ہماری ہی قوم کا ایک حصہ، اور معمولی نہیں پورا ⅓ حصہ۔ ان کو ہم یوں ہی مٹنے کے لیے نہیں چھوڑ سکتے۔ ان کا ہم پر سب سے بڑا حق ہے، اس لیے کہ جس پاکستان سے ہم متمتع ہو رہے ہیں اس کی اصل قیمت انہی نے ادا کی ہے۔ وہ اس لیے بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہیں کہ ہمارا بہترین مردم خیز حصہ وہی ہیں۔ انہیں اس بنا پر بھی نذرِ تغافل نہیں کیا جا سکتا کہ ہماری ہزار سالہ تہذیب کے تمام چیدہ ثمرات اور ہمارے تمام بڑے بڑے معاہد (Institutions) اور تہذیبی مراکز کے امانت دار وہی ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آخر ہم ٹھنڈے دل سے یہ بات کیسے گوارا کر سکتے ہیں کہ ہمارے اسلاف نے پچھلے ایک ہزار سال میں جو محنتیں اور جو جانفشانیاں اسلام کے پیغام کو اکنافِ ہند میں پھیلانے کے لیے کی ہیں ان سب پر پانی پھر جائے اور توحید کی دعوت سمٹ کر برعظیم ہند کے صرف دو چھوٹے چھوٹے خطوں میں محدود ہو جائے۔ لہٰذا کوئی شخص بے پروائی کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا مسئلہ ان کا اپنا مسئلہ ہے۔ نہیں یہ پاکستان کا بھی ویسا ہی مسئلہ ہے جیسا ہندوستان کے مسلمانوں کا ہے، اور فی الواقع یہ اس پوری ملتِ اسلامیہ کا مسئلہ ہے جو اس مصنوعی تقسیم کے باوجود اب بھی ہندوستان اور پاکستان میں ایک ہی ملت ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ان چار کروڑ مسلمانوں کو بچانے، اور ہندوستان میں اسلام کی دعوت کو زندہ اور تازہ دم رکھنے کے لیے ہم کیا کر سکتے ہیں؟ اب تک چونکہ قومی حیثیت سے ہمارا مدار کار بالکل مسلم لیگ کے نظام اور اس کی قیادت پر رہا ہے اس لیے یہ سوال لازماً اسی کی طرف پھرتا ہے۔ کیا تقسیم سے پہلے مسلم لیگ کی قیادت عظمیٰ نے اس مسئلے کا کوئی حل تجویز کیا تھا؟ کیا تقسیم کے بعد ہندوستان میں مسلم لیگ کی سیاست اور قیادت کے لیے کام کرنے کا اب کوئی موقع ہے؟ کیا پاکستانی مسلم لیگ اس بارے میں اپنے پاس کوئی لائحہ عمل رکھتی ہے؟ کیا پاکستان کی موجودہ

حکومت اس قابل ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی قسمت پر کوئی اچھا اثر ڈال سکے یا ہندوستان میں اسلام کے مستقبل کو درخشاں نہیں تو کم از کم محفوظ ہی کرنے کے لیے کچھ کر سکے؟ اگر ان سوالات کا کوئی جواب ہے تو اسے معلوم کر کے ہم بہت خوش ہوں گے۔ اگر نہیں ہے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ جب تک ہمارے قومی معاملات کی سربراہ کاری موجودہ سیاست و قیادت کے ہاتھ میں ہے، اپنی ملت کے اس سب سے بڑے مسئلے کا کوئی حل ہمارے لیے ممکن نہیں ہے، اور یہی سیاست و قیادت ہماری سربراہ کار رہی تو ہمیں چند سال کے اندر یہ دیکھنے کے لیے تیار رہنا چاہیئے کہ واگہ سے راس کماری تک اور مشرقی بنگال کی سرحدوں سے کاٹھیاواڑ کے سواحل تک کا پورا علاقہ اسلام سے خالی ہو جائے۔

دوسرے مسائل پاکستان سے متعلق ہیں۔ عموماً ان سب مسائل کو لپیٹ کر صرف ایک بڑا مسئلہ ہمارے سامنے پیش کیا جاتا ہے جس کا عنوان ہے "پاکستان کا دفاع اور استحکام"۔ اور اس کا حل یہ پیش کیا جاتا ہے کہ سب پاکستانی مل کر ایک ہو جائیں اور فوجی حیثیت سے مضبوط ہوں۔ لیکن تھوڑا سا تجزیہ کرنے ہی پر یہ بات کھل جاتی ہے کہ پاکستان کا دفاع و استحکام کوئی ایک سادہ سا مسئلہ نہیں ہے بلکہ بہت سے مسائل کا مجموعہ ہے، اور اس کا حل بھی اُتنا سادہ نہیں ہے جتنا اسے سمجھ لیا گیا ہے۔ کیا ایک ملک جس کے اخلاق کو گھن لگا ہوا ہو، محض اسلحہ اور فوجی تربیت کے بل پر کھڑا ہو سکتا ہے؟ کیا ایک ملک جس کے عناصر ترکیبی کو ایک دوسرے سے پھاڑنے اور باہم متصادم کرنے کے لیے بہت سے طاقت ور اسباب موجود ہوں بس "ایک ہو جاؤ" کی تسبیحیں پڑھنے سے واقعی ایک ہو سکتا ہے؟ پس بجائے اس کے کہ ہم سادگی و سادہ لوحی سے خود کام لیں یا دوسروں کو سادہ لوح فرض کر کے ان کی توجہ حقیقی مسائل سے ہٹانے اور فرضی مسائل کی طرف پھیرنے کی کوشش کریں، ہمیں واضح طور پر یہ دیکھنا چاہیئے کہ فی الواقع پاکستان کا بقاء و تحفظ اور اس کا استحکام کن مسائل سے وابستہ ہے اور ہم کس طرح انہیں حاصل کر سکتے ہیں۔

اوّلین مسئلہ ملک کے اخلاق کا ہے جو تشویشناک حد تک گر چکے ہیں۔ ہماری تمام مشکلات میں سب سے زیادہ اخلاق ہی کی خرابیاں کارفرما ہیں۔ اس بگاڑ کا زہر اتنے وسیع پیمانے پر ہماری

سوسائٹی میں پھیل گیا ہے اور اتنا گہرا اُتر چکا ہے کہ اگر ہم اسے اپنا قومی دشمن نمبر ایک قرار دیں تو ہرگز مبالغہ نہ ہوگا۔ کوئی بیرونی خطرہ ہمارے لیے اتنا خوفناک نہیں ہے جتنا یہ اندرونی خطرہ ہے۔ یہ ہماری قوتِ حیات کو کھا گیا ہے اور کھائے چلا جا رہا ہے۔

پچھلے سال کے فسادات میں بداخلاقی کا جو طوفان اٹھا تھا وہ ہماری آبادی کے ایک بہت بڑے حصّہ کو بہالے گیا۔ قتل و خون، آتش زنی، اور عورتوں کے بھگانے کی مشق تو شاید ہزاروں ہی کو ہوئی ہوگی، لیکن لوٹ مار کی اُلائش نے لاکھوں کو ملوث کر کے چھوڑا۔ اس اخلاقی زوال کی وسعت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک گاؤں کی ڈھائی ہزار آبادی میں صرف ایک شخص ایسا نکلا جس نے لوٹ میں حصّہ لینے سے پرہیز کیا تھا، اور ایک قصبہ کے سات سو گھروں میں سے بمشکل ۲۵ گھر ایسے پائے گئے جن میں لوٹ کا مال نہ پہنچا تھا۔ پھر ان لٹیروں میں محض جاہل عوام اور بازاری لوگ ہی شامل نہ تھے۔ بڑے بڑے شرفاء اور معززین، اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ، سوسائٹی اور حکومت میں بڑے مرتبے رکھنے والے حضرات بھی اسی بہتی گنگا میں ہاتھ دھو رہے تھے، بلکہ وہ تو اس میں خوب جی بھر کر نہائے۔ پولیس کے چھوٹے بڑے افسر، امن و انتظام کے ذمّہ دار مجسٹریٹ، حکومت کے اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ دار، بڑے بڑے نامور قومی کارکن، اسمبلی کے ممبر اور بعض وزراء تک اس گندگی میں غوطہ لگا گئے۔ یہ واقعات کسی سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ ایک دنیا ان کو جانتی ہے اور شتر مرغ کی طرح ریت میں مُنہ چھپانے سے کچھ حاصل نہیں۔ یہ حقیقت اب کُھل چکی ہے کہ ہمارے اخلاق کے جوڑ بند بُری طرح ڈھیلے ہو گئے ہیں۔ ہم میں ہزارہا آدمی ایسے موجود ہیں جو قتل و خون کے مشاق ہو چکے ہیں، ہزاروں ایسے لوگ ہیں جو موقع ملنے پر بد سے بدتر حرام کا ارتکاب کر سکتے ہیں، اور نیچے سے لے کر اونچے طبقوں تک کم از کم ۵۰ فیصدی تعداد ان لوگوں کی ہے جنہیں حرام کا مال سمیٹنے میں قطعاً کوئی تامل نہیں ہے بشرطیکہ انہیں قانون کی گرفت سے محفوظ رہنے کا اطمینان ہو۔

ان حالات میں ہمارے لیے یہ کوئی وجہ تسلّی نہیں ہے کہ اس سے بدرجہا زیادہ بدتر اخلاقی صفات کا ظہور ہندوستان میں ہندوؤں اور سکھوں سے ہوا ہے۔ جو زہر انہوں نے کھایا اس کی فکر انہیں ہو یا نہ ہو، ہمیں تو اس زہر کی فکر ہے جو ہماری رگوں میں اُتر گیا ہے۔ کیا مشتاق مجرموں

اور بے باک خائنوں کی اتنی کثیر تعداد اپنے اندر لیے ہوئے ہم اپنی قومی زندگی کو مستحکم بنا سکتے ہیں؟ کیا وہ بداخلاقیاں جو کل غیروں کی جان مال اور عصمت کے معاملے میں برتی گئی تھیں، ان کے ساتھ ہی ختم ہو گئیں اور اپنا کوئی پائدار اثر ہماری سیرت و کردار پر نہیں چھوڑ گئیں؟ کیا یہ بگڑے ہوئے اخلاق اب خود اپنوں پر ہاتھ صاف کرنے سے رُکے رہ جائیں گے؟

ایک سال کا تجربہ ہمیں بتا رہا ہے کہ جس اخلاقی زوال کی خبر گزشتہ فسادات نے دی تھی وہ وقتی اور محدود نہ تھا۔ دراصل وہ ایک نہایت خوفناک مرض کی حیثیت سے ہمارے اندر اب بھی موجود ہے اور ہماری قومی زندگی کے ہر شعبے کو خراب کر رہا ہے۔ پاکستان بننے کے بعد جو دشواریاں فطرۃً ایک نئی مملکت کو پیش آیا کرتی ہیں وہ تو ہمیں پیش آنی ہی تھیں، اور جو مصائب انگریز ہندو اور سکھ کی باہمی سازش سے ہم پر نازل ہوتے وہ بھی اپنی جگہ تھے، لیکن یہ سب کچھ بڑی آسانی سے انگیز کیا جا سکتا تھا اگر ہمارے عوام و خواص اور ہمارے سربراہ کاروں کے اخلاق اتنے بگڑے ہوئے نہ ہوتے۔ یہ واقعہ ہے، اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، کہ اخلاق کی خرابیوں نے ہماری مشکلات اور مصیبتوں کو، جتنی کہ وہ تھیں، اصل سے کئی گنا زیادہ بڑھا دیا۔

مثال کے طور پر "مہاجرین" کے مسئلے کو لیجیے جو پاکستان بنتے ہی ایک پہاڑ کی طرح ہم پر نازل ہوا۔ بلاشبہ ایک ملک کے لیے اس سے بڑی کوئی مصیبت نہیں کہ اس پر سات آٹھ لاکھ بے سروسامان آدمی یک لخت لا کر ڈال دیئے جائیں۔ لیکن غور سے دیکھیے کہ اس طرح جو مشکلات حقیقتہً رونما ہوئی تھیں ان پر کتنا اضافہ ہماری اپنی اخلاقی خرابیوں نے کر دیا۔[1] ہندو دُوں

---

[1] آخری اعداد و شمار کی رو سے پاکستان میں پناہ لینے والوں کی مجموعی تعداد ۹۰ لاکھ تھی۔ لیکن ان کو بسانے میں جو کمالات دکھائے گئے ان کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ۱۹۵۱ کی مردم شماری کی رو سے سندھ چھوڑ کر جانے والے غیر مسلموں کی تعداد ۹ لاکھ تھی، مگر ہندوستان چھوڑ کر آنے والے ۵ لاکھ چالیس ہزار مسلمان وہاں بسائے گئے۔ اور سرحد سے جانیوالے غیر مسلم ۲۹۶۰۰۰ تھے، مگر ہندوستان سے آنے والے صرف ۱۵ ہزار مسلمانوں کو وہاں بسایا گیا۔ مہاجرین کو آباد کرنے کا مسئلہ سالہا سال سے پاکستان کے لیے دردِ سر بنا ہوا (باقی صفحہ ۳۲۰ پر)

اور سکھوں نے جو عمارات ، سامان ، اموال ، دکانیں ، کارخانے ، زمینیں اور دوسری چیزیں پاکستان میں چھوڑی تھیں ، اگر ان پر خود پاکستان کے باشندے ، حکومت کے عمّال اور قومی کارکن قبضے کر کے نہ بیٹھ جاتے تو کیا مہاجرین کو بسانے میں ہم کو وہی دقتیں پیش آسکتی تھیں جن سے اب ہم دوچار ہیں ؟ مغربی پنجاب اور سرحد اور سندھ کی حکومتوں سے پوچھیے کہ جانے والوں نے کیا کچھ چھوڑا تھا ، اور اس کا کتنا حصّہ آنے والوں کو دیا گیا اور کتنا حصّہ کن کن غیر مستحقین کو پہنچا ؟ اگر یہ اعداد و شمار روشنی میں آجائیں تو دنیا یہ دیکھ کر دنگ رہ جائے کہ مہاجرین کے مسئلے کا جو زخم غیروں نے ہم کو لگایا تھا اسے سرطان کا پھوڑا بنا دینے والے دراصل کون لوگ ہیں ۔ نہیں کہا جاسکتا کہ اس حمام میں آپ کس کس کو برہنہ دیکھیں گے ۔

پھر جو لوگ کل تک " پاکستان زندہ باد " کے نعرے لگا رہے تھے ، جن سے بڑھ کر قوم کے درد میں تڑپنے والا کوئی نظر نہ آتا تھا ، اور جو آج بھی زبان سے بہت بڑے " مجاہدِ ملت " بنے ہوئے ہیں ، ان میں عظیم الشان اکثریت آپ کو ایسے افراد کی نظر آئے گی جو پاکستان بننے کے بعد ہر زاویے سے اس کی کشتی میں سوراخ کیے جا رہے ہیں ۔ یہ رشوت خوریاں ، یہ خیانتیں ، یہ غبن ، یہ قومی خرچ پر اقربا پروریاں اور دوست نوازیاں ، یہ فرائض سے غفلت ، یہ ڈسپلن سے گریز ، یہ غریب قوم کی دولت پر عیاشیاں ، جن کا ایک طوفان سا ہمارے نظامِ حکومت کے ہر شعبے میں برپا ہے اور جس میں بکثرت چھوٹے اہل کاروں سے لے کر بہت سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱۹ سے) ہے اور اسوقت تک بھی اسے پوری طرح حل نہیں کیا جاسکا ہے ۔ اس کے برخلاف ہم دیکھتے ہیں کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد مغربی جرمنی پر جرمن پناہ گزینوں کا ایک سیلاب ٹوٹ پڑا ، حتّٰی کہ جون ۱۹۶۱ء تک بڑھتے بڑھتے ان کی تعداد ایک کروڑ ۲۵ لاکھ تک پہنچ گئی ، اور یہ اس حال میں ہوا کہ مغربی جرمنی سے جانے والا کوئی نہ تھا جو اپنی جائداد خالی چھوڑ گیا ہو ۔ اس کے باوجود جرمنوں نے پناہ گزینوں کو بڑی خوبی سے بسایا بھی اور کام پر بھی لگا لیا ، بلکہ مہاجرین کا یہ سیلاب مغربی جرمنی کی معاشی خوشحالی و ترقی کا ایک بڑا ذریعہ بن گیا ۔

(جدید)

عالی مقام حکام اور وزراء تک۔ آلودہ ہیں، کیا یہ سب پاکستان کو مضبوط کرنے والی چیزیں ہیں؟ یہ دوکانوں اور کارخانوں کی ناجائز تقسیم، جس کی بدولت ملک کی صنعت و تجارت کا بڑا حصہ نااہل اور ناتجربہ کار ہاتھوں میں چلا گیا ہے، کیا یہ پاکستان کی طاقت کو مستحکم کرنے والی چیز ہے؟ یہ پبلک کا بالعموم حکومت کے ٹیکس ادا کرنے سے گریز کرنا اور ان سے بچنے کے لیے، نیز دوسرے ناجائز فوائد حاصل کرنے کے لیے سرکاری ملازموں کو رشوتیں دینا، اور جہاں بھی قانون کی گرفت سے بچ نکلنے کی امید ہو پبلک فنڈ کا بڑے سے بڑا نقصان کرنے میں بھی تامّل نہ کرنا، کیا یہی وہ چیزیں ہیں جن سے پاکستان مضبوط ہو سکتا ہے؟ ملک کے باشندوں کی اخلاقی حالت اس قدر گر چکی ہے کہ ہندوستان سے آنے والے مہاجرین کی لاشیں جب واہگہ اور لاہور کے درمیان پڑی سڑ رہی تھیں اور کیمپوں میں بھی موت کا بازار گرم تھا اس وقت ۱۲-۱۴ لاکھ مسلمانوں کے شہر میں سے چند ہزار نہیں، چند سو آدمی بھی ایسے نہ نکلے جو اپنے بھائیوں کو دفن کرنے کی زحمت اٹھاتے۔ متعدد مثالیں ہمارے علم میں ایسی ہیں کہ کوئی مہاجر مر گیا ہے اور اس کے عزیزوں کو نماز جنازہ پڑھنے کے لیے اجرت پر آدمی فراہم کرنے پڑے ہیں۔ یہاں تک بھی نوبت پہنچی ہے کہ سرحد کے قریب کسی گاؤں میں مہاجرین کو زمینیں دی گئیں اور مقامی مسلمانوں نے سرحد پار سے سکھوں کو بلا کر ان پر حملہ کرا دیا تاکہ یہ بھاگ جائیں اور زمین ہمارے قبضہ میں رہ جائے۔ حد یہ ہے کہ قوم کی جو بیٹیاں ہندوستان کے ظالموں سے بچ کر آ گئی تھیں ان کی عصمتیں یہاں خود اپنے بھائیوں کے ہاتھوں محفوظ نہ رہ سکیں ـــــــ اس قسم کے واقعات شاذ نہیں ہیں بلکہ بکثرت، ہمارے علم میں آئے ہیں، اور ان شرمناک جرائم کے مرتکب صرف عام شہدے ہی نہیں تھے ـــــــ کیا اتنے شدید اخلاقی تنزل کے ہوتے ہوئے ہم یہ امید کر سکتے ہیں کہ کسی بڑی اندرونی یا بیرونی مصیبت کے مقابلے میں ہم مضبوطی کے ساتھ کھڑے ہو سکیں گے؟ اور کیا یہ اخلاقی تنزل اپنے ملک کی تعمیر کے لیے ہماری کسی اسکیم کو کامیابی کے ساتھ چلنے دے گا؟

تھوڑی دیر کے لیے ہم اس سوال کو جانے دیتے ہیں کہ ہماری قیادت نے سیاسی تحریک کے ساتھ قوم کی اخلاقی طاقت کو سنبھالنے کی فکر کیوں نہ کی؟ ہم پوچھتے ہیں کہ اب وہ اس کے لیے

کیا کر رہی ہے؟ اخلاق بنانے اور سنوارنے کا کیا سر و سامان اس کے پاس ہے؟ کیا تدابیر اس کے پیش نظر ہیں؟ کیا لائحہ عمل اس نے بنایا ہے؟ یہ ایک اہم سوال ہے جس کا واضح جواب ہمیں ملنا چاہیئے۔ اگر اس کے جواب میں اُن نصائح کی طرف اشارہ کیا جاتے جو کبھی کبھی ریڈیو اور سرکاری پریس اور تقریروں کے ذریعہ سے پبلک کو اور حکومت کے چھوٹے اہل کاروں کو کی جاتی رہتی ہیں، تو ہم پہلے ہی کہے دیتے ہیں کہ اس طرح کی طفل تسلیوں سے ہمیں معاف رکھا جاتے۔ اس لیے کہ بد اخلاقی کے اصل سرچشمے تو خود قصرِ قیادت کے ستونوں میں شامل ہیں۔ کار فرمائی اور کار پردازی کی باگیں تو اس وقت ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں جن کی بڑی اکثریت ہی کے دم قدم سے بداخلاقی کا بازار گرم ہے۔ پھر بھلا خیانت کی زبان سے امانت کا سبق، خود غرضی کی زبان سے ایثار کا وعظ اور گناہ کی زبان سے نیکی کا درس انسانی فطرت نے کب قبول کیا ہے کہ یہاں اس کے کارگر ہونے کی توقع کی جاتے!

دوسرا مسئلہ جو پاکستان کی زندگی، اس کے بقا اور اس کے استحکام کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ پاکستان جن عناصر پر مشتمل ہے انہیں کس طرح جوڑ کر ایک بنیانِ مرصوص بنایا جاتے؟ یہ عناصر اس وقت شدت کے ساتھ مائلِ انتشار نظر آرہے ہیں، اور ظاہر ہے کہ کسی چیز کے عناصرِ ترکیبی ہی اگر مجتمع اور باہم پیوستہ نہ ہوں تو اس کے وجود کا برقرار رہنا سخت دشوار ہوتا ہے اُس کے اجزائے وجود میں پراگندگی کا رُجحان یہ معنی رکھتا ہے کہ اس کی اپنی تعمیر ہی میں خرابی کی صورت مضمر ہے۔ لہٰذا اگر یہ واقعہ ہے، اور کون ہے جو اس کا انکار کرسکتا ہو، کہ پاکستان کے ترکیبی عناصر میں جمع و تالیف کے بجائے کچھ انتشار و پراگندگی کے رُجحانات پائے جاتے ہیں اور کچھ قوتیں اُن کو بڑھانے میں لگی ہوئی ہیں، تو ہمیں سمجھنا چاہیئے کہ ہمارے بندِ استحکام، بلکہ عین ہماری بندشِ وجود ہی میں ایک خطرناک رخنہ موجود ہے جسے دُور کیے بغیر ہم اپنے آپ کو محفوظ نہیں رکھ سکتے۔

پاکستان جن عناصر پر مشتمل ہے، ان میں تین تفریقیں اس وقت بالکل نمایاں ہیں۔

پہلی تفریق مہاجرین اور غیر مہاجرین کے درمیان ہے۔ ہماری آبادی میں مہاجرین کی تعداد اس وقت ۷۰ لاکھ سے متجاوز ہوچکی ہے اور یہ تعداد روز افزوں ہے، کیونکہ ہندوستان کے ہر

حصّہ سے مسلمان اکھڑ اکھڑ کر برابر پاکستان کی طرف چلے آ رہے ہیں۔ مشرقی ہند کے لوگوں کا رخ مشرقی پاکستان کی طرف ہے اور باقی ہندوستان کے لوگ مغربی پاکستان کی راہ لے رہے ہیں[1]۔ یہ نیا عنصر اب ہماری آبادی کا ایک مستقل عنصر ہے اور تعداد کے لحاظ سے کوئی معمولی عنصر نہیں ہے۔ لیکن متعدد اسباب ایسے ہیں جو نئے اور پرانے عناصر کو مل کر ایک قوم بننے سے روک رہے ہیں۔ کچھ تو زبان، تہذیب، معاشرت اور عادات و خصائل کے قدرتی اختلافات ہیں جو بہرحال ایک مدت تک یگانگت میں مانع ہوا ہی کرتے ہیں۔ مگر ان پر غیر معمولی اضافہ جس چیز نے کر دیا ہے وہ یہ ہے کہ مہاجرین اور غیر مہاجرین دونوں میں جاہلیت کے تعصبات اور نفسانی خود غرضیاں کار فرما ہیں۔ یہ چیز ہر جگہ ان دونوں عناصر کو پھاڑ رہی ہے، ان کو مخالف جتھوں کی شکل میں منظم کر رہی ہے، ان کے درمیان آویزش کی صورتیں پیدا کر رہی ہے اور دونوں طرف کے تنگ نظر اور خود غرض مفسدین ان کو باہم لڑا رہے ہیں[2]۔

دوسری تفریق جغرافی، نسلی اور لسانی ہے۔ پاکستان اوّل تو دو ایسے خطوں پر مشتمل ہے جن کے درمیان ایک ہزار میل سے زیادہ کا فاصلہ ہے۔ پھر یہ خطّے بھی اپنی اپنی جگہ اندرونی وحدت نہیں رکھتے بلکہ مختلف اجزا سے مرکب ہیں اور ہر جزو دوسرے جزو کے خلاف تعصّب رکھتا ہے۔ اس وقت درحقیقت ہم ایک قوم نہیں ہیں، پانچ مختلف قومیں ہیں جو مصنوعی طور پر ایک سیاسی وحدت میں منسلک ہو گئی ہیں، یعنی سندھی، بلوچی، پٹھان، پنجابی اور بنگالی۔ ان میں سے ہر ایک قوم کے اندر علیحدگی کا رجحان شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے اور بعض نادان

---

[1] ۱۹۵۰ء میں کھوکھرا پار کے راستے آنے والے مسلمانوں کی تعداد ۲٬۶۴٬۸۹۹ تھی، اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ تعداد ۶ لاکھ تک پہنچ گئی۔ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کی رو سے ۷ لاکھ مسلمان زیادہ تر بہار سے مشرقی پاکستان میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے تھے۔ (جدید)

[2] مشرقی پاکستان میں نہ صرف مہاجرین، بلکہ تمام غیر بنگالی مسلمانوں کے ساتھ خود مسلمانوں نے آخرکار وہ سلوک کیا جو درندگی و سفاکی میں اُس ظلم سے بھی بازی لے گیا جو ہندوستان میں ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا تھا۔ (جدید)

گروہ اس کو شدید تر کرنے کی پیہم جد وجہد کر رہے ہیں [1]۔

تیسری تفریق معاشی ہے۔ امیر اور غریب، زمیندار اور کاشت کار، مزدور اور سرمایہ دار، بڑی تنخواہیں پانے والے افسر اور چھوٹے اہل کار، یہ مختلف گروہ ہیں جن کو معاشی بے انصافیوں نے ایک دوسرے سے پھاڑ دیا ہے۔ ان کے درمیان اخوت اور ہمدردی کا تعلق نہیں ہے بلکہ حسد اور بغض کا تعلق ہے۔ یہ ایک دوسرے کے رفیق اور حامی و ناصر نہیں ہیں بلکہ حریف اور مدمقابل ہیں۔ ان کی کشمکش بھی روز بروز بڑھ رہی ہے اور ہمارے اندر ایک گروہ ایسا موجود ہے جس کا مستقل فلسفہ ہی یہ ہے کہ انہیں ملا کر ایک کر دینے کا خیال باطل ہے اور حق صرف یہ ہے کہ ان کو باہم لڑا دیا جاتے [2]۔

سوال یہ ہے کہ یہ مختلف تفریقیں، جو ہماری قوم اور ریاست کو پارہ پارہ کر دینے پر تلی ہوئی ہیں، جن کو نشو و نما دینے کے لیے گھر کے داخلی اسباب بھی موجود ہیں، اور جنہیں بھڑکانے کے لیے خارجی محرکات کی بھی کمی نہیں ہے، آخر کس طریقے سے مٹائی جا سکتی ہیں؟ طاقت کے ذریعہ سے ان کو

---

[1] تحریک پاکستان کے وقت مسلم قومیت اور مسلمانوں کی قومی وحدت کا صور جس طرح پھونکا گیا تھا، اس سے یہ غلط فہمی لاحق ہو گئی تھی کہ یہ مختلف نسلی، جغرافی اور لسانی عناصر ایک اسلامی قومیت میں جذب ہو گئے ہیں اور جاہلیت کی یہ تفریقیں ان کے اندر باقی نہیں رہی ہیں۔ لیکن پاکستان بننے کے بعد ہی ان تفریقوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا، اور تفرقہ پردازوں نے ان جاہلیت کے تعصبات کو ابھارنے کا کام بھی شروع کر دیا۔ مگر جو لوگ گزشتہ ۲۵ سال میں پاکستان کے معاملات کو چلا رہے تھے انہوں نے ان عناصر کو ایک وحدت میں جذب کرنے کے لیے کچھ نہ کیا، بلکہ اس کے برعکس تفرقہ پردازوں کی اُلٹی حوصلہ افزائی کی۔ اسی کا خمیازہ ہے کہ آج مشرقی پاکستان تو ہم سے کٹ کر الگ ہی ہو چکا ہے، اور باقی ماندہ پاکستان میں بھی چار قومیتوں کے نعرے علانیہ لگ رہے ہیں۔ (جدید)

[2] یہ فتنہ بھی ۲۵ سال میں پل کر خوب جوان ہو چکا ہے اور اب اسلام کے ملک میں علانیہ سوشلزم کی دعوت بلند کی جا رہی ہے جو مسلم معاشرے کو طبقات میں تقسیم کر کے ان کے درمیان طبقاتی جنگ برپا کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ (جدید)

دبا کر ریاست کی سیاسی وحدت اور اس کے امن کو برقرار رکھنا ایک حد تک ممکن ہے، مگر یہ چیز دلوں کو جوڑ کر وہ قلبی وحدت تو ہرگز پیدا نہیں کر سکتی جو ریاست کی اندرونی ترقی اور بیرونی خطرات کے مقابلہ میں اس کی متحدہ مدافعت کے لیے ضروری ہے۔ پھٹے ہوئے دل اور کھنچے ہوئے ہاتھ نہ تعمیر میں تعاون کر سکتے ہیں اور نہ مدافعت ہی میں بنیانِ مرصوص بن کر کھڑے ہو سکتے ہیں۔ قومیت کا پرچار بھی اس معاملہ میں بے بس ہے۔ ہندوستان میں ہم اس کا نتیجہ دیکھ چکے ہیں۔ مغربی تصوّرات کے مطابق قومیت کی تبلیغ و تلقین وہاں جتنی بڑھتی گئی، اس نے ملک کی آبادی میں وحدت پیدا کرنے کے بجائے ان تمام گروہوں میں اپنے امتیازی وجود کا احساس جگا دیا جو اپنے اندر قومیت کے عناصر رکھتے تھے۔ پھر معاشی اغراض کا تصادم تو وہ چیز ہے جس کے زہر کا تریاق فراہم کرنے میں قومیت جگہ جگہ ناکام ہوئی اور ہو رہی ہے۔ اب ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ہماری موجودہ قیادت کے پاس اس مسئلہ کا کیا حل ہے اور وہ کہاں تک اس سے عہدہ برآ ہونے کی اہلیت رکھتی ہے؟

کوئی شخص یہ گمان نہ کرے کہ ہم اُن دوسرے مسائل کی اہمیت سے غافل ہیں جو اس وقت پاکستان کی نوزائیدہ مملکت کو درپیش ہیں۔ بلاشبہ وہ مالی، صنعتی، انتظامی، دفاعی اور خارجی مسائل بھی اپنی جگہ کافی اہم ہیں جن سے ہم اس مملکت کی پیدائش کے بعد دوچار ہوتے۔ کوئی نہیں کہتا کہ ان کی طرف توجہ نہ کی جاتے۔ نہ ان واقعی خدمات کا انکار کرنا قرینِ انصاف ہے جو اس سلسلہ میں موجودہ قیادت نے انجام دیں۔ لیکن جہاں تک ہم سمجھتے ہیں مسلمانوں کی حیاتِ قومی کے لیے اِس وقت سب سے بڑے مسئلے یہی تین ہیں جن کا ذکر ہم نے کیا ہے، اور قیادت کا اصل محکِ امتحان یہ ہے کہ وہ انہیں صحیح طور پر حل کرنے کی اہلیت، فکری اور اخلاقی حیثیت سے کہاں تک اپنے اندر رکھتی ہے۔

(ترجمان القرآن۔ اگست ۱۹۴۸ء)

کیا پاکستان کو ایک مذہبی ریاست ہونا چاہیئے؟

(پاکستان کے قائم ہوتے ہی یہ بحثیں شروع کر دی گئی تھیں کہ اس مملکت کو ایک اسلامی مملکت بنانے میں کیا مشکلات اور قباحتیں در پیش ہیں، اور اس غرض کے لیے دلائل فراہم کیے جانے لگے تھے کہ اس کو ایک لادینی ریاست ہونا چاہیئے۔ اس کا اندازہ اُس مباحثہ سے ہو سکتا ہے جو ۱۸ مئی ۱۹۴۸ء کو ریڈیو پاکستان لاہور سے نشر ہوا تھا۔ اس مباحثہ میں سائل کی حیثیت سے وجیہہ الدین صاحب بول رہے تھے اور مجیب کی حیثیت سے سید ابوالاعلیٰ مودودی)

س۔ اس بحث کو شروع کرنے سے پہلے غالباً یہ جان لینا ضروری ہے کہ آپ کے ذہن میں مذہبی ریاست کا کیا تصور ہے؟

ج۔ ظاہر بات ہے کہ ایک مسلمان جب مذہب کا لفظ بولے گا تو اس کے ذہن میں اسلام ہی مراد ہو گا۔ میں جب کہتا ہوں کہ پاکستان کو ایک مذہبی ریاست ہونا چاہیئے تو اس سے میرا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسے ایک اسلامی ریاست ہونا چاہیئے، یعنی ایک ایسی ریاست جو اخلاق، تہذیب، تمدن، معاشرت، قانون، سیاست اور معیشت کے اُن اصولوں پر قائم ہو جو اسلام نے ہم کو دیئے ہیں۔

س۔ آپ نے مذہبی ریاست کا جو مفہوم بیان فرمایا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس

ریاست کا سیاسی اقتدار ماہرینِ دینیات کے ایک مخصوص طبقے کے ہاتھ میں ہوگا۔ اس طبقہ کا کام یہ ہوگا کہ وہ سیاسی اور انتظامی امور کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر سے تحقیق و تفتیش کرے، ریاستی قوانین وضع کرے اور شرعی احکامات کی بنا پر ہر سیاسی گتھی کو سلجھاتے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس طبقے کی پشت پناہ کون لوگ ہوں گے؟ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ اقتصادی لحاظ سے ہماری سماج مختلف طبقوں میں منقسم ہے۔ ہر طبقہ اس کوشش میں ہے کہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے مذہبی جواز تلاش کرے اور مذہبی نعروں کو استعمال میں لاتے۔ ماہرینِ دینیات اس طبقاتی کشمکش سے بے نیاز اور غیر متعلق نہیں رہ سکتے۔ ان کے لیے لازم ہے کہ یا تو وہ عوامی طاقتوں کا ساتھ دیں، یا اپنے آپ کو سرمایہ دار اور جاگیر دار طبقہ سے وابستہ کردیں۔ اس صورت میں قرآنی اصولوں کی جو بھی تفسیر پیش کی جائے گی وہ ان کے سیاسی رُجحان کی آئینہ دار ہوگی۔ مختلف سیاسی خیالات رکھنے والے مفسروں میں اہم ترین مسائل پر شدید ترین اختلاف رائے پیدا ہو جائے گا۔ اقتصادی کشمکش ایک لامتناہی فقیہانہ بحث کی صورت اختیار کرے گی۔ اور وہ مسائل جن کا مناسب حل ڈھونڈنا اس وقت اشد ضروری ہے جوں کے توں دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔

جواب

جس طبقاتی کشمکش کی طرف آپ اشارہ فرما رہے ہیں وہ دراصل پیدا ہی اس لیے ہوتی ہے کہ مدتوں سے غیر اسلامی اثرات کے تحت رہتے رہتے ہمارا معاشرہ اخلاق کی اُس روح سے اور انصاف کے اُن اصولوں سے محروم ہو گیا ہے جو اسلام نے ہم کو دیئے تھے۔ جس مادہ پرستی نے دنیا کے دوسرے معاشروں کو طبقات میں تقسیم کیا اور ان کے اندر اغراض و مفاد کا تصادم پیدا کیا، وہی بدقسمتی سے اب ہمارے معاشرے کو پھاڑنے اور باہم ٹکرا دینے کی دھمکیاں دے رہی ہے۔ ابھی ابھی ہم فرقہ وارانہ کشاکش کے ہولناک نتائج بھگت چکے ہیں اور اس سے لگے ہوئے زخم ابھی بھرے بھی نہیں ہیں۔ اب ہم اس کے لیے تیار نہیں ہیں کہ اپنے آپ کو اُن اجتماعی فلسفوں کے حوالے کردیں جو ہمارے اندر ایک دوسری جنگ ـــــ طبقاتی جنگ ـــــ برپا کردیں اور ہمیں اس وقت تک

امن کی صورت نہ دیکھنے دیں جب تک ہمارا کوئی ایک طبقہ دوسرے طبقوں کو ملیامیٹ نہ کر دے۔ دوسری قوموں نے تو ان اجتماعی فلسفوں کو شاید اس لیے قبول کر لیا کہ ان کے پاس اخلاق اور انصاف کے وہ اصول موجود نہ تھے جو طبقاتی خود غرضیوں کے نشوونما کو روک سکتے اور مختلف عناصر کو ایک عادل برادری میں جمع کر دیتے لیکن ہم خوش قسمتی سے ایک ایسا نظام حیات رکھتے ہیں جو ہمیں اس خطرے سے بچا سکتا ہے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ ہم اپنے اندر سے اُن لوگوں کو اُبھاریں جو اسلام کی روح کو پوری طرح سمجھتے ہوں اور طبقاتی تعصبات سے بالاتر ہو کر اسلام کے قوانین کی بے لاگ تعبیر کر سکتے ہوں۔ پھر یہ لوگ بالاتفاق یا باکثریت کے ساتھ، جو تعبیر ہمارے سامنے پیش کریں اسے ہم سب مان لیں اور ہم میں سے کوئی طبقہ اپنے ہی مطلب کی تعبیر لینے پر اصرار نہ کرے۔ ایسے لوگوں کی پشت پناہی پوری قوم کو بحیثیت مجموعی کرنی چاہیئے نہ کہ کسی ایک طبقے یا چند طبقوں کو۔ ہمیں اُن کے انتخاب میں صرف اِس معیار کو ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ وہ بھروسے کے قابل سیرت رکھتے ہوں، اور اسلام کی صحیح تعبیر کرنے کے اہل ہوں۔

س۔ میری ناچیز رائے میں سیاسی نظام کے مرتب کرنے میں صرف خلوص اور ایمانداری ہی سے کام نہیں چل سکتا۔ ہمارے سامنے اس وقت بہت سے پیچیدہ سیاسی اور معاشی مسائل ہیں جن پر سنجیدہ غور و فکر کی ضرورت ہے۔ ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت قرار دیا جائے یا شخصی ملکیت؟ ریاست میں ایک ہی سیاسی پارٹی ہونی چاہیئے یا ایک سے زیادہ سیاسی پارٹیوں کا ہونا جمہوریت کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے؟ مزدوروں کو ہڑتال کا حق ہونا چاہیئے یا نہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ آپ ان گتھیوں کو مذہبی پیشواؤں کے حوالہ کر دیجیے، آپ دیکھیں گے کہ وہ کسی فیصلہ کن نتیجے تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ ریاست کی تعمیر کیلیے فقیہانہ تحقیق و تجسس اور مذہبی کتب کی چھان بین کے بجائے سیاسی تجزیئے اور تاریخی شعور کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں دینیات کے ماہروں کی بہ نسبت سیاسیات اور اقتصادیات کے ماہرین ہماری بہتر رہنمائی کر سکتے ہیں۔

۴۔ آپ جب "دینیات" کا لفظ بولتے ہیں تو شاید "دُنیویات" کو اس سے خارج کر دیتے

ہیں۔ اسی لیے آپ کو بجا طور پر یہ اندیشہ ہوا کہ اگر ہم نے اپنے سیاسی اور معاشی مسائل کا حل اُن ماہرین دینیات کے حوالہ کر دیا جو دُنیویات سے ناواقف ہیں تو ہمارا کوئی مسئلہ بھی حل نہ ہو سکے گا۔ لیکن آپ ذرا اس پہلو پر بھی غور فرمائیں کہ اگر ہم نے اپنے تمدن، اپنی سیاست اور اپنی معیشت کے مسائل اُن ماہرین کے حوالے کر دیئے جو صرف مغربی نظریات و عملیات سے واقف ہیں اور اسلامی تعلیمات سے کوئی مس نہیں رکھتے تو ہم کہاں پہنچیں گے؟ آپ کہتے ہیں کہ یہ لوگ ماہرین دینیات کی بہ نسبت ہماری بہتر رہنمائی کر سکیں گے۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ یہ رہنمائی ہمیں اُسی منزل پر لے جائے گی جس پر آج دنیا کی بڑی بڑی قومیں پہنچ چکی ہیں، یعنی گھر کے اندر طبقاتی خود غرضیوں کی کشاکش، اور گھر کے باہر بین الاقوامی خود غرضیوں کی کھینچ تان۔ کیا اس سے بہتر یہ نہ ہوگا کہ ہم اپنی قوم میں اُن لوگوں کو تلاش کریں جو دین اور دنیا، دونوں کو اچھی طرح جانتے ہوں، جن کی نگاہ قرآن و حدیث کی تعلیمات پر اور سیاسیات و معاشیات وغیرہ کے مسائل پر یکساں ہو، اور وہ سر جوڑ کر ہماری گتھیوں کا ایسا حل پیش کریں جو ہماری زندگی کو ساری دنیا کے لیے ایک قابلِ تقلید نمونہ بنا دے؟

س۔ ریاست پاکستان کو اسلامی شریعت کے مطابق تنظیم دینے اور شرعی احکامات کے موجودہ حالات پر اطلاق کرنے میں ہمیں ایک اور مشکل بھی پیش آئے گی۔ ہم بسا اوقات مذہبی احکامات کی روح کو فراموش کر دیتے ہیں اور ان کی لفظی حیثیت ہمارے پیش نظر رہتی ہے۔ اس طرح وسائل اور مقاصد ایک دوسرے سے خلط ملط ہو کر رہ جاتے ہیں۔ سُود ہی کو لیجیے۔ سُود کو ناجائز قرار دینے کا مقصد یہی تھا کہ اقتصادی استحصال کو روکا جائے۔ اسی طرح اجارہ، احتکار اور چور بازاری کی مخالفت کی گئی۔ لیکن بیرونی تجارت کو روا رکھا گیا۔ کیونکہ اُس زمانے میں سرمایہ داری نظام ابھی طفولیت کی حالت میں تھا اور صنعتی سرمایہ کی طرح ظلم و استبداد کا آلہ نہ تھا۔ آج حالات بدل چکے ہیں۔ آج بیرونی تجارت کا مفہوم یہ ہے کہ سامراجی نظام کو تقویت دی جائے اور دوسری قوموں کو اقتصادی اور سیاسی طور پر محکوم بنایا جائے۔ جائز اور ناجائز تجارت کا فرق مٹ چکا ہے۔ لیکن ہمارے علماء بھی

اقتصادیات پر فتوے لگاتے ہیں تو وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ موجودہ اقتصادی نظام میں مہاجنی سود کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ غربت اور بدحالی اُس شے کی پیداوار ہے جسے وہ جائز قرار دیتے ہیں، یعنی صنعتی سرمایہ داری اور بینکنگ۔

۲۔ یہ خرابی جس کا آپ ذکر فرما رہے ہیں، ہر اُس جگہ پیدا ہو جاتی ہے جہاں قانون کے منشا اور اس کی روح کو چھوڑ کر صرف اُس کے الفاظ لے لیے جاتے ہیں۔ کہیں یہ خرابی علم اور بصیرت کی کمی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، اور کہیں اس وجہ سے کہ لوگ اپنی اغراض کے لیے قانون کی روح سے بغاوت کرنا چاہتے ہیں، مگر ظاہرداری کو قائم رکھنے کے لیے قانون کی شکل بدلنے سے احتراز کرتے ہیں۔ ہمیں اس خرابی سے اگر کوئی چیز بچا سکتی ہے تو وہ صرف یہ کہ عام مسلمانوں میں اسلام کا شعور اور اس کی واقعی پیروی کا ارادہ موجود ہو۔ یہ چیز جب موجود ہو گی تو وہ اسلامی قوانین کی تعبیر کے لیے اپنے اندر سے انہی لوگوں کو منتخب کریں گے جو قرآن و سنت کے محض الفاظ ہی نہ جانتے ہوں بلکہ ان کی روح کو بھی سمجھتے ہوں۔

۳۔ شریعت کے مفسرین اور شارحین میں سیاسی اختلافات کے علاوہ جو خالصتہً مذہبی اختلافات ہیں، ان کے بارے میں آپ کا خیال ہے؟ کیا آپ کی نظر میں یہ اختلافات مستقبل کے سیاسی اور سماجی نظام کا تصور قائم کرنے میں رکاوٹ نہ ڈالیں گے؟

۴۔ ان اختلافات کی نوعیت وہی کچھ ہے جو ہمارے دوسرے اختلافات کی ہے اور انہیں بھی ہم اسی طرح حل کر سکتے ہیں جس طرح دوسرے اختلافات کو حل کیا کرتے ہیں۔ کوئی معاشرہ جو انسانوں پر مشتمل ہو، ایسا نہیں ہو سکتا جس میں زندگی کے مختلف مسائل سے متعلق مختلف نظریے نہ پائے جاتے ہوں۔ لیکن ان اختلافات کو کہیں بھی ایسی رکاوٹ بننے کی اجازت نہیں دی جاتی کہ وہ زندگی کی گاڑی کو آگے چلنے ہی نہ دیں۔ اختلافات کو حل کرنے کا جمہوری طریقہ یہ ہے کہ ریاست کا نظام اُس نقطۂ نظر کے مطابق چلایا جائے جس کو اکثریت قبول کرتی ہو، اور قلیل التعداد گروہوں کے نقطۂ نظر کی زیادہ سے زیادہ اُتنی رعایت کی جائے جس کی اصول میں گنجائش ہو، نیز اقلیت کی حیثیت سے ان کے حقوق کا منصفانہ تحفظ کر دیا جائے۔ ہم کوشش کریں گے کہ پاکستان کی ریاست اسلام

کے ان وسیع ترین اصولوں پر قائم ہو جن پر مسلمانوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ اتفاق پایا جاتا ہے۔ تاہم کچھ ایسے گروہ باقی رہ سکتے ہیں جو اُن وسیع ترین اصولوں میں بھی اکثریت کے ساتھ متفق نہ ہوں۔ اس صورت میں ہم کو وہی جمہوری طریقہ اختیار کرنا پڑے گا جس کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ ورنہ یہ بالکل ایک عجیب بات ہو گی کہ ہم سب غیر اسلام پر اس لیے اتفاق کر لیں کہ اسلام پر ہم متفق نہ ہو سکے۔

س۔ مسلمانوں کے اندرونی اختلافات کے علاوہ ریاست پاکستان میں اقلیتوں کا مسئلہ بھی قابلِ غور ہے۔ آپ کس طرح اُن کو اس بات پر راضی کر سکتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کی مذہبی ریاست کا قیام گوارا کر لیں اور اس کے وفادار رہیں؟

۳۔ اس گتھی کا حل بھی وہی ہے جو مسلمانوں کے اندرونی اختلافات کا ہے۔ جمہوری طریقہ پر ایک ملک کا نظام اُنہی اصولوں کے مطابق بنتا اور چلتا ہے جو اکثریت کی رائے میں صحیح ہوں۔ اقلیت یہ مطالبہ ضرور کر سکتی ہے کہ اُس کے نقطۂ نظر پر بھی غور کیا جائے، نیز یہ کہ اس کے حقوقِ شہریت اور اس کے پرسنل لا کو محفوظ رکھا جائے۔ لیکن ازروئے انصاف وہ یہ مطالبہ نہیں کر سکتی کہ اکثریت اُس کی خاطر اپنی رائے بدل دے۔ اس ملک کی اکثریت ایمانداری کے ساتھ یہ رائے رکھتی ہے کہ اسلام کے اصولوں کی پیروی میں پاکستان کے باشندوں کی فلاح ہے۔ اُس کو یہ حق حاصل ہونا چاہیے کہ ملک کا نظام اُس کی اس رائے کے مطابق بنے۔ اقلیت اس سے اپنے حقوق کا تحفظ مانگ سکتی ہے، مگر یہ کہنے کا حق نہیں رکھتی کہ اکثریت اسلام کے بجائے کچھ دوسرے اصولوں میں اپنی فلاح تلاش کرے۔ رہا وفاداری کا سوال، تو حقیقت یہ ہے کہ وفاداری کا تعلق کسی ریاست کے مذہبی یا غیر مذہبی ہونے سے نہیں ہے، بلکہ وہ اُس انصاف، شرافت اور فیاضی پر منحصر ہے جو اکثریت کی طرف سے اقلیت کے ساتھ برتی جاتی ہے۔ آپ اقلیت کو محض اس ریاکاری سے مطمئن نہیں کر سکتے کہ دیکھو ہم نے تمہاری خاطر اپنے مذہب کو چھوڑ دیا اور ایک غیر مذہبی ریاست بنالی۔ اقلیت تو یہ دیکھے گی کہ آپ اُس کے ساتھ انصاف کرتے ہیں یا نہیں؟ آپ کا برتاؤ تعصب اور تنگ دلی پر مبنی ہے یا رواداری اور فیاضی پر؟ یہی تجربہ دراصل فیصلہ کرے گا کہ اقلیت کو

اس ریاست میں وفادار بن کر رہنا ہے یا بیزار بن کر۔

س۔ میری رائے میں ہر ملک کا سیاسی نظام اس کے باشندوں کے رسم و رواج، اخلاق، عادات و خصائل اور اعتقادات و توہمات کا پرتو ہوتا ہے۔ ریاستی نظام بجائے خود کسی فلسفے یا مذہب کا حامل نہیں ہو سکتا۔ اگر اسے ایسا بنانے کی کوشش کی جائے تو وہ ایک مصنوعی اور عارضی کوشش ہو گی۔ قدیم یونان کی شہری ریاست افلاطون کے تخیل کی پیداوار نہیں تھی بلکہ اس انداز فکر اور فلسفہ زندگی کی پیداوار تھی جو یونان کے باشندوں میں مشترک تھا۔ اسی طرح اگر ہم اسلامی ریاست کی تعمیر چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیئے کہ پاکستان کے باشندوں میں صحیح اسلامی اسپرٹ پیدا کریں اور انہیں دین کی اصل اقدار سے روشناس کرائیں۔ جب یہ اقدار مضبوط ہو جائیں گی اور ہمارے قومی کیریکٹر میں اسلامی تصورات پوری طرح سرایت کر جائیں گے، اس وقت ہمارا سیاسی نظام خود بخود اسلامی رنگ اختیار کر لے گا۔ ہم اس وقت تک اسلامی ریاست کی داغ بیل نہیں ڈال سکتے جب تک ہماری روحانی، شخصی اور سماجی زندگی میں اسلامی روایات پوری تابندگی سے جلوہ گر نہ ہوں۔ میری نظر میں وہ وقت ابھی بہت دور ہے جب ہم مکمل طور پر اسلامی تصورات کو قبول کر لیں گے۔ اس لیے اسلامی ریاست کو قائم کرنے کی تمام کوششیں پیش از وقت ہیں۔ ہماری بنیادیں ابھی اتنی استوار نہیں ہیں کہ ہم ان پر ایک عمارت کھڑی کر سکیں۔

۴۔ آپ نے یہ فرمایا کہ ایک ملک کا سیاسی نظام اس کے باشندوں کی اخلاقی اور ذہنی حالت کا پرتو ہوا کرتا ہے۔ اب اگر پاکستان کے باشندے اسلام کی طرف ایک پُر زور میلان رکھتے ہیں اور ان کے اندر اسلام کے راستے پر آگے بڑھنے کی خواہش موجود ہے تو کیوں نہ اُن کی قومی ریاست اُن کے اس میلان اور اس خواہش کا پرتو ہو؟ آپ کا یہ ارشاد بھی بالکل درست ہے کہ اگر ہم پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں پاکستان کے باشندوں میں اسلامی شعور، اسلامی ذہنیت، اور اسلامی اخلاق پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ مگر میں نہیں سمجھا کہ اس کوشش میں حصہ لینے سے آپ خود ریاست کو کیوں مستثنیٰ رکھنا چاہتے ہیں؟ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے کی صورتِ حال تو یہ تھی کہ ہمارے اوپر ایک غیر مسلم اقتدار مسلط تھا، اس وجہ سے ہم اسلامی

خطوط پر اپنی ملت کی تعمیر میں ریاست اور اُس کی طاقتوں اور اُس کے ذرائع سے کوئی مدد نہیں پا رہے تھے، بلکہ درحقیقت اُس وقت ریاست کا پورا ادارہ اپنے زور سے ہمیں ایک دوسری طرف کھینچے لیے جا رہا تھا اور ہم انتہائی ناسازگار حالت میں اِسلامی زندگی کی تعمیر کے لیے جدّوجہد کر رہے تھے۔ اب جو سیاسی انقلاب ۱۵ اگست، ۴۷ء کو رونما ہوا ہے اس کے بعد ہمارے سامنے یہ سوال پیدا ہو گیا ہے کہ آیا اب ہماری قومی ریاست اِسلامی زندگی کی تعمیر میں وہ حصّہ لے گی جو ایک معمار کا حصّہ ہوتا ہے؟ یا وہ طرزِ عمل اختیار کرے گی جو ایک بے نیاز غیر جانبدار کا ہوا کرتا ہے؟ یا اب بھی وہی پچھلی صورتِ حال برقرار رہے گی کہ ہمیں حکومت کی مدد کے بغیر ہی نہیں بلکہ اس کی مزاحمت کے باوجود اِسلامی زندگی کی تعمیر کا کام کرنا ہوگا؟ اس وقت چونکہ پاکستان کا آئندہ نظام زیرِ تشکیل ہے اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ ایسی ریاست بن جائے جو اِسلامی زندگی کی معمار بن سکے۔ ہماری یہ خواہش اگر پوری ہو گئی تو ریاست کے وسیع ذرائع اور طاقتوں کو استعمال کر کے پاکستان کے باشندوں میں ذہنی اور اخلاقی انقلاب برپا کرنا بہت آسان ہو جائے گا۔ پھر جس نسبت سے ہمارا معاشرہ بدلتا جائے گا اسی نسبت سے ہماری ریاست بھی ایک مکمل اسلامی ریاست بنتی چلی جائے گی۔

(ترجمان القرآن۔ جون ۱۹۴۸ء۔ بشکریہ ریڈیو پاکستان)

پاکستان میں اسلامی قانون کیوں نہیں نافذ ہو سکتا؟

ایک تقریر جو ۶ جنوری ۱۹۴۸ء کو لا کالج لاہور میں کی گئی تھی

(قیامِ پاکستان کے بعد ہی وہ عذرات پیش کرنے شروع کر دیئے گئے تھے جو کچھ لوگوں کے نزدیک، یہاں اسلامی قانون نافذ کرنے میں مانع تھے۔ اس تقریر میں انہی عذرات کا جواب دیا گیا ہے)

آج کل کسی ملک میں ——— غیر مسلموں کے نہیں مسلمانوں کے اپنے ملک میں ——— اگر اسلامی قانون کے جاری کرنے کا سوال اٹھایا جاتا ہے تو اعتراضات کی ایک بوچھاڑ ہوتی ہے جس سے آدمی کو سابقہ پیش آتا ہے۔ کیا صدیوں کا پرانا قانون جدید زمانے کی سوسائٹی اور اسٹیٹ کی ضرورت کے لیے کافی ہو سکتا ہے؟ کیا ایک خاص زمانے کے قانون کو ہمیشہ کے لیے قابلِ عمل سمجھنا حماقت نہیں ہے؟ کیا اس مہذب دور میں ہاتھ کاٹنے اور کوڑے برسانے کی وحشیانہ سزائیں دی جائیں گی؟ کیا ہماری منڈیوں میں اب پھر غلام بکا کریں گے؟ اور آخر اس ملک میں مسلمانوں کے کس فرقہ کی فقہ جاری ہوگی؟ پھر جو غیر مسلم یہاں رہتے ہیں وہ کیسے راضی ہو جائیں گے کہ مسلمانوں کا مذہبی قانون اُن پر مسلّط کر دیا جائے؟ یہ اور ایسے ہی بہت سے سوالات ہیں جو تابڑ توڑ برسنے شروع ہوتے ہیں اور یہ بات غیر مسلموں کی زبان سے نہیں بلکہ مسلمانوں کے اپنے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی زبان سے ادا ہوتی ہے[1]۔

---

[1] واضح رہے کہ پاکستان بننے سے پہلے یہی طبقہ اِن سوالات کے بارے میں خاموش تھا اور (باقی صفحہ ۳۲۶ پر)

اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان لوگوں کو اسلام سے کوئی دشمنی ہے۔ دراصل اس کی وجہ ناواقفیت ہے۔ آدمی کا خاصہ ہے کہ وہ جس چیز کو نہیں جانتا اس کا نام سُن کر طرح طرح کے وسوسے اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور دُوری کی شناسائی اُنسیت کے بجائے اکثر وحشت ہی بڑھاتی ہے۔

ہماری بدقسمتی کی طویل داستان کا ایک نہایت افسوس ناک باب یہ بھی ہے کہ آج محض اغیار ہی نہیں، ہماری اپنی ملت کے لوگ بھی اکثر اپنے دین سے اور اپنے اسلاف کے چھوڑے ہوئے عظیم الشان ترکہ سے نابلد اور متوحّش ہیں۔ اس حالت کو ہم اچانک نہیں پہنچ گئے ہیں بلکہ صدیوں کے مسلسل انحطاط نے ہمیں یہاں تک پہنچایا ہے۔ پہلے مدتہائے دراز تک ہمارے ہاں تہذیب و تمدن کا ارتقاء اور علوم و فنون کا نشوونما معطل رہا۔ پھر جمود کے نتیجے میں ہم پر سیاسی زوال آیا اور دنیا کی مسلمان قومیں یا تو براہِ راست غیر مسلم حکومتوں کی غلام ہوگئیں یا ان میں سے بعض کو کچھ آزادی حاصل بھی رہی تو وہ غلامی سے کم نہ تھی، کیونکہ شکست خوردگی کا اثر ان کے قلب و روح کی گہرائیوں تک اُتر چکا تھا۔ آخر جب ہم نے اُٹھنا چاہا تو ہر جگہ کے مسلمانوں کو، خواہ وہ غلام تھے یا آزاد، اُٹھنے کی ایک ہی صورت نظر آئی اور وہ یہ تھی کہ جدید تہذیب و تمدن اور جدید علوم کا سہارا لے کر اُٹھیں۔ ہمارے دینی علوم کے حامل جو طبقے تھے وہ خود اُسی انحطاط میں مبتلا تھے جس میں ساری اُمت مبتلا تھی۔ دینی بنیادوں پر کوئی زندگی بخش اور انقلاب انگیز حرکت برپا کرنا ان کے بس میں نہ تھا۔ ان کی رہنمائی سے مایوس ہو کر اُمت کے سب چیدہ طبقے دنیا کے اُس نظامِ زندگی کی طرف متوجہ ہوگئے جو صریحاً کامیاب نظر آرہا تھا۔ اُسی سے اُنہوں نے اصول لیے، اُسی کے علوم سیکھے، اُسی کے تمدنی اداروں کا نقشہ حاصل کیا، اور اُسی کے نقشِ قدم پر چل پڑے۔ رفتہ رفتہ اہلِ دین کا گروہ بالکل گوشۂ خمول میں پھینک دیا گیا اور تمام مسلمان قوموں میں کار فرمائی کی باگیں اور کارکن طاقتیں انہی لوگوں کے ہاتھ میں آگئیں جو دین سے ناواقف اور تہذیبِ جدید کے فکری و عملی سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دو کو چھوڑ کر تمام آزاد مسلم ممالک کی حکومتیں مغرب کی بے دین ریاستوں (Secular States) کے نمونے

(بقیہ حاشیہ ص ۳۳۵ سے) مسلمانوں کو یقین دلا رہا تھا کہ ہمیں خود اپنے نظریۂ حیات کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے ایک الگ خطۂ زمین درکار ہے۔ مگر وہ خطہ فراہم ہوتے ہی یہ سوالات اُٹھائے جانے لگے۔ (جدید)

پر بن گئیں جن میں کہیں تو پوری اسلامی شریعت منسوخ ہو چکی ہے اور کہیں غیر دینی حکومت کے نظام میں مسلمانوں کے لیے محض ان کا پرسنل لا اسلامی رہنے دیا گیا ہے، یعنی مسلمانوں کی اپنی حکومت میں اُن کو صرف وہ مذہبی حقوق عطا ہوتے ہیں جو اسلامی حکومتوں میں کبھی ذمیوں کو دیئے جاتے تھے۔[1] اسی طرح جو ممالک غلام تھے ان میں بھی تمام تہذیبی اداروں اور سیاسی تحریکوں کے کارفرما اسی

---

[1] اسلامی شریعت کی تنسیخ کا سلسلہ سب سے پہلے ہندوستان میں شروع ہوا۔ یہاں انگریزی تسلط کے بعد بھی ایک مدت تک شریعت ہی کو قانون کی حیثیت حاصل تھی۔ چنانچہ ۱۷۹۱ء تک اس ملک میں چور کا ہاتھ کاٹا جاتا رہا۔ مگر اس کے بعد انگریزی حکومت نے بتدریج اسلامی قوانین کو دوسرے قوانین سے بدلنا شروع کیا یہاں تک کہ انیسویں صدی کے وسط تک پہنچتے پہنچتے پُوری شریعت منسوخ ہو گئی اور اس کا صرف وہ حصّہ مسلمانوں کے پرسنل لا کی حیثیت سے باقی رہنے دیا گیا جو نکاح وطلاق وغیرہ مسائل سے متعلق تھا۔ پھر اسی نقشِ قدم پر خود وہ ممالک بھی چل پڑے جن میں مسلمانوں کی اپنی حکومتیں قائم تھیں۔ ہندوستان کی تمام مسلمان ریاستوں نے رفتہ رفتہ اپنے پبلک لا کو برطانوی ہند کے نمونے پر ڈھال لیا اور شریعت کو صرف پرسنل لا تک محدود کر دیا۔ مصری حکومت نے ۱۸۸۳ء میں اپنے پورے قانونی نظام کو فرنچ کوڈ کے مطابق بدل لیا اور محض نکاح وطلاق اور وراثت وغیرہ کے مسائل قاضیوں کے دائرۂ اختیار میں چھوڑ دیئے۔ اس کے بعد بیسویں صدی میں البانیا اور ٹرکی نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ انہوں نے صاف صاف اعلان کیا کہ ان کی حکومتیں بے دین حکومتیں ہیں، اور صرف اتنے ہی پر اکتفا نہ کیا کہ اپنے ملکی قوانین اٹلی، سوئٹزرلینڈ، فرانس اور جرمنی کے نمونوں پر ڈھال لیے، بلکہ مسلمانوں کے پرسنل لا میں وہ کھلی کھلی تحریفات کر ڈالیں جن کی جرأت کوئی غیر مسلم حکومت بھی نہ کر سکی تھی۔ چنانچہ البانیہ میں تعدّدِ ازدواج کو قانوناً ممنوع ٹھیرایا گیا، اور ٹرکی میں نکاح، طلاق اور وراثت کے متعلق قرآن کے صریح احکام تک تبدیل کر ڈالے گئے۔ اب صرف افغانستان اور سعودی عرب دو ہی ملک دنیا میں ایسے رہ گئے ہیں جہاں شریعت کو ملکی قانون کی حیثیت حاصل ہے، اگرچہ شریعت کی رُوح وہاں سے بھی غائب ہے۔

قسم کے لوگ بنے، اور آزادی کی طرف ان کا جو قدم بھی بڑھا اُسی منزل کی طرف بڑھا جس پر دوسری آزاد قومیں پہنچی ہوئی تھیں۔ اب اگر ان لوگوں سے اسلامی قانون اور اسلامی دستور کے نفاذ کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو وہ بیچارے مجبور ہیں کہ اسے ٹالیں یا دبائیں، کیونکہ وہ اُس چیز کی ابجد تک سے ناواقف ہیں جس کے قیام و نفاذ کا ان سے مطالبہ کیا جاتا ہے۔ جو تعلیم اور ذہنی و عملی تربیت انہوں نے پائی ہے وہ انہیں اسلامی قانون کی رُوح و مزاج سے اِتنی دُور لے جا چکی ہے کہ اُس کو سمجھنا اُن کے لیے آسان نہیں رہا ہے۔ اور حاملانِ دین کی رہنمائی میں دینی تعلیم کا جو نظام چل رہا ہے وہ اس وقت تک بیسویں صدی کے لیے بارہویں صدی کے مردانِ کار تیار کرنے میں مشغول ہے۔ اس لیے کوئی ایسا گروہ بھی موجود نہیں ہے جو شاگردانِ مغرب کو ہٹا کر اسلامی آئین و قانون کے مطابق ایک جدید ریاست کا نظام بنا اور چلا سکے۔

یہ واقعی ایک سخت پیچیدگی ہے جس نے تمام مسلم ممالک میں اِسلامی قانون و دستور کے نفاذ کو مشکل بنا رکھا ہے۔ مگر ہمارا معاملہ دوسرے مسلمان ملکوں سے بالکل مختلف ہے۔ ہم اِس برِ عظیم ہند میں پچھلے دس سال سے اس بات پر لڑتے رہے ہیں کہ ہم اپنی مستقل تہذیب، الگ نظریۂ زندگی اور مخصوص آئینِ حیات رکھتے ہیں، ہمارے لیے مسلم و غیر مسلم کی ایک ایسی متحدہ قومیت ناقابلِ قبول ہے جس کا نظامِ زندگی لامحالہ ہمارے آئینِ حیات سے مختلف ہوگا، ہمیں ایک الگ خطۂ زمین درکار ہے جس میں ہم اپنے آئین پر زندگی کا نظام بنا اور چلا سکیں۔ ایک طویل اور اَنتھک کشمکش کے بعد بالآخر ہمیں وہ خطۂ زمین مل گیا ہے جس کا ہم مطالبہ کر رہے تھے۔ اور اُس کی قیمت میں ہم کو لاکھوں مسلمانوں کی جان و مال اور آبرو دینی پڑی ہے۔ یہ سب کچھ ہو چکنے کے بعد اگر ہم نے یہاں اپنا وہ آئینِ حیات ہی نافذ نہ کیا جس کے لیے اتنے پاپڑ بیل کر اور اتنی بھاری قیمت ادا کر کے یہ خطۂ زمین حاصل کیا گیا ہے تو ہم سے بڑھ کر زیاں کار کوئی نہ ہوگا۔ اسلامی دستور کے بجائے جمہوری لادینی دستور، اور اسلامی قانون کی جگہ تعزیراتِ ہند اور ضابطۂ دیوانی ہی جاری کرنا تھا تو آخر ہندوستان کیا بُرا تھا کہ اِتنے لڑائی جھگڑوں سے یہ پاکستان لیا جاتا؟ اور اگر ہمارا مقصد اشتراکی پروگرام نافذ کرنا تھا تو یہ "کارِ خیر" بھی ہندوستان کی سوشلسٹ یا کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ مل کر انجام دیا جا سکتا تھا۔ اس کے لیے بھی کوئی ضرورت نہ تھی کہ خواہ مخواہ اِتنی جانفشانی اور اِتنی بڑی قیمت پر پاکستان حاصل کرنے

کی حماقت کی جاتی۔ دراصل ہم ایک قوم کی حیثیت سے اپنے آپ کو خدا اور خلق اور تاریخ کے سامنے آئین اسلامی کے نفاذ کے لیے پابند کر چکے ہیں۔ ہمارے لیے اب اپنے قول سے پھرنا ممکن نہیں رہا ہے۔ لہٰذا چاہے دوسری مسلمان قومیں کچھ کرتی رہیں، ہمیں بہرحال اُن ساری پیچیدگیوں کو حل کرنا ہی پڑیگا جو اس کام کی راہ میں حائل ہیں۔

جہاں تک اسلامی قانون کے نفاذ کی عملی مشکلات کا تعلق ہے اُن سب کو دُور کرنے کی تدبیریں کی جاسکتی ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی اصلی مشکل نہیں ہے۔ اصلی مشکل صرف یہ ہے کہ وہ دماغ جن کی فکر و محنت اس کام کے لیے درکار ہے، بجائے خود مطمئن نہیں ہیں۔ اور اُن کے عدم اطمینان کی وجہ اُن کی عدم واقفیت ہے۔ اس لیے سب سے پہلے جو کام کرنے کا ہے وہ یہی ہے کہ اُنہیں واضح طریقہ پر یہ بتایا جائے کہ اسلامی قانون کس چیز کا نام ہے۔ اس کی حقیقت کیا ہے۔ اُس کا مقصد، اس کے اصول، اس کی رُوح اور اس کا مزاج کیا ہے۔ اُس میں کیا چیز قطعی اور مستقل ہے اور اس کے ایسا ہونے کا فائدہ کیا ہے۔ اور اُس میں کون سی چیز ابد تک ترقی پذیر ہے اور وہ کس طرح ہر دَور میں ہماری بڑھتی ہوئی تمدنی ضرورتوں کو پُورا کر سکتی ہے۔ اُس کے احکام کن مصالح پر مبنی ہیں اور اُن غلط فہمیوں کی کیا اصلیت ہے جو اُن احکام کے متعلق ناواقف لوگوں میں پھیلی ہوتی ہیں۔ اگر یہ تفہیم صحیح طریقہ پر ہو جائے تو ہمیں یقین ہے کہ ہمارے بہترین کارفرما اور کارکن دماغ مطمئن ہو جائیں گے اور اُن کا اطمینان اُن ساری تدبیروں کا دروازہ کھول دے گا جو اسلامی قانون کے نفاذ کو عملاً ممکن بنا سکتی ہیں۔

میری آج کی تقریر اسی تعارف کے لیے ہے۔

قانون اور نظامِ زندگی کا باہمی تعلق

قانون کے لفظ سے ہم جس چیز کو تعبیر کرتے ہیں وہ دراصل اس سوال کا جواب ہے کہ انسانی طرزِ عمل، انفرادی اور اجتماعی طور پر کیا ہونا چاہیئے۔ اس سوال کا دائرہ اُس دائرہ سے بہت وسیع ہے جس میں قانون اس کا جواب دیتا ہے۔ ہم کو بہت وسیع پیمانے پر اس "کیا ہونا چاہیئے" کے سوال سے سابقہ پیش آتا ہے اور اس کے بے شمار جوابات ہیں جو مختلف عنوانات کے تحت مرتب ہوتے ہیں۔ ان کا ایک مجموعہ ہماری اخلاقی تعلیم و تربیت میں شامل

ہوتا ہے اور اسی کے مطابق ہم اپنے افراد کی سیرت و کردار کو ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُن کا ایک دوسرا مجموعہ ہمارے معاشرتی نظام میں داخل ہوتا ہے اور اُسی کے لحاظ سے ہم اپنی معاشرت میں مختلف قسم کے انسانی تعلقات کو منضبط کرتے ہیں۔ اُن کا ایک تیسرا مجموعہ ہمارے معاشی نظام میں جگہ پاتا ہے اور اسی کی روشنی میں ہم دولت اور اس کی پیدائش اور اس کی تقسیم اور اس کے تبادلہ اور اس پر لوگوں کے حقوق کا ضابطہ بناتے ہیں۔ غرض اسی طریقہ پر ان جوابات کے بہت سے مجموعے بن جاتے ہیں جو ہماری زندگی کے مختلف شعبوں کی شکل اور ان کے ضوابطِ عمل معین کرتے ہیں۔ اور قانون اُن بہت سے مجموعوں میں سے صرف اُن جوابات پر مشتمل ہوتا ہے جن کو نافذ کرنے کے لیے سیاسی اقتدار استعمال کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب اگر کوئی شخص کسی قانون کو سمجھنا چاہے تو یہ کافی نہیں ہے کہ وہ اپنی تحقیقات کو صرف اُسی دائرے تک محدود رکھے جس میں قانون نے اس "ہونا چاہیئے" کے سوال کا جواب دیا ہے، بلکہ اسے سوسائٹی کی اُس پوری اسکیم کو سمجھنے کی کوشش کرنی ہوگی جس میں زندگی کے ہر شعبے کے متعلق اِس سوال کا جواب دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ قانون اُسی اسکیم کا ایک جُزو ہے اور اِس جُزو کے مزاج کو سمجھنا یا اِس کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا بغیر اُس کے ممکن نہیں ہے کہ کُل کو سمجھا جائے۔

نظامِ زندگی کی فکری اور اخلاقی بنیادیں

پھر زندگی کے پورے دائرے میں "کیا ہونا چاہیے" کے سوال کا جو جواب ہم دیتے ہیں وہ دراصل ایک دوسرے سوال یعنی "کیوں ہونا چاہیئے" کے جواب سے ماخوذ ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یُوں سمجھیے کہ "کیا ہونا چاہیئے" کے متعلق ہمارے تمام جوابات دراصل اُن نظریات پر مبنی ہوتے ہیں جو ہم نے انسانی زندگی اور اُس کے خیر و شر اور اس کے حق و باطل اور صحیح و غلط کے بارے میں قائم یا اختیار کیے ہیں۔ اور اُن نظریات کی نوعیت متعین کرنے میں اُس مآخذ یا اُن مآخذ کا بہت بڑا دخل، بلکہ اصل فیصلہ کُن اثر ہوتا ہے جہاں سے ہم نے اُن نظریات کو اخذ کیا ہے۔ دنیا میں مختلف انسانی گروہوں کے قوانین کا اختلاف اسی وجہ سے ہے کہ انسانی زندگی کے متعلق ان کے نظریات ایک مآخذ سے لیے ہوتے نہیں ہیں بلکہ ان کے مآخذ ایک دوسرے سے مختلف

ہیں۔ اِس اختلاف کے باعث اُن کے نظریئے مختلف ہوتے، اُن کے اختلاف نے زندگی کی اسکیمیں مختلف کر دیں، اور پھر اُن اسکیموں کے جو حصے قانون سے متعلق ہیں وہ بھی لازماً مختلف ہو کر رہے۔ اب یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم زندگی کی کسی خاص اسکیم کے بنیادی نظریات اور اُن کے ماخذ اور اُن سے وجود میں آنے والے پُورے نظامِ حیات کو سمجھے بغیر صرف اس کے قانونی حصّہ کے متعلق کوئی رائے قائم کر سکیں اور وہ بھی اُس قانونی حصّہ کا تفصیلی مطالعہ کر کے نہیں بلکہ اُس کے بعض پہلوؤں کے بارے میں چند اُڑتی ہوئی خبریں سُن کر!

میں یہاں تقابلی مطالعے (Comparative Study) کا ارادہ نہیں رکھتا، اگرچہ بات پوری طرح تو اسی وقت سمجھ میں آسکتی ہے جب مغربی نظامِ زندگی کو، جس کا قانون آپ پڑھتے اور اپنے ملک میں جاری کرتے ہیں، اسلامی نظامِ زندگی کے بالمقابل رکھ کر دیکھا جاتے کہ اُن کے درمیان کیا اختلاف ہے اور اس اختلاف نے کیوں ان کے قوانین کو مختلف کر دیا ہے۔ لیکن اس بحث سے گفتگو بہت طویل ہو جائے گی، اس لیے میں صرف اِسلامی نظامِ زندگی کی تشریح پر اکتفا کروں گا۔

اِسلامی نظامِ زندگی کا ماخذ

اسلام جس نظامِ زندگی کا نام ہے اس کا ماخذ ایک کتاب ہے جس کے مختلف ایڈیشن قدیم ترین زمانے سے توراۃ، انجیل، زبور وغیرہ بہت سے ناموں کے ساتھ دنیا میں شائع ہوتے رہے اور آخری ایڈیشن قرآن کے نام سے انسانیت کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس کتاب کا اصل نام اسلام کی اصطلاح میں "الکتاب" (The Book) ہے اور یہ دوسرے نام دراصل اُس کے ایڈیشنوں کے نام ہیں۔ اس کا دوسرا ماخذ وہ لوگ ہیں جو مختلف زمانوں میں اس الکتاب کو لے کر آئے اور جنہوں نے اپنے قول اور عمل سے اس کے منشاء کی ترجمانی کی۔ یہ لوگ اگرچہ الگ الگ اشخاص ہونے کی حیثیت سے نوحؑ، ابراہیمؑ، موسٰیؑ، عیسٰیؑ اور محمدؐ (علیہم الصلوٰۃ والسلام اجمعین) وغیرہ ناموں سے موسوم ہیں لیکن اس بناء پر کہ یہ ایک ہی گروہ کے اشخاص ہیں جو ایک ہی مشن لے کر اُٹھے تھے، ان سب کو ایک جامع نام "الرسول" سے موسوم کرنا بالکل صحیح ہے۔

اسلام کا نظریۂ زندگی

اس "الکتاب" اور "الرسول" نے زندگی کا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ عظیم الشان کائنات جو تمہیں صریحاً ایک زبردست نظام میں جکڑی ہوئی اور ایک مقررہ قانون پر چلتی ہوئی نظر آرہی ہے، دراصل ایک خدا کی حکومت ہے۔ خدا ہی اس کا خالق ہے، وہی اس کا مالک ہے، اور وہی اس کا فرمانروا ہے۔ یہ زمین جس پر تم رہتے ہو، اس کی بے پایاں سلطنت کے لاتعداد صوبوں میں سے ایک چھوٹا سا صوبہ ہے اور یہ صوبہ بھی مرکزی اقتدار کی اُس گرفت میں پوری طرح جکڑا ہوا ہے جس میں اس جہانِ ہست و بود کا ہر حصّہ جکڑا ہوا ہے۔ تم اس صوبے میں خدا کی پیدائشی رعیت (Born Subjects) ہو۔ تم اپنے خالق آپ نہیں ہو بلکہ اُس کی مخلوق ہو۔ اپنے پروردگار آپ نہیں ہو بلکہ اُس کے پروردہ ہو۔ اپنے بل پر آپ نہیں جی رہے ہو بلکہ اُس کے جلائے جی رہے ہو۔ اس لیے تمہارے ذہن میں اپنی خود مختاری کا اگر کوئی زعم ہے تو وہ ایک غلط فہمی اور نظر کے ایک دھوکے سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ اپنی زندگی کے ایک بہت بڑے حصّے میں تو تم صریح طور پر رعیت ہو اور اپنی محکومی کو خود جانتے ہو۔ اپنی ماؤں کے پیٹوں میں استقرارِ حمل سے لے کر اپنی موت کی آخری ساعت تک تم خدا کے قانونِ طبعی (Law of Nature) سے اس طرح بندھے ہوئے ہو کہ ایک سانس تک اس کے خلاف نہیں لے سکتے، اور تمہارے اُوپر فطرت کی قوتیں اور قوانین اس طرح حاوی ہیں کہ تم جو کچھ کر سکتے ہو اُن کے تحت رہ کر ہی کر سکتے ہو، ایک لمحے کے لیے بھی تمہارا اُن سے آزاد ہو جانا ممکن نہیں ہے۔ اب رہ گیا تمہاری زندگی کا اختیاری حصّہ جس میں تم اپنے اندر ارادے کی آزادی محسوس کرتے ہو اور اپنی پسند کے مطابق انفرادی و اجتماعی عمل کی راہیں انتخاب کرنے کی طاقت پاتے ہو، تو بلاشبہ تمہیں اس حد تک آزادی حاصل ہے، مگر یہ آزادی تمہیں فرمانروائے کائنات کی رعیت ہونے سے خارج نہیں کر دیتی بلکہ صرف یہ اختیار دیتی ہے کہ چاہو تو اطاعت کا رویّہ اختیار کرو جو پیدائشی رعیت ہونے کی حیثیت سے تمہیں اختیار کرنا چاہیے، اور چاہو تو خود مختاری و بغاوت کا رویّہ اختیار کرو جو اپنی فطری حقیقت کے اعتبار سے تمہیں نہ اختیار کرنا چاہیے۔

حق کا بنیادی تصوّر

یہاں سے حق کا سوال پیدا ہوتا ہے اور یہ اوّلین بنیادی حق کا سوال ہے جو تمام چھوٹے

سے چھوٹے جزوی معاملات تک حق اور باطل کے فیصلے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ زندگی کی حقیقت کا جو نظریہ "الکتاب" اور "الرسول" نے پیش کیا ہے اس کو بطور ایک امرِ واقعہ کے تسلیم کر لینے کے بعد یہ بات صریح طور پر حق قرار پا جاتی ہے کہ آدمی اپنی زندگی کے اختیاری حصّہ میں بھی اُسی خدا کی حاکمیت (Sovereignty) تسلیم کرے جو اُس کی زندگی کے پورے غیر اختیاری حصّے کا اور اُس تمام کائنات کا جس میں یہ زندگی بسر ہو رہی ہے، آپ سے آپ حاکم (Sovereign) ہے۔ یہ چیز کئی وجوہ سے حق ہے۔ یہ اس لیے بھی حق ہے کہ انسان جن قوّتوں اور جن جسمانی آلات سے اپنے اختیارات کو استعمال کرتا ہے وہ خدا کا عطیّہ ہیں۔ اِس لیے بھی حق ہے کہ خود یہ اختیارات انسان کے اپنے حاصل کردہ نہیں ہیں بلکہ تفویض کردہ (Delegated) ہیں۔ اس لیے بھی حق ہے کہ جن چیزوں پر یہ اختیارات استعمال کیے جاتے ہیں وہ سب خدا کی مِلک ہیں۔ اس لیے بھی حق ہے کہ جس مُلک میں استعمال کیے جاتے ہیں وہ خدا کا مُلک ہے۔ اور اس لیے بھی حق ہے کہ عالمِ کائنات اور حیاتِ انسانی کی ہمواری و موافقت (Harmony) کا تقاضا یہی ہے کہ ہماری زندگی کے اختیاری اور غیر اختیاری، دونوں حصّوں کا حاکم اور سرچشمۂ احکام ایک ہی ہو۔ اِن دو حصّوں کے دو الگ اور ایک دوسرے سے مختلف فیصلے بن جانے سے ایسا تضاد پیدا ہو جاتا ہے جو موجبِ فساد ہو کر رہتا ہے۔ ایک شخص کی زندگی میں تو اِس چیز کا فساد محدود پیمانے پر ہی ظاہر ہوتا ہے، مگر بڑی بڑی قوموں کی زندگی میں اس کے بُرے نتائج اتنے بڑے پیمانے پر نکلتے ہیں کہ خشکی اور تری اور ہوا فساد سے بھر جاتی ہے۔

"اِسلام" اور "مسلم" کے معنی

"الکتاب" اور "الرسول" انسان کے سامنے اِسی حق کو پیش کرتے ہیں اور اُس کو دعوت دیتے ہیں کہ کسی دباؤ کے بغیر وہ اپنی خوشی سے اِس کو قبول کر لے۔ چونکہ یہ انسانی زندگی کے اُس حصّے کا معاملہ ہے جس میں خدا نے اِنسان کو خود ہی اختیار دیا ہے اس لیے یہ بات کہ انسان اس حصّے میں خدا کو اپنا حاکم مانے، کسی دباؤ سے نہیں منوائی جاتی بلکہ برضا و رغبت تسلیم کرائی جاتی ہے۔ جس کا اطمینان بھی اُس بیانِ واقعہ (Statement of Fact) پہ ہو جائے جو "الکتاب" اور "الرسول" نے کائنات کی حقیقت کے متعلق دیا ہے، اور جس کا ضمیر بھی اِس امر کی گواہی دے کہ اِس

واقعی حقیقت کی موجودگی میں حق وہی ہے جو منطقی نتیجہ کے طور پر اس سے نکلتا ہے، وہ اپنی مرضی سے اپنی آزادی و خود مختاری خدا کی حاکمیت کے آگے تسلیم (Surrender) کر دے۔ اسی تسلیم کا نام "اسلام" ہے۔ اور جو لوگ تسلیم کا یہ فعل کریں وہ "مسلم" کہلاتے ہیں، یعنی ایسے لوگ جنہوں نے خدا کی حاکمیت مان لی، اپنی خود مختاری سے اس کے حق میں دست بردار ہو گئے، اور اس بات کو انہوں نے خود اپنے اوپر لازم کر لیا کہ اپنی زندگی کا نظام خدا کے احکام کے مطابق چلائیں گے۔

مسلم سوسائٹی کی حقیقت

اب ایسے تمام لوگ جنہوں نے تسلیم کا یہ فعل کیا ہو ایک وحدت میں منسلک کیے جاتے ہیں اور ان کے اجتماع سے "مسلم" سوسائٹی کی تشکیل و تنظیم ہوتی ہے۔ یہ سوسائٹی اُن سوسائٹیوں سے بالکل مختلف ہے جو اتفاقی حوادث کے نتیجہ میں بنتی ہیں[1]۔ اس کی تشکیل ایک ارادی فعل سے ہوتی ہے، اور اس کی تنظیم ایک ایسے معاہدے (Contract) کے ذریعہ سے عمل میں آتی ہے جو خدا اور بندوں کے درمیان شعوری طور پر قائم ہوتا ہے۔ اس معاہدے میں بندے یہ تسلیم کرتے ہیں کہ خدا ان کا حاکم ہے، اُسی کی ہدایت اُن کے لیے دستورِ زندگی ہے، اُسی کے احکام اُن کے لیے قانون ہیں، وہ اُسی کو خیر مانیں گے جسے خدا خیر بتائے گا اور اسی کو شر تسلیم کریں گے جسے خدا شر کہے گا۔ صحیح و غلط اور جائز و ناجائز کا معیار وہ خدا ہی سے لیں گے اور اپنی آزادی کو اُن حدود کے اندر محدود رکھیں گے جو خدا اُن کے لیے کھینچ دے گا۔ مختصر یہ کہ اس معاہدے کی بنیاد پر جو سوسائٹی بنتی ہے وہ واضح طور پر یہ اقرار کرتی ہے کہ وہ "اپنے معاملاتِ زندگی میں کیا ہونا چاہیے" کا جواب بطور خود تجویز نہیں کرے گی بلکہ اُس جواب کو قبول کرے گی جو خدا کی طرف سے ملے گا[2]۔

---

[1] یعنی کسی نسل یا ملک میں پیدا ہونا، یا کسی زبان کے بولنے والوں میں پیدا ہونا، یا کسی سیاہ یا زرد یا سفید قوم میں پیدا ہو جانا۔ (جدید)

[2] یہ سوسائٹی چونکہ اتفاقی حوادث پر نہیں بلکہ ارادی عقیدہ و مسلک پر مبنی ہے، اس لیے اس میں ہر ملک، ہر نسل، ہر رنگ اور ہر زبان کے لوگ بلا امتیاز بالکل مساویانہ حقوق کے ساتھ شامل ہو سکتے ہیں، اور یہی چیز اسے ایک عالمگیر سوسائٹی بناتی ہے۔ (جدید)

اس واضح اقرار کی بنیاد پر جب ایک سوسائٹی بن جاتی ہے تو "الکتاب" اور "الرسول" اُسے ایک ضابطۂ زندگی دیتے ہیں جو "شریعت" کہلاتا ہے اور سوسائٹی پر خود اپنے ہی اقرار کی وجہ سے یہ لازم ہو جاتا ہے کہ اپنے معاملاتِ زندگی کو اُس اسکیم کے مطابق چلائے جو اِس شریعت میں تجویز کی گئی ہے۔ تاوقتیکہ کسی شخص کی عقل بالکل ہی خبط نہ ہو گئی ہو، وہ کسی طرح اس بات کو ممکن فرض نہیں کر سکتا کہ کوئی مسلم سوسائٹی اپنے بنیادی معاہدے کو توڑے بغیر شریعت کے سوا کوئی دوسرا ضابطۂ زندگی اختیار کر سکتی ہے۔ دوسرا ضابطہ اختیار کرنے کے ساتھ ہی معاہدہ خود بخود ٹوٹ جاتا ہے اور اُس کے ٹوٹتے ہی وہ سوسائٹی "مسلم" کے بجائے غیر مسلم بن جاتی ہے۔ اتفاقی طور پر کسی شخص کا اپنی زندگی کے کسی معاملہ میں شریعت کی خلاف ورزی کر بیٹھنا اور چیز ہے۔ اس سے معاہدہ ٹوٹتا نہیں ہے بلکہ صرف ایک جرم کا ارتکاب ہوتا ہے۔ لیکن اگر ایک پوری سوسائٹی جان بوجھ کر یہ طے کرے کہ شریعت اب اُس کا ضابطۂ حیات نہیں ہے، اور یہ کہ اپنا ضابطہ اب وہ خود تجویز کرے گی، یا کسی دوسرے ماخذ سے لے گی، تو یقیناً یہ ایک فسخِ معاہدہ کا فعل ہے اور قطعاً کوئی وجہ نہیں کہ ایسی سوسائٹی پر لفظ "مسلم" کا اطلاق درست ہو۔

شریعت کا مقصد اور اُس کے اُصول

اِن بنیادی اُمور کی توضیح کے بعد اب ہمیں اُس سکیم کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے جو انسانی زندگی کے لیے شریعت نے تجویز کی ہے۔ اس غرض کے لیے مناسب ہوگا کہ ہم پہلے اُس کے مقصد اور اُس کے بڑے بڑے اُصولوں کا جائزہ لے لیں۔

اُس کا مقصد انسانی زندگی کے نظام کو معروفات پر قائم کرنا اور مُنکرات سے پاک کرنا ہے۔ معروفات سے مراد وہ نیکیاں، خوبیاں، بھلائیاں ہیں جن کو انسانی فطرت ہمیشہ سے بھلائی کی حیثیت سے جانتی رہی ہے۔ اور مُنکرات سے مراد وہ برائیاں ہیں جن کو ہمیشہ سے انسانیت کا ضمیر بُرا جانتا آیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں معروف فطرتِ انسانی سے مناسبت رکھنے والی چیز ہے اور مُنکر اس کے خلاف ہے۔

وہ ہمارے لیے اُنہی چیزوں کو بھلائی قرار دیتی ہے جو خدا کی بنائی ہوئی فطرت کے مطابق ہیں اور انہی چیزوں کو بُرا قرار دیتی ہے جو اس فطرت سے موافقت نہیں رکھتیں۔ وہ اُن بھلائیوں

کی محض ایک فہرست ہی بنا کر ہمارے حوالہ کر دینے پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ زندگی کی پوری اسکیم ایسے نقشے پر بناتی ہے کہ اس کی بنیادیں معروف بھلائیوں پر قائم ہوں اور معروفات اس میں پروان چڑھ سکیں، اور منکرات کو اس کی تعمیر میں شامل ہونے سے روکا جائے اور نظامِ زندگی میں اُن کے در آنے اور اُن کا زہر پھیلنے کے مواقع باقی نہ رہنے دیئے جائیں۔

اِس غرض کے لیے وہ معروفات کے ساتھ اُن اسباب اور ذرائع کو بھی اپنی اسکیم میں شامل کرتی ہے جن سے وہ قائم ہو سکتے اور پروان چڑھ سکتے ہیں، اور اُن موانع کو ہٹانے کا انتظام بھی تجویز کرتی ہے جو معروفات کے قیام اور نشو و نما میں کسی طور پر سدِّ راہ ہو سکتے ہیں۔ اس طرح اصل معروفات کے ساتھ ان کے وسائلِ قیام و ترقی بھی معروف شمار ہوتے ہیں اور ان کے موانع منکرات کی فہرست میں شامل کر دیئے جاتے ہیں۔ یہی معاملہ منکرات کے ساتھ بھی ہے۔ اصل منکرات کے ساتھ وہ چیزیں بھی منکر قرار پاتی ہیں جو کسی منکر کے وقوع، یا ظہور، یا نشو و نما کا ذریعہ بنیں۔ سوسائٹی کے پورے نظام کو شریعت اِس طرز پر ڈھالتی ہے کہ ایک ایک معروف اپنی پوری صورت میں قائم ہو، زندگی کے تمام متعلق شعبوں میں اُس کا ظہور ہو، ہر طرف سے اس کو قائم ہونے اور پروان چڑھنے میں مدد ملے اور ہر وہ رُکاوٹ دُور کی جائے جو کسی طرح سے اس کی راہ میں حائل ہو سکتی ہو۔ اِسی طرح ایک ایک منکر کو چُن چُن کر زندگی سے نکالا جائے، اس کی پیدائش اور نشو و نما کے اسباب رد کیے جائیں، جدھر جدھر سے وہ زندگی میں گھُس سکتا ہے اس کا راستہ بند کیا جائے اور اگر وہ سر اُٹھا ہی لے تو پھر سختی کے ساتھ اُسے دبا دیا جائے۔

معروفات کو شریعت تین قسموں پر تقسیم کرتی ہے۔ ایک واجب یا فرض۔ دُوسرے مَندُوب یعنی مطلوب۔ تیسرے مُباح یعنی جائز۔

(۱) فرض و واجب وہ معروفات ہیں جو مسلم سوسائٹی پر لازم کیے گئے ہیں۔ ان کے متعلق شریعت صاف صاف اور قطعی احکام دیتی ہے۔

(۲) مطلوب وہ معروفات ہیں جن کو شریعت چاہتی ہے یا پسند کرتی ہے کہ وہ سوسائٹی میں قائم اور جاری ہوں۔ ان میں سے بعض کو صاف الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اور بعض کا اشارہ شارع کے ارشادات سے نکلتا ہے۔ بعض کے قیام و نشو و نما کا بند و بست کیا گیا ہے اور بعض

کی صرف سفارش کی گئی ہے تاکہ سوسائٹی بحیثیت مجموعی یا اس کے صالح لوگ ان کی طرف خود توجہ کریں۔

(۳) رہے مباح معروفات، تو شریعت کی زبان میں ہر وہ چیز اور فعل مباح ہے جس کی ممانعت نہ کی گئی ہو۔ اس تعریف کی بنا پر مباحات صرف وہی نہیں ہیں جن کی اجازت کی تصریح ہو، یا جن کے معاملہ میں ہمیں صاف طور پر اختیار دیا گیا ہو، بلکہ ان کا دائرہ بہت وسیع ہو جاتا ہے، حتٰی کہ چند بیان کردہ ممنوعات کو چھوڑ کر دنیا میں سب کچھ مباح ٹھیرتا ہے۔ یہی مباحات کا دائرہ وہ دائرہ ہے جس میں شریعت نے ہم کو آزادیٔ عمل دی ہے، اور اسی دائرہ میں ہم کو اپنی ضرورتوں کے مطابق قوانین و ضوابط اور طریق کار خود تجویز کر لینے کے اختیارات حاصل ہیں۔

منکرات کو شریعت میں دو قسموں پر تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک حرام یعنی قطعی ممنوع۔ دوسرے مکروہ یعنی ناپسندیدہ۔

حرام وہ ہے جس سے باز رہنا اور اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کو اس سے پاک رکھنا مسلمانوں پر لازم کر دیا گیا ہے، اور شریعت میں اس کے متعلق صاف صاف احکام دے دیئے گئے ہیں۔

رہا مکروہ تو اس کے متعلق شارع کسی نہ کسی طور پر صراحۃً، یا کنایۃً ناپسندیدگی کا اظہار کرتا ہے جس سے باسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کس درجہ میں ناپسندیدہ ہے۔ بعض مکروہات حرام کے قریب ہیں، اور بعض مباح کی سرحد سے ملے ہوئے ہیں، اور بہت سے ان کے درمیانی مراتب پر ہیں۔ بعض کو روکنے اور بند کرنے کا شریعت کے نظام میں بندوبست کیا گیا ہے اور بعض کو ناپسندیدہ بتا کر چھوڑ دیا گیا ہے تاکہ سوسائٹی خود یا اس کے صالح عناصر ان کا سدباب کریں۔

شریعت کی ہمہ گیری

معروف اور منکر کے متعلق یہ احکام ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں میں پھیلے ہوتے ہیں۔ مذہبی عبادات، شخصی کردار، اخلاق اور عادات، کھانا پینا، پہننا اوڑھنا، نشست و برخاست، بات چیت، خاندانی زندگی، معاشرتی تعلقات، معاشی معاملات، ملکی انتظام، شہریت کے حقوق و واجبات، قیام عدل کا نظام، حکومت کے طریقے، صلح و جنگ اور دوسری قوموں کے ساتھ تعلقات، غرض زندگی کا کوئی شعبہ اور پہلو ایسا نہیں رہ گیا ہے جس کے متعلق شریعت

نے ہم پر نیکی اور بدی کے طریقے، بھلائی اور برائی کے راستے، اور پاک و ناپاک کے امتیازات واضح نہ کر دیئے ہوں۔ وہ ہمیں ایک صالح نظام زندگی کا پورا نقشہ دیتی ہے جس میں صاف صاف بتا دیا گیا ہے کہ کیا بھلائیاں ہیں جنہیں ہم کو قائم کرنا، بڑھانا، اور نشو و نما دینا ہے، کیا برائیاں ہیں جن کو دبانا اور مٹانا ہے، کن حدود کے اندر ہماری آزادیٔ عمل کو محدود رہنا چاہیئے اور عملاً ہمیں کون سے طریقے اختیار کرنے چاہئیں جن سے ہماری زندگی میں مطلوبہ بھلائیاں پروان چڑھیں اور برائیوں کا استیصال ہو۔

نظام شریعت کا ناقابلِ تقسیم ہونا

یہ پورا نقشۂ زندگی ایک ہی نقشۂ زندگی ہے اور اس کا ایک مجموعی مزاج ہے جو تقسیم ہو کر قائم نہیں رہ سکتا۔ اس کی وحدت کچھ اسی طرح کی ہے جیسی خود انسان کے وجود کی وحدت ہے۔ آپ جس چیز کو انسان کہتے ہیں وہ آدمی کا سالم وجود ہے نہ کہ انسانی جسم کے الگ الگ کیے ہوئے ٹکڑوں کا مجموعہ۔ ایک کٹی ہوئی ٹانگ کو آپ ۱/۸ انسان یا ۱/۸ انسان نہیں کہہ سکتے۔ نہ یہ کٹی ہوئی ٹانگ ان خدمات میں سے کوئی خدمت انجام دے سکتی ہے جو زندہ اور سالم جسم کا ایک عضو ہونے کی صورت میں وہ انجام دیا کرتی ہے۔ نہ اس ٹانگ کو کسی اور جانور کے جسم میں لگا کر آپ یہ توقع کر سکتے ہیں کہ اس جانور میں ایک ٹانگ کے بقدر انسانیت پیدا ہو جائے گی۔ اسی طرح انسانی جسم کے ہاتھ، پاؤں، آنکھ، ناک وغیرہ اعضاء کو الگ الگ لے کر آپ ان کے حسن یا ان کے فائدے کے متعلق بھی کوئی رائے قائم نہیں کر سکتے جب تک کہ پورے زندہ جسم میں ان کے تناسب اور ان کے عمل کو نہ دیکھیں۔ ٹھیک یہی حال شریعت کے نقشۂ زندگی کا ہے۔ اسلام اس پورے نقشے کا نام ہے نہ کہ اس کے جدا جدا ٹکڑوں کا۔ اس کے اجزاء کو پارہ پارہ کر کے نہ تو ان کے بارے میں جدا گانہ رائے زنی کرنا درست ہو سکتا ہے، نہ مجموعے سے الگ ہو کر اس کا کوئی جز وہ کام کر سکتا ہے جو صرف اپنے مجموعہ ہی میں وہ کر سکتا ہے، نہ اس کے بعض اجزاء کو قائم کر کے آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے آدھا یا چوتھائی اسلام قائم کر دیا ہے، اور نہ کسی دوسرے نظام زندگی میں اس کے کسی جز یا اجزاء کو پیوست کر کے کوئی مفید نتیجہ ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ شارع نے یہ نقشہ اس لیے نہیں بنایا ہے کہ یہ پورے کا پورا ایک ساتھ قائم ہو، نہ اس لیے کہ آپ حسب منشاء اس کے

کسی جز کو جب چاہیں لے کر قائم کر دیں بغیر اس کے کہ دوسرے اجزاء اس کے ساتھ ہوں۔ اس کا ہر جز دوسرے اجزاء کے ساتھ اس طرح جڑا ہوا ہے کہ ان کے ساتھ مل کر ہی کام کر سکتا ہے اور آپ اس کی خوبی کے متعلق صحیح رائے صرف اُسی وقت قائم کر سکتے ہیں جب کہ پورے نظامِ اسلامی کے تناسب اور عمل میں اس کو قائم کرتے ہوئے دیکھیں۔

آج شریعت کے بعض احکام کے متعلق جو غلط فہمیاں لوگوں میں پائی جاتی ہیں ان میں سے اکثر کی وجہ یہی ہے کہ پورے اسلام پر مجموعی نگاہ ڈالے بغیر اس کے کسی ایک جز کو نکال لیا جاتا ہے، اور پھر یا تو اسے موجودہ غیر اسلامی نظامِ زندگی کے اندر رکھ کر رائے قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے یا پھر بجائے خود اسی جز کو ایک مستقل چیز سمجھ کر اُس کے حسن و قبح کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اسلامی قانونِ فوجداری کی بعض دفعات پر آج کے لوگ بہت ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ لیکن انہیں یہ معلوم نہیں ہے کہ جس نقشۂ زندگی میں یہ قانونی دفعات رکھی گئی ہیں اس کے اندر اُن کے ساتھ ایک نظامِ معیشت، ایک نظامِ معاشرت، ایک نظامِ حکومت اور ایک نظامِ تعلیم و تربیت بھی ہے جو اگر ساتھ ساتھ پوری اجتماعی زندگی میں کام نہ کر رہا ہو تو نِری اِن دفعات کو قانون کی کتاب سے نکال کر عدالت کے کمرے میں جاری کر دینا خود اُسی نقشۂ زندگی کے بھی خلاف ہے۔

بلاشبہ اسلامی قانون چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا دیتا ہے۔ مگر یہ حکم ہر سوسائٹی میں جاری ہونے کے لیے نہیں دیا گیا ہے، بلکہ اسے اسلام ہی کی اُس سوسائٹی میں جاری کرنا مقصود تھا جس کے مالداروں سے زکوٰۃ لی جا رہی ہو، جس کا بیت المال ہر حاجت مند کی امداد کے لیے کھلا ہو، جس کی ہر بستی پر مسافروں کی تین دن ضیافت لازم کی گئی ہو، جس کے نظامِ شریعت میں سب لوگوں کے لیے بالکل یکساں حقوق اور برابر کے مواقع ہوں، جس کے معاشی نظام میں طبقوں کی اجارہ داری کے لیے کوئی جگہ نہ ہو اور جائز کسبِ معاش کے دروازے سب کے لیے کھلے ہوں، جس کے نظامِ تعلیم و تربیت نے ملک کے عام افراد میں خدا کا خوف اور اس کی رضا کا شوق پیدا کر دیا ہو، جس کے اخلاقی ماحول میں فیاضی، مصیبت زدوں کی دستگیری، حاجت مندوں کی اعانت اور گرتوں کو سہارا دینے کا عام چرچا ہو، اور جس کے بچے بچے کو یہ سبق دیا گیا ہو کہ تُو

مومن نہیں ہے اگر تیرا ہمسایہ بھوکا ہو اور تو خود پیٹ بھر کر کھانا کھا بیٹھے۔ یہ حکم آپ کی موجودہ سوسائٹی کے لیے نہیں دیا گیا تھا جس میں کوئی شخص کسی کو قرض بھی سُود کے بغیر نہیں دیتا جس میں بیت المال کی جگہ بنک اور انشورنس کمپنی ہے۔ جس میں حاجت مند کے لیے مدد کو بڑھنے والے ہاتھ کی جگہ دُھتکار اور پھٹکار ہے۔ جس کا اخلاقی نقطۂ نظر یہ ہے کہ ایک شخص کی کمائی میں دوسروں کا کوئی حصّہ نہیں بلکہ ہر شخص اپنی کفالت کا خود ذِمّہ دار ہے۔ جس کا معاشرتی نظام بعض خاص طبقوں کو مخصوص امتیازی حقوق دیتا ہے، جس کا معاشی نظام چند خوش نصیب اور چالاک لوگوں کو ہر طرف سے دولت سمیٹ لینے کا موقع دیتا ہے، اور جس کا سیاسی نظام اپنے قوانین کے ذریعہ سے اُن کے مفاد کی حفاظت کرتا ہے۔ ایسی سوسائٹی میں تو چور کا ہاتھ کاٹنا کیا معنی، شاید اکثر حالات میں تو اس کو سرے سے کوئی سزا دینا ہی درست نہیں ہے۔ کیونکہ اس قسم کی ایک سوسائٹی میں چوری کو جُرم قرار دینا دراصل یہ معنی رکھتا ہے کہ خود غرض اور حرام خور لوگوں کے مال کی حفاظت قانون کے پیشِ نظر ہے۔ برعکس اس کے اسلام وہ سوسائٹی پیدا کرتا ہے جس میں کسی شخص کے لیے چوری پر مجبور ہونے کا کوئی موقع نہ رہے، ہر ضرورت مند انسان کی جائز ضروریات پوری کرنے کے لیے لوگ خود ہی رضا کارانہ طور پر آمادہ ہوں، اور حکومت کی طرف سے بھی اُس کی دستگیری کا پورا انتظام ہو۔ پھر جو شخص اس کے باوجود چوری کرے اُس کے لیے اسلامی قانون ہاتھ کاٹنے کی عبرتناک سزا تجویز کرتا ہے، کیونکہ ایسا شخص ایک شریف، عادل اور فیاض سوسائٹی میں رہنے کے قابل نہیں ہے۔

اسی طرح اسلامی قانونِ تعزیرات زنا پر سو کوڑے مارتا ہے اور شادی شدہ زناکار کو سنگسار کر دیتا ہے۔ مگر یہ کس سوسائٹی میں؟ اُس میں جس کے پورے نظامِ تمدن کو شہوت انگیز اسباب سے خالی کیا گیا ہو، جس میں عورتوں اور مردوں کی مخلوط معاشرت نہ ہو، جس میں بنی سنوری عورتوں کا منظرِ عام پر آنا بند ہو، جس میں نکاح کو نہایت آسان کر دیا گیا ہو، جس میں نیکی اور تقویٰ اور پاکیزگیٔ اخلاق کا عام چرچا ہو، اور جس کے ماحول میں خدا کی یاد ہر وقت تازہ ہوتی رہتی ہو۔ یہ حکم اِس گندی سوسائٹی کے لیے نہیں ہے جس میں ہر طرف جنسی جذبات کو بھڑکانے کے اسباب پھیلے ہوتے ہیں، گلی گلی اور گھر گھر فحش گیت بج رہے ہیں، جگہ جگہ فلم اسٹاروں کی تصویریں لٹکی ہوئی

ہیں، شہر شہر اور قصبے قصبے سینما درسِ عشق دے رہے ہیں، نہایت گندہ لٹریچر آزادی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے، بنی سنوری خواتین کھُلے بندوں پھر رہی ہیں، زندگی کے ہر شعبہ میں جنسی اختلاط کے مواقع بڑھ رہے ہیں اور نظامِ معاشرت نے اپنے بیہودہ رواجوں سے نکاح کو بہت مشکل بنا دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی سوسائٹی میں تو زنا کرنے والے کو سزا دینے کے بجائے زنا سے پرہیز کرنے والے کو انعام یا کم از کم خان بہادری کا خطاب ملنا چاہیئے۔

شریعت کا قانونی حصہ

اس بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جدید اصطلاح کے مطابق شریعت کے جس حصّے کو ہم قانون کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں وہ زندگی کی ایک مکمل اور جامع اسکیم کا جُز ہے۔ یہ جُز بجائے خود کوئی مستقل چیز نہیں ہے کہ کُل سے الگ کر کے اسے سمجھا جا سکے یا جاری کیا جا سکے۔ اگر ایسا کیا بھی جائے تو یہ اسلامی قانون کا اجرا نہ ہوگا، نہ اس سے وہ نتائج حاصل ہو سکیں گے جو اسلام کے پیشِ نظر ہیں، اور نہ یہ حرکت خود شارع کے منشا کے مطابق ہوگی۔ شارع کا اصل منشا اپنی پوری اسکیم کو اجتماعی زندگی میں جاری کرنا ہے، اور اُس اسکیم کے مجموعی عمل درآمد ہی میں اسلامی قانون کا اجرا صحیح طور پر ہو سکتا ہے۔

شریعت کی یہ اسکیم عملی لحاظ سے کئی حصّوں پر مشتمل ہے۔ اس کے بعض حصّے ایسے ہیں جن کو نافذ کرنا ہر مومن کا اپنا کام ہے۔ کوئی خارجی طاقت ان کو نافذ نہیں کرا سکتی۔ بعض اور حصّے ایسے ہیں جنھیں اسلام اپنے تزکیۂ نفس اور تربیت اخلاق اور تعلیم و تدریس کے پروگرام سے نافذ کراتا ہے۔ بعض دوسرے حصوں کو جاری کرنے کے لیے وہ رائے عام کی طاقت استعمال کرتا ہے۔ بعض اور حصّوں کو وہ مُسلم سوسائٹی کے اصلاح یافتہ رواجوں کی شکل میں نافذ کرتا ہے۔ اور ان سب کے ساتھ ایک بہت بڑا حصّہ ایسا ہے جسے نافذ کرنے کے لیے وہ تقاضا کرتا ہے کہ مسلم سوسائٹی اپنے اندر سیاسی اقتدار پیدا کرے کیونکہ وہ اقتدار کے بغیر نافذ نہیں ہو سکتا۔ یہ سیاسی اقتدار اس غرض کے لیے درکار ہے کہ شریعت کے تجویز کردہ نظامِ زندگی کی حفاظت کرے، اس کو بگڑنے سے روکے، اس کے منشا کے مطابق بھلائیوں کے نشوونما اور بُرائیوں کے استیصال کا انتظام کرے، اور اس کے اُن احکام کو نافذ کرے جن کی تنفیذ کے لیے ایک نظامِ عدالت کا ہونا ضروری ہے۔

یہی آخری حصّہ وہ چیز ہے جسے ہم اسلامی قانون کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اگرچہ ایک لحاظ سے پوری شریعت ہی قانون ہے، کیونکہ وہ رعیّت پر حاکمِ اعلیٰ کا مقرر کیا ہوا مجموعۂ احکام ہے، لیکن چونکہ اصطلاح میں "قانون" کا اطلاق اُن احکام پر ہوتا ہے جو سیاسی اقتدار کے ذریعہ سے نافذ کیے جائیں، اس لیے ہم شریعت کے صرف اُس حصّے کو "قانونِ اسلام" قرار دیتے ہیں جسے نافذ کرنے کے لیے وہ خود اپنے اصول و مزاج کے مطابق ایک سیاسی اقتدار کی تشکیل چاہتی ہے۔

اِسلامی قانون کے اہم شعبے

(۱) اس سیاسی اقتدار کی تشکیل کے لیے سب سے پہلے ایک دستوری قانون (Constitutive Law) کی ضرورت ہے، اور شریعت نے اس کے تمام ضروری اصول مقرر کر دیئے ہیں۔ ریاست کا اساسی نظریہ کیا ہے؟ اس کے قیام کا مقصد کیا ہے؟ کون لوگ اس کے شہری ہو سکتے ہیں؟ اُن کے حقوق اور واجبات کیا ہیں؟ کس بنیاد پر کسی کو حقوقِ شہریت ملتے اور کس بنا پر وہ سلب ہو سکتے ہیں؟ غیر مسلم شہریوں (ذمیوں) کے حقوق و واجبات کیا ہیں؟ ریاست کے قانونی اختیارات کا ماخذ کیا ہے؟ حکومت کا انتظام کن اصولوں پر چلایا جائے گا؟ انتظامی اختیارات کس کے سپرد کیے جائیں گے؟ اُس کا تقرر کون کرے گا؟ کس کے سامنے وہ جواب دہ ہوگا اور کن حدود کے اندر وہ کام کرے گا؟ قانون سازی کے اختیارات کس کو کس حد تک حاصل ہوں گے؟ عدالت کے حقوق و فرائض کیا ہوں گے؟ دستوری قانون کے اِن تمام بنیادی مسائل کا واضح جواب شریعت نے ہم کو دے دیا ہے۔ پھر اِن اصولوں کو صاف صاف متعین کرنے کے بعد وہ ہمیں آزاد چھوڑ دیتی ہے کہ دستور کی تفصیلی شکل و صورت ہم خود اپنے حالات اور ضروریات کے مطابق بنالیں۔ ہم اس امر کے پابند تو ضرور کیے گئے ہیں کہ اپنی ریاست کے دستور میں شریعت کے مقرر کیے ہوئے اِن اصولوں پر قائم رہیں، لیکن کوئی مفصل دستور ہر زمانے کے لیے ہم کو بنا کر نہیں دے دیا گیا ہے جس کے اندر فرعی ردّوبدل بھی جائز نہ ہو۔

(۲) تشکیل کے بعد اسلامی ریاست کو اپنا نظام چلانے کے لیے ایک انتظامی قانون (Administrative Law) کی ضرورت ہے۔ اس کے بھی تمام بنیادی اصول شریعت نے واضح کر دیئے ہیں، اور مزید برآں اس معاملے میں ہماری رہنمائی کے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور

خلفائے راشدین کی مثالی حکومت کے نظائر بھی موجود ہیں۔ ایک اسلامی ریاست اپنی آمدنی کے لیے کس قسم کے ذرائع اختیار کرسکتی ہے اور کس قسم کے ذرائع اختیار نہیں کرسکتی؟ حکومت کے معاملات میں کس قسم کے تصرفات درست ہیں اور کس قسم کے نادرست؟ فوج، پولیس، عدالت اور نظم ونسق کے مختلف شعبوں میں حکومت کا رویہ کیا ہونا چاہیے؟ باشندوں کی اخلاقی اور مادی فلاح کے لیے حکومت پر کیا فرائض عاید ہوتے ہیں؟ کون سی بھلائیاں ہیں جنھیں قائم کرنے اور فروغ دینے کے لیے اسے کوشش کرنی چاہیے اور کون سی برائیاں ہیں، جنھیں روکنا اور دبانا اس کے فرائض میں سے ہے؟ باشندگان ملک کے معاملات زندگی میں حکومت کس حد تک دخل انداز ہونے کی مجاز ہے؟ ان امور میں شریعت ہم کو محض اصولی ہدایات ہی نہیں دیتی بلکہ خاص مسائل کے متعلق قطعی اور صریح احکام بھی دیتی ہے۔ لیکن پورے نظم ونسق کے متعلق اس نے کوئی تفصیلی ضابطہ بنا کر ہمیں نہیں دے دیا ہے جسے ایک ہی شکل وصورت پر ہمیشہ اور ہر زمانے میں قائم رکھنے پر ہم مامور ہوں اور جس میں کسی قسم کا تغیر وتبدل کرنے کی ہمیں اجازت نہ ہو۔ دستوری قانون کی طرح انتظامی قانون میں بھی تفصیلی ضوابط بنانے کی پوری آزادی ہمیں حاصل ہے، البتہ اس آزادی کو ہم اُن اصول اور حدود کے اندر ہی استعمال کرسکتے ہیں جو شریعت نے مقرر کردیئے ہیں۔

(۴) اس کے بعد ملکی قانون (Public Law) اور شخصی قانون (Personal Law) کے وہ ابواب آتے ہیں جو معاشرے میں امن اور انصاف قائم کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ ان ابواب میں شریعت اتنے وسیع پیمانے پر ہمیں تفصیلی احکام اور اصولی ہدایات دیتی ہے کہ کسی دَور میں اور معاملاتِ زندگی کے کسی گوشے میں بھی ہم کو اپنی قانونی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے شرعی حدود سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہیں آسکتی۔ جو تفصیلی احکام اس نے دیئے ہیں وہ اب تک ہر ملک اور ہر دَور کی سوسائٹی میں یکساں صحت کے ساتھ جاری ہوسکتے ہیں (بشرطیکہ زندگی کا وہ مجموعی نظام بھی، جس میں آپ ان احکام کو جاری کریں، اسلام کی ہدایت پر چل رہا ہو) اور جو اصولی ہدایات اس نے دی ہیں وہ اس قدر جامع ہیں کہ قریب قریب اکثر معاملاتِ زندگی میں تمام ضروری قوانین ان کی روشنی میں بنائے جاسکتے ہیں۔ پھر جن معاملات میں شریعت کسی قسم

کے احکام اور ہدایات نہیں دیتی، اُن میں خود شریعت ہی کی رُو سے اسلامی ریاست کے اہل الرائے اور اصحاب حل و عقد باہمی مشورے سے قوانین بنانے کے مجاز ہیں۔ اور اس طرح جو قوانین بنائے جائیں گے وہ قانونِ اسلام ہی کا ایک جز شمار ہوں گے، کیوں کہ وہ شریعت کی دی ہوئی اجازت کے تحت بنائے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ہمارے فقہائے استحسان اور مصالح مُرسلہ وغیرہ عنوانات کے تحت جو احکام مدون کیے تھے وہ قانونِ اسلام ہی کے اجزاء سمجھے گئے۔

(۴) سب سے آخر میں قانون کا ایک شعبہ وہ بھی ہے جس کی ایک ریاست کو اپنے بین الاقوامی تعلقات کے لیے ضرورت پیش آتی ہے۔ اس باب میں شریعت نے جنگ اور صلح اور غیر جانبداری کی مختلف حالتوں کے متعلق اسلامی ریاست کا برتاؤ متعین کرنے کے لیے بہت تفصیلی ہدایات دی ہیں اور جہاں تفصیلات نہیں دیں وہاں ایسے اصول دے دیئے ہیں جن کی روشنی میں تفصیلات مرتب کی جاسکتی ہیں۔

اسلامی قانون کا استقلال اور اس کی ترقی پذیری

اس مختصر تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ علمِ قانون کے جتنے شعبوں پر انسانی تصور آج تک پھیل سکا ہے، ان میں سے کوئی شعبہ بھی ایسا نہیں ہے جس میں شریعت نے ہماری رہنمائی نہ کی ہو۔ یہ رہنمائی کس کس شکل میں کی گئی ہے، اس کا اگر تفصیلی جائزہ لے کر دیکھا جائے تو یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ اسلامی قانون میں کیا چیز قطعی اور مستقل ہے اور اس کے ایسا ہونے کا فائدہ کیا ہے، اور کون سی چیز ابد تک ترقی پذیر ہے اور وہ کس طریقے سے ہر دور میں ہماری بڑھتی ہوئی تمدنی ضروریات کو پورا کر سکتی ہے۔

اس قانون میں جو چیز اٹل ہے وہ تین اجزاء پر مشتمل ہے:۔

۱۔ قطعی اور صریح احکام جو قرآن یا ثابت شدہ احادیث میں دیئے گئے ہیں، مثلاً شراب اور سود اور قمار کی حرمت، چوری اور زنا اور قذف کی سزائیں اور میت کے ترکہ میں وارثوں کے حصے۔

۲۔ اصولی احکام جو قرآن یا ثابت شدہ احادیث میں بیان ہوتے ہیں، مثلاً یہ کہ ہر نشہ آور چیز حرام

ہے، یا یہ کہ لین دین کے جن طریقوں میں منافع کا تبادلہ آپس کی رضامندی سے نہ ہو وہ باطل ہیں، یا یہ کہ مرد عورتوں پر قوّام ہیں۔

۲۔ حدود جو قرآن و سنّت میں اس غرض کے لیے مقرر کی گئی ہیں کہ ہم اپنی آزادیٔ عمل کو ان کے اندر محدود رکھیں اور کسی حال میں ان سے تجاوز نہ کریں، مثلاً تعدّدِ ازدواج کیلیے بیک وقت چار عورتوں کی حد، یا طلاق کے لیے تین کی حد، یا وصیت کے لیے ایک تہائی مال کی حد۔

اسلامی قانون کا یہ اٹل اور قطعی واجب الاطاعت حصّہ ہی دراصل وہ چیز ہے جو اسلامی تہذیب و تمدّن کے حدود اربعہ اور اس کی مخصوص امتیازی شکل و صورت معیّن کرتا ہے۔ آپ کسی ایسی تہذیب کی نشاندہی نہیں کر سکتے جو اپنے اندر ایک ناقابلِ تغیّر و تبدل عنصر رکھے بغیر اپنی ہستی اور اپنی انفرادیت کو برقرار رکھ سکے۔ اگر کسی تہذیب میں ایسا کوئی عنصر بھی نہ ہو اور سبھی کچھ قابلِ ترمیم و تنسیخ ہو تو فی الحقیقت وہ سرے سے کوئی مستقل تہذیب ہی نہیں ہے۔ وہ تو ایک پگھلا ہوا مادہ ہے جو ہر سانچے میں ڈھل سکتا ہے اور ہر وقت اپنی شکل بدل سکتا ہے۔

علاوہ بریں ان احکام اور اصول اور حدود کا تفصیلی مطالعہ کرنے سے ہر معقول آدمی اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ شریعت نے حکم جہاں بھی دیا ہے ایسے موقع پر دیا ہے جہاں انسانی قوتِ فیصلہ غلطی کرکے "معروف" سے ہٹ سکتی ہے۔ ایسے تمام مواقع پر شریعت صاف حکم دے کر یا امر کیا منع کر کے یا اصول بتا کر، یا حد لگا کر گویا نشانات (Sign Posts) کھڑے کر دیتی ہے تاکہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ صحیح راستہ کس طرف ہے۔ یہ نشانات ہماری رفتارِ ترقی کو روکنے والے نہیں ہیں بلکہ ہمیں سیدھی راہ پر لگانے اور ہمارے سفرِ زندگی کو بے راہ روی سے بچانے کے لیے ہیں۔ ان مستقل قوانین کا ایک معتد بہ حصّہ ایسا ہے جن پر کل تک دنیا اعتراض کر رہی تھی، مگر ہمارے دیکھتے دیکھتے تجربات اور تلخ تجربات نے کل کے معترضین کو آج معترف بنا دیا ہے اور انہی قوانین کی خوشہ چینی پر وہ مجبور ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پر میں صرف اسلام کے قانونِ ازدواج اور قانونِ میراث کی طرف اشارہ کافی سمجھتا ہوں۔

اس پائدار اور اٹل عنصر کے ساتھ ایک دوسرا عنصر ایسا ہے جو اسلامی قانون میں بے اندازہ وسعت پیدا کرتا ہے اور اسے زمانہ کے تمام بدلتے ہوئے حالات میں ترقی پذیر بناتا ہے۔ یہ

عنصر کئی اقسام پر مشتمل ہے۔

۱۔ تعبیر یا تاویلِ احکام، یعنی کوئی حکم جن الفاظ میں دیا گیا ہو ان کا مفہوم سمجھنے اور ان کا منشا متعین کرنے کی کوشش کرنا۔ یہ فقہ اسلامی کا ایک بہت ہی وسیع باب ہے۔ قانونی دماغ اور نکتہ رس نگاہیں رکھنے والے لوگ جب کتاب و سنت میں غور و خوض کرتے ہیں تو وہ شریعت کے صریح احکام میں بھی مختلف تعبیرات کی گنجائش پاتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنے فہم و بصیرت کے مطابق کسی ایک تعبیر کو بدلائل دوسری تعبیروں پر ترجیح دیتا ہے۔ یہ اختلافِ تعبیر پہلے بھی اُمت کے اہلِ علم میں رہا ہے، آج بھی ہو سکتا ہے اور آئندہ بھی یہ دروازہ کھلا رہے گا۔

۲۔ قیاس، یعنی جس معاملہ میں کوئی صاف حکم نہ ملتا ہو اُس پر کسی ایسے حکم کو جاری کرنا جو اس سے ملتے جلتے کسی معاملہ میں دیا گیا ہو۔

۳۔ اجتہاد، یعنی شریعت کے اصولی احکام اور جامع ہدایات کو سمجھ کر ایسے معاملات پر اُن کو منطبق کرنا جن میں نظائر بھی نہ ملتے ہوں۔

۴۔ استحسان، یعنی مباحات کے غیر محدود دائرے میں حسبِ ضرورت ایسے قوانین اور ضوابط وضع کرنا جو اسلام کے مجموعی نظام کی روح سے زیادہ سے زیادہ مطابقت رکھتے ہوں۔

یہ چاروں چیزیں ایسی ہیں جن کے امکانات پر اگر کوئی شخص غور کرے تو وہ کبھی اس شبہ میں نہیں پڑ سکتا کہ اسلامی قانون کا دامن کسی وقت بھی انسانی تمدن کی روز افزوں ضروریات اور متغیر حالات کے لیے تنگ ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ یاد رکھئے کہ اجتہاد و استحسان ہو یا تعبیر و قیاس، بہرحال اِس کا مجاز ہر کس و ناکس نہیں ہو سکتا۔ آپ ہر راہ رو کا یہ حق تسلیم نہیں کر سکتے کہ وہ موجودہ ملکی قانون کے کسی مسئلہ پر فیصلہ صادر کر دے۔ اس کے لیے قانونی تعلیم اور ذہنی تربیت کا ایک خاص معیار آپ کے نزدیک بھی ناگزیر ہے جس پر پورا اُترے بغیر کوئی شخص ماہرانہ رائے زنی کا اہل نہیں مانا جا سکتا۔ اسی طرح اسلامی قانون کے مسائل پر بھی رائے زنی کا حق صرف ان ہی لوگوں کو دیا جا سکتا ہے جنہوں نے اس کی ضروری اہلیت بہم پہنچائی ہو۔ تعبیرِ احکام کے لیے ضروری

ہے کہ آدمی اُس زبان کی نزاکتوں سے واقف ہو جس میں احکام دیئے گئے ہیں، اُن حالات سے واقف ہو جن میں ابتداءً یہ احکام دیئے گئے تھے، قرآن کے اندازِ بیان کو اچھی طرح سمجھتا ہو اور حدیث کے ذخیرہ پر وسیع نگاہ رکھتا ہو۔ قیاس کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اتنی لطیف قانونی حِس رکھتا ہو کہ ایک معاملہ کو دوسرے معاملہ پر قیاس کرتے ہوتے ان کی باہمی مماثلت کے پہلوؤں کو ٹھیک ٹھیک سمجھ سکے، ورنہ ایک کا حکم دوسرے پر منطبق کرنے میں وہ غلطی سے نہیں بچ سکتا۔ اجتہاد کے لیے شریعت کے احکام میں گہری بصیرت اور معاملاتِ زندگی کا عمدہ فہم —— محض عام فہم ہی نہیں بلکہ اِسلامی نقطۂ نظر سے فہم —— درکار ہے۔ استحسان کے لیے بھی ناگزیر ہے کہ آدمی اسلام کے مزاج اور اس کے نظامِ زندگی کو اچھی طرح سمجھتا ہو تاکہ مباحات کے دائرے میں جو قوانین اور ضوابط وہ تجویز کرے وہ اس نظامِ زندگی کے مجموعہ میں صحیح طور پر جذب ہو سکیں۔ اِن علمی اور ذہنی صلاحیتوں سے بڑھ کر ایک اور چیز بھی درکار ہے جس کے بغیر اسلامی قانون کا ارتقاء کبھی صحیح خطوط پر نہیں ہو سکتا، اور وہ یہ ہے کہ جو لوگ اِس کام کو انجام دیں ان کے اندر اسلام کی پیروی کا ارادہ اور خدا کے سامنے اپنی جوابدہی کا احساس موجود ہو۔ یقیناً یہ کام ان لوگوں کے کرنے کا نہیں ہے جو خدا اور آخرت سے بے پروا ہو کر محض دنیوی مصلحتوں پر نگاہ جما چکے ہوں اور اسلامی قدروں کو چھوڑ کر کسی دوسری تہذیب کی قدریں پسند کر چکے ہوں۔ ایسے لوگوں کے ہاتھوں اِسلامی قانون کا ارتقاء نہیں ہو سکتا، صرف اس میں تحریف ہی ہو سکتی ہے۔

اعتراضات اور جوابات

اب مَیں مختصر طور پر اُن اعتراضات سے بحث کروں گا جو پاکستان میں اِسلامی قانون کے اجراء کے مطالبہ پر بالعموم کیے جاتے ہیں۔ یہ اعتراضات بظاہر تو بہت سے ہیں اس لیے کہ ان کے بیان کرنے میں الفاظ کی فضول خرچی دل کھول کر کی جاتی ہے لیکن سب کا تجزیہ کرنے سے اصل اعتراض صرف چار نکلتے ہیں۔

۱۔ تہمت بوسیدگی

پہلا اعتراض یہ ہے کہ صدیوں کا پُرانا قانون جدید زمانے کی ایک سوسائٹی اور سٹیٹ کی ضروریات کے لیے کس طرح کافی ہو سکتا ہے؟

جن حضرات کی طرف سے یہ اعتراض پیش کیا جاتا ہے، مجھے شبہ ہے کہ وہ اسلامی قانون کے متعلق ابتدائی اور سرسری واقفیت بھی رکھتے ہیں یا نہیں۔ غالباً انہوں نے کہیں سے بس یہ اُڑتی اُڑتی خبر سُن لی ہے کہ اس قانون کے بنیادی احکام اور اصول ساڑھے تیرہ سو برس پہلے بیان ہوئے تھے۔ اس کے بعد یہ بات انہوں نے بطور خود فرض کر لی کہ اُس وقت سے یہ قانون جُوں کا توں اُسی حالت میں رکھا ہوا ہے۔ اِسی بنا پر انہیں یہ اندیشہ لاحق ہو گیا کہ اگر آج ایک جدید ریاست اسے اپنا ملکی قانون بنائے تو وہ اس کی وسیع ضروریات کے لیے کیسے کافی ہو سکے گا۔ ان لوگوں کو یہ معلوم نہیں ہے کہ جو بنیادی احکام و اصول ساڑھے تیرہ سو برس پہلے دیئے گئے تھے اُن پر اُسی وقت ایک ریاست قائم ہو گئی تھی اور روز مرہ پیش آنے والے معاملات میں تعبیر و قیاس اور اجتہاد و استحسان کے ذریعہ سے اس قانون کا ارتقاء اوّل روز ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ پھر اسلامی اقتدار وسیع ہو کر بحرالکاہل سے بحر اوقیانوس تک آدھی سے زیادہ مہذب دنیا میں پھیل گیا اور جتنی ریاستیں بھی بعد کے بارہ سو سال میں مسلمانوں نے قائم کیں اُن سب کا پورا نظم و نسق اسی قانون پر چلتا رہا۔ ہر دور اور ہر مُلک کے حالات و ضروریات کے مطابق اِس قانون میں مسلسل توسیع ہوتی رہی ہے۔ انیسویں صدی کی ابتدا تک اِس ارتقا کا سلسلہ ایک دن کے لیے بھی نہیں رُکا ہے۔ خود آپ کے اِس ملک میں بھی انیسویں صدی کے اوائل تک اِسلام ہی کا دیوانی اور فوجداری قانون جاری رہا ہے۔ اب زیادہ سے زیادہ صرف سَو سال کا وقفہ ایسا رہ جاتا ہے جس کے متعلق آپ کہہ سکتے ہیں کہ اِس زمانہ میں اسلامی قانون پر عمل درآمد بند رہا اور اس کا ارتقاء رُکا رہا۔ لیکن اوّل تو یہ وقفہ کچھ اتنا زیادہ بڑا نہیں ہے کہ ہم تھوڑی سی محنت و کاوش سے اُس کے نقصان کی تلافی نہ کر سکیں۔ دوسرے ہمارے پاس ہر صدی کی فقہی ترقیات کا پُورا ریکارڈ موجود ہے جسے دیکھ کر ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ ہمارے اسلاف پہلے کتنا کام کر چکے ہیں اور آگے ہمیں کیا کام کرنا ہے۔ پھر جن بنیادوں پر اسلامی قانون کا

ارتقاء ہوتا ہے انہیں دیکھتے ہوئے کوئی صاحبِ علم آدمی اس امر میں شک نہیں کرسکتا جس طرح پچھلی بارہ صدیوں میں یہ قانون ہر دَور اور ہر ملک کی ضروریات کے مطابق وسیع ہوتا رہا ہے اسی طرح موجودہ صدی میں بھی ہوسکتا ہے اور آئندہ صدیوں میں بھی ہوتا رہے گا۔ ناواقف لوگ اس کو جانے بغیر ہزار قسم کے وسوسوں میں پڑ سکتے ہیں۔ مگر جو لوگ اس کو جانتے ہیں، اس کے امکانات سے واقف ہیں، اور اس کی تاریخ پر نظر رکھتے ہیں، انہیں ایک لمحہ کے لیے بھی اس پر تنگ دامنی کا شبہ نہیں ہوسکتا۔

۲۔ الزامِ وحشت

دوسرا اعتراض، جو پبلک میں تو دبی زبان سے مگر نجی صحبتوں میں بڑی کافرانہ جسارتوں کے ساتھ کیا جاتا ہے، یہ ہے کہ اسلامی قانون میں بہت سی چیزیں قرونِ وسطیٰ کی تاریک خیالی کے باقیات میں سے ہیں جنہیں اس مہذب دَور کے ترقی یافتہ اخلاقی تصورات کسی طرح برداشت نہیں کرسکتے۔ مثلاً ہاتھ کاٹنے اور دُرّے مارنے اور سنگسار کرنے کی وحشیانہ سزائیں۔

یہ اعتراض سُن کر بے اختیار ان حضرات سے یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ ؎

اِتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ

جس دَور میں ایٹم بم استعمال کیا گیا ہے، اس کے اخلاقی تصورات کو ترقی یافتہ کہتے وقت آدمی کو کچھ تو شرم محسوس ہونی چاہیئے۔ آج کا نام نہاد مہذب انسان دوسرے انسانوں کے ساتھ جو سلوک کر رہا ہے اس کی مثال تو قدیم تاریخ کے کسی تاریک دَور میں بھی نہیں ملتی۔ وہ سنگسار نہیں بم بار کرتا ہے۔ محض ہاتھ ہی نہیں کاٹتا جسم کے پرخچے اڑا دیتا ہے۔ دُرّے برسانے سے اس کا دل نہیں بھرتا، زندہ آگ میں جلاتا ہے اور مُردہ لاشوں کی چربی نکال کر ان کے صابن بناتا ہے۔ جنگ کے ہنگامۂ غیظ و غضب ہی میں نہیں، امن کے ٹھنڈے ماحول میں بھی جن کو سیاسی مجرم یا جاسوس، یا خفیہ سازش کا مرتکب، یا قومی مفاد کا دشمن، یا معاشی اغراض کا حریف سمجھتا ہے ان کو درد ناک عذاب دینے میں وہ آخر کون سی کسر اٹھا رکھتا ہے۔ ثبوتِ جرم سے پہلے محض شبہ ہی شبہ میں تفتیش کے جو طریقے اور اقبالِ جرم کرانے کے جو ہتھکنڈے آج کی

مہذب حکومتوں میں اختیار کیے جارہے ہیں وہ کس سے چھپے ہوئے ہیں۔ ان ساری باتوں کی موجودگی میں یہ دعویٰ تو کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ آج کے نام نہاد ترقی یافتہ تصورات انسان کو انسان کے ہاتھوں عذاب پاتے ہوئے دیکھنا سرے سے گوارا ہی نہیں کرتے۔ گوارا تو وہ کر رہے ہیں اور پہلے سے زیادہ سخت عذابوں کو گوارا کر رہے ہیں۔ البتہ فرق جو کچھ واقع ہوا ہے وہ دراصل اخلاقی قدروں میں ہوا ہے۔ ان کے نزدیک جو جرائم واقعی سخت ہیں ان پر تو وہ خوب عذاب دیتے ہیں اور دل کھول کر دیتے ہیں، مثلاً ان کے سیاسی اقتدار کو چیلنج کرنا، یا ان کے معاشی مفاد میں مزاحم ہونا۔ لیکن جن افعال کو وہ سرے سے جرم ہی نہیں سمجھتے، مثلاً شراب سے ایک گونہ بے خودی حاصل کر لینا، یا تفریحاً زنا کر لینا، ان پر عذاب تو درکنار، سرزنش اور ملامت بھی انہیں ناگوار ہوتی ہے اور جرم نہ سمجھنے کی صورت میں لامحالہ وہ ناگوار خاطر ہوتی ہی چاہیئے۔

اب میں ان معترضین سے پوچھتا ہوں کہ آپ کن اخلاقی قدروں کے قائل ہیں؟ اسلام کی اخلاقی قدریں؟ یا موجودہ تہذیب کی؟ اگر آپ کی قدریں بدل چکی ہیں، اگر حلال و حرام اور خطا و صواب اور نیکی و بدی کے وہ معیار آپ چھوڑ چکے ہیں جو اسلام نے مقرر کیے تھے اور دوسرے معیار آپ نے دل سے قبول کر لیے ہیں، تو پھر اسلام کے دائرے میں آپ کی جگہ ہے کہاں کہ آپ اس کے قوانین میں ترمیم کی گفتگو چھیڑیں۔ آپ کا مقام اندر نہیں باہر ہے۔ اپنی ملت الگ بنایئے، کوئی اور نام اپنے لیے تجویز کیجیے، اور صاف صاف کہیے کہ ہم اسلام کو بحیثیت دین کے رد کرتے ہیں۔ جس خدا کی مقرر کی ہوئی سزاؤں کو آپ وحشیانہ سمجھتے ہیں اس پر ایمان لانے کا آخر کس احمق نے آپ کو مشورہ دیا ہے اور کون احمق یہ باور کر سکتا ہے کہ اُس کی بات کو وحشیانہ کہنے کے بعد بھی آپ اُس کے مومن ہیں۔

۳۔ فقہی اختلافات کا بہانہ

تیسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اسلام میں بہت سے فرقے ہیں اور ہر فرقے کی فقہ جدا ہے۔ اب اگر یہاں اسلامی قانون جاری کرنے کا فیصلہ کیا جائے تو آخر وہ کس فرقے کی فقہ کے مطابق ہوگا۔

یہ وہ اعتراض ہے جس پر اسلامی قانون کے مخالفین بڑی اُمیدیں لگائے بیٹھے ہیں۔ وہ توقع رکھتے ہیں کہ آخر کار اِسی سوال پر مسلمانوں میں پھوٹ ڈال کر وہ اسلام کے "خطرے" کو ٹال سکیں گے۔ خود مسلمانوں میں وہ لوگ جو حقیقت سے پوری طرح واقف نہیں اس سوال پر اکثر پریشان ہو جاتے ہیں کہ اس پیچیدگی کو آخر کیسے حل کیا جائے گا۔ حالانکہ درحقیقت یہ سرے سے کوئی پیچیدگی ہے ہی نہیں اور پچھلی بارہ صدیوں میں اس مسئلے نے کبھی اور کہیں اِسلامی قانون کے نفاذ کو نہیں روکا ہے۔

سب سے پہلے یہ سمجھ لیجیے کہ اسلامی قانون کا بنیادی ڈھانچہ جو خدا اور رسولؐ کے مقرر کیے ہوئے قطعی احکام اور اصول اور حدود پر مشتمل ہے، مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں ابتداء سے آج تک یکساں مسلّم رہا ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہ پہلے تھا، نہ اب پایا جاتا ہے۔ فقہی اختلافات جتنے بھی ہوئے ہیں، تعبیرات میں، قیاسی و اجتہادی مسائل میں، اور دائرۂ اباحت کے قوانین و ضوابط میں ہوئے ہیں۔

پھر ان اختلافات کی حقیقت بھی یہ ہے کہ کسی حکم کی کوئی تعبیر جو کسی عالم نے کی ہو، یا کوئی مسئلہ جو قیاس و اجتہاد سے کسی امام نے نکالا ہو، یا کوئی فتویٰ جو استحسان کی بنا پر کسی مجتہد نے دیا ہو، بجائے خود قانون نہیں بن جاتا۔ دراصل اس کی حیثیت محض ایک تجویز کی ہوتی ہے۔ قانون وہ صرف اُسی وقت بنتا ہے جب کہ اُس پر اجماع (اتفاق رائے) ہو جائے یا جمہور (اکثریت) اس کو تسلیم کر لیں اور فتویٰ اسی پر جاری ہو جائے۔ ہمارے فقہاء جب اپنی کتابوں میں کسی مسئلے کو بیان کرنے کے بعد لکھا کرتے ہیں کہ علیہ الاجماع یا علیہ الجمہور اور علیہ الفتویٰ، تو اس سے ان کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس مسئلے کے متعلق یہ رائے اب محض رائے یا تجویز نہیں رہی ہے بلکہ اتفاق رائے یا جمہوری فیصلے کی بنا پر اب قانون بن چکی ہے۔

یہ اجماعی اور جمہوری فیصلے بھی دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جن پر تمام اُمت کا ہمیشہ اجماع رہا ہے یا دنیائے اسلام کی اکثریت نے جن کو قبول کر لیا ہے۔ دوسرے وہ جن پر کسی وقت کسی ملک کے مسلمانوں کا اجماع ہو جائے یا ان کی اکثریت انہیں قبول کر لے۔

پہلی قسم کے فیصلے اگر اجماعی ہوں تو وہ نظر ثانی کے قابل نہیں ہیں۔ انہیں تمام مسلمانوں کو

بحیثیت ایک قانون کے قبول کرنا ہوگا۔ اور اگر وہ جمہوری فیصلے ہوں تو ان کے متعلق یہ دیکھنا ہوگا کہ ہم جس ملک میں اسلامی قانون جاری کر رہے ہیں، اس کی اکثریت بھی انہیں تسلیم کرتی ہے یا نہیں؟ اگر اکثریت انہیں تسلیم کرتی ہو تو وہ ملک کا قانون قرار پائیں گے۔

یہ حیثیت تو پچھلے فقہی احکام کی ہے۔ رہا آئندہ کا معاملہ، تو آگے آنے والے معاملات میں حکم خدا اور رسولؐ کی جس تعبیر، یا جس قیاس و اجتہاد اور جس استحسان پر ہمارے ملک کے اصحاب حل و عقد کا اجماع ہو جائے گا، یا ان کی اکثریت اس کو اختیار کرے گی وہ ہمارے ملک کے لیے قانون ہوگا۔ پہلے بھی ہر مسلمان ملک کا قانون ایسے ہی فتاویٰ پر مشتمل ہوتا تھا جو ملک کی تمام یا اکثر آبادی کے نزدیک مسلّم ہوتے تھے۔ اور آج بھی صرف یہی ایک صورت قابلِ عمل ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ جمہوریت کے اصول پر اس کے سوا اور کون سی صورت تجویز کی جا سکتی ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ مسلمانوں کے جو گروہ اکثریت کے ساتھ متفق نہ ہوں گے ان کی پوزیشن کیا ہوگی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسے قلیل التعداد گروہ پرسنل لا کی حد تک اپنی فقہ کو اپنے معاملات میں جاری کرنے کا مطالبہ کر سکتے ہیں اور یہ حق ان کو ضرور ملنا چاہیے۔ لیکن قانونِ ملکی (Law of the Land) بہر حال وہی ہوگا اور وہی ہو سکتا ہے جو اکثریت کے مسلک پر مبنی ہو۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ آج مسلمانوں کا کوئی فرقہ بھی یہ غیر معقول بات کہنے کے لیے تیار نہ ہوگا کہ چونکہ اسلامی قانون میں ہم متفق نہیں ہیں اس لیے یہاں کفر کا قانون جاری ہونا چاہیے۔ اسلام میں اختلاف کر کے سب مسلمانوں کا کفر پر متفق ہو جانا ایک ایسی بیہودہ بات ہے جو چند کفر پسند افراد کو چاہے کتنی ہی پسند ہو، بہر حال کسی فرقے کا مسلمان بھی اسے اپنے دل میں جگہ دینے کے لیے آمادہ نہیں ہو سکتا۔

۴۔ غیر مسلم اقلیتوں کا مسئلہ

آخری اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس ملک میں صرف مسلمان ہی نہیں رہتے غیر مسلم بھی آباد ہیں، وہ کس طرح یہ گوارا کرلیں گے کہ مسلمانوں کا مذہبی قانون ان پر مسلط ہو جائے؟

یہ اعتراض جو لوگ پیش کرتے ہیں وہ دراصل اس مسئلہ پر ایک سطحی نگاہ ڈالتے ہیں۔ انہوں نے پوری طرح سے اس کا تجزیہ نہیں کیا ہے۔ اسی لیے ان کو اس میں بڑی پیچیدگی نظر آتی ہے۔

حالانکہ تھوڑی سی تحلیل کرنے کے بعد اس کی ساری الجھنیں خود ہی سلجھتی چلی جاتی ہیں۔

ظاہر بات ہے کہ ہم جس قانون پر بحث کر رہے ہیں وہ قانونِ ملکی ہے نہ کہ قانونِ شخصی۔ جہاں تک شخصی معاملات کا تعلق ہے، ان کے بارے میں تو یہ مسلّم ہے کہ ہر گروہ پر اس کا اپنا قانون ہی جاری ہوگا۔ یہ حق دنیا میں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ فیاضی کے ساتھ اسلام نے اہل الذمہ کو دیا تھا، بلکہ درحقیقت وہ اسلام ہی ہے جس سے موجودہ دور کے اہلِ قانون نے ملکی قانون اور شخصی قانون کا فرق سیکھا ہے اور یہ اصول معلوم کیا ہے کہ جس ریاست کی آبادی مختلف المذہب لوگوں پر مشتمل ہو اس میں سب گروہوں کے شخصی معاملات ان کے شخصی قوانین ہی کے تحت ہونے چاہئیں۔ لہٰذا کسی غیر مسلم اقلیت کو ہم سے یہ اندیشہ تو ہونا ہی نہ چاہیے کہ ہم ان کے شخصی معاملات پر اپنے مذہبی قوانین کو مسلط کر کے اس قاعدے کی خلاف ورزی کریں گے جو دراصل ہمارا اپنا ہی قائم کیا ہوا قاعدہ ہے اور جس کے متعلق اسلام نے ہم کو قطعی واضح احکام دے رکھے ہیں۔

اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ اس ملک میں قانونِ ملکی کونسا ہو؟ انصاف کی رُو سے اس سوال کا جواب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ قانونِ ملکی وہی ہونا چاہیے جو اکثریت کے نزدیک صحیح ہو۔ اقلیت ہم سے اپنا جائز حق ضرور مانگ سکتی ہے اور وہ ہم اس کے مانگنے سے پہلے ہی تسلیم کر رہے ہیں۔ لیکن وہ ہم سے یہ مطالبہ کس طرح کر سکتی ہے کہ اس کو راضی کرنے کے لیے ہم خود اپنے عقیدے کی نفی کریں اور کسی ایسے قانون کو اپنے ہاتھوں جاری کرنے لگیں جس کو ہم حق نہیں سمجھتے؟ جب تک ہم اپنے ملک میں خود مختار نہ تھے ہمیں مجبوراً ایک باطل قانون کو گوارا کرنا پڑا۔ اس کی ذمہ داری سے ہم بری ہو سکتے ہیں۔ لیکن اب جبکہ اختیارات ہمارے اپنے ہاتھ میں ہیں، اگر ہم جان بوجھ کر اسلامی قانون کی جگہ کوئی دوسرا قانون جاری کریں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم قومی حیثیت سے بالارادہ مرتد ہو رہے ہیں۔ کیا فی الواقع کسی اقلیت کا ہم پر یہ حق ہے کہ اس کی خاطر ہم اپنا دین بدلنا گوارا کر لیں؟ کیا کوئی اقلیت کسی باختیار اکثریت سے یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہے کہ وہ اپنی رائے میں جس چیز کو صحیح سمجھتی ہو اُسے چھوڑ دے اور وہ چیز اختیار کرے جسے اقلیت صحیح سمجھتی ہو؟ یا پھر کیا یہ کوئی معقول اصول ہے

کہ جس ملک میں مختلف المذہب لوگ آباد ہوں اس میں سب کو لامذہب ہی ہو کر رہنا چاہیئے ؟ اگر ان سوالات کا جواب اثبات میں نہیں ہے، تو میں نہیں سمجھتا کہ آخر ایک مسلمان اکثریت کے ملک میں اسلامی قانون کیوں ملکی قانون قرار نہ پائے۔

(ترجمان القرآن ۔ جولائی ۱۹۴۰ء)

پاکستان میں اسلامی قانون کس طرح نافذ ہو سکتا ہے؟

(یہ تقریر ۱۹ فروری ۱۹۴۸ء کو لا کالج لاہور میں کی گئی تھی۔)

اس سے پہلے میں آپ کے سامنے ایک تقریر اس موضوع پر کر چکا ہوں کہ اسلامی قانون کی حقیقت کیا ہے، اس کی روح اور اس کا مقصد کیا ہے، اس کے بنیادی اصول کیا ہیں، مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا اس کے ساتھ تعلق کیا ہے اور ہم کیوں اپنے ملک میں اسے نافذ کرنے کے پابند ہیں، اور وہ شبہات کیا وزن رکھتے ہیں جو اس کے بارے میں عام طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ میری وہ تقریر محض ایک تعارفی تقریر تھی۔ اب میں ذرا تفصیل کے ساتھ اس مسئلے پر بحث کرنا چاہتا ہوں کہ اگر اب ہم اس ملک میں اسلامی قانون کو از سرِ نو جاری کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس کے لیے کیا تدبیریں کرنی ہوں گی۔

فوری انقلاب نہ ممکن ہے نہ مطلوب

اس سلسلے میں سب سے پہلے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس غلط فہمی کو دور کر دوں جو اسلامی قانون کے اجراء کے متعلق کثرت سے لوگوں کے ذہن میں پائی جاتی ہے۔ لوگ جب سنتے ہیں کہ ہم یہاں اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں اور اس حکومت میں ملک کا قانون اسلامی قانون ہوگا تو انہیں یہ گمان ہوتا ہے کہ شاید نظامِ حکومت کے تغیر کا اعلان ہوتے ہی تمام پچھلے قوانین یک لخت

منسوخ ہو جائیں گے اور اسلامی قانون بیک وقت نافذ کر دیا جائے گا۔ یہ غلط فہمی صرف عام لوگوں ہی میں نہیں پائی جاتی بلکہ اچھے خاصے مذہبی طبقے بھی اس میں مبتلا ہیں۔ اُن کے نزدیک ایسا ہونا چاہیئے کہ اِدھر اسلامی حکومت قائم ہو اور اُدھر فوراً ہی غیر اسلامی قوانین کا نفاذ بند اور اسلامی قانون کا نفاذ شروع ہو جائے۔ درحقیقت یہ لوگ اس بات کو بالکل نہیں سمجھتے کہ ایک ملک کا قانون اس کے اخلاقی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی نظام کے ساتھ گہرا تعلق رکھتا ہے۔ انہیں معلوم نہیں ہے کہ جب تک کسی ملک کا نظامِ زندگی اپنے سارے شعبوں کے ساتھ نہ بدلے اس کے قانونی نظام کا بدل جانا ممکن نہیں ہے۔ انہیں اس کا بھی اندازہ نہیں ہے کہ پچھلے سوڈیڑھ سو برس سے ہم پر جو انگریزی اقتدار مسلط رہا ہے اس نے کس طرح ہماری زندگی کے پورے نظام کو اسلامی اصولوں سے ہٹا کر غیر اسلامی اصولوں پر چلا دیا ہے اور اب اسے پھر بدل کر دوسری بنیادوں پر قائم کرنا کتنی محنت، کتنی کوشش اور کتنا وقت چاہتا ہے۔ یہ لوگ عملی مسائل میں بصیرت نہیں رکھتے، اس لیے اجتماعی نظام کی تبدیلی کو ایک کھیل سمجھتے ہیں اور ہتھیلی پر سرسوں جمانے کا خواب دیکھتے ہیں۔ پھر اُن کی یہی باتیں اُن لوگوں کو جو اسلامی نظام سے فرار کی راہیں ڈھونڈ رہے ہیں، یہ موقع دے دیتی ہیں کہ وہ اس تخیل کا مذاق اُڑائیں اور اس کے حامیوں کا استخفاف کریں۔

تدریج کا اصول

اگر ہم فی الواقع اپنے اس تخیل کو کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں فطرت کے اس اٹل قاعدے سے غافل نہ ہونا چاہیئے کہ اجتماعی زندگی میں جتنے تغیرات بھی ہوتے ہیں بتدریج ہی ہُوا کرتے ہیں۔ انقلاب جتنا اچانک اور جس قدر یک رُخا ہو گا اتنا ہی وہ ناپائدار ہو گا۔ ایک مستحکم اور پائندہ انقلاب کے لیے یہ بالکل ضروری ہے کہ وہ زندگی کی ہر جہت اور ہر پہلو میں پورے توازن کے ساتھ کارفرما ہو تاکہ اس کا ہر گوشہ دوسرے گوشہ کو سہارا دے سکے۔

عہدِ نبوی کی مثال

اس کی بہترین مثال خود وہ انقلاب ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب میں برپا کیا تھا۔ جو شخص حضورؐ کے کارنامے سے تھوڑی سی واقفیت بھی رکھتا ہے وہ بھی جانتا ہے کہ آپؐ نے

پورا اسلامی قانون اس کے سارے شعبوں کے ساتھ بیک وقت نافذ نہیں کر دیا تھا بلکہ معاشرے کو بتدریج اس کے لیے تیار کیا تھا اور اس تیاری کے ساتھ آہستہ آہستہ سابق جاہلیت کے طریقوں اور قاعدوں کو بدل کر نئے اسلامی طریقے اور قاعدے جاری کیے تھے۔ آپ نے سب سے پہلے اسلام کے بنیادی تصورات اور اخلاقی اصول لوگوں کے سامنے پیش کیے۔ پھر جو لوگ اس دعوت کو قبول کرتے گئے انہیں آپ تربیت دے کر ایک ایسا مصلح گروہ تیار کرتے چلے گئے جس کا ذہن اور زاویۂ نظر اور طرزِ عمل خالص اسلامی تھا۔ جب یہ کام ایک خاص حد تک پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا تو آپ نے دوسرا قدم اٹھایا اور وہ یہ تھا کہ مدینے میں ایک ایسی حکومت قائم کر دی جو خالص اسلامی نظریہ پر مبنی تھی اور جس کا مقصد ہی یہ تھا کہ ملک کی زندگی کو اسلام کے نقشے پر ڈھال دے۔ اس طرح سیاسی طاقت اور ملکی ذرائع کو ہاتھ میں لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وسیع پیمانے پر اصلاح و تعمیر کا وہ کام شروع کیا جس کے لیے آپ پہلے صرف دعوت و تبلیغ کے ذریعہ سے کوشش فرما رہے تھے۔ آپ نے ایک مرتب اور منظم طریقے سے لوگوں کے اخلاق، معاشرت، تمدن اور معیشت کو بدلنے کی جدوجہد کی۔ تعلیم کا ایک نیا نظام قائم کیا جو اس زمانے کے حالات کے لحاظ سے زیادہ تر زبانی تلقین کے طریقے پر تھا۔ جاہلیت کے خیالات کی جگہ اسلامی طرزِ فکر کی اشاعت کی۔ پرانی رسموں اور طور طریقوں کی جگہ نئے اصلاح یافتہ رواج اور آداب و اطوار جاری کیے۔ اور اس ہمہ گیر اصلاح کے ذریعہ سے جوں جوں زندگی کے مختلف گوشوں میں انقلاب رونما ہوتا گیا، آپ اسی کے مطابق پورے توازن اور تناسب کے ساتھ اسلامی قانون کے احکام جاری کرتے چلے گئے، یہاں تک کہ ۹ سال کے اندر ایک طرف اسلامی زندگی کی تعمیر مکمل ہوئی اور دوسری طرف پورا اسلامی قانون ملک میں نافذ ہو گیا۔

قرآن اور حدیث کے غائر مطالعے سے ہمیں واضح طور پر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آپ نے یہ کام کس ترتیب و تدریج کے ساتھ کیا تھا۔ وراثت کا قانون ۳ ہجری میں جاری کیا گیا۔ نکاح و طلاق کے قوانین رفتہ رفتہ ۷ ہجری میں مکمل ہوئے۔ فوجداری قوانین کئی سال تک ایک ایک دفعہ کر کے نافذ کیے جاتے رہے یہاں تک کہ ۹ ہجری میں ان کی تکمیل ہوئی۔ شراب کی بندش کے لیے بتدریج فضا تیار کی گئی اور ۴ ہجری میں اس کا قطعی انسداد کر دیا گیا۔ سود کی برائی اگرچہ

لکھ بھی میں صاف صاف بیان کی جا چکی تھی، مگر اسلامی حکومت قائم ہوتے ہی اسے یک لخت بند نہیں کر دیا گیا، بلکہ ملک کے پورے معاشی نظام کو بدل کر جب نئے سانچوں میں ڈھال دیا گیا تب کہیں ۹ھ ہجری میں سود کی قطعی حرمت کا قانون جاری کیا گیا۔ یہ کام بالکل ایک معمار کا سا کام تھا جس نے اپنے پیش نظر نقشے کی عمارت بنانے کے لیے کاریگر اور مزدور جمع کیے، ذرائع و وسائل مہیا کیے، زمین ہموار کی، بنیادیں کھودیں، پھر ایک ایک اینٹ رکھ کر ہر جہت سے عمارت کو اٹھاتا ہوا اوپر تک لے گیا، اور چند سال کی مسلسل محنت کے بعد آخر کار وہ عمارت مکمل ہو گئی جس کا خاکہ اس کے ذہن میں تھا۔

انگریزی دور کی مثال

قریب کے زمانہ میں خود ہمارے ملک پر جب انگریزوں کی حکومت قائم ہوئی تھی تو کیا انھوں نے یک لخت یہاں کا سارا نظام بدل ڈالا تھا؟ نہیں۔ ان کی حکومت سے پہلے چھ سات سو برس سے یہاں کا پورا نظام زندگی اسلامی فقہ پر چل رہا تھا۔ اس صدیوں کی جمی ہوئی عمارت کو ڈھا دینا اور مغربی اصول و نظریات کے مطابق ایک دوسرے نظام کی عمارت کھڑی کر دینا ایک دن کا کام نہ تھا۔ تاریخ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی اقتدار قائم ہونے کے بعد بھی ایک مدت تک ہندوستان میں اسلامی فقہ ہی رائج رہی۔ عدالتوں میں قاضی ہی انصاف کے لیے بیٹھتے تھے اور اسلام کا قانون صرف پرسنل لاء کی حد تک محدود نہ تھا بلکہ وہی ملکی قانون (Law of the Land) بھی تھا۔ انگریزوں کو یہاں کا قانونی نظام بدلتے بدلتے ایک صدی لگ گئی۔ انھوں نے بتدریج یہاں کا نظام بدل کر اپنے مطلب کے آدمی ڈھالے، اپنے خیالات کی اشاعت سے ذہنیتیں بدلیں، اپنے اقتدار کے اثر سے لوگوں کے اخلاق بدلے، اپنی بالادستی کے زور سے معاشی نظام بدلا اور پھر جیسے جیسے یہ مختلف قسم کے ہمہ گیر اثرات یہاں کی اجتماعی زندگی کو بدلتے گئے اسی کے مطابق پرانے قوانین منسوخ اور نئے قوانین جاری ہوتے چلے گئے۔

تدریج ناگزیر ہے

اب اگر ہم یہاں پھر اسلامی قانون جاری کرنا چاہتے ہیں تو ہمارے لیے بھی انگریزی حکومت

کے صد سالہ نقوش کو کھُرچ دینا اور نئے نقوش ثبت کر دینا محض ایک جُنبشِ قلم سے ممکن نہیں ہے۔ ہمارا پُرانا نظامِ تعلیم زندگی اور اس کے عملی مسائل سے ایک مدت دراز تک بے تعلق رہنے کے باعث اس قدر بے جان ہو چکا ہے کہ اس کے فارغ التحصیل لوگوں میں ایک فی ہزار کے اوسط سے بھی ایسے آدمی نہیں نکل سکتے جو ایک جدید ترقی یافتہ ریاست کے جج اور مجسٹریٹ بنائے جا سکیں۔ دوسری طرف موجودہ نظامِ تعلیم نے جو آدمی تیار کیے ہیں وہ اسلام اور اس کے قوانین سے بالکل بے بہرہ ہیں اور ان میں ایسے افراد بھی خال خال ہی پائے جاتے ہیں جن کی ذہنیت ہی کم از کم اِس تعلیم کے زہریلے اثرات سے محفوظ رہ گئی ہو۔ پھر سوڈیڑھ سو برس تک معطل رہنے کی وجہ سے ہمارا قانونی ذخیرہ بھی زمانے کی رفتار سے اچھا خاصا پیچھے رہ گیا ہے اور اسے موجودہ دَور کی عدالتی ضروریات کے لیے کارآمد بنانا کافی محنت چاہتا ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ایک طویل مدت تک اسلامی اثر سے آزاد اور انگریزی حکومت کے تابع رہتے رہتے ہمارے اخلاق، تمدن، معاشرت، معیشت اور سیاست کا نقشہ اصل اسلامی نقشے سے بہت مختلف ہو چکا ہے۔ اس حالت میں ملک کے قانونی نظام کو یک لخت بدل دینا ——— اگر ایسا کرنا ممکن بھی ہو ——— نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس صورت میں زندگی کا نظام اور قانونی نظام دونوں ایک دوسرے سے بیگانہ بلکہ باہم متصادم ہوں گے، اور ایسے قانونی تغیّر کا وہی حشر ہوگا جو ایک پودے کو ایسی آب و ہوا اور ایسی زمین میں لگا دینے سے ہوا کرتا ہے جو اس کے مزاج سے کوئی مناسبت نہ رکھتی ہو۔ لہٰذا یہ بالکل ناگزیر ہے کہ جس اصلاح و تغیر کے ہم طالب ہیں وہ تدریج کے ساتھ ہو، اور قانونی تبدیلیاں اخلاق، تعلیم، معاشرت، تمدن، معیشت اور سیاست کی تبدیلیوں کے ساتھ متوازن طریقہ سے کی جائیں۔

ایک غلط بہانہ

لیکن تدریج کے اس معقول اور بجائے خود بالکل صحیح اصول کو بہانہ بنا کر جو لوگ اس بات کے حق میں استدلال کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ سرِدست تو یہاں ایک غیر دینی ——— بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں ایک بے دین ——— ریاست ہی قائم ہونی چاہیے، پھر جب اسلامی ماحول تیار ہو جائے گا تو وہ اسلامی ریاست بھی قائم ہو جائے گی جو اسلامی قانون جاری کر سکے، وہ سرا سر ایک

نامعقول بات کہتے ہیں۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ یہ ماحول تیار کون کرے گا؟ کیا ایک بے دین ریاست، جس کی باگیں فرنگیت زدہ حکام اور لیڈروں کے ہاتھ میں ہوں؟ کیا وہ معمار جو صرف میخانہ و چنڈو خانہ ہی کی تعمیر جانتے اور اُسی سے دلچسپی بھی رکھتے ہیں ایک مسجد تعمیر کرنے کا سامان کریں گے؟ اگر ان لوگوں کا یہی مطلب ہے تو انسانی تاریخ میں یہ پہلا اور بالکل نرالا تجربہ ہوگا کہ بے دینی خود دین کو پروان چڑھا کر اپنی جگہ لینے کے لیے تیار کرے گی۔ اور اگر ان کا مطلب کچھ اور ہے تو وہ ذرا اس کی صاف صاف توضیح فرمائیں کہ اسلامی ماحول کی تیاری کا کام کون، کس طاقت اور کن ذرائع سے کریگا؟ اور اس دوران میں خود بے دین ریاست اپنے ذرائع اور اقتدار کو کس چیز کی تعمیر و ترقی میں صرف کرتی رہے گی؟

ابھی ابھی تدریج کا اصول ثابت کرنے کے لیے جو مثالیں میں نے پیش کی ہیں انہیں اگر آپ ایک مرتبہ پھر اپنے ذہن میں تازہ کرلیں تو آپ یہ بات اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ اسلامی نظامِ زندگی کی تعمیر ہو یا غیر اسلامی نظامِ زندگی کی، اگرچہ وہ ہوتی تو بتدریج ہی ہے، لیکن تدریجاً اس کی تعمیر صرف اُسی صورت میں ہو سکتی ہے جب کہ ایک معمار طاقت، اپنے سامنے ایک مقصد اور ایک نقشہ رکھ کر مسلسل اُس کے لیے کام کرے۔ صدرِ اوّل میں جو اسلامی انقلاب ہوا تھا اِسی طرح ہوا تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے برسوں اس کے لیے موزوں آدمی تیار کیے، تعلیم و تبلیغ کے ذریعہ سے لوگوں کے خیالات بدلے، حکومت کے پورے نظم و نسق کو معاشرے کی اصلاح اور ایک نئے تمدن کی تخلیق کے لیے استعمال کیا، اور اس طرح وہ ماحول بنا جس میں اسلامی قانون جاری ہو سکا۔ ماضی قریب میں انگریزوں نے ہندوستان کے نظامِ زندگی میں جو تغیرات کیے وہ بھی تو اسی طرح ہوئے کہ زمامِ کار ایسے لوگوں کے ہاتھ میں تھی جو اس تغیر کے خواہش مند تھے اور اس کے لیے کام کرنا جانتے تھے۔ انہوں نے ایک مقصد اور ایک نقشے کو نگاہ میں رکھ کر پیہم اس تغیر کے لیے کوشش کی اور آخر کار یہاں کے پورے نظامِ زندگی کو اُس سانچے میں ڈھال کر ہی چھوڑا جو ان کے اصول و قوانین سے مناسبت رکھتا تھا۔ پھر کیا اب ہماری پیشِ نظر تعمیر اُس معمار طاقت کے بغیر ہو جائے گی؟ یا ایسے معماروں کے ہاتھوں ہو سکے گی جو اس نقشے پر تعمیر کا کام نہ جانتے ہوں اور نہ چاہتے ہوں؟

صحیح ترتیبِ کار

میں سمجھتا ہوں، اور مجھے اُمید ہے کہ ہر معقول آدمی اس معاملہ میں مجھ سے اتفاق کرے گا کہ جب پاکستان اسلام کے نام سے اور اسلام کے لیے مانگا گیا ہے اور اسی بنا پر ہماری یہ مستقل ریاست قائم ہوئی ہے تو ہماری اس ریاست ہی کو وہ معمار طاقت بننا چاہیئے جو اسلامی زندگی کی تعمیر کرے۔ اور جب کہ یہ ریاست ہماری اپنی ریاست ہے اور ہم اپنے تمام قومی ذرائع و وسائل اس کے سپرد کر رہے ہیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس تعمیر کے لیے کہیں اور سے معمار فراہم کریں۔

پہلا قدم

یہ بات اگر صحیح ہے تو پھر اس تعمیر کی راہ میں پہلا قدم یہ ہونا چاہیئے کہ ہم اپنی اس ریاست کو، جو ابھی تک انگریز کی چھوڑی ہوئی کافرانہ بنیادوں پر قائم ہے، مسلمان بنائیں۔ اور اسے مسلمان بنانے کی آئینی صورت یہ ہے کہ ہماری دستور ساز اسمبلی باقاعدہ اس امر کا اعلان کرے کہ:-

۱- پاکستان میں حاکمیت خدا کی ہے اور ریاست اس کے نائب کی حیثیت سے ملک کا انتظام کرے گی۔

۲- ریاست کا اساسی قانون شریعتِ خداوندی ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے ہمیں پہنچی ہے۔

۳- تمام پچھلے قوانین جو شریعت سے متصادم ہوتے ہیں بتدریج بدل دیئے جائیں گے اور آئندہ کوئی ایسا قانون نہ بنایا جاسکے گا جو شریعت سے متصادم ہوتا ہو۔

۴- ریاست اپنے اختیارات کے استعمال میں اسلامی حدود سے تجاوز کرنے کی مجاز نہ ہوگی۔

یہ وہ کلمۂ شہادت ہے جسے اپنی آئینی زبان ——— یعنی دستور ساز اسمبلی ——— کے ذریعہ سے ادا کر کے ہماری ریاست "مسلمان" ہو جائے گی۔

دوسرا قدم

اس اعلان کے بعد ہی صحیح طور پر ہمارے رائے دہندوں کو یہ معلوم ہوگا کہ اب انہیں کس مقصد اور کس کام کے لیے اپنے نمائندے منتخب کرنے ہیں۔ عوام میں علم و دانش کی لاکھ کمی سہی، مگر وہ اتنی

سمجھ بوجھ ضرور رکھتے ہیں کہ انہیں کس کام کے لیے کس طرف رجوع کرنا چاہیے اور ان کے درمیان کون لوگ کس مطلب کے لیے موزوں ہیں۔ آخر وہ اتنے نادان تو نہیں ہیں کہ علاج کے لیے وکیل اور مقدمہ لڑنے کے لیے ڈاکٹر کو تلاش کریں۔ وہ اس کو بھی کسی نہ کسی حد تک جانتے ہی ہیں کہ ان کی بستیوں میں ایماندار اور خدا ترس کون ہیں، چالاک اور دنیا پرست کون، اور شریر و مفسد کون۔ جیسا مقصد ان کے سامنے ہوتا ہے ویسے ہی آدمی وہ اس کے لیے اپنے اندر سے ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ اب تک ان کے سامنے یہ مقصد آیا ہی نہ تھا کہ انہیں ایک دینی نظام چلانے کے لیے آدمی درکار ہیں۔ پھر وہ اس کے چلانے والے آخر تلاش کرتے ہی کیوں؟ جیسا بے دین اور غیر اخلاقی نظام ملک میں قائم تھا اور اس کا مزاج جس قسم کے آدمی چاہتا تھا، اس کے لیے ویسے ہی آدمیوں پر لوگوں کی نگاہِ انتخاب پڑی اور انہی کو رائے دہندوں نے چن کر بھیج دیا۔ اب اگر ہم ایک اسلامی ریاست کا دستور بنائیں اور لوگوں کے سامنے سوال یہ آجائے کہ اس نظام کو چلانے کے لیے انہیں موزوں آدمی منتخب کرنے ہیں، تو چاہے ان کا انتخاب کمال درجہ کا معیاری نہ ہو، مگر بہرحال اس کام کے لیے ان کی نگاہیں فساق و فجار اور دینِ مغربی کے مومنین پر نہیں پڑیں گی۔ وہ اس کے لیے انہی لوگوں کو تلاش کریں گے جو اخلاقی، ذہنی اور علمی حیثیت سے اس کے اہل ہوں گے۔

پس ریاست کو مسلمان بنانے کے بعد تعمیرِ حیاتِ اسلامی کی راہ میں دوسرا قدم یہ ہے کہ جمہوری انتخاب کے ذریعہ سے اس ریاست کی زمامِ کار ایسے لوگوں کے ہاتھ میں منتقل ہو جو اسلام کو جانتے بھی ہوں اور اس کے مطابق ملک کے نظامِ زندگی کو ڈھالنا چاہتے بھی ہوں۔

تیسرا قدم

اس کے بعد تیسرا قدم یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی ہمہ گیر اصلاح کا ایک منصوبہ (Plan) بنایا جائے اور اسے عمل میں لانے کے لیے ریاست کے تمام ذرائع و وسائل استعمال کیے جائیں۔ تعلیم کا نظام بدلا جائے۔ ریڈیو، پریس، سینما اور خطابت کی ساری طاقتیں لوگوں کے خیالات کی اصلاح اور ایک نئی اسلامی ذہنیت کی تخلیق میں صرف کی جائیں۔ معاشرت اور تمدن کو نئے سانچوں میں ڈھالنے کے لیے پیہم اور باقاعدہ کوشش کی جائے۔ سول سروس، پولیس، جیل، عدالت اور فوج سے بتدریج اُن لوگوں کو خارج کیا جائے جو پُرانے فاسقانہ دورِ کافرانہ نظام کی عادات و

خصائل میں ڈھل کر سُوکھ چکے ہیں، اور اُن نئے عناصر کو کام کرنے کا موقع دیا جائے جو اس اصلاح کے کام میں مددگار بن سکتے ہیں۔ معاشی نظام میں بنیادی تبدیلیاں کی جائیں اور اُس کا پورا ڈھانچہ جو پرانی ہندوانہ اور جدید فرنگیانہ بنیادوں پر چل رہا ہے، اُدھیڑ ڈالا جائے۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ اگر ایک صالح اور مدبر گروہ اقتدار کے منصب پر فائز ہو اور ملک کے سارے وسائل اور حکومت کے پورے نظم و نسق کی طاقت سے کام لے کر باقاعدگی کے ساتھ اصلاح کے ایک سوچے سمجھے منصوبے پر عمل شروع کردے تو دس سال کے اندر اس ملک کی اجتماعی زندگی کا نقشہ بالکل بدلا جا سکتا ہے، اور جیسے جیسے یہ تبدیلی واقع ہوتی جائے ایک صحیح توازن کے ساتھ سابق قوانین کی ترمیم و تنسیخ اور اسلامی قوانین کے نفاذ کا سلسلہ جاری ہو سکتا ہے، یہاں تک کہ بالآخر جاہلیت کا کوئی قانون ہمارے ملک میں باقی نہ رہے اور اسلام کا کوئی حکم نافذ ہونے سے بچ نہ رہ جائے۔

اجراءِ قانونِ اسلامی کے لیے تعمیری کام

اب میں خاص طور پر اُس تعمیری کام کی کچھ تفصیل آپ سے بیان کروں گا جو ملک کے قانونی نظام کو بدلنے اور اسلام کے قوانین کو جاری کرنے کے لیے ہمیں کرنا ہوگا۔ جس اصلاحی پروگرام کی طرف ابھی میں اشارہ کر چکا ہوں اس کے سلسلہ میں ہم کو قریب قریب ہر شعبۂ زندگی میں بہت سے تعمیری کام کرنے پڑیں گے، کیونکہ مدت ہائے دراز کے تعطل، انحطاط اور غلامی نے ہمارے تمدن کی عمارت کے ہر گوشے کو خراب کر کے چھوڑا ہے۔ لیکن اس وقت میری تقریر ایک خاص موضوع سے تعلق رکھتی ہے اس لیے دوسرے گوشوں کے تعمیری کام سے قطع نظر کر کے یہاں میں صرف اُس کام کے متعلق کچھ عرض کروں گا جو ہمیں قانون کے سلسلے میں کرنا ہے۔

ایک قانونی اکیڈیمی کا قیام

اس پہلو میں اوّلین کام جو ہمیں کرنا چاہیے، یہ ہے کہ ایک قانونی اکیڈیمی قائم کی جائے جو اس پورے کام کا جائزہ لے جو علم قانون میں ہمارے اسلاف اس سے پہلے کر چکے ہیں، اور ان ضروری کتابوں کو جو فقہ اسلامی کی واقفیت کے لیے ناگزیر ہیں، اُردو زبان میں صرف منتقل ہی نہ کرے بلکہ ان کے مواد کو زمانہ حال کے طرز ترتیب کے مطابق مرتب بھی کر دے تاکہ ان سے پورا فائدہ اٹھایا جا سکے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، ہماری فقہ کا اصل ذخیرہ عربی زبان میں ہے اور ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ

بالعموم اس زبان سے ناواقف ہے۔ اس ناواقفیت کی وجہ سے، اور کچھ سُنی سنائی باتوں کی بنا پر ہمارے پڑھے لکھے لوگ عموماً اس فقہی ذخیرے کے متعلق طرح طرح کی بدگمانیاں رکھتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان میں سے بہت سے لوگ تو یہاں تک کہہ بیٹھتے ہیں کہ دور از کار، لاطائل اختلافی بحثوں کے اس دفتر بے معنی کو دریا برد کر دیا جائے اور نئے سرے سے اجتہاد کر کے کام چلایا جائے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اس قسم کے مہمل خیالات ظاہر کرتے ہیں وہ محض اپنے علم ہی کی کمی کا نہیں، فکر و تدبر کے فقدان کا بھی راز فاش کرتے ہیں۔ اگر وہ اپنے بزرگوں کے فقہی کارناموں کا ذاتی مطالعہ کریں تو مجھے یقین ہے کہ انہیں اپنی ان باتوں پر خود ہی شرم آنے لگے گی۔ انہیں معلوم ہو گا کہ پچھلی بارہ تیرہ صدیوں میں ہمارے اسلاف محض فضول بحثوں میں وقت ضائع نہیں کرتے رہے ہیں، بلکہ انہوں نے اپنے بعد آنے والی نسلوں کے لیے بڑی قیمتی میراث چھوڑی ہے۔ وہ بہت سی ابتدائی منزلیں ہمارے لیے تعمیر کر گئے ہیں اور ہم سے بڑھ کر زیاں کار کوئی نہ ہو گا اگر ہم محض جہالت کی بنا پر اس بنی ہوئی عمارت کو خواہ مخواہ ڈھا کر نئے سرے سے ہی تعمیر کی ابتدا کرنے پر اصرار کریں۔ ہمارے لیے عقل مندی یہی ہے کہ جو اگلے بنا گئے ہیں اسے اپنی آج کی ضرورتوں کے لیے کارآمد بنائیں، اور آگے جن چیزوں کی ضرورت پیش آتی ہے اس کے لیے مزید تعمیر کرتے رہیں۔ ورنہ ہر نسل اگر یوں ہی اپنے سے پہلی نسلوں کے کام پر پانی پھیرتی رہے اور نئے سرے سے سب کچھ بنانے کی کوشش کرے تو یقیناً ترقی کی طرف قدم آگے بڑھ ہی نہیں سکتا۔

میں اس سلسلہ کی پہلی تقریر میں عرض کر چکا ہوں کہ پچھلی صدیوں میں دنیا کے ایک بہت بڑے حصے پر مسلمانوں کی جس قدر سلطنتیں قائم ہوئی تھیں ان سب کا قانون فقہ اسلامی ہی تھی۔ اُس زمانے میں مسلمان نری گھاس نہیں کھودتے تھے بلکہ ایک اعلیٰ درجہ کا تمدن ان کے اندر موجود تھا۔ ان کے وسیع تمدن کی ساری ہی ضروریات پر اُن کے فقہا نے اسلامی قوانین کو منطبق کیا تھا۔ یہی فقہا اُن حکومتوں کے جج، مجسٹریٹ اور چیف جسٹس ہوتے تھے اور ان کے فیصلوں سے نظائر کا ایک وسیع ذخیرہ فراہم ہو گیا تھا۔ انہوں نے قریب قریب ہر شعبۂ قانون سے بحث کی ہے۔ محض دیوانی و فوجداری قوانین ہی نہیں، دستوری اور بین الاقوامی قوانین کے متعلق بھی ان کے قلم سے ایسی ایسی لطیف بحثیں نکلی ہیں کہ ان کا مطالعہ کر کے ایک قانون داں آدمی اُن کی ژرف نگاہی کی داد دیے بغیر نہیں

رہ سکتا۔ ضرورت ہے کہ ہم اہلِ علم کے ایک گروہ کو ان بزرگوں کے چھوڑے ہوئے ذخیرہ کا جائزہ لینے پر مامور کریں، اور وہ موجودہ زمانے کی قانونی کتابوں کے طرز پر اس تمام کار آمد مواد کو مرتب کر ڈالے جو اِس ذخیرے میں مِل سکتا ہو۔

خصوصیت کے ساتھ چند کتابیں تو ایسی ہیں جن کو اُردو زبان میں منتقل کر لینا نہایت ضروری ہے۔

۱۔ احکام القرآن پر تین کتابیں، جصّاص، ابن العربی اور قرطبی۔

اِن کتابوں کا مطالعہ ہمارے قانونی طلبہ کو قرآن مجید سے احکام مستنبط کرنے کی بہترین تربیت دے گا۔ ان میں قرآن کی تمام احکامی آیات کی تفسیر کی گئی ہے، احادیث اور آثارِ صحابہ میں ان کی جو تشریح ملتی ہے اسے نقل کیا گیا ہے، اور مختلف ائمۂ مجتہدین نے ان سے جو احکام نکالے ہیں انہیں ان کے دلائل سمیت مفصّل بیان کر دیا گیا ہے۔

۲۔ دوسرا قیمتی ذخیرہ کُتبِ حدیث کی شرحوں کا ہے جن میں احکام کے علاوہ نظائر اور تشریحی بیان کا بھی بہترین مواد ملتا ہے۔ ان میں خاص طور پر یہ کتابیں اُردو میں منتقل ہونی چاہئیں۔

بخاری پر	فتح الباری اور عینی
مُسلم پر	نَوَوی اور مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کی فتح الملہم۔
ابوداؤد پر	عون المعبود اور بذل المجہود۔
موطّا پر	شاہ ولی اللہ صاحب کی مُسَوّیٰ اور مُصفّیٰ اور موجودہ دور کے ایک ہندوستانی عالم کی اَوْجَزُ المسالک
منتقی الاخبار پر	شوکانی کی نیل الاوطار
مشکوٰۃ پر	مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی التعلیق الصبیح۔
علم الآثار میں	امام طحاوی کی شرح معانی الآثار۔

۳۔ اس کے بعد ہمیں فقہ کی ان بڑی بڑی کتابوں کو لینا چاہیے جو اس علم میں اُمہات کُتب کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان میں خصوصیت کے ساتھ یہ کتابیں منتقل ہونی چاہئیں۔

فقہ حنفی پر — امام سرخسی کی المبسوط اور شرح السیر الکبیر۔ کاسانی کی بدائع الصنائع۔ ابنِ ہمام کی فتح القدیر مع ہدایہ۔ اور فتاویٰ عالمگیری۔

فقہ شافعی پر — کتاب الاُم۔ شرح المہذب اور مغنی المحتاج۔

فقہ مالکی پر — المدوّنہ اور کوئی اہم کتاب جس کا اہلِ علم انتخاب کریں۔

فقہ حنبلی پر — ابن قُدامہ کی المُغنی

فقہ ظاہری پر — ابن حزم کی المحلّٰی

مذاہب اربعہ پر — ابن رشد کی بدایۃ المجتہد۔ اور علماء مصر کی مرتب کردہ الفقہ علی المذاہب الاربعہ۔ نیز ابن القیم کی زاد المعاد میں سے وہ حصے جو قانونی مسائل سے متعلق ہیں۔

مخصوص مسائل پر — امام ابو یوسف کی کتاب الخراج۔ یحییٰ بن آدم کی الخراج۔ ابو عُبید القاسم کی کتاب الاموال۔ ہلال بن یحییٰ کی احکام الوقف۔ دمیاطی کی احکام المواریث۔

۴۔ پھر ہمیں اصولِ قانون اور حکمتِ تشریع کی بھی چند اہم کتابوں کو اُردو کا جامہ پہنانا چاہیئے تاکہ ان کی مدد سے ہمارے اہلِ قانون میں اسلامی فقہ کا صحیح فہم اور اس کی رُوح سے گہری واقفیت پیدا ہو۔ میرے خیال میں اس موضوع پر یہ کتابیں قابلِ انتخاب ہیں۔

ابنِ حزم کی اصول الاحکام۔ علامہ آمدی کی الاحکام لاصولِ الاحکام۔ خضری کی اصول الفقہ۔ شاطبی کی الموافقات۔ ابن القیم کی اعلام الموقعین۔ اور شاہ ولی اللہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغہ۔

ان کتابوں کے متعلق ہمیں صرف اتنا ہی نہیں کرنا ہے کہ محض ان کے ترجمے اردو زبان میں کروا لئے جائیں، بلکہ ان کے مضامین کو موجودہ زمانہ کی قانونی کتابوں کے طرز پر از سرِ نو مرتب بھی کرنا ہوگا، نئے عنوانات قائم کرنے ہوں گے، منتشر مسائل کو ایک ایک عنوان کے تحت جمع کرنا ہوگا۔ فہرستیں بنانی پڑیں گی اور انڈکس تیار کرنے ہوں گے۔ اس محنت کے بغیر یہ

کتابیں آج کل کی ضروریات کے لیے پوری طرح کارآمد نہ ہو سکیں گی۔ قدیم زمانے کا طریقِ تدوین کچھ اور تھا اور اُس زمانے میں قانونی مسائل کے لیے اتنے مختلف عنوانات بھی پیدا نہیں ہوتے تھے جتنے آج پیدا ہو گئے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ لوگ دستوری قانون اور بین الاقوامی قانون کے لیے کوئی الگ نام نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کے مسائل کو وہ نکاح، خراج، جہاد، امارت اور میراث کے ابواب میں بیان کرتے تھے۔ فوجداری قانون ان کے ہاں کوئی الگ عنوان نہ تھا، بلکہ اس کے مسائل حدود، جنایات اور دیات کے مختلف عنوانوں میں تقسیم کر دیئے جاتے تھے۔ دیوانی قانون کو بھی انہوں نے الگ مرتب نہیں کیا تھا بلکہ ایک ہی مجموعۂ قوانین میں بہت سے عنوانات کے تحت اس کو جمع کر دیا تھا۔ مالیات اور معاشیات وغیرہ نام ان کے ہاں نہ تھے۔ اس سلسلہ کے مسائل کو وہ کتاب البیوع، کتاب الصرف، کتاب المضاربہ، اور کتاب المزارعہ وغیرہ عنوانات کے تحت بیان کرتے تھے۔ اسی طرح قانونِ شہادت، ضابطۂ دیوانی، ضابطۂ فوجداری، اور ضابطۂ عدالت وغیرہ جدید اصطلاحیں ان کے ہاں نہیں بنی تھیں۔ ان قوانین کے مسائل ان کی کتابوں میں آداب القاضی، کتاب الدعویٰ، کتاب الاکراہ، کتاب الشہادت اور کتاب الاقرار وغیرہ عنوانات کے تحت ملتے ہیں۔ اب اگر یہ کتابیں جُوں کی تُوں اُردو میں منتقل کر لی جائیں تو ان سے کما حقہٗ فائدہ اٹھانا مشکل ہے۔ ضرورت ہے کہ کچھ قانونی نظر رکھنے والے اہلِ علم ان پر کام کریں اور ان کی ترتیب بدل کر ان کے مواد کو جدید طرز پر مرتب کر ڈالیں۔ اور بالفرض اگر یہ بہت زیادہ محنت طلب کام نظر آئے تو کم از کم اتنا تو ضرور ہی ہونا چاہیئے کہ ان کی فہرستیں پوری باریک بینی کے ساتھ بنائی جائیں اور مختلف قسم کے انڈکس بنا دیئے جائیں جن کے ذریعہ سے ان میں مسائل کا تلاش کرنا آسان ہو جائے۔

تدوینِ احکام

اس سلسلہ کا دوسرا اہم کام یہ ہے کہ ذمّہ دار علماء اور ماہرینِ قانون کی ایک ایسی مجلس مقرر کی جائے جو اسلام کے قانونی احکام کو جدید دَور کی کُتبِ قانون کے طرز پر دفعہ وار مدوّن (Codify) کر دے۔

میں اپنی پہلی تقریر میں وضاحت کے ساتھ یہ بات آپ سے عرض کر چکا ہوں کہ اسلامی

نقطۂ نظر سے قانون کا اطلاق ہر اُس قول پر نہیں ہوتا جو کسی فقیہ یا امام مجتہد کی زبان سے نکلا ہو یا کسی فقہی کتاب میں لکھا ہوا ہو۔ قانون صرف چار چیزوں کا نام ہے۔

۱- کوئی حکم جو قرآن میں اللہ تعالیٰ نے دیا ہو۔

۲- کسی قرآنی حکم کی تشریح و تفصیل، یا کوئی مستقل حکم جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو۔

۳- کوئی استنباط، قیاس، اجتہاد یا استحسان جس پر اُمّت کا اجماع ہو، یا جمہور علماء کا ایسا فتویٰ ہو جسے ہمارے ملک کے مسلمانوں کی عظیم اکثریت تسلیم کرتی رہی ہے۔

۴- اسی قبیل کا کوئی ایسا امر جس پر ہمارے ملک کے اہل حل وعقد کا اب اجماع یا جمہوری فیصلہ ہو جائے۔

میری تجویز یہ ہے کہ پہلی تین قسموں کے احکام کو ماہرین کی ایک جماعت ایک مجلۃ احکام (Code) کی شکل میں مرتب کر دے۔ پھر جو جو قوانین آئندہ اجماعی یا جمہوری فیصلوں سے بنتے جائیں ان کا اضافہ ہماری کتاب آئین میں کیا جاتا رہے۔ اگر اس قسم کا ایک مجلۃ احکام بن جائے تو اصل قانون کی کتاب وہ ہوگی، اور باقی تمام فقہی کتابیں اس کے لیے شرح (Commentary) کا کام دیں گی۔ نیز اس طرح عدالتوں میں قانون اسلامی کی تنفیذ اور لا کالجوں میں اس قانون کی تعلیم بھی آسان ہو جائے گی۔

قانونی تعلیم کی اصلاح

اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اپنے ہاں قانون کی تعلیم کا سابق طریقہ بدل دیں اور اپنے لا کالجوں کے نصاب اور طریقِ تربیت میں ایسی اصلاحات کریں جن سے طلبہ اسلامی قانون کی تنفیذ کے لیے علمی اور اخلاقی، دونوں حیثیتوں سے تیار ہو سکیں۔

اس وقت تک جو تعلیم ہماری قانونی درس گاہوں میں دی جا رہی ہے وہ ہمارے نقطۂ نظر سے بالکل ناکارہ ہے۔ اس سے فارغ ہو کر نکلنے والے طالب علم صرف یہی نہیں کہ اسلامی قانون کے علم سے بے بہرہ ہوتے ہیں بلکہ ان کی ذہنیت بھی غیر اسلامی افکار کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے اور ان کے اندر اخلاقی صفات بھی ویسی ہی پیدا ہو جاتی ہیں جو مغربی قوانین

کے اجراء کے لیے موزوں ترین، مگر قانونِ اسلامی نافذ کرنے کے لیے قطعاً غیر موزوں ہیں۔ اس صورتِ حال کو جب تک ہم بدل نہ دیں گے اور ان درس گاہوں میں اپنے معیار کے فقیہ پیدا کرنے کا انتظام نہ کریں گے، ہمارے ہاں وہ آدمی فراہم ہی نہ ہو سکیں گے جو ہماری عدالتوں میں قاضی اور مفتی کے فرائض انجام دینے کے لائق ہوں۔

اِس مقصد کے لیے جو تجاویز میرے ذہن میں ہیں وہ مَیں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ دوسرے اہلِ علم بھی ان پر غور کریں اور ان میں اصلاح و اضافہ فرمائیں تاکہ ایک اچھی قابلِ عمل اسکیم بن سکے۔

۱۔ سب سے مقدم اصلاح یہ ہونی چاہیئے کہ آئندہ سے لاکالجوں میں داخلہ کے لیے عربی زبان کی واقفیت ــــــ اتنی واقفیت جو قرآن، حدیث اور فقہ کا مطالعہ کرنے کے لیے کافی ہو ــــــ لازم قرار دی جائے۔ اگرچہ ہم اسلامی قانون کی پوری تعلیم اُردو میں دینا چاہتے ہیں، اور اس فن کی تمام ضروری کتابوں کو بھی اردو میں منتقل کر لینا چاہتے ہیں، لیکن اس کے باوجود عربی زبان کے علم کی ضرورت پھر بھی باقی رہے گی۔ اس لیے کہ اسلامی فقہ میں بصیرت بہرحال اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک آدمی اُس زبان سے واقف نہ ہو جس میں قرآن نازل ہُوا ہے اور جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کلام فرمایا ہے۔ ابتداءً ہمیں لاکالجوں کے لیے عربی داں اُمیدوار فراہم کرنے میں دُشواری ضرور پیش آئے گی۔ ممکن ہے اس غرض کے لیے ہم کو چند سال تک ہر لاکالج میں ایک مستقل کلاس عربی تعلیم کیلیے کھولنی پڑے، اور شاید تعلیمِ قانون کی مدت میں ایک سال کا اضافہ بھی کر دینا پڑے۔ لیکن آگے چل کر جب ہمارے پورے نظامِ تعلیم میں عربی بطور ایک لازمی زبان کے شامل ہو جائے گی تو کالج میں داخلہ کے لیے جو گریجویٹ بھی آئیں گے وہ پہلے ہی عربی زبان سے بخوبی واقف ہوں گے۔

۲۔ عربی زبان کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ قانون کی تعلیم شروع کرنے سے پہلے طلبہ کو قرآن اور حدیث کے براہِ راست مطالعہ سے دین کا مزاج اور اس کا پُورا نظام اچھی طرح سمجھا دیا جائے۔ ہماری عربی درس گاہوں میں بھی ایک مدت دراز سے یہ غلط طریقہ چلا آرہا ہے

کہ تعلیم کی ابتداء فقہ سے کی جاتی ہے، پھر ہر مذہب (اسکول) کے لوگ اپنے مخصوص فقہی نقطۂ نظر سے حدیث پڑھاتے ہیں اور قرآن کی صرف ایک یا دو بڑی سورتیں محض تبرکاً داخلِ درس کر دی جاتی ہیں، بلکہ ان میں بھی کلامِ الٰہی کی ادبی خوبیوں کے سوا کسی اور چیز کی طرف توجہ نہیں کی جاتی۔ اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ جو فضلاء ان درس گاہوں سے نکلتے ہیں وہ قانون کے جزئیات و فروع سے تو خوب واقف ہوتے ہیں مگر جس دین کو قائم کرنے کے لیے یہ قانون بنایا گیا ہے اس کے مجموعی نظام، اس کے مقاصد، اس کے مزاج اور اس کی روح سے بڑی حد تک نابلد رہتے ہیں۔ ان کو یہ تک معلوم نہیں ہوتا کہ دین سے شریعت کا اور شریعت سے فقہی مذاہب کا تعلق کیا ہے۔ وہ قانونی جزئیات اور اپنے مذاہبِ خاص کے فروعی مسائل ہی کو اصل دین سمجھ بیٹھتے ہیں۔ اسی چیز نے ہمارے ہاں فرقہ بندی کے جھگڑے اور تعصبات پیدا کیے ہیں۔ اسی چیز کا نتیجہ یہ ہے کہ مسائلِ زندگی پر فقہی احکام کا انطباق کرنے میں بارہا شریعت کے اہم ترین مقاصد تک نظر انداز کر دیے جاتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اب اس غلطی کی اصلاح ہو اور کسی طالب علم کو اس وقت تک قانون نہ پڑھایا جائے جب تک وہ پہلے قرآن اور پھر حدیث سے دین کو اچھی طرح نہ سمجھ لے۔

اس معاملہ میں بھی ہمیں ابتداءً چند سال تک کچھ مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا کیونکہ قرآن و حدیث سے واقف گریجویٹ نہ مل سکیں گے، اور اس کے لیے شاید ہمیں لا کالجوں ہی میں اس تعلیم کا بھی انتظام کرنا پڑے گا۔ لیکن آگے چل کر جب ہماری عام تعلیمی اصلاحات بار آور ہو جائیں گی تو آسانی کے ساتھ یہ ضابطہ بنایا جا سکے گا کہ لا کالجوں میں صرف وہی طلبہ داخلہ لے سکتے ہیں جو تفسیر اور حدیث کو مخصوص مضامین کی حیثیت سے لے کر بی اے کر چکے ہوں، ورنہ دوسرے مضامین کے طلبہ کو ایک سال زائد ان مضامین پر صرف کرنا ہوگا۔

۲۔ تعلیمِ قانون کے نصاب میں تین مضامین ضرور شامل ہونے چاہئیں۔ ایک جدید زمانے کے اصولِ قانون (Jurisprudence) کے ساتھ ساتھ اصولِ فقہ کا مطالعہ۔ دوسرے اسلامی فقہ کی تاریخ کا مطالعہ۔ تیسرے فقہ کے تمام بڑے بڑے مذاہب (اسکولوں) کا غیر متعصبانہ مطالعہ۔ ان تینوں چیزوں کے بغیر طلبہ میں نہ تو فقہ کا پورا فہم پیدا ہو سکتا ہے نہ ان کے اندر وہ

اجتہادی صلاحیتیں اُبھر سکتی ہیں جو اعلیٰ درجہ کے قاضی اور مفتی بننے کے لیے ناگزیر ہیں، اور نہ ان کے اندر سے ایسے ماہرین نکل سکتے ہیں جو ہماری ترقی پذیر ریاست کی روز افزوں ضروریات کے لیے تعبیر و قیاس اور اجتہاد و استحسان کے صحیح طریقے استعمال کر کے قوانین بنا سکیں۔ اپنے قانون کے اصولوں کو پوری طرح سمجھے بغیر آخر وہ روز نت نئے پیش آنے والے مسائل پر اُن کا انطباق کیسے کر سکیں گے۔ اپنی فقہ کی تاریخ کو جانے بغیر انہیں کیونکر معلوم ہوگا کہ اسلامی قانون کا ارتقا کس طریقہ پر ہوا ہے، اور آئندہ کس طریقہ پر ہو سکتا ہے۔ فقہائے اسلام کے جمع کیے ہوتے پورے ذخیرے پر وسیع نظر رکھے بغیر وہ کیونکر اس قابل ہو سکیں گے کہ جب کسی مسئلے میں ایک فقہی مذہب سے رہنمائی نہ ملتی ہو تو نیا اجتہاد کرنے سے پہلے دوسرے مذاہبِ فقہ سے استفادہ کریں۔ انہی وجوہ سے مَیں ضروری سمجھتا ہوں کہ ہماری تعلیمِ قانون کے نصاب میں یہ تینوں مضامین داخل ہوں۔

۴۔ تعلیم کی اس اصلاح کے ساتھ ہمیں اپنے لا کالجوں میں طلبہ کی اخلاقی تربیت کا بھی خاص انتظام کرنا ہوگا۔ اسلامی نقطۂ نظر سے لا کالج چالاک وکیل، نفس پرست مجسٹریٹ اور بدکردار جج تیار کرنے کی فیکٹری نہیں ہے بلکہ اس کا کام تو ایسے قاضی اور مفتی پیدا کرنا ہے جو اپنی قوم میں اپنی سیرت و کردار کے لحاظ سے بلند ترین لوگ ہوں، جن کی راست بازی اور عدل و انصاف پر کامل اعتماد کیا جا سکے، جن کی اخلاقی ساکھ ہر شبہ سے بالاتر ہو۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں سب سے بڑھ کر خدا ترسی، پرہیزگاری اور احساسِ ذمہ داری کا دَور دورہ ہونا چاہیئے۔ یہاں سے نکلنے والے طلبہ کو اُس مسند کے لیے تیار ہونا ہے جس پر کبھی قاضی شُریحؒ، امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور قاضی ابو یوسفؒ جیسے لوگ بیٹھ چکے ہیں[1]۔ یہاں ایسے مضبوط کیرکٹر کے آدمی تیار ہونے چاہئیں جو کسی مسئلہ شرعی میں فتوے دیتے وقت یا کسی معاملہ کا فیصلہ کرتے وقت خدا کے سوا کسی کی طرف نظر نہ رکھیں۔ کوئی لالچ، کوئی خوف، کوئی ذاتی دلچسپی، کوئی محبت اور کوئی نفرت اُن کو اُس بات سے نہ ہٹا سکے جسے وہ اپنے علم اور اپنے ضمیر کے لحاظ سے حق اور انصاف کی بات سمجھتے ہوں۔

(ترجمان القرآن۔ اگست ۴۸ ۱۹ء)

---

[1] تقریر کے آخری حصے کی تفصیلات یہاں حذف کر دی گئی ہیں۔ پوری تقریر کتابی شکل میں شائع شدہ موجود ہے۔ (جدید)

مطالبۂ نظامِ اسلامی[1]

یہ اُن تقریروں کا مجموعی خلاصہ ہے جو مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی امیر جماعت اسلامی (حال اسیرِ حکومت پاکستان) نے اپریل اور مئی ۱۹۴۸ء میں لاہور، ملتان، کراچی، راولپنڈی، سیالکوٹ اور پشاور کے مقامات پر جماعتِ اسلامی کے عام اجتماعات میں فرمائی تھیں۔ ان تقریروں کو جن ہزاروں مسلمانوں نے سُنا اُن کو پہلی مرتبہ واضح طور پر یہ احساس ہوا کہ حصولِ پاکستان پر اُن کا کام ختم نہیں ہو گیا ہے، بلکہ اصل نصب العین کی طرف قدم بڑھانے کا تو ابھی آغاز ہی ہوا ہے۔ اسے مکمل کرنے کے لیے ابھی مزید محنت و ایثار کی ضرورت ہے۔

اس تقریر کو مرتب کرنے کا وقت نکالنے سے پہلے مولانا محترم ۴ر اکتوبر ۱۹۴۸ء کو پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بند کر دیئے گئے۔ لیکن ادھر چونکہ اس تقریر کی اشاعت کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا جا رہا ہے اور مولانا کی رہائی میں ابھی دیر ہے اس لیے مجبوراً اخبارات کی مدد سے اسے ہم بطور خود

---

[1] یہ تقریر ۱۹۴۹ء کے آغاز ہی میں پمفلٹ کی صورت میں شائع ہو گئی تھی۔ ترجمان القرآن میں اس کی اشاعت کی نوبت نہ آسکی۔ (جدید)

مرتب کر کے پیش کر رہے ہیں۔

ناظم مکتبہ جماعت اسلامی

بعد از حمد و ثنا:

ہم دوراہے پر کھڑے ہیں

حاضرین و حاضرات! یہ وقت جس سے ہم آج گذر رہے ہیں، ہماری قومی تاریخ کے نازک ترین اوقات میں سے ہے۔ اس وقت ہم ایک دوراہے پر کھڑے ہیں اور ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ ہمارے سامنے جو دو راستے کھلے ہوتے ہیں، اُن میں سے کس کی طرف بڑھیں۔ اس موقع پر جو فیصلہ بہ حیثیتِ قوم ہم کریں گے وہ نہ صرف ہمارے مستقبل پر بلکہ نہ معلوم کتنی مدت تک ہماری آئندہ نسلوں پر اثر انداز ہوتا رہے گا۔ ہمارے سامنے ایک راستہ تو یہ ہے کہ ہم اُن اصولوں پر اپنے نظامِ زندگی کی بنیادی کھڑی کریں جو اسلام نے ہم کو دیئے ہیں۔ ہماری ساری کی ساری زندگی ــــــ ہماری معاشرت، ہماری معیشت، ہمارا تمدن، ہماری سیاست غرض سب کچھ ــــــ اُن اصولوں پر اُستوار ہو جو اسلام نے مقرر کر دیئے ہیں۔ دوسرا راستہ ہمارے سامنے یہ ہے کہ ہم کسی مغربی قوم کے نظامِ زندگی کو قبول کر لیں۔ خواہ وہ اشتراکیت ہو، لادینی جمہوریت ہو یا کوئی اور نظامِ زندگی۔

اگر خدانخواستہ ہم نے دوسرے راستے کو پسند کیا تو ہم اپنے اسلام کی بہ حیثیت قوم نفی کریں گے اور اپنے اُن تمام اعلانات سے منحرف ہوں گے جو ایک مدت سے ہم خدا اور خلق دونوں کے سامنے کرتے رہے ہیں اور اس اجتماعی وعدہ خلافی کی وجہ سے خدا و خلق دونوں کے سامنے ہمیں رسوا ہونا پڑے گا۔ پھر اس راستے پر چلنے کا سب سے زیادہ افسوس ناک نتیجہ یہ ہوگا کہ برِ صغیر ہندوستان میں اسلام کی تاریخ کا قطعی خاتمہ ہو جائے گا۔ بخلاف اِس کے اگر ہم پہلا راستہ انتخاب کریں اور خالص اِسلامی اصولوں پر اپنی قومی زندگی کو قائم کریں تو ہم دنیا میں بھی سرفراز ہوں گے اور آخرت میں بھی ہمارے لیے کامیابی ہوگی، ہم خدا کے حضور بھی سُرخرو ہوں گے اور خلق کے سامنے بھی ہمارا وقار قائم ہو سکے گا۔ ہم اِسلامی نظامِ زندگی کے علمبردار بن کر پھر اُسی مقام پر کھڑے ہو جائیں گے جس پر ہزاروں برس پہلے جب ایک قوم کھڑی ہوئی تھی تو اللہ تعالٰے نے اُسے

مخاطب کر کے ارشاد فرمایا تھا کہ " اَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ " یعنی ہم نے تمہیں دنیا کی ساری اقوام پر فضیلت عطا کی۔ پھر اس کے بعد جب اسی مقامِ عظمت پر ایک دوسری قوم کھڑی ہوئی تو اسے کہا گیا " کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ " اور " وکذٰلک جعلنٰکم امۃ وسطا " یعنی تم بہترین امت ہو اور تمہیں مرکزی اُمت بنایا گیا ہے۔

ہمارے مسلمان ہونے کا تقاضا

بہر حال آج یہ دونوں مواقع ہمارے سامنے ہیں اور ان میں سے جس کا بھی ہم انتخاب کریں گے، اس کا اثر مدت ہائے دراز تک ہماری قسمتوں اور ہماری آئندہ نسلوں کی قسمتوں پر پڑے گا۔ اس موقع پر اگر ہم اسلام کے اصولوں کو اپنے لیے پسند کرتے ہیں اور اپنے نظامِ حکومت کی تشکیل اسلام کے نقشے پر کرتے ہیں تو یہ کئی وجوہ سے درست ہے۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ ہمارے مسلمان ہونے کا عین تقاضا یہی ہے۔ مسلمان ہونے کے معنی خدا کا مطیع ہو جانا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی خود مختاری اور آزادی کو خدا کے حق میں تسلیم (Surrender) کر دیا جائے اور اقرار کر لیا جائے کہ اب میں جو زندگی بسر کروں گا، خدا کے مقرر کیے ہوئے حدود اور ضابطوں کے اندر رہ کر بسر کروں گا، اس کی طرف سے جدھر بڑھنے کا اشارہ ہوگا اُدھر بڑھوں گا، اور جدھر سے رُک جانے کا حکم ہوگا اُدھر سے رُک جاؤں گا۔ جس طرح ایک فرد اپنے خدا سے یہ عہد باندھ کر جب اپنی زندگی کو اس کی رضا کے تابع کر دیتا ہے تو وہ مسلمان ہو جاتا ہے، بالکل اسی طرح اجتماعی حیثیت سے ایک قوم کے مسلمان ہونے کا طریقہ بھی یہی ہے کہ وہ اپنی آزادی و خود مختاری سے اللہ تعالیٰ کے حق میں دست بردار ہو جائے اور اپنے آپ کو اس کے حدود و قوانین کا پابند بنا لے۔ یہ ایک عجیب اور نرالی بات ہوگی کہ کسی قوم کا ایک ایک فرد تو اپنی اپنی جگہ مسلم ہو، لیکن جب وہ مل کر ایک اسٹیٹ بنیں تو وہ اسٹیٹ غیر مسلم ہو۔ اگر مجموعہ غیر مسلم ہو تو افراد کس طرح مسلم ہو سکتے ہیں؟ اور اگر افراد مسلم ہوں تو ان کا مجموعہ غیر مسلم کیوں ہو؟ افراد اگر مسلمان ہوں اور مسلمان رہنا چاہتے ہوں تو اُن کے لیے لازم ہے کہ وہ جب مل کر ایک قوم اور ایک اسٹیٹ کی شکل اختیار کریں تو وہ قوم اور اسٹیٹ ہونے کی حیثیت سے بھی مسلمان ہوں۔

پاکستان برائے اسلام

پھر ہمارے مطالبۂ پاکستان کا بھی یہی تقاضا ہے کہ ہم یہاں کا نظام اسلامی اصولوں پر قائم کریں۔ پچھلے دس سال میں بہ حیثیت قوم ہمارا یہ مطالبہ تھا کہ ہمیں ایک خطۂ زمین ایسا ملنا چاہیئے جس میں ہم اپنی تہذیب و تمدن کو از سرِ نو قائم کر سکیں، اور اپنے دین کے اصولوں پر اپنی زندگی کو نشوونما دے سکیں کیونکہ ایک غیر مسلم اکثریت کے تحت ہمارے لیے اس طرح کی زندگی ممکن نہیں ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اب سے ڈیڑھ سال پہلے تک اس امر کے کوئی آثار نہ تھے کہ ہندوستان تقسیم ہو جائے گا اور یہاں مسلمانوں کی ایک آزاد سلطنت قائم ہو جائے گی۔ حتیٰ کہ جو لوگ آگے چل رہے تھے اور اس مطالبے کی جدوجہد میں قیادت کا فرض ادا کر رہے تھے، خود ان کو بھی اس بات کا قطعی یقین نہ تھا کہ پاکستان قائم ہو جائے گا۔ اس کے بعد حالات جس طرح بدلے اور پاکستان کے قیام کے لیے جس طرح فضا سازگار ہوتی اور ملک آناً فاناً تقسیم ہو گیا، اس کی آپ جو چاہیں عقلی توجیہیں کریں، لیکن میں اس انقلاب میں ارادۂ الٰہی کو خاص طور پر شامل پاتا ہوں۔ واقعہ درحقیقت یہ ہے کہ صدیوں کے بعد تاریخ میں یہ بات پیش آئی ہے کہ ایک قوم نے کھڑے ہو کر بہ حیثیتِ قوم یہ کہا کہ "ہم اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں، اور چونکہ غیر مسلم اکثریت کی حکومت میں ہمارے لیے اس کا امکان نہیں ہے لہٰذا ہمیں ایک آزاد خطۂ زمین ملنا چاہیئے، اگر ہمیں یہ آزاد خطہ مل جائے تو اس میں ہم پورے کے پورے اسلام کو غالب کریں گے"۔ خدا کے ہاں یہ بات مقبول ہوتی کہ جب یہ قوم کہتی ہے کہ ہم اسلامی نظامِ حیات کو اختیار کرنا چاہتے ہیں تو ایک بار اسے اس کا موقع دینا چاہیئے۔ ایک مدت سے آپ کو پامال کیا جا رہا تھا۔ لیکن آپ نے جب یہ خواہش ظاہر کی کہ آپ پنپنا چاہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے اس کا موقع فراہم کر دیا۔

ایک نازک امتحان

آپ کو یہ موقع مل جانا جس طرح فضل و رحمت ہے اسی طرح یہ آزمائش و امتحان بھی ہے۔ پاکستان مل جانے کے بعد آپ سب امتحان گاہ میں کھڑے ہیں۔ اب آپ کا اس امر میں امتحان ہے کہ آپ پچھلے دس سال میں جو کچھ زبانوں سے کہتے رہے ہیں، کیا فی الواقع آپ کے دلوں میں

بھی وہی ہے ؟ جن باتوں کا آپ اعلان کرتے رہے ہیں ، کیا آپ کی نیتیں بھی انہی کے مطابق ہیں ؟ خدا و خلق کے سامنے جو اقرار آپ نے کیے ہیں کیا وہ سچے اقرار تھے یا جھوٹے ؟ اللہ تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ اسلامی حکومت قائم کرنے کا جو چرچا آپ نے کیا تھا ، کیا وہ لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے تھا یا اب صدق دل سے آپ اپنی زبان سے نکالی ہوئی بات پر عمل کر کے دکھاتے ہیں ؟ آپ کہتے تھے کہ پاکستان کا مطلب کیا ، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ ۔ آپ کہتے تھے کہ ہم پاکستان اس لیے چاہتے ہیں کہ اسلام پر پوری طرح عمل کر سکیں ۔ اب اللہ تعالیٰ نے پاکستان دے کر آپ کو آزمائش میں ڈال دیا ہے اور وہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ آپ سچے تھے یا جھوٹے ؟

اسلام کے حفظ و بقا کی واحد صورت

تیسری بات جس کی وجہ سے یہ فیصلہ اور بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے ، وہ بہت زیادہ دردناک ہے ، اور وہ یہ ہے کہ اس انقلاب نے جو پچھلے سال ہوا ہے ہمیں ایک نازک مقام پر لاکر کھڑا کر دیا ہے ۔ ہندوستان کا ایک اچھا خاصا بڑا حصّہ اسلام سے اور اسلام کا نام لینے والوں سے بالکل خالی ہو چکا ہے ۔ جس خطے نے کبھی شاہ ولی اللہ اور مجدّد الف ثانی رحمہم اللہ کو جنم دیا تھا ، آج وہاں اذان کی آواز بھی سُنائی نہیں دیتی ۔ وہاں نہ کوئی اذان دینے والا رہا ہے ، نہ کوئی اس کا سُننے والا ۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے باقی حصّے میں بھی اسلام بے دردی کے ساتھ مٹایا جا رہا ہے ۔ اب وہاں صورت حالات یہ ہے کہ ریل میں سفر کرتے ہوئے یہ پہچاننا مشکل ہے کہ مسافروں میں مسلمان کون ہے ۔ بہت سے لوگ جو کل تک اسلام اسلام پکار رہے تھے ، آج وہ اسلام سے توبہ کر رہے ہیں ۔ اب وہاں اگر کوئی مسلمان رہ سکتا ہے تو صرف اسی طرح رہ سکتا ہے کہ وہ یہ ثابت کرے کہ اس میں اسلام کی بُو بھی باقی نہیں ہے ۔ اگر یہی رفتار رہی تو آئندہ چند برسوں میں مسلمان کا وجود ہندوستان میں عنقا ہو جائے گا ۔ ہمارے اسلاف نے ہندوستان میں جو اسلام صدیوں کی لگاتار کوششوں سے پھیلایا تھا وہ اب آٹھ سو سال کے بعد پاکستان کے دو خطوں میں سُکڑ کر رہ گیا ہے ۔ اب اگر ہم نے ایک قدم بھی غلط سمت میں اٹھا دیا تو ہندوستان میں اسلام کی ایک ہزار سالہ تاریخ پر پوری طرح پانی پھر جائے گا ۔ اس برِعظیم ہند کے تین چوتھائی حصّے سے تو اسلام دوسروں کے مٹانے سے مٹ رہا ہے ۔

یہاں یہ ہمارے اپنے مٹاتے مٹے گا۔ اس لیے اب ہمیں اگلا قدم خوب سوچ سمجھ کر اٹھانا چاہیئے۔
اب صرف ایک ٹھوکر ہمارے اور اسلام کے مٹنے میں حائل ہے۔ اگر ہم نے اس موقع پر ٹھوکر کھائی
تو ہمارے اسلاف کے دینی کارنامے کی ساری تاریخ حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے گی۔ یہ سب
وجوہ اس امر کے داعی ہیں کہ ہم فیصلہ کرلیں کہ ہمیں اس ملک کے نظام کو بہرحال اسلامی بنیادوں
پر اٹھانا ہے اور یہاں ہمارے ہاتھوں سے سیاست و تمدن کا جو نقشہ بنے گا وہ اسلام کے منشا
کے مطابق ہی بنے گا۔

موجودہ نظام کو مسلمان بنانے کا طریقہ

اس موقع پر میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس نظام کو جو یہاں اب تک چل رہا ہے، مسلمان بنانے
کا طریقہ کیا ہے؟ کسی نظام کے مسلمان ہونے کا فطری طریقہ بالکل وہی ہے جو ایک فرد کے
مسلمان ہونے کے لیے مقرر ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایک غیر مسلم فرد کو مسلمان بنانے کے لیے
ہم یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ اس کی ظاہری شکل و صورت اور لباس میں کچھ تبدیلیاں کرادی جائیں
اور اسے کہا جاتے کہ اپنے کھانے پینے کی فہرست میں سے بعض چیزوں کو نکال دو اور اپنی عادات
میں چند تبدیلیاں کرلو۔ اور پھر اسے چھوڑ دیا جاتے کہ جاؤ اب تم آہستہ آہستہ مسلمان بن جاؤ گے۔
پھر کچھ مدت کے بعد جب وہ غیر مسلم فرد اپنے اندر بہت سی تبدیلیاں کرچکے تو آخر میں اسے
کلمہ پڑھایا جاتے؟ ــــــ نہیں ہم ایسا نہیں کرتے، بلکہ جب کوئی فرد مسلمان ہونا چاہتا ہے
تو سب سے پہلے اسے کلمہ پڑھایا جاتا ہے اور جب وہ کلمہ پڑھ کے یہ اقرار کرلیتا ہے کہ اب
اسے اپنی زندگی خدا کی بندگی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں بسر کرنی ہے تو پھر ہم
اسے ایک ایک کرکے دین کے احکام بتاتے ہیں اور اس کے اعمال و افعال اور اس کی عادات و
اطوار میں تبدیلیاں کراتے ہیں۔ ٹھیک یہی طریقہ ایک نظامِ حکومت اور نظامِ ملکی کو بھی مسلمان
بنانے کا ہے کہ پہلے اس سے چند بنیادی اصول منوائے جاتے ہیں اور پھر جب وہ ان
اصولوں کو تسلیم کرلیتا ہے تو اس کے سامنے اسلام کے عملی مطالبات تدریجاً رکھے جاتے ہیں اور
اس میں وہ ساری تبدیلیاں پیدا کی جاتی ہیں جو دین کو مطلوب ہیں۔

ہمارے ملک کا نظام اس وقت گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء پر قائم ہے جسے

انگریز نے اپنے اصول و مقاصد کے مطابق بنایا تھا۔ انگریز کی حکومت اسلام کی حکومت نہیں تھی، کفر کی حکومت تھی۔ پاکستان میں بھی وہی نظامِ حکومت اب تک قائم ہے۔ اگرچہ اسے مسلمان چلا رہے ہیں لیکن یہ نظام اپنی فطرت کے لحاظ سے کافرانہ ہی ہے۔ اب اس نظام کو مسلمان بنانے کے لیے اگر کوئی بنیادی تبدیلی سب سے پہلے کرنے کی ہے تو وہ یہی ہے کہ جس طرح فرد کو مسلمان بنانے کے لیے کلمہ پڑھایا جاتا ہے اسی طرح اسے بھی کلمہ پڑھایا جاتے۔ ایک حکومت کو کلمہ پڑھانے کے لیے جو دستوری طریقہ ہو سکتا ہے اُسے ہم نے ایک مطالبہ کی شکل میں مرتب کیا ہے۔ میں اسے پڑھ کر سناتا ہوں اور پھر اس کی تشریح کروں گا تاکہ معلوم ہو جاتے کہ اس اسٹیٹ کو مسلمان بنانے کے لیے پہلا قدم کیا ہونا چاہیئے۔ اور اس کے مطابق کیا جدوجہد کی جانی چاہیئے!

دستوری "مطالبہ"

مذکورہ مطالبہ جو اس موقعہ پر پڑھ کر سُنایا گیا، درج ذیل ہے:

"چونکہ پاکستان کے باشندوں کی عظیم اکثریت اسلام کے اصولوں پر ایمان رکھتی ہے، اور چونکہ پاکستان کی آزادی کے لیے مسلمانوں کی ساری جدّوجہد اور قربانیاں صرف اسی خاطر تھیں کہ وہ اُن اصولوں کے مطابق زندگی بسر کر سکیں جن پر وہ ایمان رکھتے ہیں،

لہٰذا

اب قیامِ پاکستان کے بعد ہر پاکستانی مسلمان دستور ساز اسمبلی سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس بات کا اعلان کرے کہ:

۱۔ پاکستان کی بادشاہی صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور حکومت پاکستان کی کوئی حیثیت اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ اپنے بادشاہ کی مرضی اس کے ملک میں پوری کرے۔

۲۔ پاکستان کا بنیادی قانون اسلامی شریعت ہے۔

۳۔ وہ تمام قوانین جو اسلامی شریعت کے خلاف اب تک جاری رہے ہیں، منسوخ کیے

جائیں گے اور آئندہ کوئی ایسا قانون نافذ نہ کیا جائے گا جو شریعت کے خلاف ہو۔

۴۔ حکومت پاکستان اپنے اختیارات اُن حدود کے اندر استعمال کرے گی جو شریعت نے مقرر کر دی ہیں۔"

اس مطالبہ کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے یہ جان لینا چاہیے کہ جب کسی ملک کا دستور مرتب کیا جاتا ہے تو سب سے پہلے بطورِ اصولِ موضوعہ یہ طے کیا جاتا ہے کہ کن اصولوں کے مطابق نظام بنانا ہے۔ ابھی آپ کے سامنے ہندوستان کا دستور بن چکا ہے اور وہاں آپ دیکھ چکے ہیں کہ سب سے پہلے ملک کی دستور ساز اسمبلی نے ایک قرارداد مقاصد پاس کر کے ان مقاصد (Objectives) کا تعین کیا ہے جن کے لیے وہاں کی حکومت کام کرے گی۔ بالکل اسی طرح پاکستان میں بھی دستور سازی کا پہلا قدم یہی ہو سکتا ہے کہ مقاصد کو طے کر لیا جائے۔ انہی مقاصد کو ہم نے دستوری زبان میں چار نکات کی صورت میں مرتب کیا ہے۔ اب میں اس کی ایک ایک شق کی تشریح کرتا ہوں۔

پہلی شق کی تشریح:

خدا کی حاکمیت

سیاست اور دستور (Constitution) میں بنیادی سوال یہ ہوا کرتا ہے کہ حاکمیت (Sovereignty) کس کی ہے؟ اگر حاکمیت کسی شخص یا کسی خاندان کے لیے مخصوص کی جاتی ہے تو پھر حکومت کی پوری مشینری اسی شخص یا خاندان کی مرضی کے گرد گھومتی ہے۔ اگر حاکمیت (Sovereignty) ملک کے عام باشندوں کی ہو اور مالک الملک خود ملک کے عوام ہوں تو پورا نظام باشندگان ملک کی مرضی کے گرد گھومتا ہے اور حکومت کے تمام ذرائع اور طاقتیں اس لیے استعمال ہوتی ہیں کہ ان مالکانِ ملک، یعنی عام لوگوں کے منشا کو پورا کیا جائے۔ یہ ایک بنیادی سوال ہے اس لیے ہم نے سب سے پہلے اسی کو رکھا ہے۔ پاکستان کے باشندے چونکہ مسلمان ہیں، اس لیے وہ مالک الملک نہیں ہو سکتے، اُن کے مسلمان ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ اپنی حاکمیت اور آزادی سے خدا کے حق میں دست بردار ہو چکے ہیں۔ اب ان کا مقصدِ زندگی ہی یہ ہے کہ وہ ہر شعبۂ زندگی میں خدا کی حاکمیت کو تسلیم کر کے اُسی کے منشا کو پورا کریں۔

پس مسلمانوں کی قائم کی ہوئی حکومت بھی اُسی صورت میں مسلمان ہو سکتی ہے جب کہ وہ اللہ تعالیٰ کو مالک الملک مان کر اس کی مرضی کو پورا کرنے کا فیصلہ کر لے۔

بعض لوگوں نے اس مطالبہ کو یہ شکل دی ہے کہ حکومت یہ اعلان کرے کہ اس کا مذہب اسلام ہے۔ ہمارے نزدیک یہ کافی نہیں، اس لیے کہ بہت سے ملک ایسے ہیں جنہوں نے اپنے دستور (Constitution) میں اپنی حکومت کا مذہب اسلام ہی قرار دے رکھا ہے، لیکن وہاں حاکمیت کسی فرد یا خاندان یا عام باشندگان ملک کی ہے۔ ——— میں کسی ملک کا نام لینا نہیں چاہتا کیونکہ ہم ایک آزاد قوم ہیں اور ہم کسی ہمسایہ ملک سے اپنے تعلقات بگاڑنا نہیں چاہتے ——— بہرحال جب تک کوئی حکومت حاکمیت (Sovereignty) کو اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص نہ قرار دے لے، دستوری حیثیت سے وہ اسلامی حکومت نہیں بن سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اپنی دستور ساز اسمبلی سے پہلا مطالبہ اسی بات کا کرتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت پر ایمان لانے کا صاف صاف اعلان کرے۔

دوسری شق کی تشریح:۔

پاکستان کا بنیادی قانون

دوسری شق پہلی شق کا منطقی نتیجہ ہے۔ چونکہ مالک الملک خدا ہے اس لیے اُسی کی مرضی کو بنیادی قانون کی حیثیت حاصل ہونی چاہیئے۔ اس شق کو مان لینے کے بعد یہاں کی پارلیمنٹ کا حقِ قانون سازی محدود (Limited) ہو جاتا ہے اور ہماری اسمبلیوں کے اختیارات دوسری اسمبلیوں کی طرح غیر محدود نہیں رہتے۔ دوسرے لفظوں میں ہماری اسمبلیاں خدا کی ہدایت سے آزاد ہو کر کوئی قانون سازی نہیں کر سکتیں، بلکہ اُن کے لیے دستوری طور پر لازم ہو جاتا ہے کہ جو قوانین اللہ تعالیٰ نے صاف طور پر بتا دیئے ہیں، انہیں وہ جُوں کا تُوں بے چون و چرا قبول کر لیں اور ان کو پاکستان کے بنیادی قانون کی حیثیت سے نافذ العمل کریں۔ رہے وہ احکام جن کی ایک سے زیادہ تعبیریں ممکن ہیں، ان کی مختلف تعبیروں میں سے کسی ایک تعبیر کو اختیار کرنے کا حق ان لوگوں کو ہوگا جو کتاب و سُنّت کا علم اور فہم رکھتے ہوں۔ پھر جن امور کے متعلق خدا اور رسولؐ نے کوئی واضح احکام نہیں دیئے۔

دہاں واضح احکام نہ دے کر خدا اور رسولؐ نے خود یہ ظاہر کر دیا ہے کہ ان معاملات کے بارے میں مسلمانوں کی جماعت آزاد ہے کہ وہ اپنی ضرورت کے مطابق قاعدہ ضوابط بنائے اور اس کام کے لیے مسلمان عوام بہرحال ان لوگوں ہی کو متعین کر سکتے ہیں جو اجتہاد کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

تیسری شق کی تشریح:-

شریعت اسلامی کا احیاء

یہ شق دوسری شق کا منطقی نتیجہ ہے۔ اس کا منشا یہ ہے کہ جس شریعت کو منسوخ کر کے انگریز نے اپنے قوانین جاری کیے تھے اب وہی شریعت پھر نافذ ہونی چاہیے، اور انگریز کی بنائی ہوئی "کافرانہ شریعت" کو اب منسوخ کرنا چاہیے۔ اب اس ملک کا ہر قانون شریعت اسلامی کے مطابق ہوگا اور کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہوگا کہ شریعت کے خلاف کوئی قانون بنا دے۔ اب اگر کوئی مسودہ قانون شریعت کے خلاف یہاں کی پارلیمنٹ میں پیش ہوگا تو وہ از روئے دستور رد کر دیا جائے گا اور اگر کوئی ایسا قانون پاس ہو بھی جائے تو اس کے خلاف عدالت میں دعویٰ دائر کر کے اس قانون کو منسوخ کرایا جا سکے گا۔

چوتھی شق کی تشریح:-

اسلامی حکومت کی عام پالیسی

کسی نظام کا انحصار صرف قانون پر نہیں ہوتا، بلکہ اس عام پالیسی پر ہوتا ہے جس پر نظام حکومت کو چلایا جاتا ہے۔ حکومت کو تعلیم و تربیت کے لیے ایک نظام بنانا ہوگا، وہ فوج اور پولیس کی تربیت کے لیے کوئی پالیسی اختیار کرے گی، وہ مالیات کا نظام چلانے کے لیے کوئی خاص نقشہ کار تجویز کرے گی، وہ صلح و جنگ اور بین الاقوامی تجارت، اور سفارتی و معاہداتی تعلقات کے لیے کوئی خاص روش اپنائے گی۔ ہم چاہتے ہیں کہ حکومت یہ سارے کام اُن حدود کے اندر رہ کر کرے جو اسلام نے اس کے لیے مقرر کر دی ہیں۔ اگر ہماری حکومت اپنے اختیارات کو مختلف داخلی و خارجی معاملات میں اسلام کی مرضی کے خلاف استعمال کرے تو اسلامی قانون کا اجراء

بے معنی ہو جاتا ہے۔ اسی لیے ہم نے اس شق کو بھی اپنے مطالبہ میں شامل کر دیا ہے تاکہ اگر اسلامی حدود سے باہر جا کر کوئی پالیسی اختیار کی جائے تو اس کے خلاف بھی عدالت میں دعوے دائر کر کے اُسے بدلوایا جا سکے۔

تبدیلی کا نقطۂ آغاز

میرے خیال میں اس تشریح کے بعد "مطالبہ" کا ٹھیک ٹھیک مفہوم سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔ کسی اسٹیٹ کو مسلمان بنانے کے لیے سب سے پہلا قدم یہی ہو سکتا ہے جس کا تقاضا اس مطالبہ میں کیا گیا ہے۔ بس اگر ہم اپنے ملک میں اسلامی نظام حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے ہمیں حکومت سے اس مطالبہ کو منوانا چاہیے۔ اور اگر اس مطالبہ کو مان لیا جائے تو دوسرا قدم یہ ہوگا کہ ایسے اہلِ علم کی ایک کمیٹی بنائی جائے جو قرآن و حدیث کے ساتھ ساتھ دستور (Constitution) اور قانون (Law) دونوں کو خوب اچھی طرح سمجھتے ہوں۔ وہ باہم سر جوڑ کر بیٹھیں اور یہ طے کریں کہ قرآن و حدیث کی رُو سے وہ کون سے اصول ہیں جنہیں پاکستان کا بنیادی قانون قرار پانا چاہیے۔ اور خلافت راشدہ سے وہ کون کون سی باتیں حاصل ہوتی ہیں جن کو نظائر (Precedents) کی حیثیت سے پیش نظر رکھنا ہوگا۔ لیکن یہ معاملہ تو بہر حال بعد کا ہے۔ اور جب اس کا وقت آئے گا تو یہ بھی ہو جائے گا۔ اس وقت تو سب سے اہم معاملہ یہی ہے کہ حکومت پاکستان اپنے دستور کی زبان سے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کرے۔ اس لیے اگر پاکستان کے لوگ فی الواقع یہ چاہتے ہیں کہ یہاں کا نظام حکومت اسلامی ہو تو وہ اس مطالبہ کو اپنا مطالبہ بنائیں۔ یہ میرا یا کسی پارٹی کا مطالبہ نہیں ہے۔ اس میں کسی شخص کو "شیخ الاسلام" بنانے کا یا کسی خاص فرقے کے علماء کو عہدے دلوانے کا، یا کسی خاص سیاسی پارٹی کے حقوق منوانے کا کوئی سوال شامل نہیں ہے، بلکہ یہ مطالبہ پوری اُمت کا ایک عام اجتماعی مطالبہ ہے۔

مطالبہ کیوں؟

اس مطالبہ کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ یہاں ایک مصنوعی انقلاب رونما ہو گیا ہے۔ اگر یہ انقلاب اسلامی اصولوں کے مطابق فطری طور پر رونما ہوا ہوتا تو اس مطالبہ کی ضرورت

پیش نہ آتی، بلکہ انقلاب کے ساتھ ہی آپ سے آپ اِس ملک میں اسلامی حکومت قائم ہو جاتی۔ لیکن بحالاتِ موجودہ ایک مصنوعی انقلاب کے بعد جتنا اس امر کا امکان ہے کہ یہاں اسلامی نظام قائم ہو جاتے، اُتنا ہی اس امر کا بھی امکان ہے کہ ایک غیر اسلامی نظام اس ملک پر مسلط کر دیا جائے۔ اس لیے اِسلامی نظام اب ایک منظّم اور پُر زور مطالبے ہی کے ذریعے قائم کیا جاسکتا ہے۔ اس مطالبے کے لیے جدوجہد کرنے کی ضرورت اس وجہ سے بھی ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں ہم نے اپنی باگیں دے دی ہیں وہ ایک مدت سے متضاد باتیں کہہ رہے ہیں۔ یہ حضرات کبھی یہ کہتے ہیں کہ ہمارے پاکستان حاصل کرنے کے کوئی معنی ہی نہیں اگر یہاں اِسلامی نظامِ حکومت قائم نہ کیا جاتے۔ کبھی کہتے ہیں کہ یہاں ایک لادینی جمہوری اسٹیٹ (Secular Democratic State) قائم کیا جاتے گا۔ کبھی کہتے ہیں کہ یہاں قرآن کی حکومت ہوگی۔ اور کبھی یہ اعلان کرتے ہیں کہ یہاں سیاسی حیثیت سے نہ ہندو ہندو ہوگا نہ مسلمان مسلمان، بلکہ سب محض پاکستانی ہو کے رہیں گے۔ پھر اسلامی حکومت کی بھی مختلف تعبیریں کی جاتی ہیں۔ کبھی اس کی تعبیر یہ کی جاتی ہے کہ یہ انصاف اور مساوات اور اخوت کا ہم معنی ہے اور کبھی "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ نہ معلوم یہ اسلامی سوشلزم کیا چیز ہے؟ میرا خیال ہے کہ یہ لوگ خود بھی اس کا مطلب نہیں جانتے۔ کبھی یہ اِسلامی جمہوریت کا بھی چرچا کرتے ہیں۔ ہم ان سے صاف صاف کہے دیتے ہیں کہ اگر موجودہ نظام جمہوری نظام ہے اور اس میں آپ عوام کے نمائندوں کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں تو آپ کا فرض ہے کہ لوگ جس معنی میں اِسلامی نظام کے خواہشمند ہیں، آپ اُسی معنی میں اُسے قائم کریں، آپ کو اور کچھ کرنے کا حق ہی نہیں پہنچتا۔

مطالبہ کرنے کی دوسری وجہ

پھر یہ مطالبہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم نے جن لوگوں کے ہاتھ میں اختیارات دیئے ہیں ان میں سے بعض ان اختیارات کو ایسی خلافِ اسلام طریق پر استعمال کر رہے ہیں جو قوم کو اسلام سے ہٹا کر غیر اسلام کی طرف لے جانے والا ہے۔ ان میں سے ایک اچھا خاصا گروہ ایسا ہے جو اسلام کے اصولوں پر فی الواقع عقیدہ نہیں رکھتا۔ جنہوں نے مغربی

اصولوں کو اپنے لیے اور اپنی نسلوں کے لیے پسند کر لیا ہے اور اپنے گھروں کی فضا کو ان کے مطابق ڈھال لیا ہے۔ یہ چاہتے ہیں کہ جتنے یہ خود بگڑے ہیں، اتنا ہی پوری قوم کو بگاڑ دیں اور اس کام کے لیے وہ اُن اختیارات کو استعمال کر رہے ہیں جو قوم نے ان کے ہاتھ میں دیے ہیں۔ اس بارے میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی بے شمار مثالیں دن رات ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں۔ مَیں اس کی صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ یہ ہمارے ایک فوجی بھائی کا خط ہے جو اخبار "کوثر" لاہور کے ۱۷ فروری ۱۹۴۸ء کے پرچہ میں، اور "جہانِ نو" کراچی کی ۹ اپریل کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے۔

(خط پڑھ کر سنایا گیا جس میں ملٹری آفیسرز کے ایک تفریحی مجمع کا افسوسناک نقشہ مذکور تھا۔ جہاں کنگ جارج اور قائد اعظم کے جام صحت کے طور پر شراب پی گئی، ماتحت افسروں کو بیویوں کے بے پردہ کرنے کی تلقین کی گئی اور اس کو ترقی منصب کا لازمہ قرار دیا گیا، "نماز" کو فوجی فرائض کے مقابلہ میں مؤخر رکھنے کے لیے ریمارک دیے گئے۔)

یہ ایک مثال ہے اور اس قسم کی بہت سی مثالیں ہمارے سامنے روز آ رہی ہیں۔ ایک جگہ ایک چپراسی نماز کے لیے گیا تو اُسے ڈانٹا گیا۔ لاہور کے میڈیکل کالج کا واقعہ ہے کہ لدھیانہ کا ایک طالب علم جس نے جوشِ ایمان کے تقاضے سے اپنی صورت مسلمانوں کی سی بنا رکھی تھی، جب کالج میں داخلہ کے لیے گیا تو پرنسپل صاحب نے انٹرویو میں فرمایا کہ تمہارے چہرے پر ڈاڑھی ہے، تم کسی مسجد میں جا کر ملّاں بن جاؤ، کالج سے تمہیں کیا واسطہ؟ "جہانِ نو" کی ۹ اپریل کی اشاعت میں ایک مراسلہ شائع ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ محکمۂ فوج میں ڈاڑھیوں پر پابندی لگائی جا رہی ہے۔ میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ ہماری فوج کے ان اعلیٰ عہدے داروں کو کبھی کسی سکھ پر بھی اس قسم کے اعتراض کرنے یا اس طرح کی پابندیاں لگانے کی جرأت ہوتی تھی؟ مَیں نے یہ اخبار جس میں ہمارے فوجی بھائی کا خط چھپا ہے، یہاں کراچی بھیجا، اور دستور ساز اسمبلی کے ارکان کے پاس بھجوایا کہ وہ حکومت سے پوچھیں کہ کیا یہ گورنمنٹ کی پالیسی ہے یا محض افسرانِ حکومت کی ذاتی روش ہے؟ لیکن

کوئی شخص اس سوال کو اُٹھانے کے لیے تیار نہ ہو سکا۔ یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ وہ اس کی کوئی اہمیت محسوس نہیں کرتے یا کم از کم اس کی طرف سے بے اعتنائی برتنا چاہتے ہیں۔

"دلیل معقولیت" کی ضرورت

پھر اس مطالبے کی ضرورت اس لیے بھی پیش آئی کہ ہمارے یہ رہنما انگریز کے شاگرد ہیں۔ اگر یہ دلیل سے ماننے والے ہوتے تو ایک آدمی کا کہہ دینا کافی ہوتا۔ لیکن یہ اس طرح سے ماننے والے نہیں ہیں۔ یہ کسی بات کو اس وقت تک نہیں مانتے جب تک اس کے پیچھے قوت نہ ہو۔ ہم نے خود اس مطالبہ کو بھی دستور ساز اسمبلی کے ارکان کے پاس بھجوا کر حالات کو جانچنے کی کوشش کی ہے، اور ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے اس کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا اور کوئی رکن اسے دستور ساز اسمبلی میں غور و بحث کے لیے پیش کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکا۔ اس لیے اب ہم اس مطالبے کو لے کر قوم کے سامنے آتے ہیں۔ اب یہ فیصلہ آپ کو کرنا ہے کہ آپ کو اسلامی حکومت درکار ہے یا نظامِ کفر؟

منظم اور متحدہ مطالبہ

میں مسلمانوں کے تمام گروہوں سے کہتا ہوں کہ یہاں شخصیتوں اور گروہوں کا سوال نہیں ہے، بلکہ ہم سب خدا کے سامنے جوابدہ ہیں۔ اگر ہمارے ہاتھوں سے یا ہماری نگاہوں کے سامنے یہاں غیر اسلامی نظام قائم ہو گیا تو ہم سب اُس کی عدالت میں پکڑے جائیں گے۔ اس لیے آپ اپنے سارے اختلافات کو بھول جائیے۔ آپ اگر آرام سے بیٹھے رہے تو یہ کام نہیں ہو سکے گا۔ اس مطالبہ کو منوانے کے لیے تمام ضروری تدابیر اختیار کیجیے اور آپ کو خوب معلوم ہے کہ کسی مطالبہ کو منوانے کے لیے کیا کیا تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔ ابھی ابھی آپ نے پاکستان کا مطالبہ منوا کر جو تجربہ کیا ہے اس سے فائدہ اُٹھائیے اور جن صحیح اور مؤثر تدابیر کو آپ نے اُس مطالبہ کو منوانے میں استعمال کیا ہے، اُن سب کو نظامِ اسلامی کے مطالبے کے لیے بھی اختیار کیجیے۔ یہ مطالبہ بھی مخلصانہ کوشش چاہتا ہے، یہ بھی منظم اور متحد طاقت چاہتا ہے اور یہ بھی مال اور وقت اور آرام کی قربانیاں چاہتا ہے۔ اگر ان شرائط کو پورا کر

کے آپ یہ ثابت کردیں کہ یہ قوم کا اجتماعی مطالبہ ہے تو کس طرح ممکن ہے کہ آپ کے لیڈر اس
کے خلاف جائیں۔ آپ اس کے لیے جلسے کیجیے، اس کے لیے ریزولیوشن پاس کیجیے، اس
کے پوسٹر آویزاں کیجیے، اس کو ریل کے ڈبوں اور موٹر بسوں میں لکھوا لیجیے، اسے اپنی خط و
کتابت کے کارڈوں اور لفافوں پر طبع کرا لیجیے تاکہ اس مطالبے کے چار نکات آپ کے
بچے بچے کی زبان پر چڑھ جائیں۔

مسلم لیگی بھائیوں کی ذمہ داری

میں اپنے مسلم لیگی بھائیوں سے کہتا ہوں کہ آپ نے پاکستان اسلامی حکومت قائم کرنے
کے لیے مانگا تھا، آپ نے سب کچھ اسلام کے نام پر کیا، اب آپ آزمائش میں ڈال دیئے
گئے ہیں۔ اس آزمائش پر آپ پورے اترنا چاہتے ہیں تو اس مطالبہ کو اپنا مطالبہ بنائیے،
اسے ابتدائی مسلم لیگوں سے پاس کرائیے، پھر صوبائی مسلم لیگوں کے سامنے یہ مسئلہ
لائیے اور پھر جو لوگ اس مطالبے سے متفق نہ ہوں، انہیں لیگ سے باہر نکال دیجیے۔
اب اشتراکیوں اور ملحد قسم کے لوگوں کے مسلم لیگ پر قابض رہنے کی کوئی وجہ باقی نہیں
رہی ہے۔ اگر یہ دونوں باتیں ہو جائیں تو پھر مسلم لیگ اور جماعت اسلامی میں کوئی اختلاف
باقی نہیں رہتا بلکہ دونوں قریب قریب ایک ہو جاتی ہیں۔

تعلیم یافتہ طبقہ کا فرض

میں اپنے ملک کے تعلیم یافتہ طبقے سے بھی اپیل کرتا ہوں کہ وہ وقت کی نزاکت کو
محسوس کریں۔ ان پر اس سلسلہ میں بڑی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ کسی ملک کی قوت لوہا
اور کوئلہ نہیں ہے بلکہ اس کے سوچنے اور سمجھنے والے لوگ ہی اس کی اصل قوت ہوتے
ہیں۔ آپ حضرات قوم کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کو فیصلہ کرنا چاہیے کہ
آپ کو اپنا وزن کس پلڑے میں ڈالنا ہے؟ اگر آپ کو اپنے اطمینان کے لیے دلائل درکار
ہیں تو ہم آپ کے تمام شکوک و شبہات دور کرنے کے لیے تیار ہیں اور آپ کو مطمئن کر
سکتے ہیں کہ آپ کی، آپ کی قوم کی، بلکہ پوری دنیا کی فلاح اسی میں ہے کہ یہاں اسلامی
نظام حکومت قائم ہو۔ اگر آپ اس پر مطمئن ہو چکے ہیں تو آپ کی ساری قوتیں اور قابلیتیں

اس کی تائید میں صرف ہونی چاہئیں - پہلے پاکستان بننے کا مقصد بھی قوم کو اس وقت تک حاصل نہیں ہوا جب تک آپ نے اپنا سارا وزن اس پلڑے میں نہیں ڈالا - اب نظام اسلامی قائم کرنے کا مقصد بھی اسی وقت پورا ہوگا جب کہ آپ اپنا پورا وزن اس پلڑے میں ڈال دیں گے -

علماء و مشائخ سے گزارش

میں علماء اور مشائخ سے بھی کہتا ہوں کہ براہ کرم جزئی اختلافات کو چھوڑ دیجئے اور اپنی ساری کوششیں اس کام پر مرتکز کر دیجئے - اگر یہ اصلاح ہوگئی تو سارے مسائل حل ہو جائیں گے - آپ کو معلوم ہے کہ جب کسی ملک میں غیر اسلامی نظام نافذ ہو جاتا ہے تو ایک ایک کر کے اس میں سے اسلام کے سارے نشانات مٹ جاتے ہیں - آپ کو معلوم ہے کہ دنیا میں ایک ملک ایسا بھی ہے جس نے مسلمان ہوتے ہوئے حج کو برسوں ممنوع رکھا، قرآن کے قوانین کو منسوخ کر کے اُن کے بجائے دوسرے قوانین بنائے، قرآن مجید نے عورت کا حصہ وراثت میں مرد سے آدھا رکھا ہے اُس نے ازروئے قانون عورت کا حصہ مرد کے برابر کر دیا - ہمارے ملک میں اب تک اسلام سے جو رعایات روا رکھی گئی ہیں اور جو نرمی کا سلوک اس سے کیا گیا ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ یہاں ایک غیر قوم کی حکومت تھی اور اس کی مصلحت اسی میں تھی کہ وہ مذہب کے معاملہ میں ذرا ڈھیل دے دے - لیکن اگر آپ کے اپنے ووٹوں سے یہاں لادینی حکومت قائم ہوگئی تو پھر اسلام کا نشان اس ملک میں باقی نہ چھوڑا جائے گا - کیونکہ آپ کو معلوم ہے کہ اسی دنیا میں ایک مسلمان ملک کی حکومت ایسی بھی ہے جس نے لادینی نظام قائم کرنے کے بعد دینی تعلیم کو قانون کی طاقت سے حرام کر دیا ہے - اس لیے آپ اب جزئیات اور فروعات کو بھول جائیے اور ساری قوت اس کام پر اور اس بنیادی اصول کو منوانے پر صرف کر دیجیے کہ یہاں کا نظام اپنی بنیادی فطرت کے لحاظ سے صحیح معنوں میں اسلامی ہوگا -

یہ جو کبھی کہا جاتا ہے کہ شراب بند کی جائے، کبھی یہ کہ زنا کے اڈے اُڑا دیئے جائیں ـــــ تو یہ کام تو کانگریسی حکومت بھی کرتی رہی ہے - کیا ان کاموں کے کرنے

سے کوئی حکومت اسلامی حکومت ہو جائے گی؟ پھر کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کا ایک بیت المال قائم کیا جائے جس میں زکوٰۃ کی وصول اور صرف کا انتظام کیا جائے۔ لیکن یہ تو وہ حقوق ہیں جو کبھی ہم نے اپنی اسلامی حکومتوں میں اپنے ہاں کے ذمیوں کو دیئے تھے، اور جو امریکہ، رومانیہ اور یوگوسلاویہ، بلکہ روسی ترکستان تک کی حکومتوں نے اپنی مسلمان رعایا کو دے رکھے ہیں ۔۔۔ کیا ان باتوں سے کوئی نظامِ حکومت اِسلامی نظام میں بدل جاتا ہے؟

جزئی مطالبات چھوڑ دیجیے

ہم تو وہ حکومت چاہتے ہیں، جس کی ساری اسمبلیاں اور وزارتیں، نظامِ تعلیم اور نظامِ عدالت اور پورے کا پورا مالیاتی نظام اسلام کے سانچے میں ڈھل جائے۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ بیت المال تو علماء کی تحویل میں رہے اور مالیات کا نظام غیر اسلامی ہاتھوں میں رہے۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ملک کا پورا خزانہ اسلامی بیت المال میں بدل جائے۔ لہٰذا براہِ کرم آپ حضرات چھوٹی چھوٹی چیزیں نہ مانگیے، ورنہ ایسی دو ایک چیزیں دے کر آپ کو مطمئن کر دیا جائے گا۔ پھر اگر آپ اس کے بعد کوئی اور جزئی مطالبات سامنے لائیں گے تو کہا جائے گا کہ یہ مُلّا لوگ نہایت نامعقول ہیں، ان کے مطالبات کبھی ختم نہ ہوں گے اور یہ ملک کی ترقی اور استحکام کے راستے میں خواہ مخواہ روڑے اٹکاتے رہیں گے۔ پس آپ اپنی ساری قوت اُس بنیادی مطالبے کے منوانے پر صرف کیجیے جس کے اندر آپ کے سارے مطالبات مضمر ہیں۔

سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کو تنبیہ

اب میں کچھ باتیں اپنے ملک کے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں سے کہنا چاہتا ہوں۔ آپ حضرات نے ناجائز طریقوں سے جو کچھ سمیٹ رکھا ہے، اسے تو اب بہرحال جانا ہے۔ سرمایہ پرستانہ طور طریقوں کا اب زمانہ نہیں رہا۔ اب روپے کی خدائی کا تخت متزلزل ہو رہا ہے۔ اب دوسروں کی محنتوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے اور اسراف اور عیاشی کی زندگی کے لیے دوسروں کی کمائیوں میں سے سرمائے کے زور پر اپنے حق سے زائد وصول کرنے کا سلسلہ بہرحال ختم ہونا ہے۔ ان چیزوں کو ختم کرنے کے لیے آپ دو ہاتھوں میں سے ایک ہاتھ کو پسند کر لیجیے۔ ایک ہاتھ وہ ہے جو

آپ کے خود ساختہ حقوق اور اعزازات کے ساتھ خود آپ کو بھی مٹا دے گا اور دوسرا ہاتھ وہ ہے جو جب بھی اُٹھے گا، انتقام کے لیے نہیں، انصاف کے لیے اُٹھے گا، اور وہ آپ سے صرف اتنا ہی چھینے گا جو آپ نے ناجائز طور پر سمیٹ رکھا ہے۔ اگر آپ نے انصاف کرنے والے خدا پرست ہاتھ کو پسند نہ کیا تو پھر یہاں دوسرا انتقامی ہاتھ بھی بہرحال دراز دستی کے لیے موجود ہے اور وہ اپنا کام کر کے رہے گا۔

مزدوروں اور کسانوں سے اپیل

اسی طرح میں اپنے ملک کے مزدوروں اور کسانوں سے بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں، اور وہ یہ ہے کہ آدمی صرف روٹی کے لیے نہیں جیتا، آدمی کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز آدمیت ہے۔ اگر آپ کو کوئی ایسا نظام ملے جو آپ کے لیے روٹیوں کا تو انتظام کر دے، مگر آپ کی آدمیت کو ختم کر دے تو اسے ہرگز قبول نہ کیجیے۔ ایک نظام ایسا بھی موجود ہے جو آپ کو روٹی بھی دیتا ہے اور آپ کی آدمیت کا بھی انتظام کرتا ہے۔ وہ آپ کے مسئلے بھی حل کرتا ہے اور آپ کو روحانیت اور انسانیت کے مدارج بھی طے کراتا ہے۔

مسلم عوام سے خطاب

اب میں مسلمان عوام سے چند باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ آپ کو سمجھنا چاہیے کہ اسلام کیا ہے۔ اگر آپ اسلام کی حقیقت سے ناواقف رہے تو ہو سکتا ہے کہ اسلام کا نام لے کر آپ کو کفر کی طرف دھکیل دیا جائے، شراب کی بوتل پر شربت کا لیبل لگا کر اسے آپ کے ہاتھ فروخت کیا جائے اور آپ اسے لپک کر لے لیں، یہاں ایک غیر اسلامی نظام قائم کر دیا جائے اور اس کے ساتھ کچھ نمائشی چیزیں اسلام کی شامل کر دی جائیں اور آپ ان نمائشی چیزوں سے دھوکا کھا کر مطمئن ہو جائیں کہ بس اب اسلامی نظام قائم ہو گیا۔

ہم نے اپنی ساری قوت اس مقصد پر لگا دینے کا فیصلہ کر لیا ہے کہ ملک کے عوام میں صحیح اسلامی شعور بیدار ہو۔ ہم اُن کو جھنڈوں اور جلوسوں اور جذباتی نعروں سے ایک کھوکھلے اشتغال میں مبتلا کرنے کا طریق کار صحیح نہیں سمجھتے اور نہ یہ چاہتے ہیں کہ وہ اندھے جذبات کی رو میں بہنے لگیں۔ بلکہ ہم ان کے اندر اسلام کے لیے جینے اور مرنے کا شعوری ولولہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

پر ایک حقیقت ہے کہ اگر ہمارے ملک کی حکومت کے لیے ایک ایسا دستور بنا دیا جائے جو سو فیصدی اسلامی ہو، لیکن اس کی پُشت پر اسلامی سوسائٹی نہ ہو تو وہ اسلامی دستور کوئی حقیقی نتیجہ نہیں دکھا سکتا اور نہ اس کے بل پر اسلامی نظام چل سکتا ہے۔ کوئی دستور کاغذ کے اوراق پر نہیں چلا کرتا۔ بلکہ اس کا بننا اور اس کا کام کرنا اس بات پر موقوف ہوتا ہے کہ ملک کے عوام کی کتنی منظم طاقت اس کو چلانے کا عزم رکھتی ہے۔ اسی لیے ہم چاہتے ہیں کہ جو لوگ اسلام کو اپنے دین اور مسلکِ زندگی کے طور پر پسند کرتے ہیں وہ ہمارا ساتھ دیں اور دین کی خدمت کے لیے منظم ہوں۔

اب میں اُن عذرات کو رفع کرنے کی کوشش کروں گا جو وہ طبقہ ہمارے سامنے پیش کر رہا ہے جو اسلامی نظام کو پسند نہیں کرتا اور اس کے قیام کا مخالف ہے۔

استحکام پاکستان کا عذر

ہم سے کہا جاتا ہے کہ یہ نوزائیدہ حکومت ابھی ابھی بنی ہے اور جمی نہیں ہے۔ سرحد پر چاروں طرف سے خطرہ ہے۔ بس اِس وقت ساری طاقت پاکستان کو مضبوط کرنے میں صرف ہونی چاہیئے اور اسلامی حکومت کی بنیاد رکھنے کے کام کو ملتوی رکھنا چاہیئے۔

مَیں کہتا ہوں کہ پاکستان کو مضبوط کرنے کی کوشش کرنا ہر اُس شخص کا فرض ہے جو اس میں رہتا ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ پاکستان کے لیے اصل خطرہ کہاں ہے؟ ——— اس کے اندر یا باہر؟ مَیں کہتا ہوں کہ اصل خطرہ باہر سے نہیں، بلکہ اندر سے ہے، اس لیے کہ اِس کشتی کے ملاح دن رات اس میں چھید کرتے رہتے ہیں۔ ان کی رشوت خوری اور اقربا پروریاں پاکستان کو مسلسل کمزور کر رہی ہیں۔ جن نازک حالات کا رونا یہ دن رات خود روتے ہیں ان میں جو حرکات یہ لوگ خود کر رہے ہیں انہیں دیکھ دیکھ کر اکثر مسلمان یہ کہتے سُنے جاتے ہیں کہ اگر پاکستان میں بھی یہی کچھ ہونا تھا تو ہم ہندوستان میں کیا بُرے تھے؟ کتنے ہی مظلوم مہاجر یہ سوال کرتے پائے گئے ہیں کہ کیا پاکستان ان ہی مقاصد کے لیے بنایا گیا ہے؟ یہ چیزیں ہمارے عوام کا دل توڑنے والی اور ان کے جذبات کو سرد کرنے والی ہیں۔

پاکستان کو مضبوط بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے ایک ایک نوجوان اور ایک ایک فوجی سپاہی کے دل میں یہ بات بیٹھ جائے کہ جب وہ لڑے گا تو محض زمین کے

لیے نہیں، بلکہ خدا کے لیے لڑے گا اور اگر وہ جان دے گا تو قوم کے کچھ لیڈروں اور عہدیداروں کے لیے نہیں، بلکہ خدا کے دین کے لیے دے گا۔ اگر آپ اپنے ہر فوجی کو اس بات پر مطمئن کر دیں کہ تیری خدمات صرف اسلام کے لیے حاصل کی گئی ہیں تو پھر دیکھیے کہ وہ کس جرأت اور دلیری سے لڑتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ہم اپنے نوجوانوں اور اپنے سپاہیوں کے دلوں کو اطمینان دلانے کی اس کے سوا کوئی اور تدبیر نہیں رکھتے کہ پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کا صاف صاف دستوری اعلان کر دیں۔ پھر کون معقول آدمی اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ جو چیز ہم پیش کر رہے ہیں وہ پاکستان کو مستحکم کرنے والی ہے اور عین اس کے استحکام ہی کے لیے اس کو کامیاب بنانے کی ضرورت ہے۔

انتشار انگیز عصبیتیں

پاکستان کو مستحکم کرنے کے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ مختلف عناصر اور مختلف صوبے متحد ہو کر ایک بنیانِ مرصوص بن جائیں۔ لیکن جن اصولوں پر ہم آج تک کام کرتے رہے ہیں ان کا قدرتی نتیجہ یہ نمودار ہو رہا ہے کہ ہر گروہ جو اپنا کوئی مختلف مفاد رکھتا ہے وہ ایک جداگانہ عصبیت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ یہ بے اصول قومی وحدت پیدا کرنے والی مغربی سیاست کے زہر کا اثر ہے کہ اب ایک پاکستان میں ایک مسلمان قوم نہیں بلکہ پانچ علاقائی قومیں بن گئی ہیں: سندھی، بلوچی، پنجابی، افغانی اور بنگالی! ان سب کو یکجا کر کے بنیان مرصوص صرف اسلام ہی کے ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔

پھر یہاں "انصار" اور "مہاجرین"[1] کی باہمی کشمکش کے سبب سے ان کے دو الگ الگ نظام بن رہے ہیں اور دو الگ الگ ریاستیں رونما ہو رہی ہیں۔ اور اگر حالات اسی رفتار پر رہے اور ان کا کوئی سدِّباب نہ کیا گیا تو یہ مسئلہ بھی پاکستان کے لیے ایک مستقل خطرہ بن

---

[1] یہ الفاظ طنزیہ استعمال کیے گئے ہیں۔ ورنہ اسلامی اصطلاح کے لحاظ سے نہ مقامیوں نے کبھی "انصار" کا سا رویّہ اختیار کیا اور نہ ہندوستان سے آنے والوں نے مہاجرین کا سا رویّہ، الّا ماشاء اللہ۔ (جدید)

کے موجود رہے گا۔ آپ اس واقعہ سے خطرہ کا اندازہ کیجیے کہ مشرقی پنجاب سے آئی ہوئی ایک برادری کو جب مغربی پنجاب کی سرحد پر آباد کیا گیا تو وہاں کے مقامی باشندوں نے سکھوں کو دعوت دے کر ان پر حملہ کرا دیا۔ یہ متضاد عناصر پاکستان کے لیے اس وقت تک خطرہ ہیں جب تک ان کے درمیان عصبیتیں کام کرتی رہیں۔ ان کو اگر باہم جوڑا جا سکتا ہے تو اسلامی نظام کی فضا میں اسلامی اصولوں کے ذریعہ ہی جوڑا جا سکتا ہے، ورنہ ان کے ہر وقت متصادم ہو جانے کا امکان ہے۔

مسئلۂ مہاجرین کا واحد حل

اگر پاکستان حاصل ہونے سے پہلے ہمارے لیڈروں نے قوم کے اخلاق کی صحیح تعمیر اسلامی اصول پر کر لی ہوتی تو مہاجرین واقعی "مہاجرین" ہوتے اور انصار واقعی "انصار"، پھر ان کا مسئلہ حل کرنے میں ہمیں وہ مشکلات پیش نہ آتیں جو آج دن رات پیش ہیں۔ قوم میں اسلامی حس بیدار ہوتی تو یہاں کے لوگ اپنے گھروں سے نکل کر مشرقی پنجاب کے مظلوموں کا استقبال کرتے، خود زمین پر سوتے اور اپنے بستر اور پلنگ آنے والوں کے حوالے کر دیتے۔ یہ مسئلہ کوئی آج ہی ہمارے سامنے نہیں آیا۔ اس سے پہلے بھی آ چکا ہے۔ مدینہ کی چھوٹی سی بستی نے مکہ اور عرب کے مختلف قبائل کے مہاجرین کی ایک کثیر تعداد کو اس صبر و سکون سے جذب کیا کہ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوتی کہ اہلِ مدینہ کو کوئی مشکل مسئلہ درپیش ہے، درآنحالیکہ اس زمانے میں تمدنی ذرائع و وسائل بہت ہی ابتدائی حالت میں تھے۔ وہاں بھی اس مسئلہ کو اسلامی اسپرٹ اور اسلامی اخلاق نے حل کیا تھا اور یہاں بھی اس گتھی کا واحد حل یہی ہے۔

اب یہ بات ہر شخص کے خود سوچنے کی ہے کہ پاکستان کو کمزور کرنے والی شے وہ ہے جسے ہم پیش کرتے ہیں یا وہ ہے جو اس کے خلاف کی جا رہی ہے؟

ہندوستان میں ہندو حکومت کے قیام کا خدشہ

دوسرا عذر یہ پیش کیا جاتا ہے کہ اگر یہاں اسلامی حکومت قائم کر دی گئی تو ہندوستان میں ہندو حکومت قائم ہو جائے گی۔ میں کہتا ہوں کہ کیا ہندوستان میں ہندو حکومت قائم نہیں ہو چکی؟ کا عذر یہ کہا جا رہا ہے کہ انڈین یونین کی حکومت کا کوئی مذہب نہیں اور اس میں سب کو

برابر کے حقوق حاصل ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہاں مسلمانوں کو زمین پر چلنے کے بھی حقوق حاصل نہیں ہیں۔ اس لیے آپ وہاں کی فکر نہ کریں، وہاں تو جو کچھ ہونا تھا، ہو چکا۔ دوسری بات میں یہ کہتا ہوں کہ اب تک جو نقصان ہمیں پہنچا ہے وہ اسی لیے پہنچا ہے کہ ہم اسلام کا نام تو لیتے ہیں لیکن اسے اپنی زندگی کا دستور العمل نہیں بناتے۔ اگر یہاں ایک مرتبہ اسلامی نظام قائم ہو جائے جو بے لوث انصاف کے بل پر چلے اور یہاں کی حکومت وعدے کی کھری ہو، اور اپنے طرزِ عمل سے ثابت کر دے کہ اس کے تمام معاملات عدل و انصاف اور صداقت و دیانت پر مبنی ہوتے ہیں تو میں کہتا ہوں کہ نہ صرف ہندوستان کے مسلمانوں کی قسمت جاگ اُٹھے بلکہ خود ہندوستان کی قسمت بھی بدل جائے۔ آخر پہلے یہ ہندوستان کے مسلمان کہاں سے آئے تھے؟ یہیں کے ہندو ہی تو زیادہ تر مسلمان ہوئے تھے۔ تو پھر آج بھی اگر آپ دکھا دیں کہ اسلام سے ملک کا انتظام کیسا درست ہوتا ہے، معاشی اور معاشرتی نظام کتنے صالح ہو جاتے ہیں، پالیسی کتنی بے لاگ ہوتی ہے تو ہندوستان کے لوگ سوچنے لگیں گے کہ آخر کیوں نہ ہم بھی اس نظام کو اختیار کر لیں۔ وہ آپ کے دشمن تو ہو سکتے ہیں، مگر اپنے تو دشمن نہیں ہیں۔ یہی ایک صورت ہے جس سے ہماری آٹھ سو سالہ تاریخ جس پر خطِ نسخ پھر گیا ہے، از سرِ نو زندہ کی جا سکتی ہے۔

ہندو اقلیت کا عذر

پھر یہ عذر کیا جاتا ہے کہ اسلام کی حکومت کو ہندو اقلیت کیسے گوارا کرے گی۔ یہ عذر بھی مہمل ہے۔ ابھی پچھلے دنوں سرحد اسمبلی میں کوڑو رام نے ایک ریزولیوشن پیش کیا ہے جس میں سرحد اسمبلی سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ دستور ساز اسمبلی کو صوبہ سرحد کے عوام کی اس خواہش سے آگاہ کرے کہ وہ پاکستان میں اُس نظامِ حیات کو جلد از جلد نافذ کرانا چاہتے ہیں جس کی بنیاد قرآن کے قوانین پر ہو، یہ نظام یقیناً دنیا کے لیے ایک قابلِ تقلید مثال ثابت ہوگا۔

چند ہی روز پہلے میرے پاس مدراس سے ایک خط آیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ "اسلام کا نظریہ سیاسی" اور "معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل" (میرے دو رسالے) پڑھنے کے بعد ایک تعلیم یافتہ ہندو نے کہا کہ "ہم پر یہ چیز کبھی واضح نہیں کی گئی کہ پاکستان میں اس طرح کا صالح نظام

حیات قائم کیا جائے گا۔ اگر مسٹر جناح اس چیز کی وضاحت فرما دیتے تو کوئی ذی فہم انسان اس کی مخالفت نہ کرتا۔

غیر مسلم اقلیتوں سے اپیل

تاہم مجھے معلوم ہے کہ ہمارے ملک کے بہت سے غیر مسلم حضرات اس سے گھبرا رہے ہیں کہ وہ ایک ایسی حکومت کے فرمانبردار کیسے ہو سکتے ہیں جو ایک مذہب کی پابند ہو۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ ہمارے غیر مسلم بھائی ایک چیز کو محض نہ جاننے کی وجہ سے اُس سے اختلاف کر رہے ہیں، حالانکہ یہ صحیح معنوں میں وہی چیز ہے جسے گاندھی جی "رام راجیہ" کہتے تھے اور ہمارے عیسائی بھائی "آسمانی بادشاہت" کہتے ہیں۔ ہم اپنے ہندوستانی ہندو بھائیوں کے شکر گزار ہوں گے، اگر وہ ہندوستان میں تحقیق رام راجیہ قائم کر دیں۔ اس رام راجیہ میں بنیادی انسانی حقوق کی حفاظت موجودہ لادینی حکومت کی بہ نسبت زیادہ بہتر طریق سے ہوگی۔ میں اپنے غیر مسلم بھائیوں کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر یہاں اسلامی حکومت قائم ہوگی تو اُن کے حقوق بالکل محفوظ ہوں گے اور زمین پر بھی ان کو وہی حقوق دیئے جائیں گے جو کاغذ پر ہوں گے۔ لیکن اگر یہاں جمہوریت کی لادینی حکومت قائم ہوتی تو یہ مسلمانوں کی "قومی حکومت" ہوگی جس میں اکثریت اپنی مرضی کے مطابق اپنے سارے قومی تعصبات کے ساتھ من مانی کارروائیاں کرے گی۔ اسلامی حکومت کے قائم ہونے کی صورت میں جو حقوق اسلام میں آپ کے لیے مقرر ہیں، مسلمانوں کو اور ان کی حکومت کو اس کا اختیار ہی نہیں رہے گا کہ وہ ان میں کمی بیشی کریں۔ یہاں کا مسلمان اپنے اخلاقی طرزِ عمل کو انڈین یونین کے یا دنیا کی کسی اور غیر مسلم قوم یا حکومت کے رویئے کو دیکھ دیکھ کر نہیں بدلے گا، بلکہ اس کا طرزِ فکر یہ ہوگا کہ دُوسری قومیں اور حکومتیں اگر اپنے عہد کو توڑتی ہیں تو توڑیں، مَیں مسلمان ہو کر اپنے عہد کو کیسے توڑ سکتا ہوں۔

یہ بات آپ کو معلوم ہے کہ گزشتہ فسادات میں اگر کسی نے یہاں غیر مسلموں کو ظلم سے بچانے کی کوئی بے غرضانہ کوشش کی ہے تو وہ دیندار لوگ ہی تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ہندوستان میں ان کے بھائیوں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے، لیکن پھر بھی ان کی خدا خوفی اور انسانی ہمدردی نے انہیں زیادتی اور ظلم سے نہ صرف باز رکھا، بلکہ انہوں نے حتی الامکان اپنے غیر مسلم بھائیوں کو پناہ دی اور محفوظ مقامات تک پہنچایا اور اس کام میں اپنی جان اور مال کی ذرا پروا نہ کی۔ ہمارے پاس ایسے بہت سے واقعات کی

نہ صرف یہ کہ ریکارڈ ہے، بلکہ خود غیر مسلم حضرات کے متعدد اعترافی خطوط ہم تک پہنچے ہیں اور ہندوستان جانے والے غیر مسلموں میں سے ہزاروں اس کی گواہی دیں گے۔

اسلامی حکومت کی گارنٹی

اسلامی حکومت کی صورت میں یہاں جو گارنٹی دی جائے گی وہ ہماری طرف سے نہیں، بلکہ خدا اور رسولؐ کی طرف سے ہوگی۔ حضورؐ کے الفاظ ہیں کہ جو ذمہ دیکر پھر خلاف عہد کرے قیامت کے روز میں خود اس کے خلاف مدعی ہوں گا اور وہ جنت کی بو بھی نہ سونگھے گا۔ پھر حضورؐ کی آخری وصیت میں جہاں نماز اور عورتوں کے حقوق کی تاکید تھی، وہاں ذمیوں کے حقوق کی ادائیگی کا بھی حکم تھا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ جب مسلمان فوج ایک جگہ سے پسپا ہونے پر مجبور ہوئی تو انہوں نے غیر مسلموں کو بلا کر ان کے ٹیکس واپس کر دیئے کہ ہم نے ٹیکس آپ کی حفاظت کی ذمہ داری کے معاوضے کے طور پر لیے تھے اور چونکہ اب ہم حفاظت کی ذمہ داری پوری کرنے سے قاصر ہیں، اس لیے اس رقم پر بھی اب ہمارا کوئی حق نہیں رہا جو تمہاری حفاظت کے لیے لی گئی تھی۔ میں غیر مسلم بھائیوں سے کہوں گا کہ یہ نظام آپ کے لیے رحمت ہوگا، آپ اس کے قائم کرنے میں ہمارا ساتھ دیجیے اور ہمیں مدد پہنچائیے۔ اسلامی نظام میں آپ کے لیے مغربی طرز کی بے دین جمہوریت کے مقابلے میں اتنی زیادہ برکات ہیں کہ اگر آپ کو ان کا اندازہ ہو تو آپ مغربی جمہوریت کی مخالفت اور اسلامی حکومت کے قیام کے لیے مسلمانوں سے بڑھ چڑھ کر کوشش کریں۔

دنیا کی رائے عام کے بگڑ جانے کا ہول

یہ عذر بھی کیا جاتا ہے کہ اگر ہم نے مذہبی حکومت قائم کی تو دنیا کی رائے عام ہمارے متعلق خراب ہو جائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کی وجہ سے ہمیں اپنے اسلام پر شرمانا چاہیے۔ میں کہتا ہوں کہ ہمیں اسلام پر اتنا بھی ایمان نہیں جتنا ۱۹۱۷ء میں روس کے کمیونسٹوں کو کمیونزم پر تھا۔ وہ لوگ جب جنگ سے نکلے تھے تو ملک کی معاشی حالت ناگفتہ بہ تھی، سارا نظام درہم برہم تھا، ملک چاروں طرف سے دشمنوں میں گھرا ہوا تھا، فوج شکست خوردہ اور صنعت و حرفت خستہ حال تھی، اور یہ بھی واضح تھا کہ اشتراکی نظام کے قیام کے ساتھ ہی دنیا کی ساری سرمایہ دار طاقتیں اس کے خلاف ہو جائیں گی۔ لیکن ان ساری باتوں کے علی الرغم انہوں نے یہ نظام قائم کیا اور اب ہر سرمایہ دار

طاقت اس سے لرزہ براندام ہے۔ ہمیں دوسروں کی طرف نہیں، اپنی طرف دیکھنا چاہیئے کہ ہمارے مسلمان ہونے کا تقاضا کیا ہے۔ ہمیں اس تقاضے کو پورا کرنا چاہیئے۔ دنیا کی رائے عام اسلام اور مسلمانوں کے متعلق خراب ہوتی ہی اس وجہ سے ہے کہ ہم نے اسلام کو میدان عمل سے باہر رکھ کر اپنے آپ کو مسلمان کی حیثیت سے روشناس کرایا ہے، چنانچہ اسلام بھی مضحکہ بن گیا اور مسلمان بھی۔ لیکن اب اگر ہم اسلام کو میدان عمل میں لاکر اسے پورا اقتدار دیدیں تو دنیا کی رائے عام مستقل طور پر اسلام کے بارے میں بھی درست ہو جائے گی اور ہم مسلمانوں کے بارے میں بھی! ہو سکتا ہے کہ لوگ ایک دو سال تک غلط فہمیوں میں مبتلا رہیں، لیکن دو چار سال کے بعد وہ ہمارے متعلق اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہوں گے اور یہ تسلیم کریں گے کہ یہ لوگ تو ہمارے رہنما بننے کے قابل ہیں، کیونکہ ان کے پاس وہ چیز ہے جس کی بنیاد پر ایک جہانی ریاست (World State) بن سکتی ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ پاکستان میں اسلامی نظام کے تجربے کو دیکھ کر ان کے دل آپ کے سامنے جھکنے نہ شروع ہو جائیں۔

"ملّاؤں" کی حکومت کا شبہ

ایک عذر تو یہ بھی تراشا گیا ہے کہ اسلامی حکومت تو "ملّاؤں" کی حکومت ہوگی اور ملّا دنیا کے معاملات کو کیا جانیں۔ میں اس عذر کے گھڑنے والوں کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہم آپ کے اس "بادبان" سے بھی ہوا نکال چکے ہیں۔ پاکستان میں اب جو لوگ اسلامی نظام کے مطالبے کو لے کر اٹھے ہیں وہ "ملّا" نہیں ہیں بلکہ آپ کی طرح دنیا کے معاملات کو بھی خوب سمجھتے ہیں اور اس کے ساتھ قرآن و حدیث کو بھی! ——— اسلامی حکومت کے مطالبے کو لانیوالے لوگ جدید فلسفہ و سیاست کو بھی آپ سے بہتر طور پر سمجھنے والے ہیں اور قرآن کے فلسفہ و سیاست سے بھی کورے نہیں ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ اسلامی حکومت اگر قائم ہوگی تو وہ اپنے چلانے کیلیے ایسے ہی آدمی طلب کریگی جو موجودہ دور میں اسلامی اصول پر کام کر سکیں۔ ہمیں ملک کے باشندوں اور رائے دہندوں کو بتانا پڑے گا اور اس بارے میں ان کی ذہنی تربیت کرنی ہوگی کہ وہ اسلامی حکومت کے لیے کیسے آدمی فراہم کریں۔ اگر ہمیں مندر کے انتظام کیلیے آدمی مطلوب ہوں تو لوگ ویسے ہی آدمی تلاش کر کے دیں گے، اور اگر مسجد کے انتظام کیلیے کارکن درکار ہوں تو ویسے ہی آدمی ان کے سامنے آئیں گے، اور ایک بنک کا نظام چلانا ہو تو اس کی صلاحیت رکھنے والے آدمی ہی چنے جائیں گے۔ اسی طرح اگر اسلامی حکومت کو چلانے کے لیے کارکنوں کی

ضرورت ہوگی تو رائے عام اس کام کی صحیح صلاحیتیں رکھنے والوں کو چھانٹ کر آگے لانے لگے گی یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ ہمارے ملک میں اسلامی نظام کو چلا سکنے والے کارکنوں کا بالکل قحط ہے۔ ایسے آدمی موجود ہیں اور پبلک ہی کے اندر نہیں، بلکہ خود آپ کی حکومت کے موجودہ پرسنوں میں بھی اس معیار کا ایک بڑا طبقہ موجود ہے۔

غیر اسلامی نظام میں اسلامی قانون

پھر یہ کہا جاتا ہے کہ کیوں نہ نظام تو غیر اسلامی رکھا جائے اور عدالتی قانون اسلام کا جاری کر دیا جائے؟ میں کہتا ہوں کہ پھر کیوں نہ ایک سکھ کو مسجد کا امام بنا دیا جائے؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ریاست تو اپنے آپ کو لامذہب سمجھے اور قانون وہ مذہب کا جاری کرے۔ مجھے اس رائے کے پیش کرنے والوں کی عقل پر رحم آتا ہے۔ ایک غیر اسلامی نظام کے ڈھانچے میں اسلامی قانون کا صحیح طور پر نشوونما پانا ممکن ہی نہیں ہے اسلامی قانون کا قیام و اجرا نظام تعلیم اور معاشرتی اصول کو اسلام کے مطابق ڈھالے بغیر ہرگز نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا۔ اسلام کا قانونی نظام اس کے معاشی اور معاشرتی نظام سے الگ ہو کر اور کسی دوسرے نظام کا جزء بن کر نہ تو پروان چڑھ سکتا ہے اور نہ وہ برگ و بار لا سکتا ہے جو اس سے مطلوب ہیں۔ یہ حرکت تو بالکل ایسی ہی ہوگی جیسے آم کی ایک ٹہنی کو کیکر کے تنے پر پیوند کر دیا جائے۔ اس صورت میں اس ٹہنی سے آم ملنا تو کجا، دیر تک اس کا سرسبز رہنا بھی مشکل ہے۔ یہ بے جا باتیں اچھے خاصے تعلیم یافتہ لوگ ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں جو اس ملک کے نظام کو چلا رہے ہیں۔ سیدھی بات یہ ہے کہ آپ اگر اس ملک کو اسلام کے اصولوں پر چلانا چاہتے ہیں تو پھر اس کا دستور لازماً اسلامی ہونا چاہیے۔

ان عذرات کے علاوہ اگر کوئی اور عذر بھی ہوں تو ہم ان کو بھی سننا چاہتے ہیں اور ان کے جواب میں جو دلائل ہمارے پاس ہوں گے ہم انہیں پیش کر کے ذہنوں کو صاف کرنے کی کوشش کریں گے کیونکہ ہماری خواہش یہ ہے کہ اس ملک کی رائے عام کو پوری طرح مطمئن کریں اور عوام الناس خوب اچھی طرح جان لیں کہ ان کی فلاح اسی شے میں ہے کہ ان کے ملک میں اسلامی نظام قائم ہو۔